حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ

جلد — ۲

آیات، حدیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۲۰۱ ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو پاکیزگی اور فکر و ذہن کو بصیرت بخشتا ہے

مرتب: مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ

بانی و مدیر: دارالعلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق

مولانا محمد اصغر صاحب — فاضل جامعہ دارالعلوم کراچی

مولانا راشد محمود راجہ صاحب — متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

مولانا ساجد محمود صاحب — متخصص فی الحدیث جامعہ [illegible] کراچی

تصحیح و نگرانی: مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

معارف القرآن

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَافَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. أَمَّا بَعْدُ! فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "خَيْرُكُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ" أَوْ كَمَا قَالَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ) ① ...... صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

بزرگانِ محترم!...... جلسہ کی مناسبت سے میں نے جو حدیث تلاوت کی اس کا مفہوم اور ترجمہ یہ ہے:
"تم میں سے وہ شخص بہترین ہے جو قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرتا، یا دوسروں کو اس کی تعلیم دیتا ہے۔ خود پڑھتا ہے یا دوسروں کو پڑھاتا ہے"۔

خیر کی دو بنیادیں...... اس امت کے لئے سب سے پہلے جو چیز لازم کی گئی اور جس کو سراپا خیر قرار دیا گیا، وہ اللہ کی کتاب "قرآن مجید" ہے۔ جس کے متعلق احادیث میں: "إِنَّ أَصْدَقَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ" فرمایا گیا۔ یعنی سراپا سچ، سراپا خیر اللہ کی کتاب ہے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکت کے لئے: "وَأَحْسَنَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" ② کا اطلاق فرمایا گیا۔ یعنی بہترین سیرت، سیرتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ یہ دو بنیادیں ارشاد فرمائی گئی ہیں، اول کتاب اللہ، دوم رسول اللہ۔ رسول تو اللہ تعالیٰ نے اس امت کو وہ عنایت فرمایا جو خیر البشر ہیں، جو تمام بنی آدم اور تمام ملائکہ بلکہ پوری کائنات میں افضل ترین ہیں۔ اور کتاب اللہ قوانین خداوندی میں سب سے اتم ترین اور جامع و اکمل ترین قانون ہے۔ اس کی تعلیم و تعلم کو بہترین مشغلہ قرار دیا گیا۔

بنیادوں کی خیر...... اور یہ انہی بنیادوں کی خیر ہے جو امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جاری ہوئی، اسی سبب سے یہ امت، خیرِ امت کے لقب سے سرفراز ہوئی...... ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ ③ تم ہی وہ بہترین امت ہو جس کو انسانیت کی بھلائی کے لئے وجود بخشا گیا۔ گویا بنیادیں بھی خیر و برکت اور بنیادوں کے ذریعے

---

① الصحيح للبخاري، كتاب فضائل القرآن، باب خيركم من تعلم القرآن وعلمه ... ص: ۴۳۸۔

② السنن للنسائي، كتاب الصلوة، باب كيف الخطبة، ج: ۶ ص: ۴۷۔ ③ پارہ: ۴، سورة آل عمران، الآية: ۱۱۰۔

تربیت یافتہ امت بھی خیر امت، پھر یہ خیر مطلق چند طبقات پر حاوی ہوئی۔ تو وہ طبقات بھی کامل واکمل طریقہ پر باعث خیر بنے۔ چنانچہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: "خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ، ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ، ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ۔" ① زمانوں میں بہترین زمانہ میرا ہے، پھر اس سے ملا ہوا، پھر اس سے ملا ہوا۔

ان زمانوں کے اعتبار سے اعلیٰ ترین فضیلت صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو نصیب ہوئی اور قرآن کریم نے من حیث الطبقہ جس جماعت کو محترم اور مقدس قرار دیا وہ یہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا طبقہ ہے، جس میں کوئی تخصیص نہیں کی گئی۔ مطلق اس طبقہ کو ہی خیر فرمایا گیا۔ قرآن کریم میں مختلف عنوانات سے اس طبقہ کی خیریت اور تقدس کو بیان فرمایا گیا، ارشاد ہوا: ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ ② جنہوں نے اسلام کی پہلی پکار پر لبیک کہا، وہ مہاجر ہوں یا انصار یا انکے سچے دل سے پیروی کرنے والے، اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔
اس میں جانبین کی باہمی رضا وخوشی بتائی گئی۔ تو یہ طبقہ مطلقاً خیر مطلق قرار پایا۔ یہ اللہ سے راضی، اللہ ان سے خوش اور رضا وخوشی کا یہ اعلان چونکہ قرآن کریم کے ذریعے فرمایا گیا، جو دوامی کتاب ہے جس کا وجود قیامت تک باقی رہے گا بلکہ آگے جنت میں بھی جاری وساری رہے گا اور ایک لحاظ سے یہ ابدی کتاب ہے لہٰذا اعلانِ رضامندی بھی ابدی ہے۔ اس کا اطلاق ہر دور و ہر زمانہ میں ہوتا رہے گا اور کوئی زمانہ ایسا نہیں آئے گا جس میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی خیر میں فرق پڑے، ورنہ ان سے اللہ تعالیٰ کی رضا کا اعلان عام نہیں رہے گا۔ اعلان کی عمومیت ہی اس کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے ابد تک راضی ہے اور راضی رہے گا، اس کی رضا میں کوئی فرق نہیں پڑے گا، وہ ہمیشہ ہمیشہ اللہ سے راضی رہیں گے اور اللہ تعالیٰ ان سے راضی رہے گا۔

مشیت الٰہی بندہ کے تابع ..... صوفیاءِ کرام کی اصطلاح میں اسی تعلق رضا کو نسبت کہتے ہیں کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی مرضیات کے تابع ہو جائے اور اللہ تعالیٰ بندہ کی جو مرضیات ہوں ان سے خوش ہو۔ جانبین کی یہی رضا "نسبت" کہلاتی ہے۔ جس بندہ کو یہ نسبت حاصل ہو جائے تو اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے عافیت میں رکھے تب راضی، بیماری ودکھ میں رکھے تب خوش، جو بھی تقدیر خداوندی ہو، بندہ اس پر مطلقاً رضا کا اعلان بھی کردے اور دل سے بھی راضی رہے اور جب بندہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کی ہر تقدیر پر راضی ہو تو پھر اللہ تعالیٰ بھی بندہ کی ہر منشاء پر راضی ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا یہ ہوتی ہے کہ بندہ کا جو منشا ہو وہ پورا فرماتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جس کو حدیث شریف میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کی شان

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الشهادات، باب لایشهد علی شهادة جور اذا اشهد، رقم: ۲۴۵۷.

② پارہ: ۱۱، سورة التوبة، الآية: ۱۰۰.

بھی عجیب ہے اللہ تعالیٰ آپ کی خواہش پورا کرنے میں اس قدر جلدی فرماتے ہیں کہ ادھر آپ کے دل میں خواہش پیدا ہوئی ادھر اللہ نے فوراً پورا فرمادیا۔

اس کو یوں کہا جاسکتا ہے کہ مشیت الٰہی بندہ کی مشیت کے تابع ہوگئی، جو بندہ چاہتا ہے وہی ہوجاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ آپ کی جو خواہش ہوتی پوری ہوجاتی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سراپا خیر تھے اسی طرح آپ کی خواہش بھی خیرِ مطلق ہوتی تھی۔ غیرِ خیر یا شر کی خواہش نبی کے ذہن کو چھو بھی نہیں سکتی۔ انبیاء کرام کے قلوب اتنے پاکیزہ، مقدس اور صاف ہوتے ہیں کہ ان میں جو ارادہ بھی پیدا ہوتا ہے، جو خواہش بھی پیدا ہوتی ہے، خیرِ مطلق ہوتی ہے۔ جب وہ خیرِ محض ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور پورا فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر ہی چلتی ہے اور خیر ہی کی پذیرائی ہوتی ہے۔ یہی وہ انتہائی مقام ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی اور اللہ بندہ کی ہر خواہش پر راضی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عمر جدھر گھومتے ہیں، حق بھی ادھر گھومتا ہے۔ بظاہر تو صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ جدھر مشیت خداوندی اور حق ہوتا ہے ہم ادھر ہی چلتے ہیں، اور یہاں یہ فرمایا جارہا ہے کہ جدھر عمر گھومتے ہیں حق بھی ادھر ہی گھومتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ایک مقام تو مبتدی کا ہوتا ہے کہ وہ تابع مطلق ہوتا ہے۔ جدھر حق ہو، ادھر ہی گھوم جائے۔ اور ایک مقام منتہی کا ہوتا ہے۔ یہ مقام جانبین کی رضائے کامل سے حاصل ہوتا ہے کہ اللہ بندہ سے راضی اور بندہ اللہ سے راضی۔ اور یہ مقام پوری امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں سے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو حاصل ہوا۔

خیرِ عمل...... اول پوری امت کو دیگر امم کے مقابلے میں خیر امت قرار دیا گیا، پھر اس خیریت کو "خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ" کے ذریعہ عہد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے ساتھ مخصوص فرمایا گیا۔ اس کے بعد عہد صحابہ میں موجود مسلمانوں میں سے خیریت میں اس فرد کی ترجیح فرمائی گئی جو خود قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرے اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دے۔ یوں اس کی رغبت دلائی: "خَيْرُكُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ" (1) اس کو خیر العمل کہا گیا ہے۔ قرآن کریم خود بھی خیر، اس کو پڑھنے پڑھانے والے بھی خیر کے مستحق۔

حفاظتِ قرآن کریم...... ظاہر میں قرآن کریم دو چیزوں، الفاظ و معانی کا مجموعہ ہے۔ اور یہ دونوں "مُنَزَّلٌ مِّنَ اللّٰهِ" ہیں، دونوں ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں۔ الفاظ قرآن جب نازل ہوتے تھے، اسے جوں کا توں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ و حاضرین کو سنادیتے تھے، کوئی لفظ کم کرتے نہ زیادہ۔ اس معاملہ میں جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم امین تھے اسی طرح معانی کے سلسلہ میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم امین تھے۔ الفاظ کی طرح معانی بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے القاء کئے جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیت کا جو

(1) الصحیح للبخاری، کتاب فضائل القرآن، باب خیرکم من تعلم القرآن... ص: ۴۳۸۔

مقصد، مطلب و معنیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر القاء ہوتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کو روایت فرما دیتے، اپنی طرف سے کوئی معنیٰ بیان نہیں فرماتے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم الفاظ میں بھی امین تھے اور معانی میں بھی امین۔ الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کے اور معانی بھی اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں۔ اور دونوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کہ ان میں قیامت تک کوئی خلل نہیں پڑ سکتا۔ یہ الفاظ و معانی قیامت تک باقی رہیں گے۔ تحریف کرنے والے ہزار تحریف کریں مگر حق غالب ہی رہے گا الفاظ بھی باقی رہیں گے اور معانی بھی۔ خود قرآن کریم نے ہی اس کی گارنٹی دی ہے: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ﴾ ① ابتداءً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عادت شریفہ تھی: جب وحی نازل ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جلدی جلدی اس کو پڑھنے لگتے تاکہ الفاظ زبان پر چڑھ کر محفوظ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بھولنے کے خطرہ کے پیشِ نظر جلد جلد زبان کو حرکت نہ دیجیے! اس کے الفاظ آپ کے قلب میں جمانے اور زبان سے ادائیگی کا ہم ذمہ لیتے ہیں۔ گویا الفاظِ قرآن کی حفاظت اور یادداشت کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لی کہ آپ کے قلب مبارک سے پڑھوا بھی دیں گے، نہ جمع میں کوئی غلطی ہوگی اور نہ پڑھنے میں کوئی چوک ہوگی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ذمہ بھی تھا اور وعدہ بھی۔

عربی میں "عَلَی" التزام کے لئے آتا ہے، جس چیز کو کوئی اپنے اوپر لازم کرتا اور اس کا ذمہ لیتا ہے، اس کی تعبیر عَلَی سے کی جاتی ہے۔ مثلاً کوئی کہتا ہے: "عَلَیَّ اَلْفُ دِرْهَمٍ" تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ مجھ پر لازم ہے کہ تم کو ایک ہزار روپیہ دوں، یہ میری ذمہ داری ہے۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْاٰنَهُ﴾ ② یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ الفاظِ قرآن آپ کے قلب میں جمع و محفوظ بھی کر دیں اور آپ کی زبان سے پڑھوا بھی دیں۔ گویا قرأت بھی دوامی ہے، جس میں بھی کسی قسم کا خلل نہیں پڑ سکتا۔ اور جمع قرآن بھی دوامی ہے کہ اس میں تحریف ورد و بدل نہیں ہو سکتا۔ معانی پڑھے نہیں جاتے، سمجھے جاتے ہیں۔ تو یہاں "قُرْاٰنَهٗ" فرما کر الفاظ پڑھانے اور زبان پر جاری کرانے کی ذمہ داری لی گئی۔ معانی سے متعلق یہاں کچھ نہیں فرمایا گیا۔ قرآن کے لفظی معنیٰ "پڑھانا" کے ہیں۔ معانی کی ذمہ داری ﴿ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾ ③ میں لی گئی ہے۔ یعنی الفاظ کے معنیٰ کھول کھول کر بیان کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے۔ پہلی آیت میں "قُرْاٰنَهٗ" فرما کر الفاظ کی ادائیگی اور قرأت کی ذمہ داری لی اور اس آیت میں "بَیَانَهٗ" فرما کر بیان کرنے اور سمجھانے کی ذمہ داری لی۔ خلاصۂ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے دونوں اجزاء الفاظ و معانی کی ذمہ داری لے لی ہے۔ یعنی قرآن پڑھوانا بھی ہمارے ذمہ ہے اور اس کے معنیٰ و مفہوم کو، جو قرآن کے موضوعات ہیں، سمجھانا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔

قرآن اور بیانِ قرآن یعنی حدیث...... اور یہ بیان ہی دراصل حدیث کہلاتا ہے اور حدیث ہی کے ذریعہ

---

① پارہ: ۱۴، الحجر، الآیۃ: ۹۔ ② پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۷۔ ③ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۹۔

سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنی مقاصد کو واضح فرمایا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حدیث بھی قرآن کی طرح قیامت تک باقی رہنے والی ہے۔ کیونکہ قرآن کے ساتھ بیانِ قرآن باقی نہ رہے تو لوگ کچھ کا کچھ مطلب لیں گے۔ ایک معنی کے ہزار معنی بنیں گے۔ قرآن کی اولین تفسیر حدیث نبوی ہے کہ قرآن مجید میں اس کو بیان بھی کہا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ ① الفاظ جب آ چکے ہیں تو اس کے معانی بیان ہوتے ہیں۔ اس لئے بیان معانی پر صادق آتا ہے۔ الفاظ بیان نہیں کہلاتے۔ وہ تلاوت کئے جاتے ہیں، پڑھے جاتے ہیں۔ قرآن کے جو الفاظ آ چکے ہیں اور ان کے جو معانی اور مرادات ربانی ہیں ان کو بیان کر دینے کا نام "تبیین" ہے، یعنی واضح کر دینا: ﴿لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ﴾ سے معلوم ہوا کہ حدیث، بیانِ قرآن ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک متن اتارا، جس کا نام قرآن مجید ہے اور اس متن کی ایک شرح اتاری، جس کا نام حدیث ہے۔ اسکی تاکید، لفظِ بیان سے کی اور اس سلسلے میں خود ذمہ داری لی: ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ ② کہ بیان کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی آیت نازل ہوتی تو وہ اپنی جامعیت کے لحاظ سے کئی معنوں میں ڈھل سکتی ہوتی۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس طرح نہیں فرمایا کہ اس آیت کے ایک معنی یہ ہو سکتے ہیں، ایک یہ ہو سکتے ہیں اور زمانہ کے مطابق فلاں معنی ہیں، للہٰذا یہ معنی مراد ہیں۔ بلکہ اس آیت کی مراد بھی اللہ تعالیٰ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر القاء فرماتے تھے، خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم مراد پر غور نہ فرماتے کہ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے، یہ مراد بھی نکلتی ہے۔ مرادِ ربانی روایت اور نقل سے حاصل ہو سکتی ہے، عقل سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ مراد کے دائرے میں رہ کر آپ عقل لڑائیں گے تو حکمتیں کھلیں گی اور وہ حکمتِ قرآن کہلائے گی۔ لیکن خود مراد کو عقل سے متعین نہیں کیا جا سکتا۔ مراد اللہ تعالیٰ ہی بیان فرمائے گا کہ اس آیت سے میرا یہ مطلب تھا۔ اگر مرادِ آیت عقل سے ہی متعین کی جاتی تو قرآن کئی اقسام کے ہوتے۔

جیسا کہ روایت میں آیا ہے کہ جب روزہ کے بارے میں آیت نازل ہوئی۔ ابتداء میں یہ حکم تھا کہ رات کو سو کر جب بھی آنکھ کھلے، اس وقت سے اگلے افطار تک بیچ میں کھانا پینا منع ہے۔ پھر اس میں تخفیف فرمائی اور ارشاد فرمایا: ﴿وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ ③ یعنی صبح کاذب کے بعد جب صبح صادق کا اجالا ظاہر ہو تو اب کھانے پینے سے رک جاؤ اور روزہ کی نیت کرو۔ اس آیت کے نزول کے بعد لوگوں نے دو قسم کے دھاگے، کالے اور سفید تیار کرائے اور سرہانے رکھ لیے۔ جب سفید دھاگہ کالے سے تمیز ہو جاتا، تب کھانا پینا بند کرتے۔ حضرت عدی رضی اللہ عنہ نے بھی اسی طرح کے دھاگے تیار کرائے۔ اور تکیہ کے نیچے رکھ دیے۔ ان کو دیکھتے رہتے..... جب کالا دھاگا سفید دھاگہ سے بالکل ممتاز نظر آتا تو روزہ کی نیت کرتے۔ حالانکہ اس وقت صبح ہوئے خاصا وقت پندرہ بیس منٹ گزر چکا ہوتا۔ ان حضرات نے باعتبارِ لغت یہ

---

① پارہ: ۱۴، النحل، الآیۃ: ۴۴. ② پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۹. ③ پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۷.

صورت اختیار کی تھی جو لغوی اعتبار سے غلط بھی نہ تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ کی چونکہ یہ مراد نہ تھی اس لئے سب کی دلجمعی نہ ہوئی اور معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عدی رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا: اے عدی! تم کیا صورت کرتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا: میں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا﴾ ① کے نازل ہونے کے بعد دو ڈورے اپنے تکیے کے نیچے رکھ لئے ہیں اور انہیں دیکھتا رہتا ہوں، جب تک کالا ڈورا سفید ڈورے سے ممتاز نہ ہو جائے کھاتا پیتا رہتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے عدی! تمہارا تکیہ بڑا وسیع ہے کہ اس میں دن رات چھپ گئے۔ کیونکہ کالے ڈورے سے رات مراد ہے اور سفید ڈورے سے مراد دن ہے، دھاگوں کے ڈورے مراد نہیں۔ ② اس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہاں لغوی معنی مراد نہیں۔

مرادِ قرآنی اور لغت ...... یہیں سے معلوم ہوا کہ لفظ کے ایک لغوی معنی ہوتے ہیں اور ایک مرادی۔ قرآن مجید اگرچہ لغت عربی میں ہے لیکن ہر جگہ لغت مراد نہیں۔ بعض جگہ قرآن کریم نے لغت تو زبان عرب سے لی مگر معنی اس کے اندر اپنے ڈالے اور وہی مرادی معنی کہلاتے ہیں۔

اب دیکھئے "صلوٰۃ" کا لفظ ہے۔ لغت عربی میں اس کے معنی دعا مانگنے کے ہیں۔ ایک آدمی دعا مانگ لیتا ہے تو لغت کے لحاظ سے اس نے "صلوٰۃ" ادا کر لی۔ یہ یوں باعتبار لغت رحمت بھیجنا اور دعا مانگنا تو صحیح ہے مگر اسے نماز پڑھ لینا کہنا صحیح نہیں، کیونکہ "صلوٰۃ" کے لفظ کی مراد یہ نہیں ہے۔ اس سے مراد کچھ خاص اعمال و افعال ہیں کہ یوں نیت باندھو، اس طرح قیام کرو، رکوع و سجود کرو، یوں قعدہ میں بیٹھو وغیرہ۔ اس مجموعہ کو صلوٰۃ کہتے ہیں۔ یہاں قرآن نے لفظ لغتِ عربی کا لیا ہے مگر معنی اپنے ڈالے کہ یہاں صلوٰۃ سے ہماری مراد یہ ہے۔ اس مراد کی وضاحت کے بعد صرف دعا مانگنے کو نماز نہیں کہا جا سکتا اور دعا کی ادائیگی نماز سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح لغتِ عرب میں "زکوٰۃ" کے معنی پاک کر دینے کے ہیں۔ آپ ہاتھوں پر پانی ڈال کر دھو کر پاک کر لیں، زکوٰۃ ادا ہو گئی۔ یہ ہزاروں روپیہ کی زکوٰۃ نکالنے کے معنی کہاں سے نکال لیے۔ لغت میں تو اس کا کہیں پتہ نہیں ایسے ہی قرآن کریم نے زکوٰۃ کا لفظ تو لغتِ عرب سے لیا مگر اس کے معنی خود متعین کئے کہ اگر تمہارے پاس اتنا مال، اتنا روپیہ پیسہ ہو اور اس پر پورا سال بھی گزر جائے تو اس مال سے خاص مقدار کی رقم اللہ کی راہ میں نکالنا زکوٰۃ کہلاتا ہے۔ تو زکوٰۃ کے لغوی معنی جتنے بھی ہوں مگر مراد وہی عرفی معنی ہی ہیں، جو قرآن کریم نے مراد لئے ہیں۔ اللہ جل شانہٗ نے بہت سے الفاظ لغتِ عرب کے لے کر ان میں اپنے معنی ڈالے ہیں، وہی مرادی معنی ہوتے ہیں۔ معلم ان ہی معانی کو سمجھاتا رہتا اور ان ہی کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر مرادی معنی ضروری نہ ہوتے، لغوی معنی ہی کافی ہوتے تو اتنا کافی ہوتا کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام قرآن مجید کا نسخہ لاتے، بیت اللہ کی چھت پر رکھ

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۷.

② الصحیح لمسلم، کتاب الصیام، باب بیان ان الدخول فی الصوم یحصل ج ۵ ص: ۲۷۵.

دیتے اور اعلان کر دیتے: اے لوگو! تم روحانی مریض ہو یہ تمہارے لئے نسخۂ شفاء ہے، تم زبان دان ہو، عربی سمجھتے ہو، اس کتاب کو دیکھ دیکھ کر اپنا علاج کرلیا کرو۔ پھر پیغمبر مبعوث کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ مگر مسائل کہیں بھی لغت سے حل نہیں ہوا کرتے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، وہ لغت سے اللہ کی مراد کا تعین کر کے لوگوں کو بتائیں کہ اللہ تعالیٰ کی مراد کیا ہے اور اللہ کے نزدیک اس آیت کا کیا مطلب ہے۔

مقاصدِ بعثتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم..... آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چار وظیفے (چار کام) متعین و مقرر فرمائے۔ پہلا وظیفہ ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾ ① یعنی لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھ کر سنائیں۔ اور امت تک ان کو پہنچائیں۔ آپ نے یہ وظیفہ پوری امانت کے ساتھ انجام دیا اور پورا قرآن امت کو سنایا، ان تک پہنچایا۔ اس کے بعد دوسرا وظیفہ ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾ ② کتاب کی تعلیم دو۔ تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ ان الفاظ سے اللہ تعالیٰ نے جو مطلب اور مراد متعین کی ہے، وہ انہیں سمجھائیں۔ آپ نے وہ معانی سمجھائے اور مرادات ربانی بیان فرمائیں۔ یہ تعلیم کا وظیفہ ہوا۔ جب نبی خود کوئی مراد متعین فرما دے تو اس کے اندر کوئی خلجان باقی نہیں رہتا۔ پھر تیسرا وظیفہ تعلیم حکمت بیان فرمایا ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ ③ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو حکمتیں بھی سکھلائیں۔ حکمت کی دو قسمیں ہیں۔ حکمت نظری، حکمت عملی۔ بقاعدۂ بلاغت حکمت نظری تعلیم کے اندر ہی آ گئی۔ اس کے بعد لفظ حکمت کے ساتھ حکمت کی تعلیم کا حکم دینے سے یہ متعین ہو گیا کہ اس سے حکمت عملی مراد ہے۔ اور وہ ''اسوۂ حسنہ'' ہے، آپ کی مقدس سیرت ہے۔ آپ نے مرادات ربانی نہ صرف سنائیں اور ان کی تعلیم پر اکتفا فرمایا بلکہ عملی طور پر بھی ان کا نمونہ پیش فرمایا۔ اب نہ کوئی خطرہ باقی ہے نہ خدشہ اور نہ کوئی خامی باقی رہ جاتی ہے۔

اگر صرف لفظوں سے لوگوں کو عمل متعین کرنے کو کہا جاتا تو ہر ایک اپنے ذوق کے مطابق الگ الگ متعین کر لیتا۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ پر عمل بھی فرمایا اور ان مرادات ربانی کی ہیئت بھی دکھلا دی۔ اب اس میں کوئی خلجان باقی نہیں رہ سکتا۔ اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نماز کے متعلق جو عمل کر کے دکھلایا گیا، اسی کے مطابق عمل کرو: ''صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ'' جس طرح مجھے نماز پڑھتے تم نے دیکھا ہے، اسی طرح نماز پڑھو۔ میرا اسوہ و عمل تمہارے لئے نمونہ ہے۔ تم اپنی مرضی کے مطابق اس کی ہیئت متعین نہ کرو۔ میرا عمل اللہ کی مراد کے مطابق ہے اور اللہ تعالیٰ کو یہی ہیئت مطلوب ہے۔ اس کے بعد کوئی خدشہ، کوئی خلجان اس ہیئت کے متعلق کیسے باقی رہ سکتا ہے۔

اس کے بعد چوتھا وظیفہ یہ بھی فرما دیا کہ لفظ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سنا دیں، معنی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سمجھا دیں اور عمل کر کے بھی دکھلا دیں۔ مگر ان کے دلوں میں صلاحیت بھی ہونی چاہئے کہ ان معانی کو قبول

①②③ پارہ: ۲۸، سورة الجمعة، الآية: ۲.

کرلیں، اس ہیئت پر اعتقاد جمالیں۔ اس کے لئے ضرورت ہوتی ہے قلب کی صلاحیت کی، کہ ذہن بھی صحیح ہو ذہن صحیح نہ ہو، اس میں ٹیڑھ پن اور کجی ہو تو اوندھے معنی سمجھتا ہے، اس لئے بطور وظیفہ چہارم فرمایا: ﴿وَیُزَکِّیْھِمْ﴾ ① ان لوگوں کے دلوں کو بھی مانجھ دیجیے۔ ان کے ذہنوں میں استعداد اور صلاحیت بھی پیدا کیجیے کہ جب اللہ کا کلام ان کے کانوں میں پڑے تو اس کا مطلب ٹھیک ٹھیک وہی سمجھیں جو اللہ تعالیٰ کی مراد ہے اور عمل کی ٹھیک وہی ہیئت اختیار کریں جو اللہ تعالیٰ کا منشاء اور اس کا مطلوب ہے۔ محض لفظوں سے کوئی شخص عمل کا نمونہ اختیار نہیں کرسکتا، جب تک عملی نمونہ اس کے سامنے نہ ہو۔ اور عملی نمونہ کو اختیار کرنے کی رغبت پیدا نہیں ہوسکتی جب تک دل کی کدورات صاف کرکے، اس کو مانجھ کر پاک و مصفیٰ نہ کردیا گیا ہو۔

اسوۂ حسنہ کی ضرورت...... میں کہتا ہوں کہ روٹی پکانا بظاہر معمولی بات ہے۔ ہم اور آپ روزانہ گھروں میں روٹی پکتے دیکھتے ہیں۔ مگر آپ محض دیکھتے رہنے سے، روٹی پکانے کا عمل نہیں کرسکتے، جب تک اس عمل کی مشق نہ کریں۔ پہلے آپ دیکھیں گے کہ پیڑا کس طرح بنایا جاتا ہے، اس کو روٹی کی شکل کس طرح دی جاتی ہے، پھر اس کو توے پر کس طرح ڈالا جاتا ہے۔ جب آپ اپنے ہاتھ سے اس عمل کو دھرائیں گے، عملی طور پر اس کی مشق کریں گے، تب آپ کو روٹی پکانی آئے گی۔ محض بیٹھے دیکھتے رہنے سے آپ کبھی روٹی نہ پکا سکیں گے، روٹی پکانے کے عمل اور ہیئت کے دیکھنے سے۔ اول ہر عمل کی ہیئت دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ الفاظ سے ہیئت ذہن نشین نہیں ہوا کرتی اور مشق کے بغیر عمل کی صورت ظہور پذیر نہیں ہوتی۔ خیاطی ایک فن ہے۔ اس فن کی آپ ہزار کتابیں پڑھ ڈالیں، سوئی چلانی نہیں آئے گی۔ جب تک درزی کو سوئی چلاتے دیکھ نہ لیں، آپ سوئی نہ چلا سکیں گے۔ اسی طرح دنیا کی سب صنعتوں اور حرفتوں کا حال ہے کہ کوئی بھی صنعت بغیر سیکھے سکھائے نہیں آسکتی۔ جب تک سکھانے والا عملی نمونہ نہ دکھائے محض الفاظ سے صناع نہیں بنا سکتے۔

یہی حال دین کی صنعت کا بھی ہے کہ محض الفاظ اتار دینے اور ان کے معانی سمجھا دینے کے باوجود عمل کی ہیئت انسان کے ذہن نشین نہیں ہوسکتی، عملی نمونہ ضروری ہے تاکہ وہ الفاظ معانی کو صحیح عمل اور ہیئت پر منطبق کرسکیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں اور رسولوں کو اسی لئے مبعوث فرمایا کہ وہ اپنی امتوں کو اللہ تعالیٰ کے فرامین و احکامات کے الفاظ بھی سکھائیں، ان کے مفاہیم و معانی بھی بتائیں اور الفاظ و معانی سے جو عمل مطلوب ہے، اس کا نمونہ بھی ان کے سامنے رکھیں اور اسی کے ساتھ ان کے ذہن کو بھی مصفیٰ اور منور کریں۔ اور ذہن سازی فرمائیں، تاکہ وہ کلام الٰہی کے اوندھے سیدھے معانی نہ سمجھیں اور پیغمبر نے جو نمونہ عمل ان کے سامنے پیش کیا ہے اس سے گریز اور بے رغبتی نہ برتیں، بلکہ ذوق و شوق اور کشادہ دلی کے ساتھ اس نمونہ کو حرزِ جان بنالیں۔ اگر ذہن کی صفائی کے لئے الفاظ و معانی کافی ہو جایا کرتے تو انبیاء علیہم السلام کے لئے ''وظیفۂ تزکیہ'' لازم نہ کیا جاتا۔ ذہن کی

صفائی کے لئے خاص طرح کی محنت اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدات وریاضات کے ذریعہ اپنے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قلوب کا تزکیہ فرمایا۔ ان کو مجلّٰی اور مزکّٰی کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب ان کو اللہ کا کلام سنایا جاتا تو ان پر وہی اثرات ظاہر ہوتے جو کلام اللہ کے اثرات ہیں۔

اللہ کا یہی کلام آپ عام مسلمان کو سنائیں، تو عملی طور پر معتقد ہوگا کہ یہ اللہ کا کلام ہے، اس کی بے ادبی نہیں ہونی چاہئے، مگر اس سے آگے کے اثرات کا اس پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ اسکے برخلاف اللہ کا یہی کلام کسی عارف باللہ کو آپ سنائیں تو وہ کہیں سے کہیں پہنچ جائے گا۔ اسلئے کہ اس کا دل منجھا ہوا ہے۔ مجاہدات وریاضت سے اس کا قلب روشن ہے۔ اسی روشنی میں کلام الٰہی کے جو اثرات وہ مشاہدہ کرے گا، عام مسلمان ایسا نہیں کر سکے گا۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر اللہ کی کثرت، نماز کی ادائیگی، جہاد اور دیگر مجاہدات کے ذریعہ اپنے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تربیت فرمائی، ان کے قلوب کو مانجھا، مصفّٰی ومزکّٰی کیا اور ان کا رُخ بدل دیا۔ پہلے ان کا رُخ دنیا کی طرف تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرش کی طرف ان کا رُخ کر دیا۔ پہلے وہ فرشی تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت نے عرشی بنا دیا۔

تو عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کے ایک تو الفاظ ہیں، ایک معانی ہیں، جو الفاظ میں پوشیدہ ہیں پھر ان معانی کی تہہ میں حقائق ہیں، حقائق کے تحت معارف ہیں اور معارف میں کیفیات ہیں، جو قلوب پر طاری ہوتی ہیں۔ کتاب اللہ کے نزول کا مقصد محض الفاظ ومعانی کی سمجھ بوجھ ہی نہیں، بلکہ اس کا مقصد ایسے قلوب واذہان کی تربیت وتزکیہ بھی ہے، جو الفاظ ومعانی کی تہہ میں چھپے ہوئے حقائق ومعارف کے ادراک کے قابل ہوں اور ان معارف کی کیفیت کا محل بھی بن سکیں۔

قرآن کے ساتھ اجتماعِ خیر...... اس تربیت وتزکیہ کا مدار مُربّی ومزکّی کی شخصیت پر ہوتا ہے، اس لئے کلام اللہ کے ساتھ ساتھ رسول اللہ کی بعثت بھی ضروری کروائی گئی۔ جہاں بھی کسی صحیفۂ الٰہی، یا کتاب اللہ کے نزول کا ذکر ہوا اسی کے ساتھ ساتھ اس صحیفہ یا کتاب کے نزول کے مورد، پیغمبر ورسول کا ذکر بھی لازماً ہوا۔

اللہ تعالیٰ کی چار مشہور کتابیں چار پیغمبروں پر نازل ہوئیں۔ تورات کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام، زبور کے ساتھ حضرت داؤد علیہ السلام، انجیل کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور قرآن مجید کے ساتھ ہمارے پیغمبر رسولِ مقبول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ غرض کوئی ایسا دور نہیں گزرا کہ قانون تو آیا ہو مگر شخصیت نہ آئی ہو۔ اس لئے کہ دارومدار شخصیت پر ہوتا ہے، کاغذوں اور تختیوں یا ان پر کندہ حروف پر نہیں ہوتا۔ ان حروف والفاظ کی تلاوت شخصیت کرے گی اور ان کے معانی بھی شخصیت بتلائے گی اور نمونۂ عمل بھی شخصیت بنے گی۔ کسی کتاب کے اوراق تو نمونۂ عمل نہیں بنیں گے۔ دلوں کو مانجھے، ان کو مصفّٰی ومزکّٰی کرنے کا کام بھی شخصیت انجام دے گی۔ کتابوں پر لکھے ہوئے یا تختیوں پر کندہ الفاظ تو دلوں کو نہیں مانجھیں گے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ ہر قانون

کے ساتھ شخصیت لازم اور ضروری ہوتی ہے اور یہی وہ شخصیت ہے جس کا نام اللہ تعالیٰ نے نبی اور رسول رکھا۔

یہ ایک سیدھی سی بات ہے کہ جب قرآن کریم خیر الکتب ہے تو اس کے ساتھ مبعوث ہونے والی شخصیت بھی لازماً خیر البشر ہوگی۔ اور اس خیر البشر شخصیت سے شاگرد بھی خیر الناس ہوں گے۔ اور وہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔ اسی قاعدہ کے مطابق خیر البشر کا قرن ''خیر القرون'' ہوگا۔ ایسی خیر در خیر کے اندر قرآن مجید کا نزول ایسا خیر مطلق تھا کہ اس کے ساتھ کئی طرح کی خیریں وابستہ تھیں۔ زمانہ کی خیر، مکان کی خیر، ذات اقدس کی خیر، شاگردوں کی خیر اور جب گونا گوں خیریں یکجا اور مجتمع ہوگئی تو خیر الکتب کا نزول ہوا اور اس کے متعلق فرمایا گیا: ''خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ'' ① تم میں سے جو قرآن پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، وہ بہترین لوگ ہیں۔ جس کتاب کے اندر باہر، اردگرد، اوپر نیچے اور ہر سمت خیر ہی خیر ہو تو اس کے پڑھنے پڑھانے والے اس خیر سے کیسے محروم رہ سکتے ہیں، وہ بھی خیر بن جائیں گے۔

کلام اللہ کے ذریعے باطنِ خداوندی سے وابستگی ...... اسی لئے ایک حدیث اس مضمون کی مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قرآن سے برکت حاصل کرو، یہ اللہ کا کلام ہے اور اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے''۔ (او کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام) ② کلام آدمی کے اندر سے نکلتا ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ آدمی کلام کو تخلیق کرتا ہے، بلکہ کلام آدمی سے سرزد ہوتا ہے۔ آدمی اس کی تخلیق نہیں کرتا۔ جب کسی بولنے والے کو آپ بولتا سنتے ہیں تو یہ کہتے ہیں: کلام اس سے صادر ہو رہا ہے، سرزد ہو رہا ہے۔ یہ نہیں کہتے کہ یہ شخص کلام پیدا کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تمام آسمان و زمین اور پوری کائنات تخلیق فرمائی۔ تمام خیرات و برکات مخلوقِ خداوندی ہیں مگر قرآن مجید مخلوق نہیں ہے۔ وہ اللہ کا کلام ہے جو اس کے اندر سے صادر ہوا ہے۔ اسی لئے اس کلام پاک کو پڑھ کر بندہ کا تعلق باطن خداوندی سے قائم ہوتا ہے۔ دیگر نعمتوں کے ذریعہ ظاہر سے وابستگی اور تعلق قائم ہوتا ہے اور کلام خداوندی کے ذریعہ باطن سے وابستگی پیدا ہوتی ہے۔

اسی لئے قرآن کریم کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا﴾ ③ اور حدیث شریف میں حبل اللہ کی تفسیر ''اَلْقُرْاٰنُ حَبْلُ اللّٰهِ'' کے الفاظ سے فرمائی گئی ہے کہ قرآن اللہ کی رسی ہے، جو زمین پر اتاری گئی ہے۔ ④ اسے مجموعی طور پر مضبوطی سے تھامے رہو۔ کیونکہ یہ رسی قیامت کے دن کھینچی جائے گی، تو اس کو تھامنے والے بھی اسی کے ساتھ کھنچے آئیں گے اور جہاں قرآن پہنچے گا وہیں اس سے چمٹے رہنے والے، باطنِ حق

① الصحیح للبخاری، کتاب فضائل القرآن، باب خیر کم ... ص ۴۳۸.
② الجامع الکبیر للسیوطی حدیث رقم: ۳۳۸۹. کنز العمال، ج: ۱ ص: ۳۲۱.
③ پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۰۳.
④ الصحیح لمسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل علی بن ابی طالبؓ ج: ۱۲ ص: ۱۳۳.

سے وابستہ ہو جائیں گے۔

الفاظ وحروفِ قرآن کی جنت میں گل وگلزار سے تبدیلی...... بعض احادیث کے مضمون میں فرمایا گیا ہے کہ قرآن مجید میں جتنی آیات ہیں جنت میں اتنے ہی درجے ہیں۔ قرآن پڑھنے والے سے کہا جائے گا: "رَتِّلْ وَارْتَقِ" ① پڑھتا جا اور درجے چڑھتا جا۔ اب جس کو جتنا قرآن یاد ہوگا وہ اسی کے مطابق درجات تک پہنچ جائے گا۔ بعض احادیث میں فرمایا گیا ہے کہ یہ آیتیں خود جنت کے درجات ہیں۔ یہاں آپ کو جو آیات، الفاظ کی صورت میں نظر آتی ہیں۔ جنت میں یہی آیات باغ وبہار کی شکل میں ڈھل جائیں گی۔ چیز ایک ہی ہے۔ یہاں شکل اور ہے، جنت میں یہ شکل بدل جائے گی۔

ہمارے زمانے میں یورپ کا ایک کھلونا آتا تھا۔ پیکٹ میں غالباً ۱۲ گولیاں ہوتی تھیں۔ چار آنے میں ملتا تھا۔ بچے لاتے تھے۔ پانی کا پیالہ بھر کر گولی اس میں ڈالتے تھے تو پانی لگنے سے گولی پھٹتی تھی اور وہ گولی پھیل کر کوئی انجن بن جاتی تھی، تو کوئی گھوڑا، کسی کا پھول بن گیا تو کسی کا نگا۔ کاریگر نے صناعی یہ کی تھی کہ کاغذ پر اس انداز میں مسالے لپیٹے تھے کہ جب وہ گولی پھٹتی تھی تو مختلف شکلوں کا ظہور ہوتا تھا، شرط پانی کا لگنا تھا۔ اسی طرح شادی بیاہ میں آتش بازی چھوڑی جاتی ہے۔ ایک چکرا سا ہوتا ہے۔ اس میں مسالہ اس انداز اور کاریگری سے لپیٹا جاتا ہے کہ جب آگ لگا کر اسے چھوڑا جاتا ہے تو اس کے شراروں سے ایسا سماں بندھتا ہے کہ دیکھنے والوں کو گھوڑا اور اس پر سوار نظر آتا ہے، یا باغ کا نظارہ پیش نظر ہو جاتا ہے۔ لوگ حیران ہوتے ہیں اور خوب داد دیتے ہیں کہ کیا صناعی اور کاریگری ہے، اور مسالہ کو کس انداز سے لپیٹا ہے کہ کبھی گھوڑا نظر آتا ہے۔ کبھی نگا اور کبھی کوئی پھول۔ یہ ایک عجیب صناعی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کی آیات میں یہ صناعی رکھی ہے کہ وہ جب تک عالم آب وگل میں موجود ہیں، خزانۂ علم وعرفان ہے، پڑھنے پڑھانے کی چیز ہے اور جب ان کو آخرت کا پانی لگے گا تو یہی حروف والفاظ، گل وگلزار میں تبدیل ہو جائیں گے۔ دنیا میں جو الفاظ اپنے تلاوت کرنے والوں کے لئے سرمایۂ سکون وراحت تھے اور انہیں علم وعرفان کی دنیا کی سیر کراتے تھے، وہی الفاظ اب ان کے لئے جنت نگاہ باغ وبہار اور لعل وجواہر کی صورت میں ظاہر ہو کر آخرت کی زندگی پُر بہار اور گہوارۂ شادمانی ومسرت بنا دیں گے۔ انہیں میں سے نہریں پھوٹیں گی۔ یہی حروف حور وقصور کی شکل میں ظاہر ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ان حروف کے نقطے ہی وہاں لعل وجواہر، موتی وغیرہ کی شکل اختیار کر لیں۔ یہاں ان کی شکل آیات کی ہے، وہاں باغ وبہار میں تبدیل ہو جائیں اور نعمتوں کے روپ میں ڈھل جائیں گی۔

میں کہا کرتا ہوں کہ دوسری قومیں جو اچھی کتابوں اور رسالوں پر ایمان لا کر قیامت کے بعد جس جنت میں داخلہ کی امید رکھتی ہیں، وہ جنت تو مسلمان اپنے دلوں میں یہیں دنیا میں سمیٹے بیٹھے ہیں۔ وہ قیامت کا انتظار کرنے

① السنن لابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب استحباب الترتیل فی القراءۃ ج:۴ ص:۲۶۳۔

کی بجائے آج ایمان لاکر یہ جنت کیوں نہ حاصل کرلیں۔ جس مسلمان نے پورا قرآن حفظ کرلیا، اس نے گویا پوری جنت اپنے قلب میں سمیٹ لی۔ جب عالم آخرت میں حرفوں اور لفظوں میں سمٹی ہوئی یہ جنت کھلے گی اور پھیلے گی تو وہ دیکھے گا کہ یہ تو قرآن حکیم تھا، جواب جنت بن گیا ہے۔ اس دنیا میں مؤمن اپنے اندر جنت لئے بیٹھا ہے لیکن چونکہ اس کی اصل شکل سامنے نہیں ہے، اس لئے اسے پتہ نہیں کہ کتنی عظیم چیز وہ اپنے اندر لئے بیٹھا ہے۔ جب آیتوں کی حقیقت کھلے گی اور وہ اپنی اصل شکل بدل کر سامنے باغ و بہار کی نظر آئیں گی تو اس نعمت کا اندازہ ہوسکے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ مردِ مؤمن اپنی ذات میں جنت ہے۔ قیامت میں اس کو جو چیز جنت کے نام سے ملنے والی ہے۔ وہ یہیں قرآنی الفاظ کی شکل میں اس کو عنایت کردی گئی ہے۔ اب جو بھی یہاں قرآن پڑھ رہا ہے، وہ گویا جنت سمیٹ سمیٹ کر اپنے اندر ذخیرہ کررہا ہے، وہی جنت جب کھلے گی تو اسے پتہ چلے گا کہ یہ تو مجھے دنیا ہی میں مرحمت فرمادی گئی تھی۔ بہر حال قرآن حکیم حق تعالیٰ شانہ کے باطن سے وابستہ ہونے کا ذریعہ بھی ہے۔ اجر وثواب کے حصول کا باعث بھی ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ کے بدلے دس دس نیکیاں نامۂ اعمال میں ذخیرہ ہورہی ہیں اور یہی قرآن جنت کے محلات وقصور رنگیں وگلستان بھی ہیں۔

غرض قرآن شریف کی عجیب شان ہے اسے پڑھو تو اس سے بہتر وظیفہ نہیں، اس کا علم سیکھو تو اس سے بڑھ کر کوئی علم نہیں، اسے دستورِ زندگی بناؤ تو اس سے بڑھ کر کوئی قانون نہیں، اگر اس کے حقائق کھولو تو اس سے بہتر حکمتیں نہیں، اگر اس کی کیفیات اپنے اوپر طاری کرلو تو اس سے بڑھ کر سکونِ قلب کوئی نہیں، نعمتوں کا جو تصور بھی کوئی قائم کرے، وہ سب کا سب اس کے اندر جمع ہے۔ جو یہاں علمی شکل میں ہیں، عالم آخرت میں باغ و بہار کی شکل میں آجائیں گی اور یوں معلوم ہوگا کہ قرآن کریم ایک عظیم الشان اور حدِ نظر تک وسیع باغ ہے، جس میں ہزاروں لاکھوں پھول کھلے ہوئے ہیں اور ہمہ اقسام خوشبوئیں موجود ہیں۔

تورات اور میدانِ حشر..... چنانچہ حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ میدانِ حشر میں جب اقوامِ عالم جمع ہوجائیں گی تو اللہ تعالیٰ لوحِ محفوظ سے پوچھیں گے کہ وہ کتاب تورات کہاں ہے جو ہم نے تیرے اندر رکھی تھی؟ وہ عرض کرے گی کہ وہ تو جبرئیل علیہ السلام لے گئے تھے۔ جبرئیل علیہ السلام سے سوال ہوگا: لوحِ محفوظ سے تم تورات لائے تھے؟ وہ عرض کریں گے: جی ہاں لایا تھا۔ پھر سوال ہوگا: اسے کہاں لے گئے؟ وہ کہیں گے "تورات" کو میں نے موسیٰ کے قلب پر نازل کیا تھا۔ موسیٰ سے سوال ہوگا کہ جبرئیل علیہ السلام سے تم نے تورات سنی؟ وہ عرض کریں گے جی ہاں! تورات سنی اور اس کے معنی سمجھے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: پھر آپ نے کیا کیا؟ موسیٰ عرض کریں گے: میں نے وہ تورات اپنی امت کو پہنچادی۔ حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہوگا: وہ "تورات" اب اپنی امت کو سنا کر دکھاؤ۔ آپ علیہ السلام پوری تورات وہاں تلاوت فرمائیں گے۔

دنیا میں تورات کے الفاظ پڑھے اور سنائے گئے، اس کے معنی سمجھائے گئے اور آج (قیامت) کی تلاوت

نے الفاظ و معانی میں پوشیدہ حقائق مجسم شکل میں سامنے کر دیئے ہیں، جس سے معلوم ہوا وہ ایک عظیم الشان باغ ہے۔ اور اس سے قلب پر عجیب وغریب کیفیات طاری ہو رہی ہیں، حیرت انگیز انکشافات ہو رہے ہیں۔ تو امت موسیٰ کے لوگ کہیں گے: یہ تورات تو ہم نے آج تک نہ دیکھی نہ سنی۔ ہم وہاں الفاظ و معانی کی افہام وتفہیم میں الجھے رہے۔ یہ حقیقت کہ تورات کیا ہے! آج ہم پر کھلی، پہلے یہ حقیقت ہمارے سامنے کبھی نہیں آئی۔

قرآنِ حکیم اور میدانِ حشر...... اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہوگا کہ قرآن آپ تک پہنچا تو آپ نے اس کا کیا کیا؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم فرمائیں گے: جی ہاں! قرآن مجھ تک پہنچا اور اسے میں نے اپنی امت کو تلاوت وتعلیم کے ذریعہ پہنچا دیا۔ ارشاد ربانی ہوگا: اب یہاں بھی اس کی تلاوت کیجیے۔ (تا کہ اقوامِ عالم کے سامنے قرآنی الفاظ و معانی کی حقیقتیں اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہو جائیں اور سب دیکھ لیں کہ قرآن کریم نے کس طرح پورے عالم کا احاطہ کیا ہوا تھا) ۔ حدیث شریف میں آتا ہے جب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے منبر بچھایا جائے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر تشریف فرما ہو کر قرآن کریم کی اول سے آخر تک تلاوت فرمائیں گے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک کے۔ جن لوگوں کو قرآن نہیں پہنچا، حسرت دیا سے کہیں گے: کاش! دنیا میں ہم کو یہ کتاب ملی ہوتی یہ تو بہت ہی عجیب وغریب کتاب ہے۔ اس کے اندر عجیب خزانے بھرے ہوئے ہیں۔ تو دنیا میں الفاظِ قرآنی کی تلاوت کرنے، اس کے معانی کو سمجھنے سے دل پر جو روحانی کیفیت واثرات طاری ہوتے تھے، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت سے سب مجسم شکل میں آ جائیں گے اور معلوم ہوگا کہ قرآن تو اتنا بڑا اور عظیم الشان باغ ہے، جس نے پورے عالم اور کائنات کا احاطہ کر رکھا ہے اور اس میں سدا بہار پھولوں اور رنگ برنگ بوٹوں کی دنیا آباد ہے، جن کی مہک بے مثال ہے۔

اس حقیقت کو عیاں دیکھ کر خود حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین حیران ہوں گے کہ قرآن حکیم کا یہ رخ تو ہم نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت سے تلاوتِ قرآن کی کیفیات سے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قلوب پُر رہتے تھے، لیکن ان کیفیات کو آج جس شکل میں وہ مجسم دیکھ رہے ہیں، اس سے تو دنیا میں وہ بھی واقف نہ ہو سکے تھے۔ جلوۂ حق کی موجودگی کے ساتھ، تمام انبیاء و ملائکہ علیہم السلام اور تمام امتوں کے اجتماع میں جب قرآنی حقائق مجسم ہو کر سامنے آئیں گے تو حیرانگی کا عجیب عالم ہوگا۔ سارے لوگ گنگ ہوں گے۔ جن کو یہ نعمت نہیں ملی، ان کو حسرت ہوگی اور جن کو یہ نعمت ملی، ان کو افسوس ہوگا کہ ہم کتنی بڑی نعمت سے بے خبر رہے اور اس کو پس پشت ڈال کر کتنا بڑا خسارہ اور محرومیاں سمیٹتے رہے۔

تو میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کو بطور ورد پڑھو کہ اس سے بہتر کوئی وظیفہ نہیں، اس کا علم سیکھو کہ اس سے بہتر کوئی علم نہیں، حکمتوں کی تلاش ہو تو اس میں غور وفکر کرو کہ حکمتوں سے بھرا ہوا، اس جیسا کوئی اور کلام نہیں، معارف کی جستجو ہو تو قرآن سے بہتر معارف کا ذخیرہ کہیں نہیں۔ انہی چیزوں کا یہ لفظی ومعنوی مجموعہ جب اپنی حقیقی

صورت میں مجسم ہوگا تو وہی جنت کہلائے گی۔ یہ وہی جنت ہوگی جسے قاریٔ قرآن نے اپنے دل میں سمیٹ کر محفوظ کیا ہوا ہے۔ یہی جنت بالآخر اس کا مسکن وماویٰ بنے گی۔ جب وہ اپنی جنت کو دیکھے گا اور پہچانے گا تو خود کہہ اٹھے گا کہ یہ جنت تو وہی جنت ہے جو میرے نہاں خانۂ قلب میں پوشیدہ تھی۔ البتہ دنیا میں وہ اس کے حقیقی ذائقوں اور لذتوں سے ناآشنا رہا تھا اب اس کے ذائقے بھی اس کی دسترس میں آگئے ہیں۔ اس کے انوار بھی اس پر ضوفشاں ہیں اور اس کی خوشبوئیں بھی اس کو سرشار بنائے ہوئے ہیں۔ غرض قرآن اور اس کے متعلقات ہر حال و ہر آن خیرِ مطلق ہیں۔ دنیا میں بھی خیرِ مطلق، آخرت میں بھی خیرِ مطلق، اس کا پڑھنا بھی خیرِ مطلق اور اس کا پڑھانا بھی خیرِ مطلق۔ یہی بات اس فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں ارشاد فرمائی گئی ہے: ''**خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ**'' ''قرآن حکیم کا سیکھنا سکھانا جس کا وظیفہ ہو وہ تم میں بہترین آدمی ہے''۔

پیدائشی ولی شاہ محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ...... اب چند بزرگوں کے حالات سناتا ہوں، جن کو ہم نے دیکھا تو نہیں، البتہ اپنے بزرگوں سے ان کے متعلق سنا ہے۔ ہمارے استاذِ محترم مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا خاندان ''اویسیہ خاندان'' کہلاتا تھا۔ آپ کے خاندان میں کوئی نہ کوئی مادرزاد ولی ضرور پیدا ہوتا تھا۔ بلا مجاہدے اور ریاضت، من جانب اللہ وہبی طور پر ولایت عنایت ہوتی تھی۔ (خاندان اویسیہ میں ولایت عموماً وہبی طور پر مرحمت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ خاندان اویسیہ کہلاتا تھا ورنہ نسباً یہ خاندان سادات کا تھا)۔

میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نانا شاہ محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک نہایت پارسا اور نیک صفت انسان تھے۔ انکے متعلق حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس اللہ سرہٗ فرماتے تھے'' یہ وہ شخصیت ہیں کہ ان کے ذہن میں گناہِ صغیرہ کا خیال تک کبھی نہیں آیا یہ جانتے ہی نہیں کہ گناہ کیا ہوتا ہے۔'' تو انہی شاہ صاحب موصوف نے تعلیم قرآن کا مشغلہ اختیار کر لیا تھا۔ دن رات بچوں کو قرآن پاک پڑھاتے رہتے تھے۔ آپ پر استغراقی کیفیت کا غلبہ تھا۔ اولاد کے نام بھی بھول جاتے تھے۔ انکے ایک داماد تھے، جن کا نام ''اللہ بندہ'' تھا، وہ آتے تو فوراً نام پوچھتے، وہ کہتے: ''اللہ بندہ'' فرماتے صحیح نام بتاؤ، وہ پھر کہتے: حضرت! میں اللہ بندہ ہوں۔ فرماتے بھئی اللہ بندے تو ہم بھی ہیں۔ صحیح نام بتاؤ آخر میں وہ کہتے: حضرت! میں آپ کا داماد ہوں۔ تب پہچانتے۔ فرماتے اچھا بیٹھ جاؤ! بات چیت کر کے چلے جاتے۔ پھر تھوڑی دیر بعد آتے تو وہی سوال وجواب ہوتے۔ اللہ سے ایسی لو لگی ہوئی تھی۔ اور اس کا اتنا غلبہ تھا کہ ''دنیا و مافیہا'' سے بے خبر رہتے تھے۔ اولاد تک کے نام یاد نہ رہتے تھے اور یہ کیفیات پیدائشی عطیہ تھیں۔ (کسی مجاہدہ وریاضت کے نتیجہ میں نہ تھیں)۔

اس زمانہ میں گھڑی گھنٹے تو موجود نہیں تھے، نشانیوں سے وقت پہچانا جاتا تھا اور پہروں (ایک پہر دو پہر تین پہر وغیرہ) میں وقت تقسیم ہوتا تھا، ایک جگہ کوئی نشان لگا کر یا کوئی چیز رکھ کر کہہ دیتے کہ دھوپ یہاں تک پہنچ جائے تو چھٹی کا وقت ہو جائے گا بس دھوپ وہاں پہنچی اور چھٹی ہوگئی۔ بچے ہمیشہ کے شرارتی۔ کبھی شرارت کر کے نشان

آگے کاڑ دیتے تاکہ دھوپ وہاں جلدی پہنچ جائے۔ وہاں دھوپ پہنچی اور شور مچا: چھٹی کا وقت ہوگیا۔ آپ فرماتے: اچھا بھئی! چھٹی کرلو۔ لوگوں نے آپ کو بتایا: میاں جی! لڑکے شرارت کرتے ہیں اور جھوٹ بول کر وقت سے پہلے چھٹی کرالیتے ہیں۔ فرماتے: بھائی! مسلمان بچے جھوٹ نہیں بولتے۔ چھٹی کا وقت ہوگیا ہوگا، جاؤ بچو! چھٹی کرو۔ یہ آپ رحمہ اللہ تعالیٰ کا پختہ عقیدہ وخیال تھا کہ مسلمان جھوٹ بول ہی نہیں سکتا۔ عربی کا مقولہ ہے "اَلْمَرْءُ یَقِیْسُ عَلٰی نَفْسِہٖ" ہر آدمی دوسرے کو اپنے ہی پر قیاس کرتا ہے۔ ان کے دل میں جھوٹ کا کبھی وسوسہ بھی نہیں آتا تھا۔ اس لئے دوسروں کے متعلق بھی ان کا یہ خیال تھا کہ کوئی مسلمان جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اس لئے جو لوگ ان سے واقف تھے، وہ خاموش رہتے تھے۔

اَوروں کے جھوٹ، حافظ محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کی سادگی...... ہمارے زمانے میں حافظ محمد احسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ایک بزرگ تھے۔ کسی نے کسی کی زمین کے متعلق جھوٹا دعویٰ کردیا کہ یہ میری زمین ہے۔ مدعی دعویٰ کر کے میاں جی کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ حضرت جی! میں نے زمین کی بازیابی کا دعویٰ کیا ہے، دعا کیجیے! زمین مجھے مل جائے۔ فرمایا: اچھا بھائی! دعا کرتا ہوں، زمین تمہیں مل جائے۔ ادھر حافظ محمد احسن صاحب کو اطلاع ہوئی کہ مدعی نے زمین پر جھوٹا دعویٰ کیا ہے۔ کیونکہ دراصل زمین فلاں کی تھی۔ چنانچہ وہ بھی میاں صاحب کی خدمت میں آئے اور کہا: حضرت! میں بھی مسلمان ہوں، زمین میری ہے۔ فرمایا: اچھا تم اپیل کردینا، زمین تمہیں واپس مل جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، پہلے مرحلہ میں اس شخص کے حق میں دعویٰ فیصل ہوا۔ دوسرے نے اپیل کی اور اپیل میں وہ جیت گئے۔ حضرت کا دل یہ قبول ہی نہیں کرتا تھا کہ مسلمان جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔

ایک مرتبہ میاں جی رحمہ اللہ تعالیٰ کی آنکھیں دُکھنے لگیں، دوا دارو کچھ نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آنکھوں میں زخم پڑ گئے۔ کسی نے کہہ دیا: میاں جی! اس بیماری میں بینائی جاتی رہتی ہے۔ میاں جی کو یقین آگیا اور وہ مکان بند کر کے بیٹھ رہے۔ جو آیا، کہہ دیا: میں نابینا ہوگیا ہوں۔ فلاں صاحب آئے تھے، وہ کہہ گئے کہ اس بیماری میں بینائی جاتی رہتی ہے۔ اب آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں، جو آرہا ہے اس سے کہہ دیتے کہ: فلاں صاحب نے کہہ دیا تھا کہ بینائی جاتی رہتی ہے، بس میں نابینا ہوگیا ہوں۔

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اس کی اطلاع ہوئی تو مضطرب و پریشان ہوئے اور سمجھ گئے کہ ان کا پختہ خیال ہے کہ کوئی مسلمان جھوٹ نہیں بولتا۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو نابینا کہہ رہے ہیں۔ مولانا مزاج پرسی کو پہنچے، احوال دریافت کیا۔ میاں جی نے فرمایا: جی! میری تو بینائی جاتی رہی۔ فلاں صاحب آئے تھے کہہ رہے تھے: اس مرض میں بینائی جاتی رہتی ہے، اب وہ جھوٹ تھوڑا ہی بول رہے تھے۔ مولانا بہت زیرک وذہین تھے۔ بات سمجھ گئے، کہنے لگے: حضرت جی! مجھے ایسا پانی پڑھ کر دینا آتا ہے، جس کا چھینٹا آنکھ پر پڑتے ہی بینائی واپس آجاتی ہے۔ چنانچہ آپ نے پانی پڑھ کر دم کیا اور چھینٹا مار کر کہا: حضرت جی! آنکھیں کھولیے بینائی واپس آگئی ہے۔ بینائی

گئی کہاں تھی وہ تو موجود ہی تھی۔ آنکھیں کھول کر فرمایا: اللہ تمہیں جزائے خیر دے میری بینائی واپس آ گئی۔

ادھر لطیفہ یہ ہوا کہ دوسرے دن مولانا یعقوب کی مسجد کے سامنے نابیناؤں کا مجمع اکٹھا ہو گیا کہ مولانا کو ایسا پڑھی دم کرنا آتا ہے جس سے بینائی واپس آ جاتی ہے۔ لہٰذا وہ بھی علاج کے لئے آ گئے۔ مولانا نے ان سے کہا: بھائی! یہ ترکیب تو میں نے میاں جی کو سمجھانے کے لئے کی تھی۔ میرے پاس کوئی پڑھی وائی نہیں۔

برکاتِ قرآن حکیم ...... قرآن حکیم کا شغل ایک مبارک شغل ہے۔ اللہ کی کتاب سے واسطہ رہے گا تو اس کے ذریعہ اللہ سے بھی واسطہ رہے گا۔ قرآن نازل ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ لوگ اللہ تعالیٰ تک پہنچ جائیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس راستہ سے کروڑوں بندگانِ خدا، خدا تک پہنچ بھی گئے۔ کسی کو عزت عطاء ہوئی، کوئی اس ذریعے سے بلند درجات پر فائز ہوا۔ جس کا قرآن مجید سے جتنا گہرا واسطہ اور ربط رہا اسی قدر بلندیٔ درجات حاصل ہوتی رہی۔ غرض کروڑوں انسان قرآن کریم کی بدولت قابلِ احترام ہو چکے ہیں اور کروڑوں اور ہوں گے ان شاء اللہ۔ اور حدیث شریف میں ہے کہ قرآن کریم جب اللہ تعالیٰ کے سامنے مجسم شکل میں حاضر ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے: آج میں تیری وجہ سے کتنوں کو بلند درجات پر فائز کرتا ہوں اور کتنوں کو پستی و گہرائی میں ڈالتا ہوں۔ جو تجھ پر عمل کرتے تھے، تیرے علم میں مشغول تھے، ان کے لئے رفعِ مراتب اور بلندیٔ درجات اور بہترین جزاء ہے۔ اور جو تجھ سے اعراض کرتے اور بھاگتے پھرتے تھے نہ انہوں نے تجھے پڑھا، نہ تیرے پیغامات پر عمل کیا، وہ آج پست و ذلیل ہوں گے، اس گریز کی سزا پائیں گے اور ذلت و رسوائی میں مبتلا ہوں گے۔ "یَضَعُ بِهَا اَقْوَامًا وَيَرْفَعُ بِهَا اَقْوَامًا" ① (اللہ تعالیٰ اس قرآن حکیم کے ذریعہ کچھ اقوام کو بلند اور کچھ کو پست کرتا ہے)۔

اس سارے بیان سے قرآن کے خیرِ مطلق ہونے کا بخوبی پتہ چل گیا۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ پڑھانے والا اور پڑھنے والا تو قرآن سے براہِ راست رابطہ رکھنے کی بنا پر خیر ہے ہی۔ اس کی اشاعت میں کسی درجہ کی مدد کرنے والا بھی اس خیر میں شامل اور برابر کا شریک ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر "کلمۂ خیر" کہنے والا بھی اس خیر میں داخل ہو گیا۔ غرض قرآن سے کسی بھی طور پر وابستگی خیر سے محروم نہیں رہنے دیتی۔ اس لئے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ خیر تو ساری قرآن پڑھنے پڑھانے والا سمیٹ کر لے گیا، باقیوں کے حصہ میں کیا رہا! ایسا نہیں ہے، پڑھانے والے، جانی و مالی مدد کرنے والے، پڑھنے پڑھانے کے ذرائع قائم کرنے والے، ان کی خبر گیری کرنے والے، سب اسی خیر میں شامل و شریک ہیں۔ کوئی خیر سے محروم نہیں۔

حدیث شریف میں بیان کیا گیا ہے کہ جب کسی مجلس میں اللہ کا ذکر ہوتا ہے، علم کی گفتگو ہوتی ہے تو اس مجلس

---

① الحدیث اخرجہ الامام مسلم فی صحیحہ، کتاب الصلوٰۃ، باب فضل من یقوم بالقرآن ویعلمہ ... ولفظہ: عن عمر رضی اللہ عنہ اما ان نبیکم قد قال ان اللہ یرفع بھذا الکتاب اقواما ویضع بہ آخرین ... ج: ۴ ص: ۲۵۲.

کو لاکھوں کروڑوں فرشتے گھیر لیتے ہیں۔ مجلس کے اختتام پر جب فرشتے اللہ کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں تو ارشاد ربانی ہوتا ہے: کہاں گئے تھے؟ اللہ تعالیٰ کا یہ سوال ناواقفی کا نہیں! کیونکہ ان کے علم سے کوئی چیز باہر نہیں، بلکہ بطور حکمت ہوتا ہے۔ ملائکہ علیہم السلام کہتے ہیں: آپ کے بندوں کی ایک مجلس میں گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اس مجلس میں میرے بندے کیا کر رہے تھے؟ وہ کہتے ہیں: آپ کے عذاب سے ڈر رہے تھے، آپ کی نعمتوں کے طالب تھے، جنت کے طالب اور عذاب جہنم سے پناہ کے طالب تھے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: کیا انہوں نے جنت دیکھ لی ہے، جو اس کے طالب تھے اور کیا انہوں نے جہنم کا عذاب چکھ لیا ہے، جو اس سے پناہ مانگ رہے تھے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: انہوں نے دیکھا تو کچھ بھی نہیں آپ کے پیغمبروں نے جو ان کو بتایا، اس پر ایمان لا کر اور یقین کر کے یہ خواہش کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: فرشتو! تم کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ اس مجلس میں جتنے افراد بھی شریک تھے، میں نے سب کی مغفرت کر دی، جو مانگتے تھے وہ دے دیا، جس سے پناہ چاہتے تھے، اس سے ان کو بچا لیا اور اس سے نجات دیدی۔ شرکاء مجلس کے لئے کتنی بڑی عجیب بشارت ہے۔ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ: اے اللہ! اس مجلس میں سارے ہی تیرا ذکر کرنے والے تجھ سے انعام کی خواہش کرنے والے نہیں تھے۔ کئی تو مجمع دیکھ کر بطور تماشائیوں کے کناروں پر آ کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے متعلق آپ کا کیا فیصلہ ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: وہ بھی اس مجلس خیر میں شریک قرار دیئے گئے، وہ بھی اس مغفرت میں داخل ہیں۔ اصل شریک مجلس ایسے لوگ ہیں کہ جن کے آس پاس کھڑے ہونے والا بھی محروم نہیں رہتا۔ ① تو قرآن کریم کا پڑھنا خود سراپا خیر ہے ہی، اس مجلس کو تماشائی کی حیثیت سے دیکھنے والا بھی انشاء اللہ اس خیر سے محروم نہ رہے گا، چاہے وہاں وہ تعلیم و تعلّم کی غرض سے نہ بھی آیا ہو۔ یہ اتنی وسیع رحمت ہے کہ آس پاس والے بھی اس کے احاطہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ کتنے مبارک ہیں وہ لوگ۔ جو قرآن کی تعلیم دینے اور اس کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے میں شب و روز منہمک و مشغول ہیں۔ اور کتنے خوش بخت ہیں وہ طالب علم۔ جو کلام اللہ پڑھنے اور سیکھنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ دونوں ہی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

مسرت کا موقع..... قرآن کی تعلیم کا آغاز و افتتاح امر واقع یہ ہے کہ نہایت ہی خوشی اور مسرت کی بات ہے۔ یہ اتنی بڑی خوشی ہے کہ ہم جتنا بھی اس پر خوش ہوں کم ہے۔ اس لئے کہ انسان کی خوشی کے دو ہی موقعے ہیں۔ ایک جب وہ کسی کام کی ابتداء یا افتتاح کرتا ہے، دوسرا جب وہ اس ابتدا کی انتہا کو پہنچتا ہے اور حصول مقصد میں کامیاب ہوتا ہے۔ آپ جب کسی بچہ کو مکتب میں بٹھاتے ہیں تو خوشیاں مناتے ہیں اور مٹھائی بانٹتے ہیں کہ زندگی کے ایک بڑے اور اچھے مقصد کی ابتدا ہو رہی ہے اور جب وہ بچہ عالم فاضل بن کر مقصد کی انتہاء پر پہنچتا ہے، تب بھی خوشیاں منائی جاتی ہیں، جلسے کئے جاتے ہیں، مٹھائی بانٹی جاتی ہے۔ کوئی باغ لگاتا ہے تو خوشی مناتا ہے اور جب اس باغ

① الصحیح للبخاری، کتاب الدعوات، باب فضل ذکر اللہ عزوجل ج: ۲۰ ص: ۴۳.

میں پھل آتا ہے تو بھی خوشی مناتا ہے۔

خوشی کا دوسرا موقع......تو خوشی کے دو ہی موقعے ہیں ابتداء اور انتہاء۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو بڑے جشن منائے جاتے ہیں، دعوتیں ہوتی ہیں، جلسے کئے جاتے ہیں اور جب وہ مرتا ہے تو میرے نزدیک وہ بھی خوشی کا دن ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی عنایت کی ہوئی زندگی، اسی کے بتائے ہوئے طریقے پر گزار دی اور وہ اس امتحان میں کامیاب گزرا۔

چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

یہ مردِ مؤمن کی خوشی ہے کہ وہ اپنا ایمان سلامت رکھ سکا۔ تو مرنا غم کی بات نہیں، خوشی کا موقع ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ لوگ تو مغموم ہوتے ہیں، روتے ہیں، خوش تو نہیں ہوتے، میں کہتا ہوں کہ لوگ اس کے مرنے پر نہیں روتے بلکہ اس کی جدائی پر یا اپنے مفادات سے محرومی پر روتے ہیں۔ موت پر تو وہ خوش ہوتے ہیں۔ تب ہی تو یہ کہتے ہیں کہ: ''اے اللہ! فلاں جیسی موت تو ہمیں بھی نصیب کر موت پر رنجیدہ ہوتے تو اس پر روتے اور اس کی تمنا نہ کرتے۔ معبود و محبوب سے ملنے پر بھی کوئی روتا ہے موت تو ہمیں اللہ سے واصل کرتی ہے، یہ غمی کی چیز کب ہو سکتی ہے غرض بچے کی پیدائش بھی خوشی کا موقع ہے اور اس کا دنیا چھوڑ جانے کا مرحلہ بھی خوشی کا وقت ہے۔

حدیث شریف میں موت کو تحفۂ مؤمن فرمایا گیا ہے: اَلْمَوْتُ تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ ① اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ کے لئے سب سے بڑا تحفہ موت ہے۔ تو کوئی تحفہ ملنے پر بھی روتا ہے! تحفہ پر تو اظہارِ مسرت و خوشی کیا جاتا ہے۔ موت تحفہ کس طرح ہے؟ اس کے بارے میں دوسری حدیث شریف میں یوں ارشاد ہے: اِنَّ الْمَوْتَ جَسْرٌ يُوْصِلُ الْحَبِيْبَ اِلَى الْحَبِيْبِ (اَوْكَمَا قَالَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ) ② موت درمیانی پل ہے جو محب کو حبیب سے ملاتا ہے، جو وصلِ حبیب کا ذریعہ ہو، وہ باعثِ کرب و ملال کیسے ہو سکتا ہے؟ اپنے محبوب سے ملاقات بھی ماتم یا غمی کی بات ہے محبوب سے ملانے والا یہ ذریعہ تو محبت کرنے کی چیز ہے، تحفہ کی چیز ہے۔ اس لئے حقیقت میں اس پر خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بڑی اچھی زندگی گزاری۔ اللہ کا شکر ہے کہ ایمان پر خاتمہ ہو گیا۔ اشکباری اور غم تو اس کی جدائی کا کرتے ہیں کہ عزیز ہم سے چھن گیا، اس سے ہم جو فائدہ اٹھا رہے تھے، جو آرام پا رہے تھے وہ منقطع ہو گیا، اس سے محروم ہو گئے۔ اپنے نفع کے لئے رونا تو خود غرضی کا رونا ہے، موت پر رونا نہیں ہے۔

بہرحال ولادت بھی خوشی کا موقع ہے اور موت بھی خوشی کا مقام۔ اسی لئے قرآن کریم کا آغاز بھی خوشی کی چیز ہے اور جب اس سے فارغ ہو جائے، اس کا حافظ و عالم ہو جائے وہ بھی خوشی منانے کا موقع ہے۔ البتہ فرق اتنا ہے کہ آغاز پر جو خوشی ملتی ہے وہ توقعات پر ملتی ہے، کیونکہ آغاز کے وقت یہ توقع باندھتے ہیں کہ بچہ پڑھے گا، لکھے

---

① کنز العمال، حرف المیم، ص: ۱۷۰۔ علامہ عجلونیؒ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رواہ الدیلمی عن جابر بزیادۃ: والدرھم والدینار مع المنافق وھما زادہ الی النار... دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۲ ص: ۲۹۰۔

② لباب الحدیث للامام السیوطی، ج: ۱ ص: ۳۴۔ یہ حضرت حبان بن الاسود کا قول ہے۔

گا، حافظ و عالم بنے گا۔ تو آغاز کی خوشی، توقع کی خوشی ہے اور فراغت و انتہا کی خوشی، کمال پر ہوتی ہے کہ ابتداء میں جو امید باندھی گئی تھی وہ پوری ہوگئی، مراد حاصل ہوگئی۔ بچے کی پیدائش کی خوشی بھی توقعات کی خوشی ہے کہ پلے گا، بڑھے گا، جوان ہوگا، عالم فاضل بنے گا، صناع و کاریگر بنے گا۔ یہ سب توقعات ہی ہوتی ہیں۔ اور جب وہ اپنی زندگی حسبِ توقعات کامیاب گزار کر سلامتی ایمان کے ساتھ موت کی سرحد پار کر جاتا ہے، تو بھی خوشی ہوتی ہے۔ گو زندگی بھر کا ساتھ چھوٹ جانے اور بچھڑ جانے کے غم سے آدمی اشکبار بھی ہوتا ہے اور یہ اشکباری اور رونا دھونا موت کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ موت تو اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ اس لئے یہ تو خوشی کی چیز ہوئی۔

علامتِ ولایت تمنائے موت...... بلکہ خوشی کی چیز سے بھی بڑھ کر ولایت کی علامت ہے، کیونکہ دل میں موت کی محبت ہونا ولی ہونے کی علامت ہے۔ اسی لئے جب یہود نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے چہیتے (اولیاء اللہ) ہیں۔ تو قرآن کریم نے ان سے مطالبہ کیا کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو اور دیگر لوگوں کی نسبت اللہ کے زیادہ چہیتے ہو تو پھر موت کی تمنا کر کے دکھاؤ: ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ ① معلوم ہوا موت کی تمنا کرنا ولایت کی علامت ہے اور ظاہر بات ہے کہ ولایت موجود ہوگی تو موت کی تمنا میں کوئی جھجک نہ ہوگی۔ حدیث شریف میں تو ایک دعا کے طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد بھی منقول ملتا ہے کہ: "اَللّٰهُمَّ حَبِّبِ الْمَوْتَ اِلٰى مَنْ يَّعْلَمُ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ" ② "اے اللہ! جو شخص میری رسالت کو مانتا ہو اور اس کا اقرار کرتا ہو اس کے لئے موت کو محبوب بنا دے"۔ (اٰمِيْن ثُمَّ اٰمِيْن بِجَاهِ سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالتَّسْلِيْمُ)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا میں موت کی محبت اور تمنا کا ارشاد ہے۔ اس سے دل میں طالب علمانہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حدیث شریف میں تو موت کی تمنا کرنے کی ممانعت آئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "لَا يَتَمَنَّيَنَّ اَحَدُكُمُ الْمَوْتَ" ③ "تم میں سے کوئی موت کی تمنا نہ کرے"۔ اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے: "اِنَّا نَكْرَهُ الْمَوْتَ" کہ ہم موت کو ناپسند کرتے تھے۔ تو یہ کیا بات ہوئی کہ تمنا بھی فرما رہے ہیں، دعا بھی کر رہے ہیں اور تمنا سے منع بھی فرما رہے ہیں؟ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ دو چیزیں الگ الگ ہیں۔ ممانعت اس بات کی ہے کہ دنیوی شدائد و مصائب سے گھبرا کر موت کی تمنا نہ کرو کہ ایسا کرنا ممنوع ہے اور جسکے دل میں اللہ کی محبت اور اس سے ملاقات کا ولولہ اور اشتیاق ہے، اس کے لئے تمنائے موت میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ان الگ الگ چیزوں کی وجہ

---

① پارہ ۲۸: سورة الجمعة، الآية: ۶۔ ② المعجم الكبير للطبراني، باب الحاء، شريح بن عبيد الحضرمي عن ابي مالك، ج: ۳ ص: ۴۷۸۔ علامہ ہیثمیؒ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رواه الطبراني وفيه محمد بن اسماعيل بن عياش وهو ضعيف دیکھئے: مجمع الزوائد، ج: ۱۰ ص: ۳۰۹۔

③ الصحيح للبخاري، كتاب المرضى، باب تمني المريض الموت ج: ۱۷ ص: ۴۴۳، رقم: ۵۲۴۱۔

سے مضامین احادیث بھی مختلف ہیں، ان میں باہم کوئی تضاد یا اختلاف نہیں۔ غرض جس طرح ولادت خوشی کی چیز ہے، موت بھی خوشی کی چیز ہے۔

ابن قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریب مسرت..... تو جو بھی قرآن کریم کا آغاز کر رہے ہیں، ان کے لئے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہوگی اور اس سے بڑھ کر اور کوئی تقریب کیا ہو سکتی ہے۔ ہمارے بزرگوں کی تقریبات کا جو انداز تھا اور کون سی تقریب ان کی نظروں میں اہم تھی، اس کا پتہ اس سے چل سکتا ہے کہ میرے جدِ محترم مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس اللہ سرہٗ نے غالباً اپنی صاحبزادی کے نکاح کی تقریب اس طرح کی کہ چپ چپاتے مسجد میں خود نکاح پڑھایا اور گھر آ کر لڑکے سے کہا: یہ تمہاری دلہن ہے، اسے لے جاؤ۔ گھر والوں کو پتہ بھی نہیں تھا، سب حیران تھے۔ لیکن میرے والد محترم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ جب میں نے قرآن مجید حفظ کر لیا تو بڑی دھوم دھام کی شاہانہ دعوت کی۔ جب سب لوگ کھا پی کر فارغ ہوئے اور رخصت ہو گئے تو تنہائی میں مجھ سے فرمایا: میاں احمد! تم حافظ بھی ہو گئے، تمہاری عزت افزائی بھی ہو گئی، دعوت بھی ایسی دوبارہ نہ ہوگی۔ یہ سب کچھ میں نے تمہارے لئے کیا۔ لیکن یہ قرآن میں نے تم کو اپنے لئے پڑھایا ہے (تاکہ آخرت میں یہ میرے کام آئے) اس لئے والد محترم کا یہ معمول تھا کہ دو پارے روزانہ حضرت والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے لئے تلاوت فرماتے تھے۔

بہر حال قرآن کریم کا آغاز بھی مبارک اور انجام بھی مبارک۔ آج افتتاح ہے۔ اس تقریب سے بڑھ کر کوئی تقریب نہیں۔ نہ اس خوشی سے بڑھ کر کوئی خوشی ہے۔ تقریبات تو شادیوں اور پیدائشوں کی بھی ہوتی ہیں، مگر اصل تقریب افتتاح قرآن ہی کی ہے۔ جس کا افتتاح بھی مبارک، انجام بھی مبارک، ایسے موقع و تقریب کی مبارکباد دینا بھی مبارک۔ تو ہماری حاضری آپ کو مبارکباد دینے کے لئے ہوئی ہے۔ آپ حضرات بہترین کام کا افتتاح فرما رہے ہیں۔ حق تعالیٰ اس کا انجام، اس کی انتہا بھی بہترین فرمائے، جس طرح اس کا آغاز بہترین فرمایا ہے۔ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی اس کی برکات کا حصہ مقرر فرمائے اور آخرت میں بھی۔

اَللّٰهُمَّ اٰنِسْ وَحْشَتَنَا فِيْ قُبُوْرِنَا ، اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنَا بِالْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ ، وَاجْعَلْهُ لَنَا اِمَامًا وَّنُوْرًا وَّهُدًى وَّرَحْمَةً ، اَللّٰهُمَّ ذَكِّرْنَا مِنْهُ مَا نَسِيْنَا وَعَلِّمْنَا مِنْهُ مَا جَهِلْنَا ، وَارْزُقْنَا تِلَاوَتَهٗ اٰنَاءَ الَّيْلِ وَاٰنَاءَ النَّهَارِ وَاجْعَلْهُ لَنَا حُجَّةً يَّارَبَّ الْعٰلَمِيْنَ. اَللّٰهُمَّ اجْعَلِ الْقُرْاٰنَ رِضَاءَ قَلْبِيْ وَجِلَاءَ حُزْنِيْ ، فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا ، وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ. اَللّٰهُمَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنَا بِالصّٰلِحِيْنَ، غَيْرَ خَزَايَا وَلَا مَفْتُوْنِيْنَ. وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَآ اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ.

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا، وَدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ ① صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ.

اقسامِ نعمت...... بزرگانِ محترم! اس دنیا میں حق تعالیٰ شانہ کی نعمتیں اس درجہ ہیں کہ ان کا شمار کرنا ناممکن اور محالات میں سے ہے۔ رحمتوں کی ایک بارش ہے، جیسے بارش کے قطرات کو آپ گننا چاہیں تو ساری دنیا کے انسان مل کر سعی کریں کہ آسمان سے کتنے قطرے ٹپکے ہیں۔ تو یہ آپ کے قبضے میں نہیں ہے۔ اس سے کہیں زیادہ اللہ کی رحمتوں کی بارش دنیا پر ہے۔ اگر کوئی انسان گننا چاہے تو ان کے قبضۂ قدرت میں نہیں ہے کہ اللہ کی نعمتوں کو شمار کر سکے۔ اس لئے قرآنِ کریم نے دعویٰ فرمایا کہ: ﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا﴾ ② اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تم انکا احاطہ نہیں کر سکتے، گن نہیں سکتے۔ آسمان کے ستاروں کا گننا ممکن ہے، بارش کے قطروں کا گن لینا ممکن ہے لیکن اللہ کی رحمتوں کا گن لینا، یہ ناممکن اور محالات میں سے ہے۔ لیکن جہاں تک دیکھا جائے تو اصولی طور پر دو قسم کی نعمتیں ہیں۔ ان دو قسموں میں پھر کروڑوں اور اربوں نعمتیں ہیں مگر قسمیں دو ہیں۔ ایک ظاہری نعمتیں ہیں اور ایک باطنی نعمتیں ہیں۔ ایک نعمتیں وہ ہیں جن کو ہم آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں، ہمارے بدن کو لگ (چھو) سکتی ہیں، ایک نعمتیں وہ ہیں جو آنکھ سے نظر نہیں آتیں۔ بدن سے بظاہر انکی ٹکر بھی نہیں لگتی (چھو کر نہیں گزرتی)، لیکن عجیب نعمتیں ہیں، جن کو انسان اپنے ضمیر میں محفوظ کرتا ہے۔

ظاہری نعمت...... نعمتوں کے درجے میں سورج بھی اللہ کی ایک نعمت ہے۔ اس سے روشنی چھن رہی ہے، وہ اللہ کی نعمت ہے، وہ نہ ہو تو ہم کام کاج نہیں کر سکتے، اس سے جو گرمی برس رہی ہے، وہ اللہ کی نعمت ہے، وہ نہ ہو تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ غذائیں انسان کو اللہ نے لاکھوں دیں۔ ترکیبیں بتلا دیں کہ مختلف انداز سے جوڑ توڑ

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۱۰۷۔ ② پارہ: ۱۳، سورۃ ابراھیم، الآیۃ: ۳۴۔

کر کے انسان نئی نئی غذائیں نکال لیتا ہے۔ یہ ایک مستقل نعمت ہے۔ لباس مستقل نعمت ہے۔ گھر دیا گیا یہ مستقل نعمت ہے۔ غرض کھیتی باڑی، باغ، زمین، کھانا پینا وغیرہ یہ سب نعمتیں ہیں اور ان میں بھی اتنی قسمیں ہیں کہ انسان گننے لگے تو ان کا گننا ناممکن ہے۔ ہر وقت آدمی ان سے فائدہ اٹھا رہا ہے، پھل فروٹ ہے یہ ایک نعمت کا دائرہ ہے، ہزاروں پھلوں کی قسمیں ہیں۔ غلے ہیں تو ہزاروں قسم کے غلے ہیں، کہیں چنا، کہیں چاول اور گیہوں۔ غرض کھانے پینے، رہنے سہنے اور استعمال کی بے شمار نعمتیں ہیں۔ اور یہ وہ نعمتیں ہیں جن کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ یہ ہمارے ہاتھوں اور بدن کو لگتی (چھوتی) ہیں انکا ہم احساس کرتے ہیں۔ ان کو ظاہری نعمتیں کہا جائے گا۔

باطنی نعمت ...... ایک باطنی نعمتوں کی قسم ہے، جن کو دل محسوس کرتا ہے آنکھوں سے نظر نہیں آتی، جیسے علم اور معرفتِ خداوندی ہے۔ علم دل کے اندر بھر جانا، یہ ایسی چیز تو نہیں کہ آدمی اسے پکڑ کر جیب میں رکھ لے علم ظاہری چیز نہیں ہے، وہ بدن سے نہیں ٹکراتی، وہ دل سے دل میں آتی ہے۔ آدمی جانتا ہے کہ نعمت ہے لیکن آنکھ سے نظر نہیں آتی۔ محبتِ خداوندی ہے، یہ عظیم نعمت ہے۔ اپنے پروردگار سے محبت نہ ہو تو ایمان ہی نصیب نہیں ہوتا۔ لیکن محبت کوئی آنکھوں سے دیکھنے کی چیز نہیں ہے۔ اسلام تو آنکھوں سے نظر آسکتا ہے، اس لئے کہ اسلام کے معنی ظاہری عمل کے ہیں۔ نماز پڑھی، روزہ رکھا، حج کیا، زکوٰۃ دی۔ نماز پڑھنے والے کو دیکھ کر ہر ایک کہے گا کہ: یہ نماز پڑھ رہا ہے، حج کرنے والے کو دیکھ کر کہے گا کہ حج کر رہا ہے، لیکن ایمان دل میں چھپا رہتا ہے، اسے آدمی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا مگر ہر دل جانتا ہے کہ اس میں ایمان ہے۔ تو ایمان بھی ایک نعمت، محبتِ خداوندی بھی ایک نعمت، جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت، یہ عظیم نعمت ہے، ایمان کی بنیاد ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے محبت نہ ہو، ایمان ہی نصیب نہیں ہو سکتا۔

امتحانِ محبت، نعمت میں نہیں مصیبت میں ہوتا ہے ...... اسی واسطے حدیث میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ" (1)

''تم اس وقت تک مؤمن نہیں بن سکتے جب تک میرے ساتھ اتنی محبت نہ ہو کہ نہ اتنی محبت اپنی اولاد اور ماں باپ سے ہو اور نہ دنیا کے کسی سامان سے ہو''۔

جب تک میرے ساتھ اتنی محبت نہیں ہوگی آدمی مؤمن نہیں بنے گا۔ اس محبت کا ظہور کب ہوتا ہے، جب خدا اور رسول کی محبت کا دوسری محبتوں سے مقابلہ پڑے۔ آدمی سو رہا ہے، اسے محبت اس سے ہے کہ میٹھی نیند آ رہی ہے، نہ اٹھوں۔ مسجد میں اذان ہوتی ہے کہ آؤ مسجد میں اس وقت امتحان ہوگا کہ نفس سے زیادہ محبت ہے یا خدا سے زیادہ محبت ہے۔ اگر لحاف کو اتار پھینکا، گرم ٹھنڈے کی پرواہ نہ کی، وضو کیا اور مسجد میں حاضر ہو گیا تو اپنے نفس کو چھوڑ دیا، اپنے خدا کو اختیار کر لیا۔ گویا یہ امتحان کا موقع ہوتا ہے۔ اللہ کے راستہ میں جانا ہے، اولاد کی محبت چاہتی ہے کہ

(1) الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من الایمان، ج: 1 ص: 23۔

نہ جاؤں ان کو چھوڑ کے، خدا اور رسول کی محبت چاہتی ہے کہ چلا جاؤں۔ اگر چلا گیا تو محبت میں کامیاب ہے، اللہ و رسول کی محبت اولاد کی محبت پر غالب آ گئی۔

جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ (زَادَهَا اللّٰهُ شَرَفًا وَّ كَرَامَةً) کی طرف ہجرت فرمائی ہے تو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے گھر بار اور بال بچے مکہ ہی میں تھے، جائیدادیں مکہ ہی میں تھیں، عزیز واقرباء مکہ میں تھے لیکن سب کو چھوڑ چھاڑ کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چل دیئے۔ نہ جائیداد کی پرواہ کی نہ اولاد کی اور نہ بنیاد کی۔ تو یہ کہا جائے گا کہ یہ محبت میں کامیاب ہو گئے، امتحان میں پاس ہو گئے۔ جب خدا اور رسول کی محبت کا اولاد و بنیاد کی محبت سے مقابلہ پڑا، انہوں نے اولاد و بنیاد کو چھوڑ دیا اور اللہ و رسول کا راستہ اختیار کیا۔ یہ مطلب ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ میرے ساتھ اتنی محبت ہو کہ نہ اتنی اولاد سے ہو، نہ ماں باپ سے ہو اور نہ دنیا کی کسی چیز سے ہو ورنہ مؤمن نہیں بن سکتا۔ تو وہ محبت ہے جو مقابلہ کے وقت غالب آ جائے۔ یوں تو ہر شخص کہتا ہے کہ مجھے اللہ سے محبت ہے مجھے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے لیکن جب دنیا کی محبت کا مقابلہ اللہ کی محبت سے پڑ جائے اس وقت کہے کہ ہاں مجھے محبت ہے اس وقت کہا جائے گا کہ ہاں واقعی محبت والا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے۔ فرمایا: سوچ کر کہو کیا کہتے ہو، عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ سے مجھے محبت ہے۔ فرمایا: دیکھو بہت بڑا دعویٰ کر رہے ہو سمجھ کے کہو، کیا بات ہے؟ عرض کیا: آپ سے محبت ہے۔ فرمایا: اگر محبت ہے تو تیار ہو جاؤ فقر و فاقہ کے لئے، ہتنگیاں اٹھانے اور مصیبتیں جھیلنے کیلئے۔ یعنی ان تمام مواقع میں بھی محبت باقی رہی تب یہ دعویٰ سچا ہوگا کہ واقعی اللہ و رسول سے محبت ہے۔ عیش و آرام کے اندر ہر شخص کہتا ہے کہ یا اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے، آپ میرے رب اور میں آپ کا بندہ! لیکن سب کچھ چھن جائے پھر بھی کہے: آپ میرے رب اور میں آپ کا بندہ! تب کہا جائے گا سچا بندہ یہی ہے۔ نعمتوں میں رہ کر بندگی کا اعلان کرنا، یہ آسان ہے۔ مصیبت میں رہ کر محبت اور بندگی کا اعلان کرنا، یہ مشکل ہے اور یہی آزمائش کا وقت بھی ہوتا ہے۔ وہ کسی شاعر نے کہا تھا کہ

دلا! اندر جہاں یاراں سہ قسم اند ‌ ‌ ‌ زبانیاند و نانیاند و جانی

اے دل زمانے میں دوستوں کی تین قسمیں ہیں۔ یعنی آدمی جب دوستی کا دعویٰ کرتا ہے تو اسے پرکھا بھی جاتا ہے کہ دوستی میں سچا بھی ہے یا نہیں۔ تو شاعر نے کہا دوستوں کی تین قسمیں ہیں۔ ایک زبانی، جو زبانی جمع خرچ کرتے ہیں، کہ ہم آپ کے دوست ہیں، ہم آپ کے خیر خواہ و بہی خواہ ہیں۔ ایک نانی ہیں، روٹی کے دوست ہیں۔ یعنی جب تک دستر خوان پر چکنا کھانا مل رہا ہے، ہم آپ کے دوست ہیں۔ اور ایک دوست وہ ہیں جو جگری دوست ہیں کہ دوست راحت میں ہو تب بھی ساتھ، مصیبت میں ہو تو کہیں گے: پہلے ہم مصیبت جھیلیں گے، بعد میں تمہارے اوپر آئے گی۔ یہ جانی دوست کہلاتا ہے۔ تو ایک زبانی جمع خرچ، ایک روٹی کی دوستی اور ایک جگر کی

دوستی۔ اس شاعر نے کہا ہے کہ تینوں کے تین ہی طریقے ہیں۔ جو زبانی دوست ہیں، ان کے بارے میں کہتا ہے کہ:

ہنانی نان بدہ از در بدر کن تلطف کن بیاران زبانی
ولیکن یار جانی را بدست آر مدارا کن بگیری ناتوانی

یہ جو روٹی کے دوست ہیں، انہیں کچھ کھلا پلا دو اور اس کے بعد رخصت کرو۔ ان کو دوست مت سمجھو، وہ آئے تھے، ان کو ٹکڑا مل گیا، بس ٹھیک ہے۔ اور جو زبان سے کہتے ہیں کہ جناب کے دوست ہیں تم بھی زبان سے کہہ دو جناب کا بہت بہت شکریہ! ہم بھی تمہارے دوست ہیں۔ نہ حقیقی معنی میں وہ دوست، نہ حقیقی معنی میں تم دوست۔ وہ زبان کی بات ہے۔ زبان سے وہ خوش کرنا چاہتے ہیں، تم بھی زبان سے خوش کر دو مگر اعتماد مت کرو، وہ دوست نہیں ہے۔

وہ جیسے کسی شاعر کا واقعہ ہے، وہ کسی امیر کے پاس گئے تھے، اس نے قصیدہ لکھا اور امیر کی بڑی تعریف کی کہ آپ ایسے اور ایسے۔ شاعری میں آدمی سچ کم بولتا ہے، جھوٹ زیادہ بولتا ہے۔ شعر اچھا ہوتا ہی وہ ہے جس میں غلط بیانی زیادہ ہو اور جو سیدھی سیدھی بات کہہ دے، اس سے کوئی بھی خوش نہیں ہوتا۔ تو مبالغہ اور بہت حد سے گزر کر بات کرنا، یہی ہوتا ہے۔ شاعر حضرات تخانہ ہوں، کبھی کبھی میں بھی شعر کہہ لیتا ہوں، مجھے بھی جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ تو شعر کہتے ہی اسے ہیں جس میں آدمی سچ کم بولے، جھوٹ زیادہ بولے۔ تو اس شاعر نے قصیدہ لکھا، اس میں ایران توران کی ہانکی، آپ کی سلطنت تو ایسی ہے کہ آپ کے تخت کا پایہ آسمان پر رکھا ہوا ہے اور آپ کے حسن و جمال کے آگے چاند بھی شرمارہا ہے اور ستارے بھی شرمندہ ہیں کہ ہمیں وہ حسن و جمال نصیب نہ ہوا، جو ان نواب صاحب کو نصیب ہے۔ جب وہ قصیدہ پڑھ چکے، امیر نے کہا کہ: پرسوں کو آنا، دو ہزار روپیہ تمہیں (انعام) دیں گے، یہ بہت خوش ہو کر واپس ہوئے۔ چونکہ بڑے آدمی نے وعدہ کیا تھا تو یقین بھی پورا تھا، آکے پانچ سو روپے قرض بھی لے لیا اور بڑا عمدہ اچکن بھی بنوایا، گھر میں مرغا اور بکرا بھی پک رہا ہے۔ اس نے کہا پرسوں تو دو ہزار روپے مل ہی جائیں گے، پانچ سو کا قرض ادا کر دیں گے، ڈیڑھ ہزار بچ جائے گا، بہت بڑی رقم ہوگی۔ تو خوش خوش گھر میں چاندنا، کھانا اور پینا وغیرہ وغیرہ۔ پرسوں وہ پہنچے، وہ امیر بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے جا کر سلام کیا، انہوں نے جواب بھی نہیں دیا، سر سے گردن ہی نہ اٹھائی۔ بہت دیر کھڑے رہے، آخر انہوں نے کچھ کھنکار کے کہا: حضور! میں حاضر ہوں، انہوں نے کہا: کون ہیں؟ حضرت! میں وہی شاعر ہوں جو آپ کی تعریف میں قصیدہ لکھ کے لایا تھا اور آپ نے وعدہ کیا تھا کہ پرسوں آنا، دو ہزار دوں گا۔ کہنے لگے: تم بڑے بے وقوف آدمی ہو، بھئی! تم نے ہمیں لفظوں سے خوش کیا ہے، معنی کچھ نہیں تھے۔ ہم نے بھی لفظوں سے خوش کر دیا معنی کچھ نہیں تھے۔ نہ ان اشعار کے معنی تھے، نہ اس وعدہ کے معنی تھے۔

تو حقیقت یہ ہے کہ جو زبانی جمع خرچ کے دوست ہیں آپ بھی ان کے ساتھ زبانی جمع خرچ کر دیں، مگر

اصلی دوست وہ ہے جو سچا دوست ہو اور مصیبت کے وقت کام آئے۔

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست در پریشان حالی و در ماندگی

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ دوست وہ ہے جو پریشان حالی میں آ کر دوست کا ہاتھ پکڑے۔ مگر ہاتھ پکڑنے کے وہ معنی نہیں، جیسے ایک صاحب نے پکڑے تھے۔ ان کے بھی ایک دوست تھے، انہیں اتفاق سے دشمنوں نے گھیر کر مارنا پیٹنا شروع کر دیا، انہوں نے جلدی سے جا کر ان کے ہاتھ پکڑ لیے، اب وہ غریب رُکا ہوا ہے، آخر اس نے کہا کم بخت! کیا کر رہا ہے؟ میں پٹ رہا ہوں، میرے ہاتھ چھوڑ دے، میں بھی تو مقابلہ کروں، انہوں نے کہا: نہیں، شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ: دوست وہ ہے جو مصیبت میں دوست کا ہاتھ پکڑے، میں نے بھی آ کے ہاتھ پکڑ لئے، اب وہ غریب اچھی طرح سے پٹ رہا ہے۔ تو یہ معنی ہاتھ پکڑنے کے نہیں ہیں، ہاتھ پکڑنے کے معنی مدد کرنے کے ہیں، کہ جب دوست پریشانی میں مبتلا ہو مدد کرے۔

تو جب دنیا کی دوستی میں یہ بات دیکھی گئی ہے کہ بُرے وقت میں آدمی دعوے کو سچا کر کے دکھائے کہ میں دوست ہوں تو دین کے معاملہ میں تو اور بھی زیادہ امتحان کی ضرورت ہے، جب اللہ کو یوں کہے کہ میں آپ کا دوست ہوں تو اگر حق تعالیٰ کوئی مصیبت ڈالیں، جب بھی یوں کہے کہ میں آپ کا نیاز مند، غلام اور بندہ ہوں۔ تب کہا جائے گا کہ یہ سچا بندہ ہے۔ ورنہ نعمتیں برس رہی ہیں، اس میں کہے کہ میں بندہ ہوں یہ نہیں، نعمت چھن جائے اور پھر کہے کہ ویسا ہی بندہ ہوں جیسا پہلے تھا، جس حال میں آپ رکھیں میں خوش ہوں۔ تب کہا جائے گا کہ: یہ سچا بندہ ہے۔ تو محبتِ خداوندی ایک بڑی نعمت ہے، ایمان بھی نعمت، علم اور معرفت بھی نعمت، مگر یہ سب نعمتیں باطنی نعمتیں کہلاتی ہیں، جن کا قلب سے تعلق ہے۔ علم، ایمان اور محبت روٹی کی طرح سے نہیں ہیں کہ رکابی میں رکھ کر پیش کر دیئے جائیں، یہ قلبی دولت ہے۔ تو نعمت کی دو قسمیں ہو گئیں، ایک وہ نعمت جو آنکھوں سے نظر آتی ہے۔ ایک روحانی نعمت ہے، جس کو آنکھ نہیں دیکھ سکتی مگر دل پہچانتا ہے کہ یہ نعمت ہے۔

اعلیٰ ترین نعمت اور حاصلِ کائنات..... ان تمام معنوی نعمتوں میں اعلیٰ ترین نعمت درحقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، جس کو اللہ نے بطور نعمت کے دنیا میں بھیجا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات بابرکات کے طفیل علم نصیب ہوا اور ایمان نصیب ہوا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات بابرکات کی جوتیوں کے صدقے بندے کو اللہ کی محبت نصیب ہوئی، جس سے انسانوں نے اپنے خدا کو پہچانا، اپنی زندگیوں کے مقاصد کو جانا، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا طفیل ہے۔ اگر دنیا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ آتے، یہ عالم ظاہر نہ کیا جاتا، جیسے ایک حدیث میں ہے، گو وہ حدیث ضعیف ہے مگر معنی کے لحاظ سے وہ مقبول ہے۔ ابن کثیر المکی رحمۃ اللہ علیہ نے "البدایۃ والنہایۃ" میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ: حق تعالیٰ شانہ نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔ جب ان کو پیدا کیا گیا اور ان میں روح ڈالی گئی تو سب سے پہلے ان کی نگاہ عرش کے اوپر پڑی، دیکھا کہ عرش کے پائے کے اوپر

لکھا ہوا ہے: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ.

آدم علیہ السلام نے عرض کیا کہ: یہ محمد رسول اللہ کون ہیں؟ فرمایا: تیری اولاد میں سے ہیں۔ میرے آخری اور سب سے بڑے پیغمبر یہی ہیں۔ اور، اے آدم! اگر مجھے ان کا پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا میں تجھے بھی پیدا نہ کرتا، تجھے اس لئے پیدا کیا ہے کہ ان کو دنیا کے اندر لانا ہے۔ ① تو ساری کائنات کا پھل درحقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے آپ ایک درخت لگائیں، دس برس اس کے اوپر محنت کریں، پانی دے رہے ہیں، دھوپ اور پالے سے بچا رہے ہیں پھر جا کے وہ تیار ہوا۔ کیوں آپ نے یہ درخت لگایا کیوں اس پر اتنی محنت کی، اس لئے کہ اس پر پھل آجائے۔ اگر اس نے پھل دے دیا تو آپ کہیں گے محنت وصول ہوگئی۔ پھل نہ دیا تو کہیں گے محنت اکارت ہوگئی، ضائع ہوگئی۔ تو درخت سے مقصود پھل ہوتا ہے۔ پھل آگیا تو سمجھو کہ درخت کے لگانے کا مقصود حاصل ہوگیا۔ یہ پوری کائنات ایک درخت ہے، اس کے مالک نے اس کو چھ ہزار برس میں بنایا۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ﴾ ② "تیرے پروردگار نے اس زمین و آسمان کی کائنات کو چھ دن میں بنایا"۔ اور دوسری جگہ فرماتے ہیں: ﴿وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ ③ "اللہ کے ہاں کا ایک دن تمہارے ہاں کے ایک ہزار برس کے برابر ہے"۔ تو چھ دن میں بننے کا یہ مطلب نکلا کہ چھ ہزار سال میں یہ کائنات تدریجی طور پر تیار ہوئی۔ اور وہ چھ دن ہفتے کے ہیں۔ یک شنبہ (اتوار) سے گویا کائنات شروع ہوئی ہے اور جمعہ پر ختم ہوئی۔ ہفتہ کا دن فارغ ہے۔ آپ کے نزدیک یہ دن چوبیس گھنٹے کا ہے لیکن اللہ کے ہاں یہ ایک سال کے برابر ہے۔ آخری دن جمعہ کا تھا، اس کی آخری ساعت میں جو غروبِ آفتاب کے ساتھ کا گھنٹہ ہے، آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے۔ گویا چھ ہزار سال میں دنیا بنی اور اس میں آخری مخلوق جو ہے، وہ آدم علیہ السلام ہیں۔ اس لئے کہ آدم ہی کے لئے یہ ساری کائنات بنائی گئی، زمین، آسمان، چاند، ستارے سب اس لئے ہیں کہ آدم اس میں گزر بسر کر سکے۔ آسمان کی چھت ڈال دی، زمین کا فرش بچھا دیا، ستاروں کے قمقمے لگا دیئے، دریاؤں میں پانی رکھ دیا، زمین میں اُگانے کی صلاحیت رکھی، چوپائے اور جانور پیدا کیے جو انسان کے کام آئیں۔ جب مہمان کو بلاتے ہیں تو پہلے سامان سب مرتب کر دیتے ہیں، مکان، بستر، پلنگ، ملازم، کھانے کا سامان وغیرہ، تاکہ مہمان کو تکلیف نہ ہو۔ تو آدم علیہ السلام کو لانا تھا، اس نے پہلے گھر بنایا اور ساری چیزیں تیار کیں۔ جب دنیا مکمل ہوگئی تو آخیر ساعت میں آدم علیہ السلام کو لائے۔ گویا آدم ساری کائنات کا ایک شجرہ ہے۔ جیسے آپ نسب نامے کا شجرہ بناتے ہیں کہ باپ کا نام لکھا، ان کے چار بیٹے، تو چار شاخیں نکلیں، پھر آگے اور شاخیں نکلیں، پھر آگے اور شاخیں نکلیں۔ اس کو نسب کا شجرہ کہتے ہیں۔ کائنات کے شجرہ

---

① البدایة والنهایة لابن کثیر نقل البیهقي: تفرد به عبدالرحمن بن زید بن اسلم من هذا الوجه وهو ضعیف والله اعلم ج: ۱ ص: ۹۱. ② پارہ: ۸، سورة الاعراف، الآیة: ۵۴. ③ پارہ: ۱۷، سورة الحج، الآیة: ۴۷.

درخت کا پھل حضرت آدم ہیں۔ اور آدم کا جو شجرہ ہے اس میں آخری پھل جو مقصودِ اصلی ہے وہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ تو ساری کائنات کا مقصودِ اصلی جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات نکل آئی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لانا تھا اس لئے یہ سارا قصہ کیا گیا۔

مقصدِ کائنات عبدیتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہے..... اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیوں لائے گئے۔ اس واسطے کہ کائنات کو بنانے کا مقصد انسان کو لانا ہے اور انسان کا مقصد عبادت ہے کہ وہ اپنے پروردگار کو یاد کرے۔ تو عبودت کے لئے یہ سارا قصہ کیا گیا، تا کہ اللہ کے آگے نیاز مندی، اس کے سامنے جھکنا اور گڑگڑانا ہو۔ اور آدم اور اس کی اولاد میں سب سے زیادہ مکمل عبادت، سب سے زیادہ اعلیٰ ترین عبادت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا کوئی عابد نہ پیدا ہوا اور نہ آئندہ پیدا ہوگا۔ آپ کی ذات کے اوپر مراتب عبادت ختم ہیں۔ بندگی اور عبودیت کی جتنی شانیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھائیں اتنی عالم میں کسی نے نہیں دکھائیں۔ یوں کہنا چاہئے: جیسے اللہ معبودیت میں وحدہٗ لاشریک ہے، معبودیت میں اس کی کوئی نظیر نہیں، وہ یکتا معبود ہے۔ عبدیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم وحدہ لاشریک ہیں، عبدیت میں کوئی آپ کی نظیر نہیں ہے۔ اللہ کے آگے جتنی مکمل عبدیت اور بندگی آپ نے پیش کی ہے عالم میں کسی نے نہیں پیش کی۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے: ”کَانَ یَذْکُرُ اللہَ عَلٰی کُلِّ اَحْیَانِہٖ۔“ ① ۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی لمحہ ذکر اللہ اور یادِ خداوندی سے خالی نہیں تھا۔ ”کَانَ دَآئِمَ الْفِکْرَۃِ حَزِیْنًا“ ② کوئی لمحہ فارغ نہیں تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر آخرت کا غم طاری نہ ہو، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی غم میں ڈوبا ہوا ہے اور فکر میں مبتلا ہے۔ یہ کیفیت تھی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم عرض کرتے: یا رسول اللہ! آپ تو وقت سے پہلے بوڑھے ہو گئے، تو تیں آپ کی بڑی عظیم تھیں۔ فرمایا: ”شَیَّبَتْنِیْ ھُوْدٌ وَالْوَاقِعَۃُ“ ③ مجھے سورۂ ہود اور سورۂ واقعہ وغیرہ نے بوڑھا کر دیا ہے۔ اس لئے کہ ان دونوں سورتوں میں قیامت کے ہولناک مناظر بیان کئے گئے ہیں۔ ان حالات کو سامنے رکھ کر مجھ پر بڑھاپا طاری ہو گیا۔ تو کوئی لمحہ آخرت کی فکر سے خالی نہیں تھا، کوئی لمحہ ذکر اللہ سے خالی نہیں تھا۔ قدم قدم کے اوپر اطاعت، ذکر اور عبادت ہے۔ تو عبادت کو جس مکمل طریق پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات نے پیش کیا ہے گویا وہ عبادت مقصود تھی، وہ عبادت نمایاں ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا میں آنے سے تو کائنات کا مقصد پورا ہو گیا۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کے بعد پھر اس امت کی عبادتیں درکار ہیں، کہ یہ نبی کے نمونے پر چل کر اس نمونے کا

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الحیض، باب تقضی الحائض ..... ج:۲، ص:۳۔

② الشمائل للترمذی، باب کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم متواصل الاحزان، ص:۱۰۹۔

③ الترمذی، ابواب التفسیر، باب من سورۃ الواقعۃ، ج:۱۱، ص:۲۰۲۔ امام ترمذی نے اس کو حسن غریب کہا ہے اور علامہ البانی نے اس پر تحقیق فرما کر اس کو صحیح فرمایا ہے دیکھئے: صحیح وضعیف سنن الترمذی ج:۷، رقم:۳۲۹۷۔

پیغام دنیا کی اقوام کو پہنچا دیں۔ ورنہ مقصد تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے سے پورا ہوگیا۔ اسی واسطے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: "بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ" ① میں اور قیامت اس طرح سے ہیں جیسے یہ دو انگلیاں ملی ہوئی ہیں، کہ میں ذرا آگے نکل آیا ہوں، قیامت پیچھے دوڑتی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ اس لئے کہ جب کائنات کا مقصد پورا ہوگیا تو اب اس کائنات کو باقی رکھنے کی ضرورت نہیں۔ جب درخت پھل دے کر فارغ ہو جائے اور آئندہ ایسا پھل بھی آنے والا نہیں پھر اسے کاٹ کے جلا دیتے ہیں کہ مقصد پورا ہوگیا۔ وہ پھل تھا جو ہم نے کھالیا، تو اصل پھل آ گیا، مقصد پورا ہوگیا۔ اب کائنات کو باقی رکھنے کی ضرورت نہیں۔

فرمایا کہ قیامت کی ہزاروں علامتیں ہیں۔ سب سے پہلی علامت دنیا میں میرا آنا ہے۔ سمجھو کہ دنیا کے خاتمے کا وقت قریب ہے۔ اس لئے کہ دنیا کے برپا کرنے کا مقصد میرے آنے سے پورا ہوگیا۔ اب جب مقصد آ گیا تو اب دنیا کے باقی رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف دنیا اس لئے باقی رہے گی کہ میرا پیغام پوری دنیا تک پہنچ جائے۔ اور امت نمونہ بن کر دکھلائے کہ یہ ہے عبادات کا نمونہ، جس کے لئے دنیا قائم کی گئی۔ تو جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سب سے بڑی نعمت ہے اور نعمتوں کی جڑ و بنیاد ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عالم کے لئے رحمت ہیں۔ پوری دنیا کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کا سبق دیا۔

اسلام تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ہے..... بعض غیر مسلموں نے یہاں مجھ سے سوال کیا کہ اسلام نے ہمیں نئی چیز کیا دی، جو ہم اسلام قبول کریں۔ ہم تو اپنے اپنے مذہب پر چل رہے ہیں۔ میں نے کہا: اسلام کوئی نئی چیز لے کر نہیں آیا، جو کل انبیاء علیہم السلام کا دین ہے، وہی دین، اسلام لے کر آیا ہے۔ یہی اسلام ہے جو سارے انبیاء کا مذہب اور دین رہا ہے۔ یہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی لے کر آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے تمام انبیاء کا دین اسلام بتلایا ہے۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، ایک جگہ حق تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ② "اے ابراہیم! مسلم بن جاؤ" کہا: میں مسلم بن گیا، فرمایا: اگر بن گئے ہو تو اعلان کرو: ﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ "اے ابراہیم کہہ دو! میری نماز اور میرا حج، میرا مرنا اور جینا سب اللہ کے لئے ہے۔ مجھے اسی کا امر کیا گیا ہے اور میں (آج کے دور میں) اول مسلم ہوں"۔ تو ابراہیم علیہ السلام کی طرف اسلام منسوب کیا گیا کہ وہ بھی مسلم تھے اور اسلام ہی لے کر دنیا میں تشریف لائے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کہتے ہیں: ﴿تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ﴾ ③ "اے میرے پروردگار! مجھے مسلم بنا کر وفات دیجئے کہ مرتے دم تک میں اسلام پہ قائم رہوں"۔ یوسف علیہ السلام کا دین بھی اسلام ہی ثابت ہوا۔ ابراہیم علیہ

① الصحيح للبخاري، كتاب الرقاق، باب بعثت انا والساعة ... ج: ٢، ص: ٩٥٩.

② پارہ: ١، سورة البقرة، الآية: ١٣١. ③ پارہ: ١٣، سورة يوسف، الآية: ١٠١.

السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی، فرمایا: ﴿وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ، يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ ① کہ اے بیٹو! تمہارے لئے اللہ نے ایک دین پسند اور منتخب کیا ہے، سو تم مرنا بھی تو اسلام ہی کے اوپر مرنا۔ یہی تمہارا دین ہے۔ تو ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کا دین بھی اسلام ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میرا دین بھی اسلام ہے، جو خود قرآن نے نقل کیا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے کہا کہ: ﴿وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾ ② اے مسیح! آپ گواہ رہیں، ہم سب مسلمان ہیں۔ تو دین عیسوی بھی اسلام ہے۔ سلیمان علیہ السلام پر بلقیس جیسی ملکہ ایمان لائی تو کہتی ہے: ﴿اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ③ میں اس سے پہلے گنہگار تھی مگر اب میں اسلام لاتی ہوں سلیمان کے ہاتھ پر۔ تو سلیمان علیہ السلام کا دین بھی اسلام ہے۔ غرض کوئی پیغمبر ایسا نہیں ہے جس کی طرف اسلام منسوب نہیں کیا گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسلام لے کر آئے۔ فرمایا: ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ ④ دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ تو میں نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نیا دین لے کر نہیں آئے، جو سارے انبیاء علیہم السلام لے کر آئے وہی دین ہے۔ نئی چیز کیا ہے؟

تکمیلِ دین ایک مستقل نعمت ہے ...... ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ ⑤ میں نے دین کو مکمل نقشے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ تو دین نیا نہیں ہے بلکہ تکمیلِ دین ہے کہ دین کے ہر ہر جز، ہر ہر اصول و فروع کو آپ نے اتنا مکمل کر دیا ہے کہ اب اس میں کمی زیادتی کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ گویا دین، اسلام ہی چل رہا تھا، شریعتیں آ رہی تھیں۔ اس میں اضافے ہو رہے تھے، کمی بھی ہو رہی تھی، احکام منسوخ بھی ہوتے تھے، نئی نبوت آ کر نیا پروگرام دیتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پروگرام دیا وہ اتنا مکمل ہے کہ اب اس میں کمی بیشی کی گنجائش نہیں ہے۔ تو یہ تکمیلِ دین ہے، دین نیا لے کر نہیں آئے، دین وہی ہے جو سارے انبیاء علیہم السلام کا ہے، شریعت مکمل لے کر آئے، جو پروگرام کہلاتا ہے، وہ نیا اور مکمل لے کر آئے۔ اب اس میں کمی بیشی کی گنجائش نہیں۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جب کوئی بچہ پیدا ہو آپ اسے جو کرتہ پہنائیں گے، وہ بالشت بھر کا ہوگا لیکن اس کے بعد جب وہ چھ مہینے کا ہوگا تو کرتہ ڈیڑھ بالشت کا ہوگا، اس کے بعد جب وہ آٹھ برس کا ہوا تو گز بھر کا کرتہ پہنے گا۔ بچہ تو وہی ہے بعینہٖ، جو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا، آٹھ برس پہلے بھی وہی تھا، چار برس پہلے بھی وہی تھا۔ کرتے بدل رہے ہیں، اس کی پیمائش بڑھ رہی ہے۔ بچہ وہی ہے۔ پھر چودہ برس کا ہوا تو سوا گز کا کرتہ ہو گیا اور جب تیس برس کا جوان ہو گیا جو نشو ونما کا انتہائی وقت ہے، اس وقت کرتے کی پیمائش بالکل آخری اور مکمل ہو گئی۔

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۲. ② پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۵۲. ③ پارہ: ۱۹، سورۃ النمل، الآیۃ: ۴۴.
④ پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۹. ⑤ پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۳.

اب گھٹنے بڑھنے کا کوئی سوال نہیں کیونکہ اب گھٹنا بڑھنا ختم ہوگیا۔ جتنا قد وقامت ہونا تھا، وہ ہوگیا، اب جو کرتے کی پیمائش ہے، وہ مرتے دم تک ایک ہی رہے گی۔ اس میں اب کمی بیشی نہیں ہوگی۔

تو دین کو ایک بچے کی مانند سمجھو۔ آدم علیہ السلام جو دین لے کر آئے وہ بھی اسلام تھا، لیکن اس وقت یہ چھوٹا سا تھا، پیدا ہوا ہی تھا، اس کے لئے شریعت بھی چھوٹی رکھی گئی، بالشت بھر کا کرتہ اس کے لئے کافی تھا۔ عارضی طور پر وہ اس کے بدن کے اوپر پھب گیا۔ جوں جوں اسلام کا قد وقامت بڑھتا گیا شریعتیں یعنی کرتے بھی بڑھتے رہے۔ تو آدم علیہ السلام کے زمانے کی شریعت بہت مختصر اور معمولی سی تھی۔ حدیث میں ہے کہ ایک وقت کی نماز تھی اور وہ بھی مکمل صورت نہیں تھی، جو اب اسلام میں ہے۔ بس اللہ کے آگے ہاتھ جوڑ کے کھڑے ہو جاؤ، نیازمندی سے کھڑے ہو جاؤ، یا اوندھے منہ لیٹ جاؤ، یہ کافی ہے۔ یہ قیام، رکوع، تشہد، قومہ، جلسہ اور یہ سجدہ، یہ چیزیں آدم علیہ السلام کی شریعت میں نہیں تھیں۔ جیسا دین اسلام تھا چھوٹا سا تھا، پیدائش ہی ابھی ہوئی تھی، ویسی ہی شریعت تھی۔ گویا لباس بھی اس کا چھوٹا تھا۔ جب اسلام کا قد وقامت بڑھا اور ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ آیا، شریعت بھی ذرا پھیل گئی۔ موسیٰ علیہ السلام کا دور آیا، دین کا قد وقامت بڑھا تو شریعت کا لباس بھی وسیع ہوا اور فرمایا: ﴿وَتَفْصِيلًا لِكُلِّ شَيْءٍ﴾ ہم نے دین کے اندر بہت تفصیل کردی۔ اور جب آخری زمانہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا آیا تو دین کا نشوونما مکمل ہوکر جوان ہوگیا۔ اب جو شریعت کی پیمائش ہے اس میں نہ کمی ہے نہ زیادتی۔ یہ دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے جب کوئی تعلیم پائے اور دوسری شریعتوں کا شریعت اسلام سے موازنہ کرے، بالکل زمین وآسمان کا بیّن فرق معلوم ہوتا ہے کہ اور شریعتوں کے احکام معلوم ہوتے ہیں جیسے بچے ہیں اور شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے جوان ہیں کہ ان کا قد وقامت مکمل ہے۔

توحید کی تکمیل..... بہرحال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شریعت پیش فرمائی وہ دین کی تکمیل ہے، دین وہی ہے جو پہلے سے تھا مگر اس میں کمال پیدا ہوگیا۔ یعنی مثلاً توحید ہے، ہر نبی نے توحید کا عقیدہ سکھلایا، کسی نبی نے شرک کی تعلیم نہیں دی، سب نے یہی کہا کہ اللہ کو ایک جانو! لیکن توحید کی تکمیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کی کہ اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کو ایک جانو! اس کی ذات کو یکتا، اس کی شان یکتا، افعال یکتا، اس کو صفات وافعال کے لحاظ سے بھی یکتا جانو۔ ہر ہر چیز میں اسے یکتا سمجھنا چاہیے۔ جب اس کی ساری شانوں میں یکتائی ہے تو اتنے ہی حقوق قائم ہوں گے، پھر عبادتیں بھی اتنی ہی ہوں گی کہ قلب سے یوں عبادت کرو، زبان سے یوں عبادت کرو، قالب سے یوں عبادت کرو، اس لئے کہ جب اس کے حقوق بہت ہیں، اس کی شانیں بے حد ہیں، اس کے سامنے نیازمندی کے سارے طریقے بھی مکمل ہونے چاہئیں۔ اسی طرح سے اور انبیاء علیہم السلام نے شرک سے روکا اور منع کیا لیکن اسلام نے فقط شرک سے نہیں روکا بلکہ شرک کے اسباب سے بھی روک دیا کہ وہ بھی منع ہیں، جن اسباب سے شرک کے پیدا ہونے کا وہم بھی ہوسکتا تھا، ان کو بھی رد کردیا، جہاں شرک کا وہم بھی ہوسکتا تھا، اس وہم کو بھی ختم کیا۔

اسبابِ شرک کو بھی شریعتِ محمدی میں قطع کر دیا گیا...... حدیث میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ طواف کر رہے تھے اور مطاف کے اندر ہزاروں آدمی طواف میں مشغول تھے۔ جو لوگ حج کر کے آئے ہیں انہیں معلوم ہے، بیت اللہ کے ارد گرد سات پھیرے کئے جاتے ہیں۔ اس کو طواف کہتے ہیں۔ حجرِ اسود جنت کا ایک پتھر ہے، اس کو چوم کر پھیرا شروع کیا جاتا ہے اور اسی پر آ کر ختم کیا جاتا ہے، ہر پھیرے پر اس کی تقبیل کرتے ہیں (چومتے ہیں)۔ تو لوگ دوڑ رہے تھے، حجرِ اسود کے اوپر جھک رہے تھے اور عوام الناس حجرِ اسود پر زیادہ جھکتے ہیں۔ چاہے طواف ملے نہ ملے مگر اس کو چومنا مل جائے۔ اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ لڑائی تک کی نوبت آتی ہے۔ تو لوگ ہجوم کر رہے تھے۔ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ بالکل ایسی حالت ہو گئی ہے، جیسے حجرِ اسود کی پوجا اور عبادت کر رہے ہوں۔ بس وہیں کھڑے ہو کر للکارا، ایک دم طواف رک گیا اور حجرِ اسود کو خطاب کیا، فرمایا: "**إِنِّي أَعْلَمُ أَنَّكَ حَجَرٌ لَا تَنْفَعُ وَلَا تَضُرُّ، لَوْ لَا أَنِّي رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ قَبَّلَكَ مَاقَبَّلْتُكَ**" ①

"میں جانتا ہوں تو ایک پتھر ہے، نہ تجھ میں نفع پہنچانے کی طاقت ہے نہ نقصان پہنچانے کی۔ اگر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھے چوما ہے تو میں کبھی تجھے نہ چومتا" ہمارا نفع نقصان قطعاً تیرے قبضے میں نہیں ہے، میں جانتا ہوں کہ تو پتھر ہے، مطلب یہ کہ اتباعِ سنت کے لئے چوم رہا ہوں، عبادت کے لئے نہیں۔ لوگوں کے خیالات درست ہو گئے۔ جو لوگ یہ سمجھ رہے تھے یا سمجھنے کا اندیشہ تھا کہ شاید اسی پتھر کی عبادت مقصود ہو تو پھر بت پرستی اور خدا پرستی میں فرق کیا رہتا۔ چنانچہ اس طرز کو رد کر دیا۔ تو اتنے اتنے احتمالات کے اوپر اسلام نے روک ٹوک کی ہے۔ شرک تو بجائے خود شرک ہے، شرک کا وہم بھی پیدا ہو، اس کو بھی روکنے کی کوشش کی ہے۔

سترہ سامنے رکھنے میں شرک سے بچنے کی احتیاط...... حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک مرتبہ میدان میں نماز پڑھی، تو مسئلہ آپ کو معلوم ہے کہ سترہ سامنے رکھ لیتے ہیں، کوئی لاٹھی کھڑی کر لی، کوئی پتھر کھڑا کر لیا تاکہ آنے جانے والے نمازی کے سامنے نہ آئیں بلکہ اس کی وجہ سے باہر باہر سے چلے جائیں۔ مقصد یہ کہ نمازی کے آگے سے جو گزرے گا تو وہ جو بندے اور خدا کے درمیان رابطہ ہے وہ قطع ہو جاتا ہے، تشویش پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن جب سترہ کھڑا کر لیا اور جانے والا سترہ سے باہر چلا گیا، اب قلب پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس لئے سنت طریقہ یہ ہے کہ کوئی سترہ رکھ لو، لاٹھی رکھ لو یا پتھر رکھ لو۔ تو عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بھی سامنے سترہ رکھا، ایک پتھر کھڑا کر لیا لیکن پتھر دائیں مونڈھے کے سامنے کھڑا کیا اور لوگوں کو حکم دیا کہ دائیں مونڈھے کے سامنے یا بائیں مونڈھے کے سامنے پتھر رکھو، بالکل ناک کے سامنے مت رکھو، فرمایا: ناک کی سیدھ میں رکھو گے تو کسی کو وہم ہوگا کہ کہیں پتھر کی تو عبادت نہیں کی جا رہی، اس وہم سے بھی بچو۔

تو یہاں پر اسبابِ شرک کو بھی رد کیا ہے، فقط شرک ہی کو رد نہیں کیا۔ ورنہ ظاہر ہے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الحج، باب ما ذکر فی الحجر الاسود، ج:٦ ص:١٥١.

جو نماز پڑھ رہے تھے، ان کے قلب میں تو شرک کا وہم بھی نہیں تھا، جلیل القدر صحابی ہیں، ان سے زیادہ متبع سنت کون ہے یہ احتمال بھی نہیں ہوسکتا کہ معاذ اللہ! عبداللہ بن عمرؓ کے قلب میں کوئی شرک کا وہم تھا۔ لیکن صورت بھی ایسی نہیں بنانی چاہیے، ناک کی سیدھ میں پتھر رکھنے سے شرک کی صورت بنتی تھی، اس صورت کو ختم کر دیا۔ تو بعید سے بعید احتمالات کو بھی قطع کر دیا کہ کسی طرح شرک قلب کے اندر گنجائش نہ پانے پائے، قلب اس سے بری رہے۔

بعض شرک چیونٹی کی آہٹ سے بھی زیادہ مدہم ہوتے ہیں..... حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اَلشِّرْکُ اَخْفٰی فِیْ اُمَّتِیْ مِنْ دَبِیْبِ النَّمْلِ.'' ① اتنا باریک باریک شرک ہے جیسے ایک چکنے پتھر کے اوپر چیونٹی کے چلنے کی آہٹ ہے۔ تو اس کے چلنے کی آواز نہیں آتی، اتنی باریک آواز ہوتی ہے کہ آپ اس کا احساس نہیں کر سکتے۔ فرمایا: جتنی وہ باریک چلتی ہے شرک کی اس سے بھی زیادہ باریک چال ہے۔ بعض دفعہ آدمی شرک میں مبتلا ہوتا ہے اور اسے خبر بھی نہیں ہوتی کہ میں شرک میں مبتلا ہو چکا ہوں۔ مثلاً فرمایا: اگر کوئی شخص نماز پڑھنے لگے اور دل میں یہ جذبہ ہو کہ لوگ یوں سمجھیں کہ بڑا عبادت گزار ہے، تو فرمایا: ''اِنَّ الرِّیَاءَ شِرْکٌ'' ② ریا خود شرک ہے۔ یہ خدا کی نماز نہیں پڑھ رہا بلکہ بندے کی نماز پڑھ رہا ہے۔ لوگوں کو دکھلانے کے لئے تاکہ یہ مجھے عبادت گزار سمجھیں۔ اب ریاء اور دکھلاوا کرنے والا ذہن میں تصور نہیں کرتا میں شرک کر رہا ہوں۔ اپنے نزدیک تو وہ خدا کی عبادت کر رہا ہے مگر حقیقتاً وہ خدا کی عبادت نہیں وہ تو دیکھنے والوں کی عبادت ہو رہی ہے، جن کو وہ دکھلا رہا ہے۔ تو ریا بھی ایک شرک ہے مگر یہ ظاہری اور کھلا ہوا شرک نہیں۔

اور ایک شرک اس سے بھی زیادہ باریک ہے یعنی کوئی بھی دیکھنے والا نہ ہو اور پھر بھی شرک پیدا ہو جائے، اس کو عُجب کہتے ہیں۔ یعنی آدمی تنہا عبادت کر رہا ہے، دل میں غرور ہے کہ میں ایسی عبادت کر رہا ہوں کہ آج تک کسی نے نہیں کی۔ گویا میں ہی دنیا میں ایسی عبادت کرنے کو پیدا ہوا ہوں، فرمایا یہ بھی شرک ہے۔ یہ اپنے نفس کے لئے عبادت کر رہا ہے، خدا کے لئے نہیں۔ اس کے نفس میں غرور اور پندار پیدا ہو رہی ہے اور اپنے نفس میں بڑائیاں مار رہا ہے کہ میں بہت بڑا آدمی ہوں، اتنی بڑی عبادت کی۔ جب یہ خود خدا کے سامنے کھڑا ہو کے بڑا بننے لگا تو اس کی بڑائی کا تو انکار کر دیا، اپنے نفس کو اس کی بڑائی کی جگہ دے دی۔ یہ بھی شرک پیدا ہوا۔ اس تک کو اسلام نے قطع کیا ہے کہ جب تنہا کھڑا ہو تو عُجب اور خود بینی نہ ہو کہ اپنے کو دیکھ کر نماز پڑھے۔ لوگوں کے سامنے کھڑے ہو تو لوگوں کے دکھلاوے کے لئے نہ پڑھے کہ وہ بھی شرک ہے۔ اگر ضرورت ہو تو سترہ رکھو، اس کو بھی ایسے انداز سے

① المسند للامام احمد، احادیث ابی موسی الأشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ص: ۹۸۔ علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواہ ابو یعلی من روایۃ لیث بن ابی سلیم عن ابی محمد عن حذیفۃ ولیث مدلس وابو محمد ان کان ھو الذی روی عن ابن مسعودؓ او الذی روی عن عثمان بن عفان فقد وثقہ ابن حبان وان کان غیرھما فلم اعرفہ، وبقیۃ رجالہ رجال الصحیح دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۱۰ ص: ۲۲۳۔ ② السنن للترمذی، ابواب النذور والایمان، باب ماجاء فی کراھیۃ الحلف ... ج: ۶ ص: ۱۳۔ حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحیح وضعیف الترمذی للالبانی ج: ۴ ص: ۳۵ رقم: ۱۵۳۵۔

مت رکھو کہ وہاں شرک کی صورت بھی بن جائے، تو شرک کی صورت بھی درست نہیں، حقیقی شرک تو کیا درست ہوتا اور مذاہب نے بھی شرک کو رد کیا ہے مگر دور دور کے اسباب کو رد نہیں کیا۔ اسلام نے ان کو بھی رد کیا تاکہ توحید مکمل ہو کر دنیا کے سامنے آئے۔ وحدانیت کی تکمیل اسلام (یعنی شریعت محمدی علی صاحبہا الف الف تحیۃ وسلام) نے پیش کی ہے۔ صرف توحید پیش نہیں کی، توحید تو پچھلے انبیاء علیہم السلام بھی پیش کر گئے، مگر اس توحید کو اتنا مکمل بنادیا کہ ظاہر اور باطن میں شرک کی کچھ گنجائش باقی نہیں رہی۔

بت پرستی کی ابتداء ...... اس مذہب میں تصویر حرام کی گئی کہ اس سے شرک کا اندیشہ ہوتا ہے۔ تصویر ہی سے شرک کی ابتداء ہوئی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم میں پہلے شرک پیدا ہوا ہے۔ ان کی قوم میں پانچ بزرگ تھے، جب ان کا انتقال ہوا، قوم نے ان کے بت بنا کے عبادت گاہوں میں رکھ دیئے تھے کہ ان کی صورتیں دیکھ دیکھ کے ہمیں خدا یاد آئے گا، جیسے ان کی مجلس میں بیٹھ کر خدا یاد آتا تھا۔ پہلی نسل تو ان کو دیکھ کر خدا کو یاد کرتی رہی، ان کی عبادت انہوں نے نہیں کی، مگر جب دوسری نسل آئی، ان کے دلوں میں وہ علم و معرفت نہیں تھی، جو ان کے بڑوں میں تھی کچھ تعظیم انہوں نے مورتیوں کی شروع کی جو عبادت گاہوں میں رکھی ہوئی تھیں، کچھ خدا کی طرف جھکے۔ اب جب تیسری نسل آئی تو خدا کو تو بھول گئے اور ساری عبادت ان بتوں ہی کے لئے رہ گئی۔ یہیں سے شرک کا قصہ چلا۔ تو شرک کی ابتداء انہیں چیزوں سے ہوئی ہے۔ ابتداء میں تصویر رکھی گئی پھر وہ شرک کا ذریعہ بن گئی۔

اسی طرح سے دنیا کی قومیں بہکتی ہیں کہ کسی بزرگ نے غلبۂ حال میں کسی کام پر عمل کر لیا۔ بعد والوں نے اسے قانون بنا کر اسی پر عمل کرنا شروع کر دیا اور شرک میں مبتلا ہو گئے۔ تو انکے بزرگوں نے تصویر یاد دہانی کے لئے رکھی تھی، عبادت کے لئے نہیں۔ مگر بعد والوں نے ان کی صورت کو اختیار کر لیا کہ وہ بتوں کے آگے جھک رہے تھے۔ لہٰذا ہم بھی جھکیں۔ یہی صورتیں ہوتی ہیں اور اس طرح کہیں درختوں کی پوجا شروع ہو جاتی ہے، کسی بزرگ نے کسی درخت کے نیچے بیٹھ کے عبادت کی ہوگی۔ اس کے ماننے والے معتقدین نے اس درخت کی عظمت شروع کی۔ انہوں نے فقط تعظیم کی، ان کے بعد والوں نے اس کو پوجنا شروع کر دیا۔ آج ہندوؤں میں پیپل کا درخت واجب العبادت ہے، اس کی عبادت کی جاتی ہے۔ ان کا کوئی بزرگ پیپل کے درخت کے نیچے عبادت کرنے بیٹھا ہوگا۔ انہوں نے پیپل ہی کی عبادت شروع کر دی، وہی معبود بن گیا۔

حضرت عمر کا شجرۂ حدیبیہ کو کٹوانا ...... حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس چیز کو سمجھا۔ حدیبیہ کے مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے بیعت جہاد کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیکر کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے اور اس کے نیچے بیٹھ کر بیعت لی، وہ وقت ختم ہو گیا۔ یہ واقعی اثر کی بات ہے کہ بزرگ اور اہل اللہ جہاں بیٹھ جاتے ہیں، وہاں بھی برکت کے آثار ظاہر ہوتے ہیں تو سید الاولین والآخرین کسی جگہ بیٹھیں اور وہاں برکت نہ ہو یہ ناممکن تھا۔ اس درخت کے اندر برکت پیدا ہوئی، صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ شروع

گیا کہ جب ادھر سے گزرتے تو تبرکاً اس درخت کے نیچے دو رکعت نفل پڑھ کر جاتے۔ اگر نماز کا وقت نہ ہوا یا وقت مکروہ تھا تو کم سے کم وہاں بیٹھ کے کچھ تسبیح وتہلیل ہی کر لیتے، کہ برکت حاصل ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیکھا کہ آج تو یہ صحابہ ہیں، یہ تو عارفین ہیں، اللہ اور رسول کی پہچان ہے، یہ محض تبرکاً یہاں بیٹھتے ہیں، درخت کی پوجا کرنے نہیں بیٹھتے لیکن آئندہ نسلیں جو آنے والی ہیں، کیا خبر ہے، ان کے دل میں علم ومعرفت نہ ہو اور وہ اس درخت کی عظمت سمجھ کے اسی کی پوجا کریں۔ حکم دیا کہ اس درخت کو کاٹ دو، درخت کٹوا دیا۔ صحابۂ کرام کو ناگوار ہوا کہ ایک بابرکت درخت کٹوا دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ تمہارے نزدیک بابرکت ہے۔ بعد والوں کے نزدیک یہی عبادت کا ذریعہ بنے گا اور کیکر کا درخت معبود بن جائے گا، پوجا شروع ہو جائے گی۔

دنیا کی اقوام اسی طرح سے بہکی ہیں، کہیں درخت معبود بنا، وہ اسی طرح سے کہ بزرگ نے وہاں برکت حاصل کرنے کے لئے قیام کیا۔ معتقدین ومتوسلین نے نیک نیتی سے اس چیز کی عظمت سے فائدہ اٹھایا۔ بعد والوں میں نہ وہ نیکی رہی، نہ وہ نیت رہی، انہوں نے اس چیز کو معبود بنا لیا۔ یہیں سے شرک کی ابتداء ہوگئی۔

مولانا یعقوب نانوتوی اور گنگا جل کی حقیقت...... ہمارے دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تھے۔ جو عارف کامل، صاحب کشف وکرامت بزرگ اور اولیائے کاملین میں سے تھے۔ تو مولانا کے مزاج میں کچھ مجذوبیت سی تھی۔ جیسے مجذوب ہوتے ہیں کہ آدھے باؤلے سے، آدھے عقلمند سے۔ اس طرح سے ایک جذب کا مادہ تھا، آنکھیں سرخ رہتی تھیں اور ایک کیفیت طاری۔ جس چیز کی لٹک لگ گئی وہ لگ جاتی تھی۔ ایک دن بیٹھے تھے یہ چیز ذہن میں آگئی کہ اس کی تحقیق کرنی چاہئے کہ یہ گنگا کہاں سے نکلی ہے۔ ہندوستان میں یہ بڑا دریا ہے، ہندو گنگا کی پوجا کرتے ہیں، اس کے پانی کو بڑا باعظمت جانتے ہیں، اس کو سامنے رکھ کر پوجا کرتے ہیں، اس کی بڑی عظمت ان کے دلوں میں ہے، اس کو گنگا مائی کہتے ہیں کہ یہ ہماری ماں اور اصل ہے۔ جب وہ پانی لے کر گنگا سے چلتے ہیں جب تک پانی کندھے پر رہتا ہے تو جوتا نہیں پہنتے، زمین پہ بیٹھتے نہیں، کھڑے کھڑے اس کو لاتے ہیں۔ اتنی عظمت کرتے ہیں۔ تو مولانا مرحوم کے دل میں یہ ایک جذبہ پیدا ہوا کہ یہ گنگا کہاں سے نکلی ہے اور اس کے نکلنے کا کیا سبب ہوا ہے حالانکہ اس کی تحقیق ایک غیر ضروری بات تھی، مگر ایک لٹک لگ گئی تو رات کے بارہ بجے چارپائی سے اٹھ کے گنگا کی تحقیق کے لئے روانہ ہو گئے۔

دیوبند سے گنگا چالیس میل کے فاصلے پر بہتی ہے، چالیس میل کے سفر کے ارادہ سے رات کو بارہ بجے چارپائی سے اٹھ کر روانہ ہو گئے۔ صبح کو جب مولانا درس میں نہ آئے تو سارے دارالعلوم میں ڈھونڈ پڑی کہ مولانا کہاں! مولانا کا کہیں پتہ نہیں، طلبہ پریشان، مدرسین پریشان کہ ہمارا صدر مدرس کہاں گیا۔ آدمی بھیجے گئے، کسی کو نانوتے، کسی کو گنگوہ، مولانا کا کہیں پتہ نہیں۔ لوگ سب حیران بیٹھے تو رو پڑے کہ خدا جانے کیا گزر رہی اور مولانا گنگا کی طرف سفر کر رہے ہیں، پورا ایک دن رات لگا، پورے چوبیس گھنٹے کا پیدل سفر کر کے وہاں پہنچے۔ وہ ایک چھوٹا سا

گاؤں ہے، جس کا نام گنگوتری ہے۔ اسی مناسبت سے گنگا اس کو کہتے ہیں۔ تو اس گاؤں میں پہنچے، جہاں سے یہ دریا نکل رہا ہے اور چشمہ ہے۔ وہاں مولانا نے سات دن قیام کیا، نماز میں اور تلاوت میں سات دن لگے رہے، رات دن کامل عبادت کی۔ چونکہ خود بھی بزرگ تھے تو حال منکشف ہوا کہ گنگا کیوں نکلی! کیا بات ہوئی۔

فرمایا: مجھ پر منکشف ہوا کہ جہاں سے گنگا نکلی ہے یہاں یا تو کسی نبی کی قبر ہے یا کسی نبی کے بیٹھنے کی جگہ ہے، اس برکت کے آثار ہیں، اس لئے چشمہ نکلا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوم کی قوم مبتلا ہے۔ تو گنگا کا چشمہ کسی پیغمبر کی دعا سے نکلا ہوگا، اس میں کچھ برکت کے آثار آ گئے۔ لیکن قوم نے جہالت سے اس پانی کو معبود سمجھ لیا۔ ابتداء میں اس کی تعظیم و وقعت کی ہوگی اور جب علم و معرفت دل میں باقی نہ رہا وہی معبود بن گیا، قابل پوجا بن گیا۔ اسی کے سامنے سجدے شروع ہو گئے۔ یہ امتِ مسلمہ پر اللہ کا رحم ہے کہ وہی نوعیت مکہ مکرمہ میں آبِ زمزم کی ہے، جو ہندو گنگا کی سمجھتے ہیں۔ لیکن اللہ کا فضل ہے آج تک آبِ زمزم کی پرستش کسی نے نہیں کی، نہ پوجا کی، نہ زمزم سامنے رکھ کر کسی نے سجدے کئے، عظمت و توقیر کرتے ہیں۔ شرعاً حکم ہے کہ پانی بیٹھ کر پیو، مگر یہ پانی تبرکاً کھڑے ہو کر پیو، یہ سب کچھ ہے۔ لیکن یہ کہ اس سے مسلمان مرادیں مانگتے ہوں، اے زمزم! ہمیں بیٹا دے۔ یا اے زمزم! روٹی دے، یہ کوئی نہیں کرتا، معبود نہیں جانتے۔ یہ محض اللہ کا اس امت کے اوپر فضل ہے، اس امت میں بھی برکت کی چیزیں آئی ہیں مگر پوجا اور عبادت کے لائق صرف اللہ کی ذات کو سمجھتے ہیں۔ غیر اللہ کے آگے نہیں جھکتے۔

وہ کیوں؟ اس لئے کہ اسلام نے نہ صرف شرک سے روک دیا، بلکہ شرک کے دور دور کے اسباب کو بھی قطع کر دیا ہے کہ شرک پیدا نہ ہونے پائے۔ اس لئے یہ امت کامل توحید پر قائم ہے۔ اگر اسلام اسبابِ شرک کو نہ روکتا تو ہم بھی انہیں چیزوں میں مبتلا ہوتے جس میں دوسری اقوام مبتلا ہوئیں، ہر درخت کو پوجتے، ہر پانی کو پوجتے، ہر پتھر کے آگے جھکتے۔ اور جہاں کچھ طبقات میں جہالت ہے وہ اب بھی ایسا کرنے سے باز نہیں رہتے۔ لیکن مجموعی طور پر امت الحمدللہ کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی۔ لوگ نادانی اور جہل کی وجہ سے غلطیاں کرتے ہیں۔ مگر اصل دین جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم چھوڑ گئے ہیں، وہ موجود ہے۔ وہ قیامت تک رہے گا۔ اصل دین میں فرق نہیں آئے گا۔ یہ اس کی برکت ہے کہ اسلام نے توحید کو لیا، شرک کو رد کیا اور شرک کے دور دور کے اسباب تک کو رد کر دیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانے سے ہی روک تھام شروع ہو گئی تھی۔

فاروقِ اعظم کے زمانہ میں ایک پیغمبر کی قبر سے پیشن گوئی کی کتاب کا نکلنا...... حدیث میں ایک واقعہ ارشاد فرمایا گیا ہے، کہ دمشق میں ایک پیغمبر کی قبر تھی، وہ اتفاق سے کھلی، پانی برسنے سے یا کسی اور وجہ سے، اس میں سے ایک کتاب نکل آئی۔ اس کتاب میں کچھ قواعد ایسے لکھے ہوئے تھے کہ آئندہ کی کچھ خبریں اس سے معلوم ہو سکتی تھیں۔ کسی آدمی نے اس کو پڑھ کر بتلایا کہ کل کو یوں ہوگا، پرسوں یوں ہوگا۔ اس سے لوگوں کے اندر فتنہ پھیلنا شروع ہوا اور اس شخص نے دعویٰ کر دیا کہ میں خود پیغمبر ہوں۔ دیکھو میں تین دن کے بعد کی بات بتا رہا ہوں کہ یہ

ہوگا، ہفتہ بعد یوں ہوگا۔ اس کتاب سے دیکھ دیکھ کے اس قسم کی باتیں شروع ہوئیں۔ لوگوں میں فتنہ پھیلا۔ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اطلاع دی گئی تو مدینہ طیبہ سے مستقل شام کا سفر فرمایا اور بیت المقدس پہنچے۔ اس شخص کو بلوایا گیا، کتاب اس سے لی گئی، اس کتاب میں کچھ قواعد کے ذریعے سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ قطعی اور یقینی نہیں ہوتی، وہ قیاسی ہوتی ہیں، جیسے ایک طبیب طب کے لحاظ سے پیشین گوئی کرے کہ فلاں مریض تین دن میں مرجائے گا، یہ کوئی غیبی الہام نہیں ہوتا کہ اس پر ایمان لانا ضروری ہو، قیاسی چیز ہے، ہو بھی سکتی ہے، نہیں بھی۔

بہت سے لوگ سیاسی پیشین گوئیاں کیا کرتے ہیں کہ دو برس کے بعد فلاں حکومت کا یہ حشر ہونے والا ہے۔ وہ اپنے تجربات اور سیاسی قواعد سے پیشین گوئی کرتے ہیں۔ وہ غیبی الہام نہیں ہوتا کہ اس کا یقین کرنا اور اس کا عقیدہ بنانا ضروری ہو۔ ہر صاحب فن اپنے فن کے لحاظ سے کچھ پیشین گوئیاں کر دیتا ہے۔ اسی طرح سے علماء نے کچھ قواعد لکھے ہیں، ان کے ذریعے سے بعد کی باتیں معلوم ہوسکتی ہیں، کچھ مستقبل کی چیزوں کا پتہ چل سکتا ہے۔ اسلام نے ان چیزوں سے اس لئے روک دیا ہے کہ یہ قیاسی چیزیں ہیں، قطعی نہیں۔ ان پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایسا ہو جائے' ہوسکتا ہے اس کے خلاف ہو۔ مؤمن کا کام یہ ہے کہ اللہ پر بھروسہ رکھے۔ جو خبر اس نے اپنے پیغمبر کے ذریعہ بھیجی ہے یقینی ہے باقی اور کوئی چیز قطعی اور یقینی نہیں ہے۔

فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ کے سامنے وہ کتاب پیش کی گئی۔ فرمایا: جہاں یہ قبر کھلی ہے وہاں گیارہ قبریں کھدوائی جائیں۔ گیارہ قبریں کھدوادی گئیں اور اعلان کیا کہ جن پیغمبر کی نعش مبارک ظاہر ہوئی ہے اور وہ اوپر آگئی ہے، ان کو دفن کیا جائے گا۔ چنانچہ وہ قبر جو تھی اس میں سے نعش نکالی گئی اور رات کو جب تمام سوگئے تو کسی قبر میں دفن کردیا اور کتاب بھی ان کے ساتھ دفن کردی، اوپر سے ساری زمین برابر کردی گئی۔ لوگوں کو اب یہ پتہ نہیں چلا کہ کون سی قبر میں وہ کتاب دفن کی گئی ہے۔ وہ ہمیشہ کے لئے غائب ہوگئی۔ یہ اس لئے پیش بندی کردی کہ اگر وہ کتاب رہ جاتی تو لوگ اس سے فتنہ پھیلاتے، اس سے پیشین گوئیاں کرتے کہ ہم نبی ہیں، ہم پر الہام ہوا ہے، اس سے ختم نبوت کا انکار ہوتا۔ تو دور سے پیش بندی کر کے اس سلسلہ ہی کو قطع کردیا کہ لوگ پہنچنے ہی نہ پائیں۔ بہر حال اس قسم کے اسباب کو رد کرنا، یہ اسلام نے توحید کی تکمیل کے لئے کیا ہے، تاکہ توحید مکمل ہو کے دلوں کے اندر آئے۔

اسباب معاصی بھی حرام ہیں...... یہی وجہ ہے کہ ایسی تعظیم سے بھی روکا جس سے شرک کا واہمہ بھی پیدا ہو۔ جیسے فقہاء لکھتے ہیں کہ جب سلام کرو تو جھک کے مت کرو۔ مسلمانوں کا سلام ''اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ'' ہے۔ یہ جھکنا جھکانا نہیں ہے، تھوڑا سا کوئی جھک جائے تو مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر اتنا جھک گیا کہ رکوع کی شکل پیدا ہوگئی تو اس شخص کو سزا دی جائے گی کہ اس نے عبادت کی شکل پیدا کردی، حالانکہ انسان کے لئے عبادت نہیں رکھی گئی۔ تو سلام میں رکوع کی شکل پیدا ہوجانا، یہ مکروہ تحریمی ہے، اس سے شرک کے پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ یہاں تک پیش بندی کی اور دور تک اسباب کو قطع کیا۔ اسی طرح سے معاصی اور زنا میں بھی کیا گیا ہے

کہ زنا سے روکنا مقصود ہے لیکن اس کے روکنے کے لئے جو اسباب زنا تھے، ان کو بھی حرام قرار دیا۔ اجنبی عورت پر ارادے سے نگاہ ڈالنا، یہ بھی ممنوع ہے۔ اس کو ہاتھ لگانا، یہ بھی ممنوع، اس کی آہٹ پر چلنا، یہ بھی ممنوع ہے۔ حالانکہ اصل میں عورت کو دیکھنا کوئی ممنوع چیز نہیں ہے، یہ بری بات نہیں ہے۔ برا فعل وہ ہے جس کو زنا کہتے ہیں۔ مگر چونکہ بسا اوقات یہ اصل فعل کا ذریعہ بن جاتا ہے، اس لئے اس سے بھی روک دیا۔ فرمایا: عورت خوشبو لگا کر سڑک کے اوپر نہ نکلے۔ اس لئے کہ خوشبو ایک دعوت ہے کہ مجھے دیکھیں، خوشبو جب ناک میں پہنچے گی، لوگوں کی توجہات منعطف ہوں گی۔ تو حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ خوشبو لگا کر باہر جانے والی عورت کی مثال زانیہ کی ہے گویا زنا کر رہی ہے کہ زنا کی دعوت لوگوں کو دے رہی ہے، اس حد تک روک دیا گیا۔ تو باہر نکلنا یا خوشبو لگا کے نکلنا یا ایسے زیورات پہن کے نکلنا، جس کی آواز دوسروں کے کانوں تک پہنچے، ان سب چیزوں سے روکا۔ تا کہ اصل فعل سے آدمی رک جائے۔ روکنا زنا کا مقصود ہے۔ یہ چیزیں اپنی ذات سے ناجائز نہیں تھیں، اس لئے روک دی گئیں، کہیں ذریعہ نہ بن جائیں۔ اس کو شریعت کی اصطلاح میں "سدِّ ذرائع" کہتے ہیں۔ یعنی وسائل کو روک دو، تا کہ آدمی مقاصد تک نہ پہنچنے پائے۔ روکنا تو چوری کا مقصود ہے کہ دوسرے کا مال نہ لے، لیکن تاک لگانا، کسی مکان میں ٹوہ لینا، نقب لگانا، دیوار میں دیکھنا کہ اینٹ کہاں سے ٹوٹ سکتی ہے، مال اسباب کہاں رکھا ہوا ہے۔ اس سب دیکھنے کو ممنوع وحرام قرار دے دیا ہے۔ اس لئے کہ جو آج دیکھ رہا ہے وہ کل چوری بھی کرے گا، یہی چیزیں ذریعہ بنیں گی۔ تو چوری کو روکنے کے لئے جتنے اسباب اور دواعی تھے، ان سب کو ممنوع اور ناجائز قرار دے دیا گیا۔

عبداللہ بن مسعودؓ کا فرمان ہے: مَنْ اَتٰی سَاحِرًا اَوْ کَاهِنًا اَوْ عَرَّافًا فَقَدْ کَفَرَ بِمَآ اُنْزِلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ ① جو جادوگر کے پاس گیا، اس نے شریعت محمدی کے ساتھ کفر کیا۔ حالانکہ جادوگر کے پاس جانا اپنی ذات سے کفر نہیں۔ اس لئے کہ جب وہ اس کے پاس گیا تو اس نے توحید کا انکار نہیں کیا، نبوت، قیامت اور فرشتوں کا انکار نہیں کیا۔ ایمان کا تعلق تو ان چیزوں سے ہے۔ جب یہ ساری چیزیں موجود ہیں پھر کیسے کفر کیا۔ پھر فرمایا گیا اس لئے کہ جو آج کسی جادوگر کے پاس جائے گا تو سب سے پہلے تو جادو کی برائی دل سے نکلے گی، وہ جو دل میں بیٹھا ہوا تھا کہ جادو کرنا حرام ہے، وہ حرمت دل سے نکلے گی۔ دوسرے دن جا کے وہ اسے یوں کہے گا کہ: ایک منتر مجھے بھی سکھلا دو، تو ایک منتر سیکھ لیا، تیسرے دن جائے گا تو خود منتر کرے گا اور چوتھے دن اچھا خاصا جادوگر بن جائے گا اور کفر میں مبتلا ہو جائے گا۔ اس سے بچانے کے لئے یہیں سے روکا کہ جادوگر کے پاس جانا ہی کفر کی چیز ہے۔ اس کو کہتے ہیں کسی عمل کی تکمیل کر اس کے دور دور کے اسباب کو بھی روک دیتا کہ اصل برائی کے اندر مبتلا نہ ہونے پائے۔

روکنا شراب سے مقصود تھا، فرمایا: مَا اَسْکَرَ کَثِیْرُهٗ فَقَلِیْلُهٗ حَرَامٌ ② جس چیز کے زیادہ حصے میں نشہ

① مسند ابی یعلی، ج ۱۱ ص: ۱۹۶ رقم: ۵۴۸۰، مسند عبداللہ بن مسعودؓ، حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے صحیح الترغیب والترھیب ۳: ۹۸۔ ② السنن لابی داؤد، کتاب الأشربۃ، باب النھی عن المسکر ص: ۱۰۶۔

ہے، اس کا کم حصہ بھی ناجائز اور حرام ہے۔ یعنی شراب کا گلاس پینا حرام ہے تو ایک قطرہ چکھنا بھی حرام ہے۔ اس کو نجس العین کہا گیا ہے، جیسے خنزیر نجس العین ہے کہ اس کی ذات ہی ناپاک ہے، اسی طرح شراب کو بھی فرمایا گیا کہ اس کی ذات اور جوہر بھی ناپاک ہے۔ اس لئے فرمایا: ایک قطرہ بھی اسی طرح سے حرام ہے جس طرح سے ایک گھونٹ اور ایک جام پینا حرام ہے۔ لیکن اگر کوئی یہ سوال کرے کہ شراب اس لئے حرام کی کہ نشہ لاتی ہے اور نشے میں آدمی کی عقل جاتی رہتی ہے مگر ایک قطرہ چکھنے سے تو نشہ نہیں پیدا ہوتا پھر یہ کیوں حرام ہے؟ وہ یہی وجہ ہے کہ جس نے آج ایک قطرہ پیا، وہ کل کو ایک گھونٹ پیئے گا، جو کل کو ایک گھونٹ پیئے گا پرسوں کو ایک گلاس بھی پیئے گا۔ جو پرسوں کو ایک گلاس پیئے گا وہ چوتھے دن جا کر شراب خور بن جائے گا۔ تو شراب خور بننے سے روکنے کے لئے ایک قطرہ کو بھی ممنوع قرار دے دیا تاکہ ابتداء سے آدمی رک جائے۔

پھر یہی نہیں کہ شراب کا ایک قطرہ یا ایک گھونٹ ہی پینا حرام ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں چار قسم کے برتن تھے جن میں شراب پی جاتی تھی۔ جیسے اس زمانے میں بھی شراب پینے کے کچھ مخصوص برتن ہوتے ہیں جام اور صراحی، اس کے الگ ہوتے ہیں۔ ایسے ہی زمانۂ جاہلیت میں چار قسم کے برتن تھے: حَنْتَمْ، دُبَّاء، نَقِیْر اور مُزَفَّت۔ "دُبَّاء" ایک خاص قسم کا کدو ہوتا تھا، جس کو اندر سے کھرچ کر کھوکھلا کرتے تھے اور اس میں شراب رکھتے تھے، تو اس میں نشہ زیادہ پیدا ہوتا تھا۔ اسی طرح سے نقیر ایک خاص قسم کے درخت (کھجور) کی جڑ ہوتی تھی، اس کو کھود کر پیالہ بناتے تھے، اس پر روغن اور بہت عمدہ رنگ کر کے اس کو بیچتے تھے، اس میں شراب پی جاتی تھی تو وہ اچھی معلوم ہوتی تھی۔ اسی طرح دوسرے برتن تھے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جس طرح سے شراب حرام ہے اسی طرح سے یہ چار برتن بھی حرام قرار دیئے گئے کہ ان میں پانی بھی مت پیو۔ اس لئے کہ اگر پانی پینے بیٹھے، ممکن ہے شراب یاد آجائے اور شراب کی طرف توجہ ہو جائے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ روکنا اصل، حرام فعل سے مقصود ہے، اس کے جتنے اسباب تھے دور دور تک، ان سے بھی روکا ہے تاکہ آدمی وہاں تک نہ پہنچنے پائے۔ تو شرک ایک قبیح فعل تھا اس کو روکنے کے لئے اس کے جتنے اسباب تھے ان سے بھی روک دیا تاکہ انسان میں کمالِ توحید اور کمالِ تقویٰ پیدا ہو۔

یہ جو آپ نے سنا ہوگا کہ صغیرہ گناہ اور کبیرہ گناہ۔ تو صغیرہ اور کبیرہ گناہ کی تعریف یہی ہے کہ ہر گناہ کے سلسلہ میں جو فعل اصل مقصود ہوتا ہے وہ تو کبیرہ ہے اور جو اس کے اسباب ہوتے ہیں وہ صغیرہ ہے۔ زنا تو کبیرہ گناہ ہے عورت کو دیکھنا، بری نیت سے ہاتھ لگانا، اس کی طرف چل کے جانا یہ سارے گناہِ صغیرہ ہیں۔ اگر خدانخواستہ وہ اصل فعل واقع ہو گیا تو یہ سارے گناہ لادے جائیں گے اور سب کا وبال چکھنا پڑے گا۔ لیکن اگر یہ سارے افعال سرانجام دیئے اور اصل فعل سے بچ رہا تو یہ بھی سب معاف کر دیئے جائیں گے۔ نیکیاں کرنے سے صغیرہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ تو شریعتِ اسلام نے فقط گناہ سے نہیں روکا بلکہ ان کے اسباب یعنی صغیرہ گناہ سے بھی روکا ہے۔ تاکہ اس گناہ سے آدمی دور در رہے۔ یہ اصل میں دین کی تکمیل ہے کہ اصل مقاصد کو روکنے کے لئے اس

کے دواعی اور اسباب تک کو روکا اور مکمل قانون بنا دیا۔

اسبابِ فرائض پر اجر و ثواب ہے..... اسی طرح سے جو فرائض ہیں ان میں اصل مقصود تو فرض ہے لیکن فرض کو انجام دینے کے لئے اسباب کا سلسلہ بچھا دیا۔ مثلاً اصل مقصود نماز ہے، یہ تو فرض ہے لیکن اس کے لئے شریعتِ اسلام نے کہاں سے سلسلہ چلایا۔ فرمایا گیا: اگر ایک شخص لحاف میں پڑا ہوا سو رہا ہے اور اذان ہوئی تو جب مؤذن "حَيَّ عَلَى الصَّلٰوة" کہے تبھی بستر چھوڑ دینا چاہئے۔ اس لئے کہ اگر یہ خیال ہوا کہ ابھی یہ اذان دے رہا ہے، ابھی پانچ منٹ اذان میں لگیں گے، اس کے بعد پندرہ منٹ نماز میں! ذرا اور سو جاؤں تو سوتے سوتے وہ آدھ گھنٹے سوئے گا، جماعت بھی قضا ہو جائے گی۔ مسجد میں جانا ہی نصیب نہیں ہوگا۔ تو وہاں سے پکڑا ہے کہ جب "حَيَّ عَلَى الصَّلٰوة" کی آواز آئے تبھی اٹھ کھڑے ہو جاؤ۔ آسانی اسی میں ہے۔ اس کے بعد آدمی نے وضو کیا، فرمایا گیا: جب آدمی وضو کرنے بیٹھتا ہے تو جس عضو کو آدمی دھوتا ہے، جو گناہ اس عضو سے کئے ہیں، وہ جھڑنے شروع ہوتے ہیں، ہاتھ سے گناہ کیا، جب ہاتھ دھوئے گا تو ناخنوں سے وہ گناہ جھڑیں گے۔ پیر دھوئے گا تو پیروں کے گناہ جھڑیں گے۔ کلی کرے گا تو منہ سے جو گناہ کئے ہیں، وہ جھڑیں گے۔ ناک میں پانی دے گا، تو ناجائز سونگھنے کے جو گناہ کئے ہیں، وہ جھڑیں گے: "حَتّٰى يَخْرُجَ نَقِيًّا مِنَ الذُّنُوْبِ"۔ (1) جب وضو کر کے اٹھے گا تو ایسا پاک ہوگا گویا اس نے وہ گناہ کئے ہی نہیں تھے۔ یہ سب پاکی نماز کے لئے کی جا رہی ہے۔ پھر فرمایا گیا: جب وضو کر کے آدمی چلا تو مسجد تک جانے میں ہر قدم پر ایک نیکی لکھی جاتی ہے اور ایک بدی مٹا دی جاتی ہے۔ اب نیکیوں کا ایک ذخیرہ یہاں سے جمع ہوا۔ پھر فرمایا گیا: اگر مسجد میں بیٹھا ہے اور ابھی نماز نہیں ہوئی، دیر ہے اور یہ انتظار کر رہا ہے تو نماز کا انتظار کرنے والا نماز پڑھنے والے کے حکم میں ہے۔ انتظار کے وقت میں اتنا ہی اجر دیا جائے گا جتنا کہ نماز پڑھنے میں دیا جاتا ہے۔ یہاں سے ایک اجر کا ذخیرہ مہیا ہوا۔ تو وہاں سے ثواب کے وعدے دینے شروع کئے کہ لحاف سے اٹھے تو اجر و ثواب، وضو کیا تو ایک ایک عضو دھونے پر ثواب، مسجد گئے تو ایک ایک قدم پر ثواب، مسجد میں انتظار کیا تو ایک ایک منٹ پر ثواب۔ حتیٰ کہ نماز کا وقت آ جائے۔ تو مقصود نماز کا ثواب دینا ہے۔ اس کے لئے ایک سلسلہ بچھا دیا کہ وہاں سے آدمی چل پڑے تاکہ نماز کے قضا ہونے کا کوئی احتمال باقی نہ رہے۔

تو جیسے ناجائز چیزوں میں روکنے کے لئے اسباب تک کو روک دیا۔ یہاں فرائض کے ادا کرانے کے لئے کچھ اسباب بھی کروائے تاکہ آدمی مکمل طریق پر اچھے دین کو انجام دے۔ یہ بات مجھے اس پر یاد آ گئی کہ سوال اُس شخص نے یہ کیا تھا کہ اسلام نے کوئی نئی چیز ہمیں کیا لا کر دی۔ جو ہم اس کی طرف متوجہ ہوں؟ میں نے کہا کہ دین نیا نہیں لا کے دیا، دین تو وہی ہے جو سارے انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ اس دین کی تکمیل کر دی ہے۔ ہر ہر حکم کو اتنا مکمل کیا ہے کہ وہ مستقل ایک قاعدہ اور ضابطہ بن گیا۔ توحید کی تکمیل، نماز کی تکمیل، صدقات کی تکمیل، حج کی تکمیل حتیٰ

(1) الصحيح لمسلم، كتاب الطهارة، باب خروج الخطايا مع ماء الوضوء، ج: ٢ ص: ٣٥.

کہ سونے اور جاگنے کے اوقات کو عبادت سے مکمل بنادیا۔ یہ چیز اسلام نے لاکر دی ہے۔ اسی کی ہم دعوت دیتے ہیں۔ دوسرے مذاہب میں یہ چیز نہیں ملتی۔ اصل دین ملتا ہے، نیکی ملتی ہے۔ ہر مذہب کہے گا کہ: زنا مت کرو، بہت بری بات ہے۔ کوئی بھی: جازت نہیں دے گا لیکن بچنے کے طریقے کیا ہیں؟ قانون کا ایک لمبا سلسلہ.... یہ نہیں ملے گا۔ ہر مذہب کہے گا کہ شراب مت پیو لیکن شراب کے لئے اسباب کیا ہیں جن سے شراب پی جاتی ہے اور جن میں پیتا ہے، ان سے اسلام نے روکا، ایسی صحبت مت اختیار کرو جس میں شراب کی رغبت پیدا ہو، ایسے اوباش لوگوں کے پاس بیٹھو بھی مت، جو تمہیں شراب پینے پر ڈال دیں اور تمہارے اندر رغبت پیدا کردیں۔ ایک ایک شق اور سبب کو روک دینا ہر حکم میں یہی دیکھتے ہیں۔ ہر حکم ایک مستقل قانون بنا ہوا ہے۔ یہ ہے تکمیل دین۔ یہ تکمیل جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے ہوئی۔ تو کامل دین ایک مستقل نعمت ہے، اور اس نعمت کے لانے والے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس واسطے آپ کا دنیا میں آنا سب سے بڑی نعمت ہے۔

اللہ جل شانہٗ کی طرف سے ہدیہ...... اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا ہے: يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا أَنَا رَحْمَةٌ مُهْدَاةٌ ① میں اللہ کی ایک رحمت ہوں جو بطور ہدیہ کے بندوں کے پاس بھیجی گئی ہے۔ اللہ کا ایک ہدیہ جو بندوں کو ملا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے۔ تو اتنی بڑی نعمت دی گئی کہ جتنی عالم کی نعمتیں ہیں سب اسی کے طفیل میں مل رہی ہیں۔ زندگی کی نعمت ملی، تب اسی کے طفیل ملی، جب آدم علیہ السلام کو فرمایا کہ اگر تمہیں پیدا نہ کرنا ہوتا تمہیں بھی پیدا نہ کرتے! اگر آدم علیہ السلام کو پیدا نہ کرتے ہم اور آپ کہاں سے آجاتے! ہمارا وجود اور زندگی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے ہے۔ پھر زندگی کے بعد جتنی کائنات میں نعمتیں ہیں، اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ آتے تو کائنات نہ تھی۔ بس وہ نعمتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہوئیں۔ ہمیں کھانا پینا جو بھی نعمتیں مل رہی ہیں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے مل رہی ہیں۔ اگر آخرت میں نعمتیں ملیں گی وہ ایمان کی وجہ سے ملیں گی، ایمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لاکے دیا، پھر یہ ایک مستقل نعمت ہے۔ غرض دنیا سے لے کر قبر تک اور قبر سے لے کر حشر تک نعمتوں کا ایک سلسلہ ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے ہے۔ اس لئے اس نعمت کا جتنا بھی ناز کیا جائے وہ کم ہے اور جتنا بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کو پہچانا جائے اتنا ہی کم ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق بنیادی طور پر تین ہیں، جن کا ادا کرنا ضروری ہے۔ ایک عظمت، ایک محبت، ایک متابعت۔ عظمت یہ کہ آپ کو اتنا بڑا جانا جائے کہ کائنات میں کوئی بڑی ہستی نہیں ہے جتنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

---

① السنن للدارمي، المقدمة، باب كيف كان اول شان النبي صلى الله عليه وسلم، ج: ١، ص: ١٧، حدیث صحیح ہے، دیکھئے: السلسلة الصحيحة ج: ١ ص: ٨٨٣ رقم: ٤٩٠.

دوسری چیز محبت ہے۔ اگر محبت نہ ہوگی تو ایمان نصیب نہیں ہوگا۔ آپ کا یہ حق ہے کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کریں۔ محبت کا یہ خاصہ ہے کہ فقط محبوب ہی محبوب نہیں ہوتا محبوب کی ادائیں بھی محبوب ہو جاتی ہیں۔ جس سے محبت ہوتی ہے، تو آدمی یہ چاہتا ہے کہ میں صورت بھی ایسی بنالوں جیسی محبوب کی ہے۔ میں چال ڈھال بھی ایسی بنالوں جیسی محبوب کی ہے۔ میں رہن سہن کا ڈھنگ بھی وہ بنالوں جو میرے محبوب کا ہے۔ محبوب سے جب محبت ہوتی ہے فقط محبوب سے نہیں ہوتی، اس کی ہر ایک ادا سے محبت ہو جاتی ہے، اس کا گھر بھی محبوب بن جاتا ہے۔ جیسے مجنوں لیلیٰ کا عاشق بن گیا تھا، لوگوں نے دیکھا کہ مجنوں لیلیٰ کے مکان کی ایک ایک اینٹ چومتا پھر رہا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ بھئی! اینٹ میں کیا رکھا ہے؟ اس نے یہ شعر پڑھا

اَمُرُّ عَلَی الدِّيَارِ دِيَارِ لَيْلٰی ۔۔۔ اُقَبِّلُ ذَاالْجِدَارِ وَذَاالْجِدَارِ

میں لیلیٰ کے مکان سے گزرتا ہوں تو کبھی اس اینٹ کو چومتا ہوں کبھی اس کو، کبھی دہلیز کو، کبھی اس کے کواڑوں کو۔

وَمَا حُبُّ الدِّيَارِ شَغَفْنَ قَلْبِيْ ۔۔۔ وَلٰكِنْ حُبُّ مَنْ سَكَنَ الدِّيَارَ

مجھے ان اینٹوں سے محبت نہیں۔ مجھے اس سے محبت ہے جو ان اینٹوں کے اندر بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سے مجھے اینٹیں بھی عزیز ہو گئیں۔ وہ محبوب ہے تو اس کا مکان اور کتا بھی محبوب ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں محبوب ہیں تو مدینہ منورہ بھی محبوب ہے، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شہر ہے۔ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہمیں محبوب ہے کہ وہ حضور کی مسجد ہے۔ مدینہ کے رہنے والے بھی ہمیں محبوب ہیں اور ہم انہیں اپنا مخدوم جانتے ہیں، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوسی ہیں۔ جب محبوب، محبوب ہے تو ادائیں بھی محبوب، ان سے جن کو نام لگ گئے ہیں یا ان کی نسبت لگ گئی ہے، وہ بھی سب محبوب بن گئے۔ تو وہ وطن بھی، مکان بھی، اور وہاں کے باشندے بھی سب محبوب۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا اکرام مدینہ میں گیارہ دن تک یوں وبراز سے رُکنا...... اور عظمت تو عظمت کرنے والوں نے کی۔ ہم تو دعویٰ ہی دعویٰ کرتے ہیں۔ حقیقی عظمت کرنے والے تو گزر گئے۔ عظمت کرنے والے وہ تھے کہ ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ جب حج کرنے گئے ہیں تو تین دن ٹھہر کر مدینہ طیبہ سے واپس ہونے لگے، تمام اہل مدینہ نے آ کے راستہ روکا کہ ہم تو آپ کو نہیں جانے دیں گے۔ لوگوں کو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت اور محبت تھی۔ سارے اہل مدینہ آ کے کھڑے ہو گئے کہ ابھی آپ اور رہیں، ہم نہیں جانے دیں گے۔ ان کے کہے سنے سے پھر رک گئے۔ پانچ دن کے بعد پھر ارادہ کیا پھر اہل مدینہ نے آ کے روک دیا کہ ابھی نہیں جانے دیں گے۔ بہت کہا! بہت معذرت کی۔ مگر اہل مدینہ نے نہیں مانا، پھر رک گئے۔ یہاں تک کہ کئی دفعہ ہوتے ہوتے گیارہواں دن آ گیا۔ اب جانے کا ارادہ کیا پھر اہل مدینہ نے روکا تو کہا: اب میرے بس میں نہیں ہے رُکنا۔ لوگوں نے عرض کیا:

حضرت! بس کی کیابات ہے؟ فرمایا: گیارہ دن گزر گئے ہیں آج تک میں نے استنجا نہیں کیا، ایک ہی وضو سے اتنے دن گزارے۔ اس لئے کہ میرے دل نے گوارہ نہیں کیا کہ مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں آ کر میں یہاں بول و براز کروں، اس زمین کو گندہ کروں۔ معلوم نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم کہاں پڑا ہوگا اور میں وہاں گندگی ڈالوں، یہ تھی حقیقی عظمت۔ ہم اور آپ اس عظمت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کا رتبہ اور حق تھا کہ گیارہ دن تک ایک وضو سے رہے۔ تب اہل مدینہ نے کہا کہ اب تو ہم جلدی رخصت کریں گے، لہٰذا جلدی رخصت کیا۔ تب جا کے استنجاء وغیرہ سے فارغ ہوئے۔ خیر یہ تو ایک کرامت کا درجہ ہے، ہر ایک اس کو انجام نہیں دے سکتا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا اکرامِ مدینہ...... امام مالک رحمۃ اللہ علیہ امام دارالہجرت کہلاتے ہیں۔ مدینہ سے بے حد محبت تھی اور یہ چاہتے تھے کہ مدینہ ہی میں میری وفات ہو جائے اور مدینہ ہی کی زمین مجھے قبول کرے۔ تو آخیر عمر ساری مدینہ میں گزار دی اور اس ڈر کے مارے حج نفل ادا کرنے نہیں جاتے تھے کہ کہیں مدینہ سے باہر موت نہ آ جائے۔ کیفیت یہ تھی، کہ جب تک مدینہ میں رہے ہیں، مدینہ کی گلیوں اور بازاروں میں ننگے پاؤں پھرتے تھے کہ معلوم نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم مبارک کہاں پڑا ہوگا میں جوتے لیکر وہاں سے گزروں! مجھے چاہیے تھا کہ میں سر کے بل چلتا مگر یہ میرے بس میں نہیں، کم سے کم جوتا تو پہن کے نہ چلوں۔ عظمتِ حقیقی یہ تھی جو ان اکابر نے کی ہے کہ ساری عمر مدینہ میں جوتے پہن کر نہیں چلے۔

آثارِ مدینہ نظر پڑتے ہی قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تڑپ اور بے خودی...... مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ بانیٔ دارالعلوم دیوبند جب حج کے لئے گئے ہیں تو مدینہ منورہ کے قریب ایک منزل آتی ہے، جس کو ''بیر علی'' کہتے ہیں۔ ذرا سی پہاڑی ہے، اس پر جب اونٹ یا کاریں چڑھتی ہیں تو ایک دم حرم (مدینہ) شریف کے مینار نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ وہاں سے مدینہ منورہ تین چار میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ حضرات مدینہ منورہ حاضر ہوئے، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ اور سارے بزرگ۔ جب ''بیر علی'' پر پہنچے اور حرم کے مینار پر نظر پڑی تو حضرت مولانا قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بے تاب ہو کر ایک دم اونٹ سے کودے اور ننگے پیر چل پڑے تھے۔ اور کچھ عاشقانہ اشعار زبان پر تھے جیسے معلوم ہو کہ اپنے ہوش میں نہیں۔ حالانکہ وہاں کی کنکریاں ایسی ہیں کہ جب وہ چبھتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خنجر یاں چبھ رہی ہوں۔ اور لوگ بھی حضرت کو دیکھ کر کود پڑے۔ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ دوسرے لوگ جو کودے، یہ نقالی کر رہے ہیں، اُن پر تو حال طاری ہے، وہ تو اپنے آپے میں نہیں، اُن کی یہ نقل نہیں اتار سکیں گے۔ چار پانچ میل اسی طرح ننگے پاؤں چلے، پیر لہولہان ہو گئے مگر انہیں کچھ ہوش نہیں تھا۔ حقیقی عظمت تو اہل اللہ کی ہوتی ہے، جن پر عظمت کا حال طاری ہوتا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ ہم اگر تھوڑی بہت نقل بھی اتار لیں۔ یہ بھی ہماری سعادت ہے، وہ حال تو حال والوں کا ہوتا ہے، ہم میں وہ حال کہاں۔

غرض مدینہ منورہ سے محبت کیوں ہے؟ اس لئے کہ صاحب مدینہ سے محبت ہے۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وطن بنا تھا۔ جب وطن والا ہمارا محبوب ہے تو وہ وطن بھی محبوب، اس کے رہنے والے بھی ہمیں محبوب، اس کا پانی اور اینٹ اینٹ بھی محبوب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خاکِ شفاء، مدینہ کی مٹی تھوڑی تھوڑی تبرک کے طور پر لے کر آتے ہیں، اس کو گھر میں تبرکاً رکھتے ہیں۔ اس واسطے کہ جس ذاتِ اقدس سے ہمیں محبت ہے، وہیں کی تو یہ مٹی ہے۔ یہ مٹی بھی ہمیں عزیز ہے، اس کا ایک ایک ذرہ بھی ہمیں عزیز ہے۔

مدینہ میں موت آنے کی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی فکر وکڑھن...... امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا تو یہ حال تھا کہ وہ یہ چاہتے تھے کہ مجھے موت مدینہ میں آئے۔ نفلی حج کرنا اس ڈر کے مارے چھوڑ دیا تھا کہ کہیں باہر وفات نہ پا جاؤں۔ ان کے واقعات میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ خواب میں دیکھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حاضر ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ آگے بڑھے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے یہ بتلا دیا جائے کہ میری عمر کتنی باقی ہے؟ تاکہ اگر میری عمر زیادہ باقی ہو تو میں حج نفل کرلوں اور توقع رکھوں کہ لوٹ کے آجاؤں گا اور مدینہ میں میرا انتقال ہو جائے گا۔ میں مدینہ کی زمین کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ مجھے یہ پتہ چل جائے کہ میری عمر کے کتنے سال باقی ہیں۔ اگر دو تین سال باقی ہوں تو میں نفلی حج کر آؤں۔

یہ پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح سے ہاتھ سامنے کر دیا کہ پانچ انگلیاں سامنے ہیں۔ پھر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی آنکھ کھل گئی۔ حیران ہوئے کہ پانچ انگلیوں کا کیا مطلب ہے! آیا میری عمر کے پانچ برس، یا پانچ ماہ، یا پانچ ہفتے، یا پانچ دن باقی ہیں! کچھ سمجھ میں نہ آیا تو تعبیر خواب کے بڑے ماہر، امام محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ جو تابعی بھی ہیں اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ہمعصر ہیں، خواب کی تعبیر ایسی دیتے ہیں کہ ادھر تعبیر دی اور ادھر ہاتھ کے ہاتھ واقعہ ظاہر ہو گیا۔ اس فن کے بڑے امام تھے۔ انہوں نے کتاب لکھی ہے "**تعطیر الأنام فی تعبیر المنام**"۔ دو جلدوں میں ہے، اس میں بہت بڑے تعبیر خواب کے اصول بتلائے ہیں۔

ایک جیسے دو خواب اور مختلف تعبیریں...... ان کی بات پر یاد آیا۔ ان کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کیا: حضرت! میں نے ایک خواب دیکھا ہے کہ میری چارپائی کے نیچے انگارے دھک رہے ہیں! فرمایا: جلدی جا، تیرا مکان گرنے والا ہے، بیوی بچوں اور سامان کو نکال لے۔ بے چارے نے جلدی جلدی سامان اور بیوی بچوں کو نکالا۔ دو تین گھنٹے کے بعد ساری بلڈنگ آپڑی۔ خواب کی تعبیر بالکل ہاتھ کے ہاتھ ظاہر ہو گئی۔ کوئی پانچ چھ مہینے کے بعد ایک اور شخص آیا اور عرض کیا: میں نے خواب دیکھا ہے کہ میری چارپائی کے نیچے انگارے دھک رہے ہیں۔ فرمایا جا کر چارپائی کے نیچے کھدائی کر، تجھے سونا ملے گا۔ کھودنا جو شروع کیا تو لاکھوں روپے کا سونا نکلا، ایک خزانہ دبا ہوا نکلا۔

لوگوں نے امام ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ حضرت! خواب تو دونوں نے ایک ہی دیکھا ایک کا تو آپ نے گھر گروا دیا اور ایک کو سونا دلوا دیا۔ فرمایا کہ: پہلے نے جو خواب دیکھا وہ گرمی کے زمانے میں دیکھا اور

گرمی میں چارپائی کے نیچے آگ کا ہونا، یہ گویا بنیاد کے منہدم ہونے کی علامت ہے۔ لہٰذا میں نے تعبیر دی کہ تیرا گھر گر پڑے گا۔ اور دوسرے نے یہی خواب سردی کے زمانے میں دیکھا اور سردی میں چارپائی کے نیچے آگ کا ہونا یہ بڑی خوشگوار نعمت ہے، اس سے بڑھ کر نعمت نہیں۔ اور آگ کی رنگت سونے کے مشابہ ہے۔ سو میں نے کہا: چارپائی کے نیچے سے سونا نکلے گا۔ دونوں باتیں پوری ہوئیں۔

پانچ چیزوں کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ...... تو ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ اس درجے کے امام تھے کہ ان کی تعبیر ہاتھ کے ہاتھ پوری ہوتی تھی۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا یہ خواب کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر پوچھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ انگلیاں سامنے کر دیں، ایک شخص سے کہا اور فرمایا: تو اس کی تعبیر ابن سیرین سے پوچھ کے آ! مگر یہ مت کہنا کہ مالک نے یہ خواب دیکھا ہے، یوں کہنا کہ: ایک مسلمان نے یہ خواب دیکھا ہے۔ میرا نام مت بتلانا۔ وہ شخص ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کے پاس گیا اور کہا کہ ایک مسلمان نے یہ خواب دیکھا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار ہے اور وہ یہ عرض کر رہا ہے کہ حضرت! یہ فرما دیجیے میری عمر کتنی باقی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ انگلیاں اٹھا دیں۔ اس کی کیا تعبیر ہے؟

فرمایا: سچ بتلا یہ خواب کس نے دیکھا ہے؟ اس نے کہا: جس نے دیکھا ہے اس نے نام بتلانے کی ممانعت کر دی ہے۔ بس یہ سمجھ لیجیے ایک مسلمان نے دیکھا ہے۔ فرمایا: یہ خواب کوئی بڑا عالم دیکھ سکتا ہے۔ عوام الناس میں سے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ پھر فرمایا: مدینہ میں امام مالک سے بڑا کوئی عالم نہیں، تو امام مالک نے تو یہ خواب نہیں دیکھا؟ اب وہ بے چارہ چپ ہو گیا، اسے ممانعت تھی۔ فرمایا: اچھا جاؤ! پوچھ کے آؤ، نام بتلانے کی اجازت لے کے آؤ۔ اس نے آ کر امام مالک سے عرض کیا: حضرت! وہ تو پہچان گئے کہ آپ ہی نے خواب دیکھا ہے مگر چونکہ اجازت نہیں تھی اس لئے میں نے کوئی حامی نہیں بھری، بس چپ ہو گیا۔ فرمایا: اچھا جاؤ میرا نام بتلا دینا۔ یہ آیا اور آ کر ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ: واقعی امام مالک نے ہی وہ خواب دیکھا تھا اور آپ نے ٹھیک سمجھا تھا۔ فرمایا: امام مالک ہی یہ خواب دیکھ سکتے تھے، دوسرے کسی عالم کی مجال نہیں تھی۔ کہہ دینا: اس کی تعبیر یہ ہے کہ حضور نے جو پانچ انگلیاں اٹھا کے دکھلائیں، اس سے نہ پانچ برس، نہ پانچ گھنٹے، نہ پانچ دن اور نہ پانچ ماہ مراد ہیں، بلکہ اشارہ اس طرف ہے کہ: ﴿خَمْسٌ لَا يَعْلَمُهُنَّ إِلَّا اللهُ﴾ "موت اور زندگی کا علم ان پانچ چیزوں میں سے ہے جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ①: ﴿إِنَّ اللهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ﴾② پانچ چیزیں اللہ نے ارشاد فرمائیں کہ قیامت کا علم اللہ ہی کو ہے کہ کب آئے گی! کس سن میں آئے گی! کسی کو اس کا علم نہیں دیا

---

① الصحيح للبخاري، كتاب الايمان، باب سوال جبريل النبي صلى الله عليه وسلم عن الايمان والاسلام ج: ١ ص: ٨٧ رقم: ٣٨. ② پارہ: ٢١، سورة لقمان، الآية: ٣٤.

گیا۔حتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نہیں دیا گیا۔اور یہ بارش کہاں سے آتی ہے! کیوں آتی ہے! کیا اسباب باطنی بنتے ہیں! کسی کو پتہ نہیں۔ظاہری طور پر ہم آلات سے پتہ چلالیں کہ بادل اٹھے گا، مون سون اٹھے گا لیکن خود مون سون آج کے دن کیوں اٹھے گا! مون سون کو بنانے والی کیا چیز ہے! وہ کیا ہے اور وہ کیوں بناتی ہے۔یہ سب علل اور بنیادی چیزیں اللہ ہی جانتا ہے، اللہ کے سوا کسی کے علم میں نہیں ہے۔ہم ظاہری اسباب کا کچھ پتہ چلا سکتے ہیں مگر باطنی اسباب کا کچھ پتہ نہیں، وہی جانتا ہے۔﴿وَيَعْلَمُ مَافِي الْاَرْحَامِ﴾ ① ماں کے پیٹ میں کیا ہے! لڑکا یا لڑکی! اللہ ہی جانتا ہے۔بعض دفعہ بزرگوں نے بتلا دیا ہے کہ لڑکی ہے یا لڑکا ہے، وہ شخصی طور پر ایک جزوی چیز بتلائی۔کلی طور پر یہ علم کہ لڑکا کیوں بنتا ہے! لڑکی کیوں بنتی ہے! کیا اندرونی اسباب ہیں کہ اس دفعہ لڑکا بن گیا، اُس دفعہ لڑکی بن گئی۔یہ اللہ ہی کے علم میں ہے۔﴿وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا﴾ ② اور کسی نفس کو یہ پتہ نہیں وہ کل کو کیا عمل کرنے والا ہے۔کل جب آئے گی جبھی پتہ چلے گا۔﴿وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ﴾ ③ کسی نفس کو یہ پتہ نہیں کہ کونسی زمین میں اور کب اس کا انتقال ہوگا! تو فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو پانچ انگلیاں دکھائیں، اس کا یہ مطلب ہے کہ کونسی زمین میں آپ کا انتقال ہوگا! یہ ان پانچ چیزوں میں سے ہے جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔

سب سے بڑی نعمت کے حقوق.....تو بات مجھے اس پر یاد آئی تھی کہ چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پورے عالم کے لئے محسن اعظم ہیں اور ساری نعمتیں آپ کے طفیل سے ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کو پہچاننا یہ سب سے بڑی نعمت ہے۔اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق تین ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم محبت کریں، آپ کی عظمت کریں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور متابعت کریں۔تو عظمت کے بارے میں کہہ رہا تھا کہ عظمت حقیقی کرنے والے تو گزر گئے، لیکن ان کو دیکھ کر کچھ بھی کرلیں وہ بھی ہماری سعادت ہے۔چلو جتنی بھی کرسکیں، ورنہ اصل عظمت تو یہ تھی کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے عمر بھر جوتا پہننا چھوڑ دیا، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے گیارہ دن استنجا تک نہیں کیا کہ مدینۃ الرسول میں رہ کر میں گندگی پھیلاؤں۔دوسری چیز محبت ہے کہ اولاد و بنیاد کی محبت اس درجہ کی نہ ہو، یعنی جب اولاد و بنیاد سے مقابلہ پڑے تو ہم اللہ و رسول کی محبت کو ترجیح دیں۔جب کسی حکم شرعی سے اولاد کی محبت سے مقابلہ پڑ جائے تو ہم حکم شرعی کو ترجیح دیں۔مثلاً خدانخواستہ کسی کا بچہ بیمار ہوجائے تو مرد تو نہیں مگر عورتیں ٹونے ٹوٹکے اور شرکیہ رسموں میں مبتلا ہوجاتی ہیں کہ شاید اچھا ہوجائے! جو خلاف شرع ہوتا ہے۔تو محبت کا تقاضا یہ ہے کہ شریعت سے محبت ہونی چاہیے۔بچے سے اتنی محبت نہ ہو کہ ماں باپ شرکیہ امور سرانجام دینے لگیں کہ کسی طرح اس کی جان بچ جائے۔جان بچانے والا اللہ بزرگ و برتر ہے۔جب اس کے قانون

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۳۴۔ ② پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۳۴۔

③ پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۳۴۔

کی پابندی کرو گے لیکن بے اسی کی برکت سے جان بچ جائے۔ بچے کی جان بچانے کے لئے شرکیہ امور انجام دینا، یہ اس کی دلیل ہے کہ خدا کی محبت گویا اتنی نہیں ہے جتنی بچے کی ہے۔ بچے کی محبت سامنے آئی تو خدا کے قانون کو چھوڑ دیا۔ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ بچے کی جان کی شریعت کے مقابلے میں پرواہ نہ کی جائے۔ تو دوسرا حق یہ ہے۔ اور تیسرا حق متابعت ہے۔ جو قانون آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لا کے دیا ہے، اس کی پیروی اور اطاعت کریں۔ جو سنتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، ان کی اتباع کریں۔ ایک ایک سنت کی پیروی میں جو نورانیت اور برکت ہے، ہم اپنی عقل سے ہزار قانون بنالیں، اس میں وہ خیر و برکت نہیں آسکتی، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت کی ادائیگی میں ہوسکتی ہے۔ تو ایک ایک سنت کی پابندی کرنا مثلاً پہننے میں، کھانے میں، پینے میں، چلنے پھرنے میں، اٹھنے بیٹھنے میں...... اس انداز کو اختیار کرنے کی کوشش جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انداز تھا۔ یہ ایک مستقل نعمت اور برکت ہے، اسی کا نام متابعت ہے۔ ایک فرائض میں اتباع ہے جیسے نماز پڑھ لی، وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سنت کے مطابق پڑھیں گے۔ روزہ رکھیں گے، وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے طریقے کے مطابق ہوگا۔ یہ دو فرائض ہیں جو ہمارے ذمے ہیں۔ اصل تو یہ ہے کہ ہم اپنی پوری زندگی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں۔ اسی کے لئے تعلیم حاصل کی جاتی ہے، علم سیکھا جاتا ہے تو قدم بقدم چلنے کی کوشش کریں۔

مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا قدم بقدم سنت پر چلنا...... میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کو بزرگوں میں سے کسی نے خواب میں یوں دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کی خبر ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جارہے ہیں، صحابہ رضی اللہ عنہم کا ہزاروں کا مجمع پیچھے ہے اور بھی ہزاروں لوگ ہیں، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو بھی دیکھا گیا، وہ بھی مجمع کے ساتھ ساتھ ہیں۔ لیکن مجمع تیزی سے جارہا ہے کہ جلدی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کریں اور مولانا آہستہ آہستہ دھیمی چال سوچ سوچ کے قدم رکھ رہے ہیں، جس کی وجہ سے مجمع سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت! لوگ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شوق میں دوڑے جارہے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آگے آگئے ہیں، جلدی پہنچیں اور کسی طرح زیارت نصیب ہو، جاتو آپ بھی رہے ہیں مگر قدم ٹٹول ٹٹول کے۔ فرمایا کہ ہاں میں چاہتا ہوں کہ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم پڑا ہے، میں بھی وہاں قدم بہ قدم، قدم رکھوں، اس کے دیکھنے میں دیر لگتی ہے۔ اس لئے میں آہستہ چل رہا ہوں۔ الحمدللہ میرا ایک قدم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نشان سے الگ نہیں پڑا۔ ٹھیک اسی نشان پہ قدم رکھتا ہوا جارہا ہوں، اگرچہ دیر میں پہنچوں گا۔ گویا وہ ان کی اتباع سنت کی چیز تھی جو خواب میں دکھلائی گئی۔

اللہ پاک ہمیں اتباع سنت نصیب فرمائے...... مسلمان میں یہ جذبہ ہونا چاہئے کہ اپنی زندگی کے ہر لمحہ کو اس انداز میں ڈھالنے کی کوشش کرے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہو بہو نقشہ تم ہم نہیں اتار سکتے، ہماری ایسی قسمت کہاں! مگر

اپنا کام سعی اور جدوجہد کرنا ہے۔ دل میں تڑپ پیدا ہو جائے۔ اگر تڑپ پیدا ہو گئی تو ممکن ہے اللہ پوری پیروی نصیب کر دے، ورنہ جتنی بھی نصیب ہو جائے! اس جذبہ کی وجہ سے ہمیں نجات ہونے کی توقع ہے۔ تو تین حقوق ہیں: ایک عظمت، ایک محبت، ایک متابعت۔ محبت میں فنائیت ہوتی ہے کہ آدمی محبوب میں فنا ہو جائے۔ متابعت میں قدم بہ قدم چلنے کا جذبہ ہوتا ہے۔ کہ ایک ایک چیز میں پیروی نصیب ہو۔ عظمت سے اعتقاد پیدا ہوتا ہے۔ اگر بڑائی دل میں نہ ہو تو عقیدت نہیں ہو سکتی۔ اور عقیدت و اعتقاد نہیں ہوگا تو ایمان نہیں بنے گا۔ اس واسطے ان تینوں حقوق کی ضرورت ہے۔ تو میں نے آیت ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ① پڑھی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے بارے میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں ہم نے آپ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا۔ تو عالموں کا وجود، ان کی نعمتیں اور ان کی ہستی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہی سے ہے۔ جس امت کو ایسی بابرکت ہستی دی گئی ہو، وہ امت کتنی قسمت والی اور بانصیب ہے، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسا نبی عطا کیا گیا۔ تو امت پر نبی کے حقوق کا حق عائد ہوتا ہے۔ تو محبت بھی ہو، عظمت بھی ہو اور متابعت بھی ہو۔ محض محبت ہو کہ آدمی دعویٰ کرے کہ میں عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوں...... مگر اطاعت نہ کرے، وہ محبت ناتمام ہے۔ محبت کی علامت ہی یہ ہے کہ اطاعت کرے، اطاعت دلیل ہے اور محبت دعویٰ ہے۔ جب کہے گا کہ مجھے محبت ہے تو دلیل پوچھیں گے! تو کہے گا کہ: میں پیروی کر رہا ہوں۔ کہا جائے گا کہ: بے شک یہ محبت ہے۔ ایک شخص اپنے باپ سے کہے کہ مجھے آپ سے بڑی محبت ہے۔ باپ کہے: مجھے حقہ پینے کی عادت ہے، ذرا حقہ بھر کے لاؤ۔ تو کہے: صاحب! میں نے تو یہ کہا تھا کہ مجھے محبت ہے، یہ کب کہا تھا کہ میں حقہ بھی بھر کے لاؤں گا، یا پانی بھی پلاؤں گا! باپ کہے گا: تو پھر محبت کیسی! محبت تقاضا کرتی ہے کہ جو میں کہوں وہ کر۔ تو ہم نے دعویٰ کیا کہ ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے۔ محبت کا خاصہ ہے کہ اطاعت ہو۔ اطاعت نہیں ہوگی تو دعویٰ محبت غلط ہوگا۔ اسی کو حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ”من احب سنتی فقد احبنی ومن احبنی کان معی فی الجنۃ“ ② جسے میرے ساتھ محبت ہوگی وہ میری اطاعت بھی کرے گا اور جو اطاعت کرے گا وہ جنت میں بھی میرے ساتھ ہوگا۔ تو اصل بنیاد محبت ہے اور محبت کی علامت اطاعت ہے اور دل میں عظمت ہو۔ تو آیت میں نے پڑھی تھی اس کی روشنی میں یہ چند باتیں مجھے عرض کرنی تھیں تاکہ حقوقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سامنے آجائیں۔ سارا دین اور اسلام اس لئے ہے کہ انسان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق پہچان لے۔ دعا کیجئے! اللہ تعالیٰ ہمیں اطاعت، محبت و عظمت اور عقیدت و اعتقاد کی توفیق عطا فرمائے اور سنت کی پیروی نصیب فرمائے اور ہم کو اپنی مرضیات پر چلائے۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً، اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ،

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۱۰۷۔

② السنن للترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء فی الاخذ بالسنۃ واجتناب البدع ج: ۹ ص: ۲۸۹۔

بیت اللہ الکریم

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ٥ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ.

اوّلِ عالَم ...... بزرگانِ محترم! اس وقت ہم سب خدا مِدین بحمد اللہ اول عالَم میں موجود ہیں۔ جو مرکزِ عالَم بھی ہے، وسطِ عالَم بھی ہے اور اصلِ عالَم بھی ہے۔ میں نے یہ چار الفاظ مکہ مکرمہ کے بارے میں استعمال کئے ہیں۔ اول عالَم، اصلِ عالَم، مرکزِ عالَم اور وسطِ عالَم۔ یعنی سب سے پہلا مقام دنیا میں یہی ہے اور ہم سب کی اصل یہی ہے۔ اور اس عالَم شاہد کے ٹھیکوں بیچ بھی یہی ہے اور مرکزِ عالَم بھی یہی ہے۔ یہ چار چیزیں ہیں۔ اس میں بعض امور تو نصِ قطعی سے ثابت ہیں۔ یعنی قرآن کریم نے خود تصریح فرمائی ہے اور بعض آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہیں۔ یعنی اس بارے میں یا تو حدیث مرفوع ہے ہی نہیں یا ہمارے علم میں نہیں، لیکن آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم بکثرت ملتے ہیں، جن سے یہ چاروں دعوے ثابت ہوتے ہیں۔

قرآنِ حکیم نے تو ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ﴾ ② خدا کا سب سے پہلا گھر جس کو اللہ نے لوگوں کے لئے وضع کیا وہ بکہ میں ہے۔ خواہ بکہ کے معنی (مکمل شہر) مکہ کے ہوں یا بکہ کے معنی خاص اس موضع کے ہوں جس میں بیت اللہ الکریم واقع ہے اور اس کے اردگرد کو مکہ کہتے ہوں۔ یہ اختلاف اقوال ہے۔ مگر بہر حال حاصل یہ نکلا کہ خدا کا سب سے پہلا گھر جو عبادت کے لئے بنایا گیا، وہ مکہ میں ہے، جس کا نام بیت اللہ الکریم ہے۔ یعنی قدرت نے جب ارادہ کیا کہ اس عالَم کو پیدا کیا جائے اور بنایا جائے تو اس میں سب سے پہلی وضع بیت اللہ کی واقع ہوئی، جیسا کہ آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی واضح ہوتا ہے کہ اس پورے عالَم میں

① پارہ: ۴ سورۃ اٰل عمران، الآیۃ: ۹۶-۹۷۔ ② پارہ: ۴ سورۃ اٰل عمران، الآیۃ: ۹۶۔

پانی ہی پانی تھا۔ یعنی عناصر اربعہ میں سے سب سے پہلے اللہ نے پانی کو پیدا فرمایا۔ جب حق تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ اس پانی سے دوسرے عنصر تیار کئے جائیں اور دوسری کائنات بنائی جائے تو اس پانی میں ایک وضع واقع ہوئی۔ پانی میں اتنی جگہ جہاں بیت اللہ واقع ہے، کا کچھ حصہ ابھرا ہوا تھا، جیسے پہاڑی کا ایک چھوٹا سا مقام ہوتا ہے ، وہ بھر گیا۔ وہ بیت اللہ تھا۔ اس کے بعد کچھ گہرائی واقع ہوئی۔ اس کے بعد پانی نے ٹکرانا شروع کیا تو پانی ......اور بالخصوص سمندر کا پانی جب ٹکراتا ہے تو اس میں غلظت اور گاڑھا پن پیدا ہوتا ہے جیسا کہ اب بھی آپ دیکھتے ہیں کہ سمندر کے کناروں پر جب پانی ٹکریں کھاتا ہے تو جھاگ پیدا ہوتی ہے، وہ سمندری جھاگ مثل پتھر کے ہو جاتی ہے۔ اسی طرح پانی نے ٹکرانا شروع کیا اور ٹکریں کھا کر اس میں غلظت اور گاڑھا پن پیدا ہوا۔ گاڑھے پن نے سختی اختیار کی اور ایک اینٹ کے برابر جگہ میں سختی پیدا ہو گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اول زمین ایک اینٹ کے برابر بنی۔ تو زمین کی اصل یہی بیت اللہ ہے، اس کے بعد میں حق تعالیٰ نے اس کو بڑھایا اور پھیلانا شروع کیا۔ وہ پھیلتے پھیلتے زمین بنتی گئی اور اس حد پر آ کر رک گئی، جس حد تک آج زمین ہے۔ کتنے دنوں میں؟ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، قرآن کریم میں بعض جگہ تصریحات بھی ہیں۔ لیکن اس وقت مدت سے بحث نہیں کہ کتنی مدت تک زمین پھیلی، بہر حال زمین پھیلی۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ بیت اللہ ساری زمین کی اصل ہے۔ یہیں سے ایک اینٹ کے برابر زمین پیدا ہوئی، وہیں سے پھیلی اور پھیلتے پھیلتے اس حد پر آ کر رک گئی، جس کو آج ہم زمین کہتے ہیں۔

ہم سب کی اصل بیت اللہ ہے...... گویا زمین کا اول حصہ وہ ہے جو بیت اللہ ہے۔ یہیں سے زمین شروع ہوئی، اور آپ سب جانتے ہیں کہ ہم سب زمینی مخلوق ہیں، ہمیں اللہ نے اس مٹی سے پیدا کیا، جیسا کہ حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا: "کُلُّکُمْ بَنُوْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ خلق مِنْ تُرَابٍ" ① تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو اور آدم کو اللہ نے مٹی سے پیدا کیا۔ آدم کی اصل بھی مٹی ہے، ہم سب کی اصل بھی مٹی ہے۔ اسی لئے انسان کو مشت خاک اور مشتِ غبار کہا جاتا ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے ناں کہ:

قدرت خدا کی دیکھیں تو انسان کو دیکھئے! کیا کیا تکلفات ہیں مشتِ غبار میں

ایک مٹھی بھر مٹی ہے اور کیا کیا تکلفات دکھائے، کتنا دنیا کو سجایا اور کہاں تک پہنچایا۔ تو حق تعالیٰ شانہ نے ہم سب کو مٹی سے بنایا اور مٹی کی اصل بیت اللہ ہے۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ ہم سب کی اصل بیت اللہ ہے۔ ایک عام اصول ہے: "کُلُّ شَیْءٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِہٖ" ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ اگر شاخیں ہیں تو وہ جڑ کی طرف رجوع کریں گی، پانی ہے تو وہ اپنے مرکز کی طرف رجوع کرے گا، زمین ہے تو وہ مرکزِ ثقل کی طرف رجوع کرے گی، ہر چیز اپنے مرکز کی طرف فطرتاً دوڑتی ہے، اسے کہنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اگر بیٹے کو باپ کی طرف کشش ہے تو آپ بیٹوں کو تلقین نہیں کرتے کہ بھئی! باپ کی طرف رجوع کرو۔ کہیں نہ کہیں وہ تو رجوع

① شعب الایمان للامام البیھقی، ج: ۱، ص: ۲۳، حدیث حسن ہے۔ دیکھئے: غایۃ المرام ج: ۱ ص: ۱۸۹ رقم: ۳۰۹۔

ہوگا، اس لئے خلقتاً وطبعاً تمام انسانوں کی بیت اللہ کی طرف رجوع ہے۔

لوگ بیت اللہ کی طرف کیوں کھنچتے ہیں..... بعض کے علم میں ہے کہ یہ ہماری اصل ہے اور بعض کے علم میں نہیں ہے، علم میں آجائے تو پھر ان میں کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے مثلاً کسی شخص کے اولاد ہوئی، بچہ پیدا ہوتے ہی باپ چھوڑ کر کہیں چلا گیا، بچہ جوان ہوا، بڑی عمر کا ہوا۔ اب اگر باپ کہیں سامنے آئے گا تو طبعی کشش تو ہوگی مگر یہ نہیں جانے گا کہ یہ باپ ہے، جب تک کہ پہچانوایا نہ جائے۔ بیٹا جب پہچان جائے گا کہ یہی ہے وہ باپ، جس کی طرف طبعی کشش ہے تو طبعی چھوڑ کر وہ کشش عقلی بھی بن جائے گی، قدرتاً آدمی متوجہ ہوگا۔ تو فطرتاً ہر انسان جانتا ہے کہ یہ میری اصل ہے، اس کی طرف کشش ہے۔ انبیاء علیہم السلام نے آکر تعارف کرادیا کہ جس اصل کی طرف انسانوں کی کشش ہے وہ یہی اصل ہے، مگر علم میں نہیں، کشش موجود ہے اور وہ تشخص کے ساتھ موجود ہے۔ جن کے علم میں آ گیا، وہ ایمان لے آئے۔ انہیں کشش بھی ہے اور تشخص یعنی معرفت اور پہچان بھی ہے۔ غرض انسان کا بیت اللہ کی طرف خلقتاً رجوع ہے۔

چونکہ طبعی کشش تھی، حق تعالیٰ نے عقلی کشش بھی پیدا فرمادی کہ عبادت میں بھی اسی کو مرکز سمجھو۔ اگر عبادت کا مرکز کوئی ایسا ہوتا کہ طبعاً اس کی طرف رجوع نہ ہوتا تو لوگ زبردستی رجوع کرتے، کیونکہ فطری کشش نہ ہوتی مگر حق تعالیٰ نے اسی چیز کو مرکزِ عبادت بنایا جس کی طرف کشش بھی تھی۔ وہ طبعی کشش انسانوں کو اس کی طرف کھینچ کر لاتی ہے۔ اب یہ لاکھوں انسان اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے لے کر اربوں کھربوں انسان جو ﴿مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ﴾ ① ہر گھاٹی سے نکل نکل کر آرہے ہیں۔ سفر کی سختیاں اٹھاتے ہیں، محنتیں اٹھاتے ہیں، خلافِ طبع باتیں برداشت کرتے ہیں مگر پھر بھی آتے ہیں۔ تو کوئی تو کشش ہے، وہ فطری کشش بھی ہے، شرعی کشش بھی ہے اور عقلی کشش بھی ہے۔ کئی کششیں جمع ہو گئیں۔ فطری تو یوں ہے کہ وہ ہماری اصل ہے اور عقلی یوں ہے کہ اصل کی طرف رجوع ہوتا ہی ہے، معقول بات ہے۔ اور شرعی یوں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعارف کرادیا کہ یہی ہے وہ بیت اللہ جو تمہاری اصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نبی ایسے نہیں گزرے، جنھوں نے آکر بیت اللہ کا طواف نہ کیا ہو۔ اور جب انبیاء علیہم السلام نے طواف کیا تو یقیناً ان کی اقوام کے دلوں میں بھی یہ چیز ہوگی کہ یہ ہماری اصل ہے۔ یہ اصل صرف آپ ہی کی نہیں جو مسلمان کہلاتے ہیں بلکہ آدم علیہ السلام کی ساری اولاد کی اصل ہے۔

بیت اللہ کی حدود..... حضرت آدم علیہ السلام نے اس کی تعمیر کی ہے، ملائکہ علیہم السلام نے اس کی بنیادیں بھری ہیں اور بنیادیں بھی دس بیس، سو پچاس گز نہیں بلکہ حدیث میں ہے کہ تحت الثریٰ تک بیت اللہ کی بنیادیں بھری گئی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیت اللہ فقط اس حصہ میں نہیں ہے جو چار دیواری آپ کے سامنے ہے بلکہ تحت

---

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۲۷۔

الثریٰ تک جتنا حصہ چلا گیا وہ سب بیت اللہ ہے۔ اس طرح سے اوپر کی طرف جائیے تو عرش تک سب بیت اللہ ہی ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ہر آسمان میں ایک قبلہ ہے، وہ قبلہ ٹھیک اسی سیدھ میں ہے جہاں یہ بیت اللہ ہے اور ساتویں آسمان پر بیت المعمور ہے، وہ ساتویں آسمان کا قبلہ ہے۔ تو ہر آسمان میں قبلہ ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے ایک تار میں لٹو باندھ دیئے جائیں اور تھوڑے تھوڑے فاصلے سے پرو دیئے جائیں تو ہر لٹو دوسرے لٹو کا محاذی ہوگا۔ گویا بالکل سیدھ میں بیت اللہ ہے۔ جیسے حدیث میں ہے کہ اگر بیت المعمور سے کوئی پتھر گرایا جائے تو وہ سیدھا بیت اللہ کی چھت پر آ کر گرے گا۔ تو بیت اللہ فقط اس چار دیواری کا نام نہیں ہے جو کعبہ شریفہ کی شکل میں موجود ہے، وہ ایک علامتی نشان ہے..... ورنہ بیت اللہ عرش سے لے کر تحت الثریٰ تک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر آپ آسمانوں پر پہنچ جائیں اور بیت اللہ کی طرف نماز پڑھیں تو آپ کو الٹا نہیں لٹکنا پڑے گا کہ بیت اللہ تو نیچے ہے، اسی طرح نماز پڑھیں گے جیسے زمین پر پڑھتے ہیں۔ اس لئے کہ وہاں بھی بیت اللہ سامنے ہے اور اگر آپ کشتیوں کے ذریعے سے زمین کی بڑی تہ میں پہنچ جائیں تو وہاں آپ کو الٹ کے سجدہ نہیں کرنا پڑے گا کہ بیت اللہ تو اوپر ہے۔ آپ اسی طرح سجدہ کریں گے جیسے زمین پر۔ تو بیت اللہ نیچے سے لے کر اوپر تک ایک کیل کی مانند ہے۔ ایک نورانی لاٹ ہے جس کے اردگرد..... یہ سارے جہان چکی کے پاٹ کی طرح سے چکر کھا رہے ہیں، یہ بیچ میں ایک مرکز ہے۔

بیت اللہ مثل اللہ کا عکس..... حق تعالیٰ نے اس کو مرکز بنا کر بغور دیکھا تا کہ اس کو وجود دیا جاسکے اور مرکز سے جو چیز چلتی ہے وہ چہار طرف برابر چلتی ہے۔ اگر آپ پانی کے بیچ میں ڈھیلا ماریں تو دائرے بنتے بنتے کنارے تک پہنچیں گے مگر مرکز سب کا ایک ہی رہے گا اور برابر دائرے بنتے چلے جائیں گے۔ تو مرکز میں جو حرکت ہوتی ہے وہ پورے محیط میں ہوتی ہے۔ وجود کو جب حرکت دی گئی کہ زمین کو پیدا کیا جائے تو اسی مرکز کو قدرت حق نے تاکا اور وجودی تجلی یہیں نازل ہوئی۔ اس لئے بیت اللہ محض کوئی کوٹھا نہیں ہے، کوئی عمارت نہیں ہے بلکہ وہ تجلی گاہ ربانی ہے۔ اس میں حق تعالیٰ کی وہ تجلی جو اقرب الی الذات ہے وہ موجود ہے۔ اسی تجلی کو ہم سجدہ کرتے ہیں۔ اس تجلی کو سجدہ کرنا عین ذات کو سجدہ کرنا ہے۔ تجلی کے معنی فی الحقیقت عکس کے ہیں تو بیت اللہ آئینۂ جمال خداوندی ہے، جس میں حق تعالیٰ نے اپنا عکس ڈالا ہے اور عکس اور اصل میں عینیت ہوتی ہے۔ جو حرکت ذات کرتی ہے وہ عکس کرتا ہے سایہ بھی کرتا ہے، اگر ذات ہنس رہی ہے تو سایہ بھی ہنسے گا، اگر ذات چل رہی ہے تو وہ بھی چلے گا۔ البتہ شدت اور ضعف کا فرق ہوتا ہے۔ ورنہ حرکت اور سکون وہ بھی وہی کرتا ہے جو اصل ذات کرتی ہے۔ تو وہ تجلی ربانی بیت اللہ میں اتری ہوئی ہے جسے ہم سجدہ کرتے ہیں۔ اسے سجدہ .....عین ذات کو سجدہ کرنا ہے۔ اس لئے کہ عین ذات اتنی لطافت میں ہے کہ کوئی سیدھ اور محاذات بن نہیں سکتی۔ اگر محض ذات کو سجدہ کرایا جاتا تو تصور محض ہوتا، ظاہر میں اصلیت کچھ نہ ہوتی۔

لیکن ذات کا عکس جب اتار دیا گیا تو عکس کا قاعدہ ہے کہ بڑی سے بڑی چیز کا عکس بھی چھوٹی سے چھوٹی چیز

میں آ جاتا ہے۔ آفتاب کو اپنے آئینے میں دیکھتے ہیں تو آئینہ زمین کا ایک حصہ ہے، اس حصہ کو سورج (جیسے کرہ) کے سامنے کوئی حیثیت نہیں لیکن پورا آفتاب مع اپنی شکل وصورت کے اس میں موجود ہو جاتا ہے اور پھر جو کام اصل آفتاب کرتا ہے، وہی آئینہ کا آفتاب بھی کرتا ہے، آپ آئینے کو دوسرے آئینہ کے سامنے کریں اس میں بھی عکس پہنچ جائے گا، تیسرے کے مقابل رکھیں اس میں بھی عکس پہنچ جائے گا۔ آفتاب کی روشنی پہنچتی رہے گی..... چاہے آپ اندھیرے کوٹھے میں روشنی پہنچا دیں۔ اسی طرح آفتاب کا کام حرارت پہنچانا ہے، آئینوں کے ذریعے سے بھی وہی حرارت پہنچتی ہے، بس شدت اور ضعف کا فرق ہوتا ہے۔ تو جو کام آفتاب کا ہے وہی اس کا عکس بھی کرتا ہے۔

اس لئے عکس کو دیکھ کر کہا کرتے ہیں کہ ہم نے آفتاب کو دیکھا۔ آفتاب کی ذات کو نگاہ باندھ کر کوئی نہیں دیکھ سکتا ورنہ تو نگاہیں کھو دینی پڑیں گی۔ آئینے میں جب آفتاب کا عکس آتا ہے تو دیکھ بھی سکتے ہیں، اس کی ہر جانب اور سمت کو آپ دیکھ سکتے ہیں، معائنہ کر سکتے ہیں۔ تو عکس میں اور ذات میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ عین ذات کو سجدہ کرنا یہ ناممکن تھا، اس لئے کہ وہ غایت نظافت میں اور غیب در غیب میں ہے کہ اس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔

اس لئے حق تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحم کھایا کہ اپنا عکس، آئینۂ بیت اللہ میں اتار دیا تاکہ ایک حد تک محدود ہو جائے اور بندوں کی نگاہ اس حد تک جا سکے اور اس کی طرف جھک سکیں، ورنہ جھکنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ یہ حق تعالیٰ کا فضل اور عنایت ہے کہ ذات اور تجلی کی نسبت سے اپنی وہ تجلی جو اقرب الی الذات تھی اتار کر بندوں کو سجدہ کا موقع دیا۔ ورنہ کہاں ذاتِ باری تعالیٰ اور کہاں یہ بندے، وہ نورِ مطلق اور ہم ظلمتِ محض! بیچ میں ایک چیز تجلی کی اتار دی تاکہ سجدہ بھی کر سکیں، طواف بھی کر سکیں، عبادت بھی کر سکیں۔ اور اس کی عبادت کو ذات کی عبادت قرار دیا۔

مادیت، روحانیت اور نورانیت سب کی اصل بیت اللہ ہے ..... بیت اللہ فی الحقیقت ہماری مادی اصل بھی ہے، روحانی اصل بھی ہے۔ مادی اصل تو یوں ہے کہ زمین اسی سے بنی اور ہم سب زمینی مخلوق ہیں تو وہ ہماری مادی اصل ہوئی۔ اور روحانی اصل یوں ہے کہ جب عبادت کریں گے تو انوارِ ربانی اسی کے ذریعے ہمارے قلب میں آئیں گے، تو روحانی اصل بھی ہوئی۔ اور جب یہ بیت اللہ تحت الثریٰ تک ہے اور اوپر عرش تک ہے تو میں کہتا ہوں کہ جہاں جہاں بیت اللہ ہے، اس کے اردگرد جو جو مخلوق ہے..... اس سب کی اصل یہی بیت اللہ ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ہر وطن کے مناسب اس کی صورت بن جاتی ہے، زمین میں بیت اللہ ہے تو اس کی صورت اینٹ پتھر کی ہے، آگے آسمانوں میں جائے گا لطافت بڑھتی جائے گی، نورانیت بڑھتی جائے گی، عرش کے قریب پہنچ جائے گا تو نورانیت محض رہ جائے گی۔ اس لئے کہ وہاں نوری مخلوق پیدا ہوئی، یہاں کثیف اور خاکی مخلوق پیدا ہوئی، مگر ہے سب کی اصل بیت اللہ۔ اس لئے سب کا رجوع اس کی طرف ہے، ملائکہ علیہم السلام بھی اس کا طواف کرتے ہیں، انسان بھی طواف کرتے ہیں، حتیٰ کہ بعض جانور بھی اس کا طواف کرتے ہیں۔ اس لئے کہ سب پہچانتے ہیں کہ یہ ہماری اصل ہے۔

تو میں نے ایک تو عرض کیا تھا کہ وہ اول عالم ہے۔ تو واقعی وہ اول عالم ہے: ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ﴾ ① سب سے پہلے قدرت نے اسی کو بغور دیکھا اور حدیث میں فرمایا گیا ہے: جب زمین پھیلنی شروع ہوئی تو سب سے پہلے وہ پہاڑیاں پیدا ہوئیں جو مکہ کے اردگرد ہیں، پھیلتے پھیلتے اور پہاڑیاں بن گئیں۔ ظاہر بات ہے کہ جب چاروں طرف زمین پھیلنا شروع ہوئی تو جس جس چیز میں جو جو خصوصیت تھی وہ چمک اٹھی۔ تو مدینہ منورہ بھی تو اسی میں آتا ہے، وہ بھی اوّلِ عالم ہے اپنے ماسوا کے لحاظ سے، اس لئے کہ مدینہ کے دائرہ کے باہر جو ہے، اس سے مدینہ مقدم ہے اور وہ مدینہ سے مؤخر ہے۔ تقدیم وتاخیر ہوتی چلی جائے گی۔ تو اصل جا کے سب کی بیت اللہ نکلتی ہے، اس لئے میں نے کہا وہ اول عالم بھی ہے، اصل عالم بھی ہے اور وسط عالم بھی ہے۔

بیت اللہ کے وسطِ عالم ہونے کی حکمت...... معلوم ہوتا ہے کہ بیت اللہ کوئی مرکزی جگہ ہے۔ جس میں قدرت نے تجلی ڈالی تاکہ چہار طرف انوار و برکات برابر پھیلیں۔ اسی واسطے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے: "يَا أَهْلَ مَكَّةَ أَنْتُمْ فِي وَسَطٍ مِنَ الْأَرْضِ." "اے اہل مکہ! تم زمین کے بیچوں بیچ واقع ہوئے ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیت اللہ وسطِ عالم بھی ہے۔ اور مرکز ہوتا بھی وسط میں ہی ہے۔ دائرہ جبھی بنے گا جب بیچ میں مرکز ہو۔ پرکار کی ایک ٹانگ کو آپ مرکز پر رکھیں گے اور ایک ٹانگ گھمائیں گے، تبھی تو دائرہ بنے گا۔ اگر مرکز سے ٹانگ ہٹ جائے دائرہ بن نہیں سکتا۔ تو معلوم ہوا کہ اول بھی ہے، اصل بھی ہے، مرکز بھی ہے اور وسط و درمیان بھی ہے۔

بظاہر یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت مکہ میں فرمائی۔ اور اللہ کی طرف سے اسلام اور جامع دین کی گویا پہلی دعوت مکہ سے چلی تاکہ مرکز سے دعوت چلے اور یکسانی کے ساتھ تمام عالم میں اس کی آواز پھیل سکے۔ اگر مثلاً بیت اللہ کو روس میں اور کاکیشیا کے پہاڑوں پر بنادیتے تو ساری دنیا کو مصیبت اٹھا کے وہاں جانا پڑتا اور اگر کہیں مغرب میں امریکہ کی طرف بنادیتے تو روس سے جو لوگ چلتے وہ لاکھوں مصیبتیں اٹھا کے پہنچتے، بہت سے پہنچ نہ سکتے۔ اللہ نے اسے بیچ میں رکھ دیا تاکہ نرم اور گرم ہر ملک کا ہر انسان وہاں پہنچ سکے۔ مشقت سب پہ برابر پڑے اور اپنے مرکز کو پہنچ جائیں۔ جیسا کہ وسط ہونے کی وجہ سے آسانی ہے۔ اسی طرح مرکز سے جو چیز چلے گی اسے پھیلنے میں بھی آسانی ہوگی۔ حق تعالیٰ نے دعوت الی اللہ اور جامع دین کا کارخانہ مکہ سے شروع کیا اور اسلام کی پہلی دعوت مکہ سے شروع ہوئی۔

مرکزیت کی منتقلی...... وہیں سے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت دی، اس کے بعد مدینہ مرکز بنا۔ یہ حق تعالیٰ کی مشیت اور شان ہے کہ اس نے کمالات کی ظاہر ہوں یا باطن کسی کے ساتھ تخصیص نہیں رکھی۔ مثلاً یہ کہ علم ہوگا تو فلاں ہی خاندان میں ہوگا اور کسی میں نہیں ہوگا، روحانیت ہوگی تو فلاں ہی خاندان والے اس کے وارث ہوں گے، دوسرے محروم رہیں گے، علم ہوگا تو فلاں ہی خطے میں ہوگا۔ بلکہ بنی آدم کے ہر طبقہ کو علم اور روحانیت سے

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۹۶.

نوازا اور تمام زمین کے خطوں کو اس میں سے حصہ دیا۔ تو اول مرکز مکہ بنا، اس کے بعد وہ مرکزیت مدینہ کی طرف منتقل ہوئی۔ خلفائے راشدین کی حکومت وہیں قائم ہوئی۔ اور علم کے دریا اور نہریں وہاں سے جاری ہوئیں۔ اس کے بعد مرکزیت عراق کی طرف منتقل ہوئی، بغداد دارالخلافہ بن گیا، تو وہاں ہزاروں لاکھوں علماء تیار ہوئے۔ اس کے بعد خراسان کی طرف مرکزیت منتقل ہوئی تو خراسان اور ماوراء النہر سے بڑے بڑے اجلہ علماء اور فضلاء تیار ہوئے۔ کبھی اسپین کی طرف علم منتقل ہو گیا، بڑے اکابر علماء اسپین میں پیدا ہوئے۔ کبھی فلسطین مرکز بنا۔

تو مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے کسی ایک خطۂ زمین کو خاص نہیں کیا کہ اسی میں اس کی برکت آ گئی۔ وہ مبداء فیاض ہے، اس کے لئے سب برابر ہیں۔ حکمت کا تقاضہ یہ ہے کہ کبھی یہاں، کبھی وہاں، کبھی وہاں۔ اسی طرح سے خاندان بدلتے رہتے ہیں۔ کتنے عرصے بنی اسرائیل میں نبوت رہی، جب انہوں نے ناشکری و ناقدری کی تو اس خاندان بنی اسرائیل کو محروم کر کے بنی اسماعیل میں نبوت آ گئی اور ایک ہی نبوت ایسی آئی کہ ساری نبوتوں سے فائق تر ہو گئی، خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پیدا فرمائے گئے اور بنی اسماعیل کو نوازا گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے برکات وکمالات بھی کسی ایک خاندان کے ساتھ خاص نہیں ہیں، صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفۂ اول ہیں، تو صدیقیت کے ساتھ خلافت آئی، پھر فاروقیت کے ساتھ آئی، عثمانیت کے ساتھ آئی اور پھر علویت کے ساتھ آئی۔ ہر خاندان کو حصہ ملتا رہا۔ اور ہر خطۂ زمین مستفیض ہوتا رہا۔ کبھی مکہ مرکز ہے، کبھی مدینہ مرکز ہے، کبھی خراساں مرکز ہے، کبھی اسپین ہے، کبھی ماوراءالنہر مرکز ہے، اور کبھی ہندوستان مرکز ہے کہ مرکزیت منتقل ہوئی تو دہلی پہنچ گئی۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، انہوں نے علم حدیث پھیلایا۔ پھر وہ دہلی سے ضلع سہارن پور کی طرف منتقل ہو گئی، بڑے بڑے اجلہ علماء اس میں پیدا ہوئے۔ تو مرکزیت کسی ایک خطے کے ساتھ خاص نہیں۔ مگر مرکز سب کا بہرحال ایک ہی رہے گا، مرکزیت حقیقی وہ صرف بیت اللہ کو حاصل ہے۔ وہیں سے علم اور کمالات کے چشمے پھوٹ رہے ہیں۔

برکت و ہدایت کا گھر...... اس لئے فرمایا کہ: ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ① تو یہ گھر برکت والا بھی ہے اور ہدایت والا بھی ہے۔ برکت کا لفظ عام طور سے مادیات میں استعمال ہوتا ہے، چاہے روحانیت میں بھی استعمال کریں، مگر عام استعمال مادیت میں ہے۔ جیسے مثلاً بھائی! کھانے میں برکت ہو گئی، فلاں کی عمر میں برکت ہو گئی، فلاں کے کاموں میں برکت ہو گئی۔ تو برکت کا لفظ مادیات میں استعمال ہوتا ہے اور ہدایت کا لفظ معنویات میں استعمال ہوتا ہے۔ علم ہے، معرفت ہے اور کمالات معنویہ ہیں۔ حاصل یہ نکلا کہ برکت کا گھر بھی ہے اور ہدایت کا گھر بھی ہے۔ یعنی مادی برکتیں بھی اس میں موجود ہیں، روحانی برکتیں بھی اس میں موجود ہیں۔

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۹۶۔

آیات بینات...... ﴿فِيهِ آيٰتٌ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ إِبْرٰهِيمَ﴾ ① آج یہاں لاکھوں انسان آئے ہوئے ہیں تو یہ کھلی کھلی نشانیاں ہیں کہ لاکھوں کو روٹی بھی مل رہی ہے، پھل بھی مل رہے ہیں۔اس وادی غیر ذی زرع میں...... جہاں نہ سبزہ، نہ پانی، نہ نہریں، نہ باغات، لیکن ہر تازہ پھل میسر۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے کہ: ﴿وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ ② اے اللہ! اس گھر والوں کو رزق دے۔اور رزق بھی کیا! فروٹ جو اعلیٰ ترین رزق ہے، یعنی تازہ پھل۔اگر کہیں ملک شام میں دعا مانگتے تو اسباب طبعیہ کے مطابق دعا قبول ہوتی کہ وہاں پر تو پیدا ہوتے ہیں۔یہاں دعا مانگی، جہاں نہ سبزہ نہ پانی! لیکن دنیا بھر کے تازہ پھل موجود اور ہر ملک کے موجود، اور ہر شخص ان سے مستفید۔دس بیس ہزار کا مجمع ہو، گرانی الگ ہو جاتی ہے، جھگڑے اور نزاعات الگ ہوتے ہیں، ﴿فِيهِ آيٰتٌ بَيِّنٰتٌ﴾ ③ کھلی کھلی نشانیاں ہیں، رزق بھی مل رہا ہے، جھگڑے بھی نہیں ہوتے۔اور لاکھوں آدمی جمع ہیں۔عرفات میں تو ایک جگہ جمع ہوتے ہیں، جو چودہ پندرہ لاکھ آدمی ہوتے ہیں (اور یہ تعداد روز افزوں بھی ہے)۔لیکن سانس کی آواز نہیں ہوتی، ہر شخص اپنے کام میں لگا ہوا ہے، ہر شخص اپنے مرکز کی طرف متوجہ ہے۔کوئی آواز ہو، کوئی گفتگو ہو، کوئی جھگڑا ہو...... بالکل بھی نہیں۔ایک ایسا سکونِ محض ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں کی مسجدوں میں بھی دیکھنے میں نہیں آتا جتنا میدان عرفات کے لاکھوں آدمیوں میں سکون ہوتا ہے۔تو کیا یہ آیات بینات میں شامل نہیں ہے۔

قالبی امن کے ساتھ قلبی امن بھی...... انسان میں دو ہی قوتیں ہیں، جن سے ساری مصیبتیں پھیلتی ہیں، ایک قوتِ شہوانی اور دوسری قوتِ غضبی۔ایک سے فواحش ومنکرات پھیلتے ہیں اور دوسری سے مار دھاڑ، جھگڑے اور فتنے پھیلتے ہیں۔لیکن میں کہتا ہوں کہ مطاف کے اندر عورت مرد مخلوط ہو کر طواف کرتے ہیں، کندھے سے کندھا لگ رہا ہے، صرف یہی نہیں کہ مرد کو ادھر توجہ نہیں بلکہ بعض اوقات کراہت پیدا ہوتی ہے کہ عورت کیوں سامنے آ گئی۔تو میں کہتا ہوں کہ ایک (باطل) جذبے کو سرد کر دینا، کیا یہ آیات بینات میں داخل نہیں ہے! یہ اللہ کی کھلی نشانی ہے ورنہ مرد کو عورت کی طرف طبعی کشش ہوتی ہے، لیکن سینکڑوں عورتیں موجود، کندھے سے کندھا، کمر سے کمر لگتی ہے۔نہ صرف یہ کہ رغبت نہیں بلکہ بعض اوقات کراہت بھی ہوتی ہے کہ یہ کہاں بیچ میں آ گئی! اور ہماری طاعت وعبادت کے درمیان خلل انداز ہو گئی۔تو دلوں کا بدل ڈالنا بلاشبہ آیات بینات میں داخل ہے۔

یہی قوت غضبی کا حال ہے، ورنہ اتنے جھگڑے جھیلے ہوتے کہ حکومت کو فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا، جگہ جگہ لڑائیاں ہوتیں، لیکن کہیں لڑائی نہیں، حتیٰ کہ کندھے سے کندھا ٹکراتا ہے، خلاف طبع امور پیش آ رہے ہیں۔اور

---

① پارہ:۴، سورة آل عمران، الآية:۹۷۔

② پارہ:۱، سورة البقرة، الآية:۱۲۶۔

③ پارہ:۴، سورة آل عمران، الآية:۹۷۔

لاکھوں آدمیوں میں مُتَفَقِّه فِى الدِّين علماء تو نام کو ہیں زیادہ تو جہلاء ہیں، لیکن جھگڑے کا نشان نہیں۔ اور یوں بھی اتفاق سے ہو جائے تو بندہ بشر ہے، انسان ہے! کہیں ہو جائے، لیکن جتنا خبط ہونا چاہئے تھا، قطعاً اس کا نشان نہیں۔ تو قوتِ غضبی بھی ساکن ہے اور قوتِ شہوانی بھی ساکن ہے۔ کیا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ باطنی طور پر بھی امن کا گھر ہے۔ تو اندر بھی امن ہے، باہر بھی امن ہے اور قلوب کے اندر بھی امن ہے۔ نفسی اور نفسانی قوتوں کو وہاں اتنا پامال کر دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے کام میں نہیں لگتیں۔ خدا کی ذات بابرکات کی اطاعت وعبادت اور روحانیت کی طرف متوجہ کر دیا جاتا ہے۔ تو ﴿فِيهِ ءَايَٰتٌۢ بَيِّنَٰتٌ﴾ ① میں رزق کا ملنا، جھگڑوں کا نہ ہونا بھی داخل ہے، شہوانی امور کا مٹنا اور نہ ہونا، یہ بھی داخل ہے۔ خالص قلبی اور قالبی امن ہے، باطنی بھی اور ظاہری بھی ہے۔ ﴿وَمَن دَخَلَهُۥ كَانَ ءَامِنًا﴾ ② جو اس میں داخل ہو گیا وہ امن میں آ گیا۔ تو امن فقط اسی کو نہیں کہتے کہ جان بچ جائے، امن اسے بھی کہتے ہیں کہ آدمی نفس سے بچ جائے، شیطان کے رخنوں سے بچ جائے، نفس وشیطان کی مکاریوں سے بچ جائے۔ اور یہاں سبھی چیزوں سے بچاؤ ہو رہا ہے تو "آیات بیّنات" ظاہر میں بھی نمایاں، باطن میں بھی نمایاں۔ تو مکہ مکرمہ اور بیت اللہ اول عالم بھی ہے، مرکز عالم بھی ہے، وسط عالم بھی ہے اور ہم سب کی اصل بھی ہے۔

وسطِ عالم میں ولادتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکمت..... اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں پیدا فرمایا گیا، کہ یہ دین عالمی ہے مقامی نہیں ہے کہ کسی ایک خطہ اور قوم کے لئے ہو، وہ پوری دنیا کے لئے ہے۔ تو پھر ایسی جگہ سے آواز اٹھائی جائے کہ چاروں طرف اس کی آواز برابری کے ساتھ پھیلے، وہ مکہ ہی ہو سکتا تھا۔ اس لئے ولادت باسعادت مکہ میں ہوئی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعوت الی اللہ شروع کی وہ مکہ سے شروع کی، ہر طرف اس کی آواز پھیلی۔ اگر کسی ایک جانب ہوتے تو وہاں دین کا غلبہ ہوتا اور دوسری طرف اندھیرا ہوتا۔ لیکن جتنا بھی دین پھیلا ہے بہر حال چہار طرف پھیلا ہے۔ کوئی ملک خالی نہیں جس میں اللہ کے نام لیوا موجود نہ ہوں۔

پھر اس کو وعدہ دیا گیا کہ ایک وقت آ رہا ہے کہ پورے عالم میں یہی ایک دین ہو جائے گا۔ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لَا يَبْقَى عَلَى ظَهْرِ الْأَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ إِلَّا أَدْخَلَهُ اللهُ كَلِمَةَ الْإِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِيزٍ وَبِذُلِّ ذَلِيلٍ ③ روئے زمین پر کوئی کچا پکا گھر، نہ کوئی اینٹ پتھر کا گھر اور نہ کوئی کپڑے اور چمڑے کا خیمہ باقی نہیں رہے گا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو جائے گا، رغبت سے مانے یا مجبور ہو کر مانے۔ جبر کے معنی یہ نہیں کہ مسلمان گلے پر تلوار رکھیں گے کہ کلمہ قبول کرو، اس کی تو ممانعت ہے: ﴿لَآ إِكْرَاهَ فِى ٱلدِّينِ﴾ ④ دین میں کوئی اکراہ (جبر) نہیں۔ ﴿أَفَأَنتَ تُكْرِهُ ٱلنَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا۟ مُؤْمِنِينَ﴾ ⑤ اے پیغمبر! کیا آپ لوگوں کو مجبور کریں گے کہ وہ دین قبول کریں! تو دین جبری چیز نہیں۔ اس لئے اسلام میں اکراہ جبر

---

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۹۷ ② پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۹۷ ③ المستدرک للامام الحاکم، ج: ۱، ص: ۲۹۴۔ ④ پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۵۶۔ ⑤ پارہ: ۱۱، سورۃ یونس، الآیۃ: ۹۹۔

نہیں..... پھر یہ بھی فرمایا گیا کہ "بِــذُلِّ ذَلِيــلٍ"!!! یعنی دنیا میں چہار طرف دھکے کھا کھا کے اسلامی اصول مجبور کر دیں گے کہ انہیں میں پناہ لی جائے، اس کے سوا پناہ گاہ کوئی نہیں رہے گی، مجبور ہو کر سب اس کی طرف آئیں گے۔

ہر ایک کو اسلامی اصول بالواسطہ یا بلاواسطہ تسلیم کرنا..... بادشاہوں میں عموماً گدی نشینی ہوتی تھی، خاندانوں میں اس کی وراثت چلتی تھی، کئی کئی صدیوں تک ایک ہی خاندان حکومت کرتا تھا۔ آج بین الاقوامیت غالب آئی تو بادشاہتیں اور اس کی حکومتیں ختم ہونا شروع ہوگئیں۔ "انتخابِ اصلح" کا اصول آیا کہ جو تم میں بہتر ہو اس کو امیر بناؤ۔ یہ الگ چیز ہے کہ بہتری کا معیار کیا تجویز کیا گیا۔ اسلام میں بہتری کا اصول یہ ہے کہ جو فاضل ہو، متقی ہو، متوجہ الی اللہ ہو وہ اصلح ہے، جس کو خلیفہ کہتے ہیں۔ لوگوں نے کہا: جو مالدار زیادہ ہو، یا کہا کہ جس کے ساتھ ووٹ زیادہ ہوں۔ یہ تو الگ چیز ہے، الحاصل "انتخابِ اصلح" کا اصول رائج کرنا پڑا۔ جیسے کہ عرف عام میں مشہور ہے کہ سب بادشاہتیں ختم ہو جائیں گی، بس دو بادشاہتیں باقی رہیں گی، ایک انگلستان کی اور ایک جو تاش میں بادشاہ ہوتا ہے۔ انتخابِ اصلح اسلام کا اصول نہیں تو اور کیا ہے! انتخابِ اصلح یعنی صالح ترین امیر مقرر کرو۔ اسلام نے یہ اصول دیا ہے۔ وہاں نہ خاندانیت تھی، نہ قبائلیت تھی۔ باقی چاہے وہ اتفاق سے خاندانی بھی ہو جائے تو اس کا مضائقہ نہیں، خاندان کی بالکل نفی نہیں کہ اچھے خاندان کی طرف جانا ہی نہیں۔ اگر خاندان میں ہی کوئی اصلح پیدا ہو جائے، کوئی صالح ترین فرد ہو تو سبحان اللہ! دونوں باتیں حاصل ہو جائیں گی۔ مگر مقصودِ اصلی یہ ہے کہ امیر صالح اور مصلح ہو۔ بہرحال انتخاب ہوا۔ تو انتخابِ اصلح کا اصول آیا۔ آج لوگ انتخاب کرنے پر مجبور ہیں۔ انہیں اس کے علاوہ کہیں پناہ نہیں مل سکتی، ایک سلسلہ چل پڑا۔

اسی طرح وراثت کا قصہ ہے۔ بہت سی اقوام میں بیٹیوں کو وراثت نہیں ملتی تھی۔ اسلام نے بیٹے اور بیٹیوں کا حق رکھا۔ البتہ فرق مراتب ضرور قائم رکھے۔ مگر جس طرح بیٹا باپ کا وارث ہے، بیٹی بھی وارث ہوگی۔ بعض اقوام میں بیٹیوں کی بالکل وراثت نہیں تھی۔ ہندوستان میں بعض قوموں کی عورتوں نے ایجی ٹیشن برپا کیا اور انہوں نے اسمبلی کے اردگرد دھاوا بولا کہ: جس باپ کی اولاد لڑکے ہیں، اسی کی اولاد ہم لڑکیاں بھی ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ہمیں میراث نہ ملے! آخر بالکل مجبور ہو کر گورنمنٹ کو قانون بنانا پڑا اور وراثت میں ان کو حصہ دار بنایا۔ اس قانون کے بنانے میں اقوام نے کدھر رجوع کیا! ان کے ہاں تو کچھ نہیں تھا، سوائے اس کے کہ انہوں نے اسلامی فقہ کو لے کر اپنے الفاظ میں ادا کر دیا اور کیا کہا جائے گا!۔ تو لوگ اسلام کا نام نہیں لیتے مگر اس کے اصول اختیار کرتے جا رہے ہیں۔

ہندو گورنر کے ایم منشی کا تسلیمِ حق..... کے ایم منشی جو یوپی کا گورنر تھا، اس نے ایک جلسہ میں اپنا پیغام بھجوایا۔ میں بھی اس جلسہ میں لکھنؤ میں موجود تھا۔ اس کو جلسہ میں شرکت کی دعوت دی گئی تو اس نے معذرت کی کہ حکومت کے کام بہت بڑے ہوئے ہیں، میں نہیں آ سکتا، میں اپنے بجائے اپنا پیغام بھیجتا ہوں۔ سیرت کا جلسہ

تھا، وہ پیغام پڑھ کر سنایا گیا، اس کے دو جز تھے۔

پہلا جز یہ تھا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مناقب اور فضائل اس نے بیان کئے اور ایسے بیان کئے کہ شاید کوئی مسلمان بھی اتنا نہ بیان کرے۔ اس نے کہا: دنیا میں اگر کوئی ہستی ایسی ہے جس کی زندگی پر انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں تو وہ سوائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسری کوئی نہیں، کامل اور مکمل ہستی ایک ہی پیدا ہوئی۔ یہ تو ابتدائی جز تھا۔ دوسرا جز یہ تھا کہ ہم نے ہندوستان کا قانون اسلامی اصولوں پر بنایا ہے ہم نے عدل قائم رکھا، مساوات قائم رکھیں، اقوام کے حقوق برابر رکھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان حقوق کو چور اور ڈاکو مارنے لگیں اور نہ پہنچائیں، مگر قانون میں حقوق برابر رکھے گئے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انکے ہاں اس قسم...... کے اصول نہیں تھے آخر مجبور ہو کر اسلام کی طرف رجوع ہوئے اور وہاں سے اصول لئے۔

گاندھی جی کا صدیق وفاروق کی حقانیت کے آگے سرنگوں ہونا...... ہندوستان میں جب کانگریس کی عارضی حکومت قائم ہوئی تھی تو گاندھی نے کہا تھا کہ: ''ہمارے وزراء اگر عالمی وقار چاہتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ وہ چھوت چھات کو ختم کریں، نسلی امتیازات کو ختم کریں، اونچ نیچ ختم کریں اور...... صدیق وفاروق کا نمونہ اختیار کریں''۔ گاندھی کی قوم نے برا مانا اور کہا کہ آپ کو صدیق وفاروق ہی کا نمونہ ملتا ہے!۔ اس نے کہا:

''بھئی! کسی اور قوم میں تم نمونہ بتادو۔ جب نہیں ملا تو اب میں کس کا نام لوں! یہ ساری مثالیں انہوں نے ہی قائم کی ہیں کہ حکومت بھی قائم اور درویشی بھی قائم، دبدبہ بھی قائم اور ساتھ میں پیوندوں کی چادریں بھی قائم اور زہد و قناعت بھی قائم۔ تم کوئی حکومتیں مثال میں بتلا دو کہ نظام عالم بھی قائم ہے اور سارے درویش کے درویش ہیں''۔

خلفائے راشدین نے کوئی سونے چاندی کے محل نہیں قائم کرائے، یہی سادہ زندگی جو عوام الناس کی تھی، وہی زندگی ان کی تھی۔ مگر پورے عالم میں دین حق کا ایک دبدبہ پھیلا دیا۔ تو قوم نے برا مانا کہ تمہیں یہی نمونہ ملتا ہے۔ اس نے کہا جب نمونہ نہیں ہے تو میں کسے پیش کروں، تم برا مانو یا بھلا! بہر حال مطلب یہ ہے کہ لوگ اسلام کی طرف جھکیں گے، مسلمان ان کے گلے پر کوئی تلوار نہیں رکھیں گے کہ اسلام قبول کرو، بلکہ اصول مجبور کریں گے کہ اسلام کی طرف آؤ، زمانہ مجبور کرے گا۔ دوسری طرف پناہ نہیں ملے گی وانہیں اصول میں پناہ ملے گی۔ اس لئے کہ یہ فطری اصول ہیں، تو قبول کرنے کیلئے لامحالہ مجبور ہوں گے۔

فیضانِ نبوت کا پورے عالم میں پھیل جانا...... تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وعدہ دیا، فرمایا: ''لَا یَبْقٰی عَلٰی ظَھْرِ الْاَرْضِ بَیْتُ مَدَرٍ وَّلَا وَبَرٍ'' الخ روئے زمین پر کوئی کچا پکا گھرانہ نہیں رہے گا مگر اس میں اسلام کا کلمہ داخل ہو جائے گا (1) ''فَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ'' ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر پورے عالم میں ایک دین ہو جائے گا۔

(1) المستدرک للامام الحاکم، ج: ۱ ص: ۱۲۴۔

بعض حضرات شراح فرماتے ہیں کہ یہ کلمہ: ’’فَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰہِ‘‘ حدیث کا جز ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقولہ ہے مگر بہرحال مقولہ حق ہے کہ جب روئے زمین کے ہر گھر میں اسلام کا کلمہ داخل ہو جائے گا تو پورے عالم میں دین واحد ہو جائے گا۔

یہ مکہ کی آواز تھی، سارے عالم میں پھیلنی چاہیے تھی۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک وقت مقرر کر دیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی وہ آواز مرکز سے چہار طرف پھیلی اور اس کی تکمیل ہوئی تھی۔ مگر وہ تکمیل کیفیت کے لحاظ سے تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لاکھ چوبیس ہزار وہ افراد تیار فرما دیے، جو نبی تو نہیں تھے مگر آثارِ نبوت سب کے اندر موجود تھے۔ ’’عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ ....‘‘ (1) وہ انبیاء علیہم السلام تو نہیں تھے، مگر حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے وہ کام کئے جو انبیاء کرتے ہیں۔ جو جس خطے میں پہنچ گیا اس خطے کو ایمان و علم اور نور سے رنگ دیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان تو بڑی ہے۔ آئمہ مجتہدین میں سے جو جہاں بیٹھ گیا اس نے اس خطے کو علم و معرفت اور ایمان سے رنگ دیا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ خراسان میں تھے، انکا مذہب پھیلا تو خراسان، ہندوستان، افغانستان میں حنفیت ہوگئی، اس راستے سے کروڑوں آدمی جنت میں پہنچ گئے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ابتدائی قیام حجاز میں تھا اور وفات کے وقت مصر میں قیام تھا تو مصر و حجاز میں اکثریت شوافع کی ہے۔ غرض جو امام جہاں بیٹھ گیا اس نے علم و تفقہ اور کمالات دینی سے اس خطہ کو رنگ دیا۔ تو یہ حضرات انبیاء نہیں تھے لیکن کام وہ کیا جو نبیوں کا کام تھا۔ ایک نبی آیا تو علاقہ کو ایمان سے بھر دیا۔ اس امت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خدام میں ایسے افراد پیدا ہوئے کہ کارہائے نبوت انجام دیئے۔ طاقت ایک ہی نبوت کی تھی اور وہ ہے ختم نبوت! اس کے پیچھے آ کر علماء نے کام کیا۔ فیضان ایک نبوت کا ہے، اس کے تحت میں علوم و کمالات دنیا میں پھیلے..... اور پھیلتے ہی رہیں گے۔ تو عہد نبوت میں دین مکمل ہوا اور چہار طرف پھیلا..... مگر کیفیت کے لحاظ سے، کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار ایسے نمونے تیار ہو گئے کہ شاید ہر صحابی کسی ایک نبی کی نسبت پر ہے۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات جامع النسب ہے اور آپ کی تربیت سے وہ نسبتیں آگے پھیلیں تو کیفیت کے لحاظ سے دین مکمل ہو گیا۔

مگر آواز مرکز کی یعنی مکہ کی تھی، اسے سارے عالم میں پھیلنا تھا تو دور عیسوی میں اور دور مہدوی میں جو کہ آخری دو مجدد ہوں گے، اس وقت کے بارے میں فرمایا گیا کہ: ﴿وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (2) پورے عالم میں دین واحد ہو جائے گا۔ اسلام واحد کے سوا کوئی دین باقی نہیں رہے گا اور اسلام سارے عالم میں پھیل جائے گا۔ تو کمیت یعنی تعداد کے لحاظ سے اخیر میں تکمیل ہوگی۔ کیفیت کے لحاظ سے پہلے تکمیل ہو چکی ہے۔ تو مکہ کی آواز

(1) علامہ سخاوی فرماتے ہیں قال شیخنا ومن قبلہ الدمیری والزرکشی: انہ لا اصل لہ، زاد بعضھم ولایعرف فی کتاب معتبر دیکھئے: المقاصد الحسنۃ للسخاوی ج ا ص: ۴۵۹ (2) پارہ: ۹، سورۃ الانفال، الآیۃ: ۳۹۔

جو مرکز سے اٹھی تھی بے اثر نہیں جاسکتی تھی، کیفا بھی پہنچ گئی اور جب کیت کے لحاظ سے پورے عالم میں دین واحد ہوگیا تو مقصد دنیا پورا ہو جائے گا کہ عبادت کا کارخانہ مکمل ہو چکا، اس کے بعد پھر قیامت کا دور ہے، چنانچہ یہ عالم ختم کر دیا جائے گا۔ میرے عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز مکہ سے اٹھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ خیر و برکت کے بعد پوری امت آپ کی قائم مقام ہے تو اس امت کا فرض بھی یہ ہے کہ اس آواز کو آگے بڑھائے اور مرکز سے چلائے۔

قاری طیب صاحب کے وفد کی شاہِ حجاز ملک عبدالعزیز سے ملاقات..... تقریباً انچاس برس کا عرصہ ہوا ہے، جب پہلی دفعہ یہاں (کعبہ مکرمہ میں) میری حاضری ہوئی ہے۔ اس وقت ملک عبدالعزیز بن سعود مرحوم زندہ تھے۔ اور ان کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا تھا کہ مطاف میں ان پر کسی نے حملہ کیا، اللہ نے ان کو بچایا۔ تو ہندوستانی زعماء کی طرف سے مبارک بادی کا جلسہ منعقد کیا گیا کہ ملک کو مبارک باد دیں کہ اللہ نے آپ کی حفاظت کی اور آپ کو محفوظ رکھا۔ فندق مکہ میں یہ جلسہ ہوا۔ اور تقریباً تین چار سو کے قریب حضرات، جن میں علماء زعماء تجار اور امراء سب جمع تھے۔ اس حج کو لوگ حج العظماء کہا کرتے تھے۔ یعنی ہر ملک کے بڑے بڑے لوگ اس حج میں شریک ہوئے۔ خیر وہاں جلسہ ہوا تقریریں ہوئیں، تجویز پاس ہوئی اور ایک وفد گیارہ آدمیوں کا تیار کیا گیا، جس میں مفتی نعیم صاحب مرحوم لدھیانوی، حافظ ہدایت حسین صاحب کانپوری، مولانا آزاد سبحانی مرحوم وغیرہ گیارہ آدمی تھے اور انہوں مجھے رئیس الوفد بنا دیا کہ جا کر ملک کی خدمت میں تجاویز پیش کریں کہ کل جلسہ ہوا تھا، یہ اس کی کارروائی ہے۔ ملک نے اجازت مرحمت فرمائی اور بہت ہی توقیر و عزت کی۔

انہوں نے یہ فرمایا کہ: وہ جو گیسٹ ہاؤس ہے، مہمانوں کے بیٹھنے کی جگہ..... وہاں علما کو نہ بٹھایا جائے، اس لئے کہ وہاں میں آؤں گا تو علماء میری تعظیم کو کھڑے ہوں گے، میں چاہتا ہوں کہ خود ان کی تعظیم کروں، وہ میری تعظیم کو کھڑے نہ ہوں۔ لہٰذا محل میں جو ان کا اپنا کمرہ تھا اس میں بلوایا، تا کہ جب علماء آئیں تو میں تخت سے اتر کر ان کی تعظیم کروں چنانچہ ہم اندر پہنچے اور ملک اپنے شہ نشین سے اترے اور انہوں نے ہر ایک سے مصافحہ کیا، اپنا تعارف کرایا، خیر یہ کارروائی ہوتی رہی۔ اس کے بعد اخیر میں میں نے تجویز پیش کی کہ:

"اس وقت کوئی عیسائی حکومت ایسی نہیں، جس کے ہاں تبلیغی مشن نہ ہو۔ امریکہ، انگلستان اور فرانس کی حکومتیں کروڑوں روپے اس پر خرچ کر رہی ہیں اور جگہ جگہ ملکوں میں تبلیغی مشن کے افراد پہنچے ہوئے ہیں۔ اگر حکومت حجاز اس قسم کا اقدام کرے اور اسلامی تبلیغ کے لئے یہاں سے وفود روانہ کرے تو سارے مسلمانوں کے لئے ایک عزت افزائی کا سامان ہوگا، حکومت کی محبت بھی دلوں میں قائم ہوگی۔ اور اس آواز میں بھی اثر ہوگا۔ اور ہندوستان...... جب وفد آئے گا...... تو میں نے عرض کیا: سارے علماء اس کی حمایت اور اسکے تعاون کے لئے کھڑے ہو جائیں گے جہاں جہاں آپ وفد بھیجیں گے"۔

یہ ہم نے تجویز پیش کی۔ ملک نے اس کو بہت پسند فرمایا اور فرمایا کہ بالکل مناسب تجویز ہے۔ مگر یہ کہا کہ ابھی اس کا وقت نہیں، اس لئے کہ مثلاً برطانوی حکومت ہے، ہم اسلامی تبلیغ کے لئے وفد بھیجیں گے۔ وہ کہیں گے اس میں کوئی سیاسی چال ہے، تو تبلیغ تو ایک طرف رہ جائے گی اور سیاسی قصے آ جائیں گے پھر اس میں کہیں شکوک وشبہات اور فتنے نہ کھڑے ہو جائیں۔ مگر تجویز معقول ہے وقت آ رہا ہے اس کے او پر عمل درآمد ہوگا، وقت کا انتظار کیا جائے۔

ممکن ہے یہ چیز عمل میں بھی آ جائے، کچھ سننے میں آ بھی رہا ہے کہ یہ تجویز عمل میں آ رہی ہے۔ بہر حال وہ حکومت کا قصہ ہے۔ جس طرح حکومت نے حج کے سلسلے میں احسانات کئے ہیں، حرم شریف کی توسیع اور حج کے انتظامات کئے ہیں، اس کے علاوہ یہ بھی ایک چیز ہے کہ دین کی تبلیغ اور اشاعت کی طرف توجہ ہو۔ مگر بہر حال جب تک حکومت متوجہ نہ ہو اس وقت تک علماء کا کام ہے کہ وہ اپنے طور پر اس کو چلائیں اور اس کو مرکز بنایا جائے۔

اہلِ مکہ کے بجائے تبلیغی جماعت نے دین کا کام اٹھایا...... الحمد للہ ہماری تبلیغی جماعتوں نے اس کو مرکز بنالیا ہے۔ بہت سے افراد ہیں جو ہجرت کر کے یہاں آ گئے ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جو یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں اور کام جاری ہے۔ دیہات تک میں کام پھیلا دیا ہے۔ باقی وہ احق تھے اسکے..... کہ یہ کام پھیلاتے۔ یہ کام اس کا مستحق تھا کہ یہ کام یہیں سے جاری ہو۔ برکت اور وسعت کا اس میں اثر ہے۔ مکہ کے لوگ جب باہر ملکوں میں پہنچیں گے تو کہا جائے گا کہ یہ تبلیغ کے لئے آئے ہیں۔ تو قلوب پر کتنا اچھا اثر پڑے گا۔ جو جماعتیں پہنچتی ہیں اس میں عرب ہوتے ہیں تو ہندوستان والے اس سے اثر قبول کرتے ہیں۔ اور ان کے دلوں میں ایک نیت پیدا ہوتی ہے کہ بھئی جب عرب تک تبلیغ کرنے آ گئے تو ہم ہی بیٹھے ہیں، ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم بھی تبلیغ کریں، اس کا اثر پڑتا ہے۔ بہر حال تبلیغی جماعت نے یہاں بھی اور دنیا کے ہر ملک میں بحمد اللہ مراکز قائم کئے۔ حجاز میں بھی مرکز قائم ہے، مدینے و مکہ میں بھی ہیں اور یہاں سے مضافات میں بھی جماعتیں جاتی ہیں اور بہت سے لوگوں کے اندر یہ سلسلہ پھیل گیا ہے۔ تو واقعی مکہ ہی اس کا احق تھا کہ یہیں سے آواز اٹھتی۔

شام مرکزِ سیاست ہے...... آج مکہ مکرمہ جس طرح بین الاقوامی عبادت گاہ ہے اسی طرح بین الاقوامی تجارت گاہ بھی بن گیا ہے۔ دنیا کے ہر ملک کی چیز یہاں ملتی ہے، اور کہیں ملے نہ ملے۔ تو بین الاقوامی تبلیغ گاہ بھی یہاں ہونی چاہیے۔ یہیں سے اللہ کے دین کا کلمہ بلند ہو اور چلے اور آثار روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اخیر دور میں عرب ہی کھڑے ہوں گے۔

انہی کے ہاتھوں پر قوت وشوکت کے ساتھ یہ چیز آگے بڑھے گی اور باطل قوتیں بھی انہی کے ہاتھوں ٹوٹیں گی۔ مہدی ہیں وہ بھی عربی ہیں اور حسنی ہوں گے، ان کے زمانے میں مغرب کی قوتیں ٹوٹیں گی، بیعت بھی انہی کے ہاتھ پر مکہ ہی میں شروع ہوگی اور وہ شام کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنائیں گے۔ اس لئے کہ وہ مرکز سیاستِ اسلام ہے۔ حجاز مرکزِ عبادت بنایا گیا ہے، عبادت کے لئے امن کی ضرورت ہے، فتنہ ہوتا ہے تو آدمی نہ تلاوت کر سکے نہ ذکر

کر سکے، عبادت کے لئے سکون ضروری ہے۔ جب اللہ نے اس کو مرکزِ عبادت بنایا تو امن کا بھی مرکز بنادیا: ﴿وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا﴾ ①۔ اور ﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ﴾ ②۔ پھر اس کو امن گاہ بھی عالمی بنایا، اس لئے کہ یہ عبادت گاہ تھی اور عبادت فتنوں کے اندر نہیں ہو سکتی۔ یہاں جانوروں اور درختوں تک کو پناہ ہے، بلکہ یہاں تک کہ گھاس بھی نہیں کاٹی جاسکتی۔ یہاں کے پتھر وغیرہ ہیں ان کے بارے میں بھی یہ پسندیدہ نہیں سمجھا گیا کہ آدمی اٹھا کر لے جائے کیونکہ یہاں امن ہے، محرم کے لئے شکار تک ممنوع ہے۔ تو جانوں کو بھی پناہ، مال کو بھی پناہ، یعنی امن کامل۔ جب اتنا امن ہے، تبھی عبادت کا کارخانہ یہاں چل سکتا ہے۔ اور سیاست کے لئے تعلقات، روابط، جوڑ توڑ اور اونچ نیچ کی ضرورت ہے۔ اگر وہ یہاں ہوتی تو عبادت کی خیر سلّا ہوجاتی۔ اسلام نے شام کو مرکزِ سیاست قرار دیا ہے، حجاز مرکزِ عبادت ہے، اصل اصول وہی ہے۔ لیکن جب جنگ کرنی ہو، فوجیں پہنچی ہوں تو وہ شام سے ہو۔ تو شام کو مرکزِ سیاست قرار دیا۔

مصر مرکزِ عسکریت ہے..... اور مصر کو مرکزِ عسکریت قرار دیا کہ وہاں فوجی قوت جمع رکھو۔ شام اور حجاز کو مہاجر بنایا، کوئی ہجرت کرے تو شام میں اور حجاز میں کرے۔ مصر کو ہجرت گاہ نہیں بنایا، وہ فوجی چھاؤنی ہے۔ اس لئے کہ فوج میں جو لوگ بھرتی ہوتے ہیں وہ ہجرت کر کے وطن چھوڑ کے تھوڑا ہی جاتے ہیں، وہ تو طاقت کو فراہم کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ مصر کو فوجی طاقت بناؤ اور لوگ مدد پہنچائیں مگر ہجرتیں کر کے وہاں نہ جائیں۔ طاقت ان کے وہاں پہنچتی رہے۔

اس لئے کہ مصر درحقیقت یورپ کے لئے ایشیا کا دھانہ ہے، اور ایشیاء کے لئے یورپ کا دھانا مصر ہے۔ تو ادھر کے لئے ادھر دھانا اور ادھر کے لئے ادھر دھانہ۔ اس دھانے پر جو غالب ہوگا اسی کے اثرات غالب ہوں گے۔ اگر ایشیا مصر پر غالب ہے تو یورپ تک اثرات پہنچیں گے۔ اور اگر یورپ نہر سویز اور مصر پر غالب ہوگیا تو پورے ایشیا پر یورپ کے اثرات پہنچیں گے۔ اس لئے احادیث سے اشارے ملتے ہیں کہ مصر کو قوت گاہ بناؤ، مرکزِ عسکریت قرار دو، شام کو مرکزِ سیاست قرار دو، یہاں شام میں امن رہنا چاہئے، وہاں مصر میں جنگیں ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیت المقدس جنگوں کے بیچ میں رہا ہے، کبھی ہم غالب، کبھی یہودی غالب، کبھی نصرانی غالب، کُلَّمَا نَصَبَتْ حَرْبٌ نَصَبَتْ اُخْرٰی ایک جنگ ختم ہوتی ہے، دوسری چھڑ جاتی ہے۔ وہ مرکزِ عبادت بنتا تو عبادت کا کارخانہ کبھی نہ جم سکتا، رات دن جنگیں اور جوڑ توڑ رہتا۔ تو عبادت کا مرکز حجاز کو قرار دیا، اسے امن بخشا، سیاست کا مرکز شام کو قرار دیا کہ یہاں لڑتے مرتے رہو، جو بھی غالب آجائے۔

اسلام کی بقاء تبلیغ میں ہے..... بہرحال دین کی تبلیغ، یہ بھی امن کی چیز ہے، بدامنی میں تبلیغ بھی مشکل ہوتی ہے، جیسے نماز پڑھنی مشکل۔ تو یہ ملک (حجاز) زیادہ احق ہے کہ یہ مرکزِ تبلیغ بنے۔ یہیں سے اللہ کے دین کی آواز اٹھے،

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۲۵۔ ② پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۶۷۔

جیسا کہ یہاں سے دین اٹھا ہے۔اور خدا کا شکر ہے کہ تبلیغی حضرات نے اس کو سمجھا ہے اور کام چل رہا ہے۔دیہات تک ان کے تعلقات اور روابط ہیں۔یہیں سے جماعتیں ہندوستان اور دوسری جگہ بھی جانے لگی۔تو ہم سب کا فرض ہے کہ اس کام میں شرکت کر کے قوت پہنچائیں،اس لئے کہ اس کی قوت سے ہماری قوت ہے۔اسلام کی قوت جو ہے وہ پھیلنے میں ہے،سکڑنے میں نہیں ہے۔اگر اسلام کو آپ کسی کوزے میں بند کر کے رکھ دیں وہ پھیل نہ سکے گا،اسلام کی اصلیت ختم ہو جائے گی،اسلام میں جامعیت اور پھیلاؤ ہی ہے،وہ جبھی اپنی اصلی صورت میں رہے گا جب کہ وہ دنیا کے اندر پھیلتا رہے۔"لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَةٍ۔" اس کے اندر جماعتی رنگ رہنا چاہئے۔اگر یہ تبلیغی دین نہ ہوتا تو حجاز سے باہر نہ نکلتا،لیکن یہ ساری دنیا میں پھیلا ہے،یہ تبلیغ ہی کی برکت ہے۔اس لئے کہ جب یہ دین کا مرکز ہے تو تبلیغ کا مرکز بھی ہے۔اس کے لئے یہاں کے لوگوں کو زیادہ آمادہ کیا جائے کہ یہ دینی تعلیم و تبلیغ کے لئے اور دعوت الی اللہ کے لئے اٹھیں۔

اختتامیہ کلمات......اس واسطے میں نے یہ چند باتیں عرض کیں کہ مکہ کا اول عالَم ہونا اس کا مقتضی ہے کہ دین کے کاموں کی یہیں سے اوّلیت ہو۔اس کا مرکزِ عالَم ہونا اس کا مقتضی ہے کہ یہاں دین کی مرکزیت ہو۔اس کا اصل عالَم ہونا اس کا مقتضی ہے کہ یہیں سے چہار طرف آواز پھیلے۔

اس واسطے میں نے یہ چند چیزیں عرض کیں اور محض تعمیلِ حکم کے لئے عرض کیں،ورنہ میں کچھ بیمار بھی ہوں۔یہ بھی واقعہ ہے کہ مدینہ اور مکہ میں ہماری جرأت تو بولنے کی ہوتی نہیں،اب زبردستی بڑے بلوائیں تو الگ چیز ہے۔مثل مشہور ہے کہ بڑا مارے بھی اور رو کر رونے بھی نہ دے۔حکم دیا کہ کرو تقریر! عذر بھی نہیں سنا جائے گا،اس لئے تعمیلِ حکم کے طور پر یہ چند باتیں عرض کیں،ورنہ کچھ علالت اور مقام کی ہیبت وعظمت کی وجہ سے نہ جرأت پڑتی ہے نہ ہمت ہوتی ہے۔یہ چند الفاظ بھی خود اپنی ہمت سے نہیں کہے کہ میری ہمت کام کر رہی ہو۔ممکن ہے آپ حضرات کی ہمت کام کر رہی ہو،ورنہ میں نے عرض کر دیا تھا:میرے میں جرأت نہیں،بہت سے لوگوں نے کہا کہ حرم شریف میں تقریر ہو جائے! میں نے کہا کہ تقریر کے بہت سے مواقع ہیں،حرم شریف ہماری تقریروں کے لئے نہیں،جو باعزم لوگ ہیں تقریر کریں،ہم جیسے طالب علموں کے لئے مناسب نہیں۔بہر حال تعمیلِ حکم کے طور پر یہ چند چیزیں عرض کیں تا کہ ایک تو مقامات کی برکت معلوم ہو جائے اور جو مقصد ہے،تبلیغ کا کام پھیلے،اس کی طرف بھی کچھ اشارہ ہو جائے۔اللہ تعالیٰ اس کام کو بڑھائیں اور ہم سب کو اس کام میں لگنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

"اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ"

عبادت وخلافت

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ!فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ. اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾o صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ①

بزرگانِ محترم!..... یہ قرآن کریم کی ایک آیت ہے جو اس وقت میں نے آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی۔ یہ نصیحت ہے جو حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو کی اور حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کو نقل فرمایا، یہ پورا رکوع ہے جس میں حضرت لقمان علیہ السلام کی نصیحتوں ہی کا ذکر ہے، ان کی نصائح میں ایک نصیحت یہ ہے جو اس وقت میں نے تلاوت کی۔ اس آیت کے سلسلہ میں کوئی لمبی چوڑی بات نہیں کرنی، اور نہ اسی آیت کی تفسیر کرنی ہے کہ وہ بہت لمبی چیز ہے، وقت اتنا نہیں ہے، اسی آیت سے ایک مضمون اخذ و استنباط کر کے میں عرض کرنا چاہتا ہوں، اور وہ دو مقاصد پر مشتمل ہوگا، جس سے یہ معلوم ہوگا کہ انسان کو اللہ نے دنیا میں کیوں بھیجا؟ کیوں پیدا کیا؟ اس کی زندگی کے کیا مقاصد متعین ہیں؟ اور ہم ان مقاصد کو کس حد تک انجام دے رہے ہیں۔

تمہید...... ان دو مقاصد کی تفصیل سے پہلے ایک مختصری تمہید سمجھ لیجئے تاکہ اس مقصد کا سمجھنا آسان ہو جائے، وہ یہ کہ یہ جو لمبی چوڑی کائنات آپ کے سامنے پھیلی پڑی ہے، جس میں بے انتہا طویل وعریض آسمان کا خیمہ تنا ہوا ہے، زمین کا فرش بچھا ہوا ہے، زمین وآسمان کے بیچ میں ہزاروں قسم کی مخلوقات پھیلی پڑی ہیں، جمادات اور ان کی ہزاروں قسمیں، نباتات اور ان کی ہزاروں قسمیں، جانوروں کی ہزاروں قسمیں ہیں، دریا اور خشکی کے جانور، غرض جمادات، نباتات اور حیوانات یہ بہت سی انواع واقسام ہیں، جو زمین وآسمان کے درمیان پھیلی ہوئی ہیں پھر آسمانوں کے اوپر ایک عظیم مخلوق ہے، جس کو ملائکہ کہتے ہیں وہ اتنے پھیلے ہوئے ہیں، جیسے حدیث میں ہے کہ:

① پارہ: ۲۱، سورۃ لقمٰن، الآیۃ: ۱۷۔

آسمان میں چار انگل جگہ خالی نہیں ہے جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ مصروف عبادت نہ ہو۔ تو ان گنت ملائکہ اوپر پھیلے ہوئے ہیں، اس ساری کائنات اور مخلوقات کی انتہا عرش پر جا کر ہوتی ہے۔ عرش عظیم کے اوپر شریعت کسی مخلوق کا پتہ نہیں دیتی، وہاں خالق کی تجلیاں اور کمالات ہیں۔ صرف ایک مخلوق کا پتہ چلتا ہے کہ اللہ نے ایک تختی اور لوح رکھی ہوئی ہے، اور وہ تختی زمین و آسمان سے بھی زیادہ بڑی ہے، اس پر لکھا ہوا ہے کہ "اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ" ① میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے رحمت آگے آگے چلتی ہے، غضب اس کے پیچھے پیچھے رہتا ہے، اصل رحمت ہے، غضب اس کے تابع ہے، یہ ایک دستاویز لکھی ہوئی ہے، اس مخلوق کا تو نشان ملتا ہے باقی خالق کی تجلیات وکمالات اور اس کی صفات عرش کے اوپر پھیلی ہوئی ہیں تو زمینیں، آسمان و زمین کے درمیان فضا، آسمان، جنت، عرش اور کرسی پھر تجلیات ربانی کا یہ سلسلہ ہے، تو بڑی لمبی چوڑی کائنات ہے۔

انسان میں مخلوقات کے نمونے ..... لیکن اللہ کی قدرت دیکھئے کہ اس ساری لمبی چوڑی کائنات کہ جو کروڑوں میلوں پر پھیلی ہوئی ہے، ایک چھوٹی سی ڈبیہ میں بند کر دیا آجکل کے سائنس دانوں کے قول کے مطابق چاند زمین سے ستر لاکھ میل دور ہے، جس تک جانے کا ارادہ کیا جا رہا ہے، (اب تو ان کا دعوی ہے کہ وہ پہنچ بھی چکے ہیں) پھر اس سے کتنا اوپر آسمان ہے، پھر اوپر کتنے آسمان اور کتنی جنتیں ہیں، تو لاکھوں کروڑوں میل پر مشتمل ہے، لیکن جب اس کو سمیٹا تو ایک ڈیڑھ گز کی جگہ میں آگئی، اور وہ ڈیڑھ گز کی جگہ کیا ہے؟ وہ آپ ہیں ساری کائنات کو اللہ نے انسان میں جمع کر دیا، جس میں زمین بھی ہے، آسمان بھی ہیں، پہاڑ بھی ہیں، جمادات، نباتات اور حیوانات بھی اس کے اندر جمع ہیں۔

انسان کو دیکھا جائے تو اس میں مٹی بھی ہے، پیدا ہی زمین سے ہوا، اسے مشت خاک ہی کہتے ہیں کہ ایک مٹھی خاک سے ہمارا بدن پیدا کیا گیا تو یہ ہمارا بدن زمین کا ایک تودہ ہے، روح نے اس مٹی کو سنبھال رکھا ہے روح نکلنے کے بعد پھر مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے تو اصل میں مٹی ہے، اور اس زندگی کی حالت میں بھی اس سے مٹی نکلتی رہتی ہے، اگر آپ روزانہ غسل نہ کریں تو جب بدن پہ ہاتھ پھیریں گے، بدن سے سیاہ بتیاں اتریں گی، وہ مٹی اور کوڑا کباڑ نہیں تو کیا ہے؟ تو بدن خاک کا ہے اور خاک ہی اس سے چھنتی ہے۔

اگر خارش ہو جائے، تو سارے بدن سے بھوسی سی جھڑتی ہے، جیسے مٹی جھڑ رہی ہو، تو آج بھی انسان مٹی کا تودہ ہے مرنے کے بعد یہ مٹی بکھر جاتی ہے، گویا انسان کے اندر زمین موجود ہے، اور وہی خاصیت اس زمین کی ہے، جو عام زمین کی ہے۔ اگر آپ اس میں غور کریں، آپ کی اس زمین میں پہاڑوں کا سلسلہ بھی ہے ہزاروں سا چھوٹے بڑے پہاڑ پھیلے ہوئے ہیں یہ جو انسان میں ہڈیوں کا سلسلہ ہے یہ پہاڑیوں کی مانند ہے، کوئی بڑی، کوئی چھوٹی، کوئی لمبی، کوئی چوڑی، جیسے پہاڑ مختلف ہوتے ہیں۔ تو یہ ایک سلسلہ ہے جو اس میں پھیلا ہوا ہے، اسی طرح اگر آپ غور کریں، جیسے دنیا کی زمین میں درخت، گھاس اور نباتات اگتے ہیں، ہماری زمین میں بھی نباتات اگے

① الصحیح للبخاری، کتاب التوحید، باب وکان عرشہ علی الماء، ص: ۳۲۲.

ہوئے ہیں، کہ بہت ہی قریب قریب درخت ہیں، تو سر ایسا ہے، جیسے گھنا جنگل، کہ سینکڑوں درخت اس میں قریب قریب اگے ہوئے ہیں۔ کوئی زمین ایسی ہوتی ہے کہ اس میں درخت دور دور ہوتے ہیں۔ جیسے عام بدن کے اوپر رواں، یہاں بال دور دور ہیں، کوئی زمین کا حصہ ایسا ہوتا ہے کہ اس میں کوئی درخت پیدا ہی نہیں ہوتا ہتھیلیوں پر کچھ بھی نہیں اگتا، ناک کے اوپر کوئی بال نہیں اگتا تو اور کچھ حصہ وہ ہے کہ اس میں سر سے بال اگتے ہی نہیں غرض ہمارے بدن کی زمین میں مٹی، پہاڑ اور نباتات کا سلسلہ بھی ہے۔

اور اس میں حیوانات بھی ہیں آجکل کے ڈاکٹروں کی تحقیقات تو یہ ہیں کہ خون میں جراثیم (چھوٹے چھوٹے حیوانات) ملے ہوئے ہیں، جو خوردبین سے دکھلائی دیتے ہیں، ویسے نہیں بدن کے ہر حصے میں نئے نئے رنگ کے جانور ہیں، ان کے مجموعے سے خون بنا ہے، وہ مر جائیں تو انسان مر جاتا ہے، تو پورے بدن میں جراثیم پھیلے ہوئے ہیں جیسے آپ کی زمین میں مختلف صوبے ہیں، کسی صوبے میں خاص قسم کے جانور، کہیں اور قسم کے جانور، کہیں کچھ ہوتا ہے کہیں کچھ تو یہ ہاتھ اور پیر اس زمین کے صوبے ہیں، اس میں مختلف قسم کے جانور ہیں وہ حیوانات مختلف شکلوں کے ہیں، اس سے امراض بھی پیدا ہوتی ہیں، اگر ان جراثیم کو مار ڈالا جائے تو ان سے بیماری ختم ہو جاتی ہے۔

انہی جراثیم سے زندگی بھی ہے، انسان کے مادے (خون) میں پھیلے ہوئے ہیں اور سر میں بھی تو کبھی جوئیں پڑ جاتی ہیں، آدمی ان کو پکڑتا ہے اور ناخن پر رکھ کر مارتا ہے یہ ایسے ہے جیسے جنگل میں مختلف جانور پھرا کرتے ہیں تو جیسے اسی زمین سے جانور پیدا ہوتے ہیں اور اسی میں کھپ بھی جاتے ہیں بعض دفعہ معدے میں کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں، ڈاکٹر علاج کرتے ہیں، وہ کیڑے ساری غذا کھاتے رہتے ہیں، انسان کمزور ہوتا رہتا ہے بدن کو نہیں لگتی، تو سر میں جوئیں اور معدے میں کیچوے پیدا ہو جاتے ہیں، زخموں میں کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں بہر حال انسان کی زمین میں مختلف حیوانات ہیں، جو چل رہے ہیں تو جیسی کائنات باہر کی ہے ویسی ہی ہمارے اندر کی کائنات بھی ہے، کہ زمین، پہاڑ، نباتات اور مختلف قسم کے حیوانات بھی، شکل وصورت سے بھی مختلف، پیدا بھی ہوتے ہیں اور مرتے بھی ہیں۔

پھر جیسے آپ کی اس دنیا میں وقت آنے پر بارشیں ہوتی ہیں، اس بدن میں بھی بارش ہوتی ہے جب گرمی آتی ہے تو پسینہ نکل رہا ہے، ایسے ٹپک رہا ہے، جیسے بارش ہو رہی ہو پھر جتنے قسم کے پانی زمین میں ہیں، اتنے ہی قسم کے انسان کے اندر ہیں، دنیا میں بعض جگہ پانی کے گرم چشمے نکلتے ہیں ہندوستان میں منڈیل کے ضلع میں بعض جگہ کھولتے ہوئے پانی کے چشمے ہیں، لوگ اس پانی کو ٹھنڈا کر کے غسل کرتے ہیں، ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے منوں آگ میں اسے پکایا گیا ہو بعض چشمے ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے ہیں سمندر کا پانی کڑوا ہے بعض جگہ پانی میں ترشی ہوتی ہے۔ انسان کے بدن کے اندر بھی ایسے ہی ہے منہ کے اندر اللہ نے میٹھا چشمہ جاری کر رکھا ہے، اگر منہ میں کڑوا پانی ہوتا، آدمی کی زندگی تلخ ہو جاتی تو نہایت شیریں قسم کے پانی کا چشمہ زبان سے بہہ رہا ہے اسی پانی کی مدد

سے غذا اندر پہنچتی اور اسی کی مدد سے ہضم بھی ہوتی ہے آنکھوں سے جو آنسو ٹپکتے ہیں، وہ نمکین پانی ہے، کبھی زبان پر آنسو کا پانی لگ جائے، تو نمک کا سا مزا آتا ہے تو آنکھوں کے اندر نمکین چشمہ جاری کر دیا ہے پتے میں دیکھو تو کڑوا پانی بھرا ہوا ہے، اس میں کڑوا چشمہ جاری ہے معدے کے اندر ترش پانی بھرا ہوا ہے، جس سے غذا ہضم ہو رہی ہے پھر کہیں پاک پانی اور کہیں ناپاک مثانے میں ناپاک پانی بھرا ہوا ہے جسے پیشاب کہتے ہیں اور منہ میں پاک پانی بھرا ہوا ہے جسے لعاب کہتے ہیں، یہ نکلے کہ آدمی تھوکے، اس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ پیشاب کا ایک قطرہ نکل آئے وضو ٹوٹ جاتا ہے تو بدن میں پاک، ناپاک، ٹھنڈا، گرم، ترش اور میٹھا وکڑوا ہمہ قسم پانی موجود ہے برسات اس میں ہے کہ پسینہ ٹپ ٹپ ٹپک رہا ہے، تو جو اس کائنات میں ہے وہی انسان کے اندر ہے ساری کائنات انسان میں جاری ہے۔

یہاں اگر ہوائیں چلتی ہیں تو انسان میں بھی ہوائیں چلتی ہیں جیسے یہاں ٹھنڈی اور گرم ہیں، آپ جب سانس اندر کو لیتے ہیں، تو ٹھنڈی اور جب باہر کو لیتے ہیں تو گرم ہوا نکلتی ہے۔ جیسے دنیا میں بعض اوقات ہوا بند ہو جاتی ہے، آدمی دوڑا دوڑا پھرتا ہے کہ بھئی پنکھے چلاؤ، طبیعت گھبرا گئی، انسان کے بدن میں بھی بوجھ ہو جاتا ہے، معدے میں ہوا پھنس جاتی ہے، ڈاکٹروں کے پاس دوڑے دوڑے پھرتے ہیں کہ صاحب! کسی طرح سے ہوا نکال دو اگر ہوائیں بند ہو جائیں تو اندر بھی گھٹن ہوتی ہے تو انسان کے بدن میں پانی بھی ہے اور ہوا بھی اور چلنے کا ڈھنگ بھی وہی جو باہر کی زمین میں ہے۔ اسی طرح انسان کے بدن میں آگ بھی ہے کبھی آپ بدن پر ہاتھ رکھیں گے تو گرمی محسوس ہوتی ہے اگر بدن میں آگ نہیں تو یہ گرمی کاہے کی ہے؟ اور اگر آدمی زور سے ہاتھ کو ملے، تو چنگاریاں سی نکلنے لگتی ہیں اور میل پھر دوڑ لیں، تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بدن میں آگ بھر گئی اگر اندر حرارت نہیں ہے، تو اندر کیا چیز جلتی ہے تو آگ پانی، ہوا اندر موجود ہیں، اور ان کا عمل بھی جاری ہے۔

غرض یہ آپ کا بدن اس پوری کائنات کی طرح ایک دنیا ہے، جیسے اس میں اوپر آسمان ہے، اور نیچے زمین ہے آپ کے اندر سر آسمان کی مانند ہے اور نیچے پیر زمین کی مانند ہیں جیسے آسمان میں چاند سورج ہیں، جن کی روشنی سے آپ اس کائنات کو دیکھتے ہیں، انسان کی پیشانی پر چاند اور سورج کی طرح سے دو آنکھیں ہیں، ان میں روشنی نہ ہو، کائنات نظر نہیں آتی تو چاند، سورج اور روشنی بھی ہے پھر حکومت کا ایک نظام بھی قائم ہے ہاتھ اور پیر یہ قلب کے خادم ہیں، قلب کا ذرا اشارہ ہو، ہاتھ پیر چلنے لگتے ہیں تو پوری کائنات جیسے باہر منظم ہے، اسی طرح اندر بھی ہے قلب حاکم بادشاہ اور ہاتھ پیر اس کے خدام ہیں غرض تفصیل کہاں تک عرض کی جائے انسان کے اندر ہوا، برسات، آگ مٹی، پہاڑ، سبزہ، جانور اور موت و حیات بھی ہے سارا قصہ وہی ہے جو کائنات کے اندر ہو رہا ہے انسان کی ایک صورت یہ ہے جس کا آپ نے مشاہدہ کیا اور مثال دیکھی کہ آسمان سے زمین تک جتنے درجے کائنات کے ہیں، وہ سب اس کے اندر موجود ہیں یہ اللہ کی صناعی ہے کہ جس کائنات کو لاکھوں، کروڑوں میل میں پھیلایا ہے، جب اس کو سمیٹا تو ایک ڈیڑھ گز کے انسان میں ساری کائنات کو جمع کر دیا اسی واسطے علماء لکھتے ہیں کہ انسان حقیقت جامعہ ہے،

یعنی اتنی جامع حقیقت ہے کہ وہ سارے کمالات اس کے اندر جمع ہیں جو پوری کائنات میں پھیلے ہوئے ہیں۔

انسان میں خالق کائنات کے نمونے...... پھر یہی کہ اس میں فقط کائنات ہی کے نمونے ہوں غور کیا جائے تو خالق کائنات کے نمونے بھی انسان ہی میں جمع ہیں۔ ایسے نمونے جمع ہیں کہ اگر ہم انہیں سامنے رکھیں تو ان نمونوں سے خدا تعالیٰ کی ذات، صفات اور کمالات سب عیاں ہو جائیں ہمیں کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں اگر ہم اپنے اندر غور کریں، تو خدائی کمالات بھی ہمارے اندر سے ابھریں گے۔

آپ غور کیجئے کہ آپ کے بدن کی یہ ساری کائنات کس چیز سے سنبھلی ہوئی ہے، یہ روح ہی سے سنبھلی ہوئی ہے، اگر روح نکل جائے، تو ساری کائنات بکھر جائے۔ مٹی بکھر کر مٹی میں جا ملے گی، پانی پانی میں، آگ، آگ میں اور ہوا، ہوا میں مل جائے گی، ساری کائنات ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔ روح ایک مدبر اعظم ہے، جس نے قیومیت کر رکھی ہے ساری کائنات کو سنبھال رکھا ہے ہم اس کو سامنے رکھ کر دلیل پکڑ سکتے ہیں کہ جب ہماری کائنات بدن کو سنبھالے رکھنے کے لئے ایک قیوم کی ضرورت ہے، اسی طرح اس پوری کائنات کا ایک مدبر اعظم ہے، جس نے پوری کائنات کو سنبھال رکھا ہے تو خدا کے وجود پر دلیل ہمیں اپنے اندر سے مل جاتی ہے۔

آپ غور کیجئے آپ کا بدن سرخی مائل ہے چہرے پر سرخی اور بالوں پر سیاہی ہے تو بدن پر کہیں سفیدی، کہیں سرخی، کہیں سیاہی، غرض بدن پر مختلف رنگ ہیں یہ سارے رنگ روح کی وجہ سے قائم ہیں، لیکن روح کا کوئی رنگ نہیں، وہ ہر رنگ سے بری و بالا ہے اسی طرح سے ہم کہیں گے کہ اس کائنات میں ہزاروں رنگ ہیں انسان کے مختلف رنگ ہیں درخت سبز، پھول سرخ ہیں ان سارے رنگوں کو اس روح اعظم نے سنبھال رکھا ہے جس کو ذات خداوندی کہتے ہیں اور خود ہر رنگ سے بری و بالا ہے، لیکن ہر رنگ کو جلوہ دے رکھا ہے تو خدا کے وجود کی دلیل اپنے اندر سے ملتی ہے۔ نیز اس پر غور کریں کہ آپ کے اس بدن کے اندر کسی کو جانے کا موقع دیا جائے اور آپ کے اندر گھس کے وہ خوب سیر کرے آپ اس سے پوچھیں کہ بھئی! روح کہاں کو بیٹھی ہوئی ہے، ہاتھ پیر، دماغ یا دل میں؟ وہ یوں کہے گا کہ مجھے تو ہر ہر ذرے میں روح کا جلوہ نظر آتا ہے۔

میں (کسی خاص عضو کی طرف) اشارہ نہیں کرسکتا، کہ روح وہاں بیٹھی ہے جب روح اعظم اور جلوہ خداوندی ہر جگہ پھیلا ہوا ہو اور اشارہ نہ کیا جاسکے کہ وہاں ہے، یا یہاں ہے، اس میں کون سے تعجب کی بات ہے؟ یہ اللہ کی شان ہے کہ وہ سمت اور جہت میں نہیں انگلی سے اس کی طرف اشارہ نہیں کرسکتے وہاں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کسی جہت اور سمت میں مقید ہے وہ لامحدود ذات ہے، مگر اس نے اپنا نمونہ روح کو بنا دیا کہ روح کو آپ کسی خاص عضو میں مقید نہیں بتا سکتے ہاں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کو بدن کے بعض حصوں سے خاص تعلق ہے جلوہ تو ہر جگہ ہے۔

مگر تعلقات الگ الگ ہیں۔ روح کو جو تعلق قلب سے ہے، وہ دماغ سے نہیں۔ جو دماغ سے ہے، وہ پیٹ سے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر قلب میں سوئی بھی چبھو دی جائے، تو آدمی مرنے کو ہو جاتا ہے۔ روح دوڑنے لگتی ہے

کہ میں نہیں ٹھہرتی۔ دماغ کو توڑ دیا جائے، روح باقی نہیں رہے گی۔ ہاتھ پیر کو کاٹ لیا جائے، روح باقی رہے گی۔ اگرچہ آدمی ناقص ہو جائے گا۔ ناخن اور بال کاٹ دو تو کوئی اذیت نہیں ہوگی۔ معلوم ہوتا ہے روح کو جو تعلق قلب سے ہے، دوسرے اعضاء سے وہ تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح اس کائنات میں اللہ کا جلوہ ہر جگہ موجود ہے وہ آپ کی مسجدوں سے نہیں ہے اور جو آپ کی مسجدوں سے ہے۔ وہ آپ کے گھرانوں سے نہیں ہے۔ جو آپ کے گھرانوں سے ہے وہ ویران جنگلوں سے نہیں ہے۔ تو جلوہ ہر جگہ ہے، مگر تعلقات الگ الگ ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بیت اللہ کے بارے میں اگر کوئی گستاخی کا کلمہ بھی کہہ دے تو پورے عالم میں شور مچ جاتا ہے، جیسے عالم تباہ ہونے کے قریب آ گیا۔ مسجد پر اگر کوئی حملہ کر دے، تو اس مقام کے مسلمانوں میں بے چینی پھیل جاتی ہے، اگر آپ کے گھر پر کوئی حملہ کر دے تو آپ اور آپ کے خاندان والے پریشان ہوں گے۔

یہ نہیں کہ سارا شہر بے چین ہو جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیت اللہ سے اللہ کو جو تعلق ہے وہ اتنا بڑا ہے کہ پوری کائنات پر پھیلا ہوا ہے۔ اور سارے انسان بے چین ہو جائیں گے۔ مسجد اور عام گھروں سے وہ تعلق نہیں۔ تو تعلق درجہ بدرجہ ہے مگر جلوہ ہر جگہ موجود ہے۔ اس لئے اللہ کے جلوے اور اس کی تجلیات کا ہر جگہ موجود ہونا اور اس کے تعلقات میں فرق مراتب ہونا، آپ کو اپنے اندر سے اس کی دلیل مل جاتی ہے کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں۔

نیز آپ غور کریں کہ آپ روح سے زندہ ہیں۔ تو ایک روح سے زندہ ہیں، یا دو روحیں کام کر رہی ہیں؟ ظاہر بات ہے کہ ایک ہی روح ہے۔ اگر دو روحیں ہو جائیں، بدن پھٹ کر خراب ہو جائے، ایک روح کہے گی میں بدن کو بھوک لگانا چاہتی ہوں، دوسری کہے گی میں ہرگز نہیں چاہتی۔ ایک روح کہے گی سردی لگنی چاہئے، دوسری روح کہے گی گرمی لگنی چاہئے۔ تو روحوں کو لڑائی سے فرصت نہیں ہوگی۔ بدن کی تربیت کون کرے گا؟ بدن خراب خستہ ہو کر تباہ ہو جائے گا۔ ایک ہی روح کام کر سکتی ہے۔ دو روحیں ہوں تو بدن کا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا۔

یہی صورت اس کائنات کی ہے کہ: ﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا﴾ ① اگر کائنات میں دو خدا ہوں تو کائنات چل نہیں سکتی۔ ایک خدا کہے گا میں فلاں کو بیٹا دینا چاہتا ہوں، دوسرا خدا کہے گا میں اس کو بانجھ رکھنا چاہتا ہوں۔ ایک کہے گا میں فلاں قوم کو عزت اور دوسرا کہے گا کہ میں اس کو غلام بنانا چاہتا ہوں۔ دونوں خداؤں کو لڑائی سے فرصت نہیں ہوگی۔ کائنات کون چلائے گا؟ یہ بات الگ رہی کہ دو خدا ہو بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ لیکن اگر معاذ اللہ مان لیا جائے تو کائنات برقرار نہیں رہ سکتی۔ جیسے بدن میں دو روح ہوں۔ کائنات بدن باقی نہیں رہ سکتی۔ یہ تو ایسا ہوگا جیسے ایک میان میں دو تلواریں ڈال دیں اور ایک شیردانی میں دو آدمی گھس جائیں، شیردانی پھٹے گی نہیں تو اور کیا ہوگا؟ تو ایک کائنات یہ پچاس مخلوقات ایک ہی خالق سے چلتی ہیں۔

اور اگر یوں مان لیا جائے کہ دونوں خدا آپس میں صلح کر لیں۔ معلوم ہوا ایک دوسرے سے دب گیا تو جو

---

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۲۲۔

رتی ہو، وہ خدا کیسے ہو سکتا ہے؟ خدا وہ ہے جو سب چیزوں پر غالب اور قوی ہو، جو لڑائی سے بچنے کے لئے دوسرے سے کہے کہ صلح کرلو، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دل میں دوسرے سے خوف موجود ہو، جس میں خوف ہو، وہ خدا تھوڑا ہی ہے۔ خدا وہ ہے کہ سارے اس سے ڈریں، وہ خود ڈر اور خوف سے بالاتر ہو۔ تو نہ صلح کے اصول کو سامنے رکھ کر اور نہ فساد کو سامنے رکھ کر دو جب خدا نہیں مانے جا سکتے، تو اللہ کی توحید اور یکتائی کی دلیل آپ کے اندر سے آپ کو مل رہی ہے۔ آپ کو باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ خود آپ کے اندر اللہ کی ذات توحید، اس کی یکتائی، اس کی صفات کے سب نمونے آپ کے اندر سے نکل آتے ہیں اور ثابت ہو جاتا ہے کہ بے شک کائنات میں کوئی مدبر اعظم ہے۔ اور یہ تخیل کہ معاذ اللہ خدا نہیں ہے۔ اور کائنات خود ہی چل رہی ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص یوں کہے کہ میرے اندر روح نہیں ہے۔ یہ بدن ایسے ہی چل رہا ہے۔ اگر کوئی دہریہ اس کائنات کے اندر خدا کا منکر ہے، اسے اپنے اندر کی روح کا بھی انکار کرنا چاہئے۔

اور جس طرح سے آپ کی روح، بدن کے خطے خطے سے واقف ہے۔ آپ کے اندر شعور ہے کہ وہ جانتی ہے کہ یہ میرا ناخن، بال، پیٹ ہے، نیز یہ کہ اس وقت پیٹ میں گڑ بڑ ہو رہی ہے۔ یہ اسے علم ہوتا ہے۔ اس وقت پیٹ اچھا ہے، تو کائنات بدن کے ذرے ذرے سے روح واقف ہے اگر واقف نہ ہو، تو نظم کیسے چلائے، اگر روح کو پتہ ہی نہ چلے کہ بخار چڑھ رہا ہے، تو دور کرنے کی اسے فرصت کہاں ہوگی؟ اسی طرح اس کائنات کے ذرے ذرے کا علم اللہ کی ذات کو ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ حق تعالیٰ نہ جانیں کہ کائنات میں کیا ہو رہا ہے۔ ﴿اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ﴾ ① جو پیدا کر رہا ہے، کیا وہ معاذ اللہ لاعلم ہوگا؟ پیدا کرنے والا ہی مخلوق کے ذہن، صفات اور احوال کو جانتا ہے، تو اللہ کے لامحدود علم کی نظیر ہمارے اندر موجود ہے۔ تو اللہ نے انسان کو ایسا جامع بنایا کہ اگر وہ اپنے اندر خدائی کمالات دیکھنا چاہے، تو اپنے آئینے کے اندر دیکھ لے۔ اس کو سارے خدائی نمونے نظر آ جائیں گے۔

﴿سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ﴾ ② ہم عنقریب حق کی نشانیاں انسانوں کو ان کی جانوں کے اندر بھی دکھلائیں گے، تاکہ واضح ہو جائے کہ اللہ ہی حق و ثابت ہے اور وہی کائنات کا چلانے والے ہے۔ تو منطقی دلیلیں الگ رہیں، یہ مشاہدے کی دلیلیں ہیں کہ آدمی اپنے اندر غور و فکر کر کے خدائی کمالات کو پہچان لے۔ میرے عرض کرنے کا حاصل یہ نکلا کہ خالق اور مخلوق کے نمونے سارے ہمارے اندر موجود ہیں۔ تو انسان ایک عجیب چیز نکلی کہ اس میں دونوں نمونے جمع ہیں۔

نمونۂ کائنات ہونے کی نسبت سے انسان کا فریضہ..... اس واسطے انسان پر دو ہی فرائض عائد ہوں گے، ایک وہ فریضہ جو مخلوق ہونے کے مناسب اور ایک فریضہ ایسا جو خالق کے نمونوں کے مناسب ہے۔ نمونہ مخلوق ہونے کا فریضہ کیا ہے؟ جس مخلوق کو خدا وجود دے، وہ اپنی پیدائش میں بھی خالق کی محتاج ہے اور بقا میں

---

① پارہ: ۲۹، سورۃ الملک، الآیۃ: ۱۴۔ ② پارہ: ۲۵، سورۃ حم سجدہ، الآیۃ: ۵۳۔

بھی۔ تو ہر قدم پر ہم خدا کے محتاج ہیں، محتاج کا کام غنی کے سامنے کیا ہوتا ہے؟ محتاج کا کام یہ ہے کہ وہ غنی کے سامنے جھکے اور اس کے آگے سجدہ کرے۔ اس لئے کہ اگر ہمارے پاس سب کچھ ہو، تو ہمیں اس سے مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم تبھی حاجت مندی اس کے سامنے لے جاتے ہیں کہ ہمارے پاس کچھ موجود نہیں۔

ایک فقیر آپ سے تبھی سوال کرے گا کہ اس کے پاس دولت نہ ہو، اگر اس کے پاس دولت ہو، اسے سوال کرنے کی کیا ضرورت پڑی؟ تو محتاج ہاتھ پھیلاتا ہے، غنی نہیں۔ زندگی ہمارے قبضے میں نہیں تھی۔ ہم نے ہاتھ پھیلایا کہ اے اللہ! ہمیں زندگی عطا کر، اس نے دے دی۔ زندگی آنے کے بعد اس کا باقی رکھنا ہمارے قبضے میں نہیں، اگر ہمارے قبضے میں ہوتا، تو ہم کبھی نہ مرتے۔ مگر مرنا پڑتا ہے۔ معلوم ہوا ہمارے ہاتھ میں زندگی نہیں۔ ہم دعائیں مانگتے ہیں کہ یا اللہ ہمارے زندگی طویل کردے۔ عملی دعا مانگتے ہیں۔ یعنی ان اسباب کو اختیار کرتے ہیں جن سے زندگی باقی رہے، کھاتے، پیتے، دوائیں استعمال کرتے ہیں۔ یہ عملی دعا ہے۔ اور زبان سے بھی کہتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں زندہ رکھ۔ یہ کیوں مانگتے ہیں؟ محتاجگی ظاہر کرنے کو، کہ وہ غنی ہے، ہم محتاج ہیں۔ محتاج کا کام جھکنا ہے۔ تو مخلوق خالق کی محتاج ہوتی ہے۔ اس کا فریضہ ہے کہ وہ جھکے۔

اور جھکنا بھی معمولی درجے کا نہیں، بلکہ انتہا درجے کا جھکنا ہے، یعنی ایسی ذلت ظاہر کرے، کہ ایسی ذلت کسی کے آگے ظاہر نہ کرسکے۔ اسلئے کہ خالق وہ ہے کہ اس کی عزت کی کوئی انتہا نہیں۔ تو اس کے سامنے ذلت بھی ایسی پیش کرنی چاہئے کہ اس ذلت کی بھی کوئی انتہا نہ ہو۔ اس انتہائی ذلت کو پیش کرنے کا نام، اسلام کی زبان میں عبادت ہے۔ عبادت غایت تذلل کو کہتے ہیں۔ اور اگر آپ غور کریں تو یہ انتہائی ذلت آدمی نماز میں ہی ظاہر کرسکتا ہے کسی اور عبادت سے ظاہر نہیں کرسکتا۔ اس لئے کہ انتہائی تذلل کی جتنی شانیں ہیں، وہ ساری نماز کے اندر موجود ہیں۔ نوکروں کی طرح ہاتھ باندھ کر گردن جھکا کر کھڑے ہوئے۔ پھر اتنی ذلت پر قناعت نہیں، رکوع کر کے گردن جھکا دی، اور زیادہ ذلت کا اظہار کیا پھر اسی پر قناعت نہیں، سب سے زیادہ عزت کی چیز انسان میں ناک اور پیشانی ہے، اسے سجدے میں جا کر زمین پر رگڑتا ہے۔ کہ اے اللہ! تیری عزت کے سامنے میں اپنی انتہائی ذلت پیش کرتا ہوں۔ پھر اسی پر بس نہیں، اخیر میں بھیک مانگتا ہے کہ اے اللہ! تیری عزت کے سامنے میں اپنی انتہائی ذلت پیش کرتا ہوں۔ پھر اسی پر بس نہیں، اخیر میں بھیک مانگتا ہے کہ اے اللہ! مجھے نیکی دے، رزق دے، وغیرہ وغیرہ۔ بھیک مانگنے سے زیادہ کسی چیز میں ذلت نہیں ہوتی۔ تو سجدے کے بعد اخیر میں دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ تو مقصود یہ نکلا کہ مخلوق اپنے خالق کے آگے جھکے۔ انتہائی ذلت کا اظہار کرے، اور وہ نماز کے اندر ہوتی ہے۔ تو نماز کا فریضہ عائد ہوا، جس سے آدمی عبادت کرسکتا ہے، نماز کے سوا عبادت حقیقۃً عبادت کی کوئی چیز نہیں ہے جس سے عبادت کی جاسکے عبادت کے معنی انتہائی ذلت پیش کرنے کے ہیں، یہ نماز ہی میں ہے اور کسی عبادت میں نہیں ہے۔ مثلاً آپ زکوٰۃ یا صدقہ دیں، یہ حقیقی طور پر عبادت نہیں، اس میں ذلت کا اظہار تھوڑا ہی ہے، اس میں اللہ کے

ساتھ مشابہت پیدا کرنا ہے، کہ جیسے اللہ مخلوق کو دیتا ہے، آپ بھی غریب کو دیتے ہیں۔ تو دینا اور احسان کرنا ذلت نہیں، بلکہ انتہائی عزت کی بات ہے، یہ خدائی کام ہے، تو زکوٰۃ وصدقہ دینا اپنی ذات سے عبادت نہیں۔ چونکہ اللہ نے حکم دیا، ایسا کرو، تعمیل حکم کی وجہ سے اس میں عبادت کی شان پیدا ہوگئی۔ ورنہ اپنی ذات سے عبادت نہیں۔

اسی طرح آپ روزہ رکھیں۔ روزہ اپنی ذات سے عبادت نہیں۔ اس لئے کہ روزے کے معنی یہ ہیں کہ آپ کھانے، پینے اور بیوی سے بے نیاز۔ سب سے مستغنی۔ تو یہ شانِ اللہ کی ہے کہ کھانے، پینے اور بیوی سے بری و بالا ہے۔ اللہ سے مشابہت پیدا کرنا، یہ ذلت کی بات تھوڑی ہی ہے۔ تو روزہ عین عزت ہے، پھر بھی روزہ عبادت بنا، اس لئے کہ حکم ہے کہ روزہ رکھو، تعمیل حکم کی وجہ سے عبادت بن گیا۔ ہم سچ بولنے کو عبادت کہتے ہیں، لیکن سچ بولنا اپنی ذات سے عبادت نہیں، کیونکہ سچ بولنا اللہ کا کام ہے۔ ﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا﴾ ① اللہ سے زیادہ کس کا قول سچا ہے۔ ﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا﴾ ② اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی۔ جو سچ بولے، وہ ذلت کا کام تھوڑا ہی کر رہا ہے۔ وہ تو انتہائی عزت کے مقام پر ہے۔ عبادت اس لئے بنا کہ حکم خداوندی ہے کہ سچ بولو، جھوٹ مت بولو۔ تعمیل حکم کی وجہ سے اس میں شانِ عبادت پیدا ہوگئی۔ ان تمام چیزوں میں کوئی چیز اپنی ذات سے عبادت نہیں۔ یہ نیت اور مقاصد کی وجہ سے عبادت بن گئی ہیں۔ لیکن نماز میں جتنے افعال ہیں، ان میں اپنی ذات کی وجہ سے اظہارِ ذلت ہے۔ کھڑے ہونا، جھک جانا، سجدہ کرنا، دعائیں کرنا، بھیک مانگنا سب ذلت کا اظہار ہے، اس لئے اپنی ذات سے جو چیز عبادت ہے، وہ صرف نماز ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نماز اللہ نے فقط انسان پر نہیں، کائنات کے ذرے ذرے پر فرض کی ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا۔ ﴿كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ﴾ ③ ہر چیز نے اپنی نماز اور تسبیح پہچان لی۔ معلوم ہوا اور درخت، پہاڑ، جانور، سبھی نماز پڑھتے ہیں۔ سب پر نماز واجب ہے۔ فرق اتنا ہے کہ انسان کو خطاب کیا گیا ہے، کیونکہ اس میں عقل ہے اور مخلوقات کو خطاب نہیں کیا گیا۔ مگر بنایا ایسے گویا وہ نماز پڑھ رہے ہیں۔ جیسے علماء لکھتے ہیں کہ جتنے درخت ہیں، ان کی نماز میں قیام ہے، رکوع وسجدہ نہیں۔ گویا ایک پیر پر کھڑے ہوئے نماز میں مصروف ہیں۔ رکوع سجدے کی اجازت نہیں ہے۔ چوپائے، جو چار پیروں سے چلتے ہیں، انکی نماز میں رکوع ہے۔ ان کو ایسی ہیئت سے اللہ نے بنایا، کہ وہ ہر وقت رکوع میں ہیں، سجدہ قیام ان کی نماز میں نہیں ہے۔ پہاڑوں کو اس طرح بنایا، جیسے آدمی تشہد میں بیٹھتا ہے۔ گویا پہاڑ زمین پر گھٹنے ٹیکے ہوئے التحیات میں مصروف ہیں، ان کی نماز میں قعدہ ہے۔ قیام، رکوع، سجدہ نہیں ہے۔ حشرات الارض جیسے سانپ بچھو، ان کی نماز میں سجدہ ہے نہ رکوع ہے نہ قیام۔ یہ گویا ہر وقت اوندھے پڑے ہوئے اللہ کے سامنے سجدے میں مصروف ہیں۔ چاند، سورج یا آجکل کے قول کے مطابق زمین گردش میں ہے۔ یہ گردش سے اللہ کی عبادت کر رہے ہیں، حرکت دوری ان کی نماز ہے۔ اسی طرح سے جنت و

دوزخ کی نماز دعا مانگنا ہے۔ حدیث میں ہے کہ جنت یہ سوال کر رہا ہے اے اللہ! قیامت کے دن مجھے بھر دیجئے۔ میرے محلات خالی نہ رہیں۔ جہنم بھی کہہ رہا ہے کہ مجھے بھر دیجئے۔ اور اللہ کا وعدہ ہے، قیامت کے دن دونوں کو بھر دیا جائے گا۔ وعدہ پورا کیا جائے گا۔ جب تک نہیں بھریں گے، جہنم پکارتا رہے گا۔ ''هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ' هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ.'' چاند، سورج، پہاڑ، دریا، مٹی، سب جھونک دیئے جائیں گے۔ پھر بھی وہ کہے گا ''هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ.'' جب ان سب چیزوں سے نہیں بھرے گا، تو حدیث میں ہے حق تعالیٰ جہنم کے منہ پر پیر رکھ دیں گے، جیسا پیر ان کی شان کے مناسب ہے۔ اس وقت کہے گا کہ بس! بس! اب میں بھر گیا اور وعدہ پورا ہو گیا۔

جنت میں سارے جنتی داخل ہو جائیں گے۔ پھر بھی اس کے شہر اور بستیاں خالی رہ جائیں گی، تو ایک مستقل مخلوق پیدا کی جائے گی۔ جس سے جنت آباد کی جائے گی۔ تو جنت وجہنم کی نماز دعا مانگنا ہے۔ فرشتوں کی نماز صف بندی ہے، کہ صفیں باندھ کر کھڑے رہیں۔ انسان اور بالخصوص مسلمان کی نماز میں ساری کائنات کی نمازیں اللہ نے جمع کر دیں۔ درختوں کا سا قیام، چوپایوں جیسا رکوع، حشرات الارض جیسا سجدہ، جنت وجہنم جیسی دعا پہاڑوں جیسا تشہد، فرشتوں کی سی صف بندی اور چاند وسورج یا زمین کی گردش بھی نماز میں ہے۔ اس واسطے کہ کوئی نماز دو رکعت سے کم کی نہیں۔ دو تین یا چار رکعت کی ہے۔ آپ ایک رکعت پڑھ کے کیا کام کرتے ہیں؟ جو کام پہلی رکعت میں کیا تھا، وہی کام دوسری، تیسری اور چوتھی میں کرتے ہیں۔ وہی الحمد سورت اور تسبیحات وغیرہ۔ اس لئے گردش اور دوران نماز کے اندر ہے۔

جیسے انسان کو اللہ نے ایک جامع حقیقت بنایا، عبادت بھی جامع دی۔ آپ کی عبادت میں ساری کائنات کی عبادتیں جمع ہو گئیں۔ اس سے دین کا کمال بھی واضح ہوتا ہے۔ پچھلے ادیان میں ایسی نمازیں نہیں تھیں۔ کسی قوم کو فقط سجدے، کسی کو فقط قیام کسی کو فقط رکوع کی نماز دی گئی۔ لیکن اسلام کی نماز میں ساری قوموں کی نمازیں جمع ہیں۔ ساری اقوام اور ساری مخلوقات کی نمازیں جمع ہو گئیں، تو نماز ایک جامع ترین عبادت ہے، بلکہ نماز ہی عبادت ہے، اور چیزیں تعمیل حکم کی وجہ سے عبادت بن جاتی ہیں، تو انسان پر ایک فریضہ جو عائد ہوتا ہے، وہ نماز کا ہے۔ اس لئے کہ جب وہ مخلوقات کے سارے نمونے اپنے اندر رکھتا ہے، تو سارے نمونوں کی ذلت وعبادت اللہ کے سامنے پیش کر دینا اس کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے انسان کی زندگی کا ایک مقصد تو عبادت ہے۔

نمونہ کمالات خداوندی ہونے کی نسبت سے انسان کا فریضہ...... اب یہی انسان جیسے مخلوق کے نمونے رکھتا ہے، خالق کے نمونے بھی رکھتا ہے۔ اس پر یہ فریضہ بھی عائد ہوا کہ جو کام خالق کرتا ہے، یہ بھی وہ کرے۔ خالق کا کام کیا ہے؟ اپنی مخلوق کو پالنا، اس کی تربیت کرنا، اس کو ہدایت کرنا، اس نے رزق پیدا کیا، تا کہ مخلوق پلے، اس نے مخلوق کو تعلیم دی، تا کہ اپنے بھائیوں پر رحم کرے۔ یعنی، جیسے میں رحم کرتا ہوں۔ جیسے میں تمہیں راستہ دکھاتا ہوں تم اپنے بھائیوں کو دکھاؤ۔ جیسے میں تمہاری تربیت کر رہا ہوں تم بھی اپنے بچوں اور عیال کی تربیت کرو۔ یعنی میری

طرف سے نائب بن کردہ کام کرو، جو میرے کام ہیں۔ میں مدبر ہوں، تم بھی تدبیر کرو۔ میں موجد ہوں، تم بھی دنیا میں ایجادیں کرو، میرا کام ہدایت دینا ہے، تم بھی دنیا کے لئے ہادی بنو۔ میرا کام احکام جاری کرنا ہے، تم بھی میرے نائب بن کر احکام جاری کرو۔

حاصل یہ نکلا کہ ایک فریضہ انسان پر عبادت کا اور ایک فریضہ خلافت کا عائد ہوتا ہے۔ ایک طرف جھک کر عبادت کرے گا اور ایک طرف تختِ خلافت پر بیٹھ کر اللہ کا نائب بن کر اس کی کائنات میں تصرفات کرے گا۔ ملکوں کو فتح کرے گا۔ دنیا میں ہدایت پھیلائے گا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے گا۔ یہ اللہ کا کام ہے، لیکن نائب بن کہ یہ بھی کرے گا۔ انبیاء علیہم السلام دنیا میں اللہ کے نائب بن کر آتے ہیں اور ہدایت کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ کائنات کے مربی ہیں۔ تو انبیاء بھی مخلوق کی روحوں کی تربیت کرتے ہیں۔ اللہ معلّم ہے جو انبیاء کو تعلیم دیتا ہے، اس لئے انبیاء علیہم السلام بھی تعلیم دیتے ہیں، تا کہ دنیا میں علم پھیل جائے۔ اللہ کے احکام جاری کرتے ہیں۔ قصاص لیتے ہیں، شراب خوری پر درے لگاتے ہیں۔ تو انبیاء علیہم السلام اللہ کے اولین نائب ہیں۔ پھر انبیاء کے نائب ان کے صحابہ ہوتے ہیں، پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کے نائب تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ ہوتے ہیں۔ تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ کے نائب تبع تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ ہوتے ہیں۔ اخیر تک سلسلہ پہنچ جاتا ہے۔ علماء ربانی، مشائخ حقانی اور سچے درویش وصوفی، جو مخلوق کو سیدھا راستہ دکھاتے ہیں۔ یہ خلافت کا کام ہے۔ حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے سلطنت بھی کر کے دکھائی، خلافت کی گدی پر بیٹھ کر ملکوں کو بھی فتح کیا، مگر ملکوں پر اس لئے قبضے نہیں کئے کہ ان سے کچھ کھانا پینا مقصود تھا، اس لئے فتح کیا تا کہ مخلوق کو سیدھے راستے پر چلائیں۔ انکو خدا کے قانون پر چلائیں۔ انہوں نے اللہ و رسول کے نائب بن کردہ کام کئے جو اللہ کا منشاء تھے۔ دن بھر خلافت کے کام سرانجام دیتے، جب وقت آتا تو مسجد میں جاکے سجدے کرتے اور عبادت کا کام سرانجام دیتے، تو ایک طرف عبادت اور ایک طرف خلافت کر رہے ہیں۔

اس لئے صحیح معنوں میں انسان وہ ہے جو اپنی ذات کو اپنے پروردگار کے سامنے جھکا دے اور عبادت میں آگے بڑھے، کہ اس کی ناک، پیشانی، ہاتھ، پیر، اس کی روح اور خیال بھی اللہ کے سامنے ذلیل بن کر جھک جائے۔ یہ کام اپنی ذات کے لئے ہوگا، یہ عبادت ہے، دوسرا فریضہ یہ ہے کہ تختِ خلافت پر بیٹھ کر دنیا سے برائیوں کا خاتمہ کرے۔ اس لئے نہ فقط عبادت اور نہ فقط خلافت مقصدِ زندگی ہے بلکہ دونوں مقصود ہیں۔

ہمارے سب کے باپ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے پیدا کیا، تو سب سے پہلے ملائکہ سے یہی بات فرمائی: ﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ ① میں زمین میں اپنا ایک نائب اتارنے والا ہوں۔ آدم علیہ السلام نائب کس چیز میں تھے؟ عبادت میں نائب نہ تھے، عبادت اللہ کا کام تھوڑا ہی ہے، وہ تو معبود ہے، عبادت سے بری ہے، عابد نہیں ہے۔ لیکن عالَم کو درست رکھنے، اس کی تربیت اور اصلاح کے لئے خلافت دی، مگر یہ

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۰.

خلافت وہ انجام دے گا، جو پہلے عبادت کر کے اپنے آپ کو درست کرے۔ پہلے اللہ کے سامنے جھک کر اپنے اخلاق درست کرے اپنے اندر نیاز مندی اور بندگی کی شان پیدا کرلے۔اس میں تواضع وخاکساری وللھیت بھی ہو، نہ غرور وتکبر رہے، نہ حرص ولالچ رہے، بلکہ اس میں غنا اور ایثار ہو۔مخلوق کی خدمت کا جذبہ اس میں ہو۔ یہ جذبات عبادت کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔عبادت کر کے جب جذبات پیدا ہو گئے۔اب وہ نائب خدا بن گیا، اب وہ دوسروں کی اصلاح کرے گا۔تو مقصد زندگی دو چیزیں نکل آئیں۔ایک عبادت دوسرے خلافت۔

تکمیل ایمان کے لئے عبادت وخلافت دونوں ضروری ہیں......اسی واسطے ایمان کے دو رکن فرمائے گئے: ’’اَلتَّعْظِیْمُ لِاَمْرِ اللہِ وَالشَّفَقَۃُ عَلٰی خَلْقِ اللہِ‘‘ ترجمہ:...... ’’اللہ کے امر کی تعظیم کرنا،اس کے سامنے جھک جانا۔دوسرے اس کی مخلوق پر شفقت اور اس کی خدمت کرنا‘‘۔دونوں باتوں سے مل کر ایمان بنتا ہے۔ایک شخص چوبیس گھنٹے مسجد میں رہے،مخلوق چاہے جیئے یا مرے اسے کوئی پرواہ نہیں۔اس کا آدھا ایمان ہے۔اور ایک شخص رات دن مخلوق کی خدمت میں انجمنوں کے ذریعے لگا ہوا ہے۔مگر مسجد میں جانے کا نام نہیں لیتا اس کا آدھے سے بھی کم ایمان ہے۔اس لئے کہ خلافت کا کام تو انجام دیا مگر عبادت چھوڑ دی۔انسان مکمل تب ہوگا جب ایک طرف عابد و زاہد ہو اور ایک طرف خلیفہ خداوندی ہو۔ایک طرف وہ کام کرے جو مخلوق کے کرنے کا ہے،وہ عبادت ہے۔ایک طرف وہ کام کرے جو خالق کا ہے،وہ تربیت ہے۔انبیاء علیہم السلام کی یہی زندگی ہے،راتوں کو دیکھو تو تہجد پڑھتے پڑھتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر ورم آجاتا تھا۔دنوں میں دیکھو تو مخلوق کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ہدایت وتبلیغ فرما رہے ہیں۔دنیا کے بادشاہوں کے نام خطوط جاری فرمارہے ہیں،جن میں اسلام کی دعوت دی جارہی ہے۔سفر فرمارہے ہیں،کبھی طائف میں ہیں،کبھی مدینہ میں ہیں،تاکہ خلق خدا نیک راستے پر آجائے۔یہ خلافت کا کام ہے۔مسجد نبوی میں جس طرح سے آپ نماز پڑھتے،اسی طرح سے آپ مقدمات کے فیصلے بھی فرماتے،مسجد میں جیسے عبادت ہوتی،ویسے ہی درس وتدریس کے ذریعے تعلیم بھی ہوتی،یہ خلافت کا کام تھا۔نماز پڑھنا،تلاوت کرنا،سجدے کرنا،یہ عبادت کا کام تھا۔

یہی شان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ہے کہ ایک طرف تخت خلافت پر بیٹھ کر مخلوق خدا کی اصلاح،ایک طرف بورئے اور چٹائی پر بیٹھ کر اللہ کے سامنے عجز و نیاز سے سر جھکا دینا۔

فارس میں جب جنگ ہوئی ہے تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعداد کل تیس یا تینتیس ہزار تھی۔ فارسیوں کا تین لاکھ کا لشکر تھا،پھر فارس کی فوجیں کیل کانٹے سے مسلح وردیاں،غذائیں اور رسدان کی باقاعدہ۔یہ تو اہل فارس کی شان۔اور ادھر صحابہ کرام محض درویشوں کا ایک لشکر۔وردی تو یہ ہے کہ کسی کے پاس کرتہ ندارد ہے،تو کوئی لنگی باندھے ہوئے ہے،کسی کے پاس لمبا کرتہ،کسی کے سر پر پگڑی نہیں تو رسی باندھ رکھی ہے،کسی کے ہاتھ میں نیزہ،کسی کے ہاتھ میں تلوار،کسی کے ہاتھ میں خنجر۔ہتھیار،لباس نہ غذائیں کچھ بھی باقاعدہ نہیں درویشوں کا لشکر

ہے۔ مگر کیفیت یہ تھی۔ لاکھوں فارسی آتے تھے جب صحابہ رضی اللہ عنہم بھوکے شیروں کی طرح پڑتے تھے وہ بلیوں کی طرح سے بھاگتے تھے، اور یہ غالب تھے۔ پورے فارس میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ فارس کا سب سے بڑا سپہ سالار رستم تھا۔ آپ نے رستم پہلوان کا نام سنا ہوگا، وہ کمانڈر انچیف تھا، اس نے تمام سرداروں اور لیفٹننٹوں کو جمع کیا اور کہا کہ یہ غضب کی بات ہے کہ ہمارا لشکر تین لاکھ، اور عرب کے بدو، کل تیس ہزار، پھر ان کے پاس سامان با قاعدہ نہیں، ہمارے پاس سامان با قاعدہ، انہیں مدد نہیں پہنچ رہی، ہمارے پیچھے پورا ملک ہے۔ یہ ہمارے ملک میں حملہ کرنے آئے ہیں۔ انکا ملک دور رہ گیا، یہ ہمارے ملک میں گھرے ہوئے ہیں، مگر اس کے باوجود حملہ کرتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بھوکے شیر ہیں اور تم فارسی اس طرح سے بھاگتے ہو جیسے لومڑیاں بھاگتی ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے؟ تمہارے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ سرداروں نے کہا اے رستم! اگر آپ سچی بات پوچھیں، ہم بتلادیں، مگر ہماری جان کی بخشش کردی جائے، امان دیا جائے کہ ہمیں قتل تو نہیں کیا جائے گا۔ اس نے کہا تمہاری جان کو امان دی جاتی ہے۔

اب سرداروں نے مل کر کہا، اے رستم! یہ مٹھی بھر عرب تیرے ملک پر غالب آکر رہیں گے، انہیں کا قبضہ ہوگا، انہی کی حکومت ہوگی۔ پورا ایران ان کے تحت میں آئے گا۔ یہ نہیں ہاریں گے، تم ہاروگے۔ رستم نے کہا کیوں؟ انہوں نے کہا۔ اس وجہ سے کہ انکی شان یہ ہے۔ ''هُمْ بِالَّيْلِ رُهْبَانٌ وَبِالنَّهَارِ فُرْسَانٌ'' دن بھر یہ گھوڑے کی پشت پر سوار جہاد میں مصروف ہیں اور رات میں مصلے کی پشت پر سوار ہیں، اللہ کے آگے گڑگڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے مالک! ہم میں کوئی طاقت نہیں، طاقت والا تو ہے، ہم تیرے سپاہی ہیں، تو اگر ہمیں فتح دے گا، تو ہم فتح یاب ہو جائیں گے۔ تو ہمیں شکست دے گا، شکست کھا جائیں گے۔ ہمارے اندر کوئی طاقت اور قوت نہیں۔ قوت وسلطنت تیری ہی ہے۔ تو رات بھر اللہ کے سامنے گڑگڑاتے ہیں۔ عجز و نیاز سے سر زمین پر رگڑتے ہیں اور دن کو گھوڑے کی پشت پر سوار ہوتے ہیں۔

اور ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ ایسے بزرگ ہیں، جس گاؤں میں جاتے ہیں، اگر کھیتیاں جلی ہوئی ہوتی ہیں تو سرسبز ہو جاتی ہیں۔ یہ دوسروں کی بیٹیوں کی ایسے ہی حفاظت کرتے ہیں، جیسے اپنی بہو بیٹیوں کی کرتے ہیں۔ اور اے رستم! تیرا یہ لشکر، شرابیں یہ پیتے ہیں، جس گاؤں میں جا پڑتے ہیں، بہو بیٹیوں کی عزتیں برباد ہو جاتی ہیں۔ جس کھیتی اور باغ میں پہنچ جاتے ہیں۔ پھل اجڑ جاتے ہیں۔ کھیتیاں سب برباد ہو جاتی ہیں، یہ اثرات تیری فوج کے ہیں۔ اور یہ اعمال ان کی فوج کے ہیں۔ تو غلبہ تجھے ہوگا یا انہیں ہوگا؟ راتوں کو مصلے کی پشت پر یہ عبادت میں مصروف اور دنوں کو گھوڑے کی پشت پر سوار، اللہ کے نائب بن کر یہ دنیا کی اصلاح کے در پے۔ تو در حقیقت رستم اور اس کے سرداروں نے پہچانا کہ ان بزرگوں میں یہی دو چیزیں تھیں۔ ایک طرف یہ عبادت میں کامل اور ایک طرف خلافت میں کامل۔ ایک طرف سر نیاز اللہ کے سامنے جھکا ہوا ہے، ایک طرف اس کی مخلوق کی اصلاح کے لئے دنیا میں سفر کر رہے ہیں۔ جو مفسد سامنے آتا ہے اس کو راستے سے ہٹاتے ہیں تا کہ دین پہنچ سکے اور لوگ دین پر غور کرسکیں۔

بہرحال جب مقصد زندگی عبادت اور خلافت نکلا، سب سے بڑے عابد دنیا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور سب سے بڑے اللہ کے نائب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے، تو ان کی امت کو بھی سب سے بڑا عابد اور سب سے بڑا نائب خداوندی بننا چاہئے۔ یہ امت اس لئے آئی ہے کہ رات دن عبادت میں مصروف رہے اور رات دن اللہ کی نائب بن کر اللہ کی مخلوق کی اصلاح کرے۔ یہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اٹھے۔ اپنی زندگی اور موت کا یہ مقصد قرار دے میں چاہے جیوں یا مروں، مگر خدا کا نام اونچا ہو، تو اللہ اس قوم کو کبھی ذلیل نہیں کرے گا۔ ذلت و رسوائی جب ہوتی ہے جب کوئی خدا کے نام کو چھوڑ کر اپنی برتری چاہے، اپنے عیش کو آگے رکھے۔ خدا کی طرف سے اس کی مدد نہیں ہوتی۔ اس پر دشمن اور اقوام مسلط کی جاتی ہیں، جو اس کو غلامی میں بھی جکڑ کر بند کرتی ہیں۔ لیکن جو کہے مجھے ملک و دولت مقصود نہیں، مجھے اللہ کا نام اونچا کرنا ہے۔ میری دولت، میری جان اور خاندان اس کے لئے وقف ہے، اس نصب العین کے تحت زندگی ہوگی، وہ بھی باعزت ہوگی، موت ہوگی، وہ بھی باعزت ہوگی۔ انسان کو اصل میں عزت کی زندگی کے لئے اللہ کا نائب بنا کر بھیجا گیا ہے۔ دنیا میں ذلیل ہونے کے لئے نہیں بھیجا گیا۔ تو سب سے بڑے خلیفہ خداوندی اور عابد خداوندی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جیسے وہ سردار انبیاء ہیں، یہ امت امتوں کی سردار بنائی گئی۔ اس کو خیر امت اور افضل الامم کہا گیا، مگر افضلیت کیوں؟ کھانے پینے اور دولت کی وجہ سے نہیں۔ اس وجہ سے کہ اس کا کام یہ ہے کہ یہ دنیا کی قوموں کی اصلاح کرے۔ دنیا کی قوموں میں جو کھوٹ ہے اس کو رفع کرے اور اگر یہ دنیا کی قوموں کی نقالی کرنے لگے کہ جو کھوٹ انکے اندر ہے، وہ اپنے اندر لے لے، تو پھر یہ اصلاح کیا کرے گی؟ اس کا حاصل تو یہ نکلا کہ دوسری قومیں اس پر غالب آئیں گی، یہ غالب نہیں آسکتی۔ یہ ایک چیز سے غالب آسکتی ہے، وہ یہ کہ یہ کلمہ خداوندی کو اونچا کرنے کا نصب العین لے کر چلے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ تم دنیا کی قوموں پر دولت سے غالب نہیں آسکتے، دولت دوسروں کے پاس زیادہ ہے، تعداد میں تم دنیا پر غالب نہیں آسکتے۔ اہل باطل کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی ہے اور رہے گی۔ تم اگر دنیا کی قوموں پر غالب آؤ گے تو اخلاق محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے غالب آؤ گے۔ کردار سے غالب آؤ گے، دین کو لے کر اٹھو گے تو غالب آؤ گے۔ اس لئے سب سے بڑھ کر تمہارے پاس حجت دین ہے، اس سے بڑھ کر کوئی حجت نہیں۔ اگر آپ کسی سے بحث کریں اور یوں کہیں کہ میری عقل یوں کہتی ہے، دوسرا کہے گا میری عقل تم سے زیادہ ہے، میری عقل یوں کہتی ہے۔ لیکن اگر آپ یوں کہیں کہ یہ خدا کا حکم ہے، ہم خادم ہیں، ہمیں یہ حکم پورا کرنا ہے، دنیا کی ہر قوم چپ ہو جائے گی، اس سے آگے اب حجت نہیں ہے۔ آگے پھر زور اور طاقت ہے، تو جس قوم کے ہاتھ میں خدا کا نام ہو اور خدا کی نائب بن کر آئے۔ وہ حجت میں بھی اور انجام میں بھی غالب ہوتی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نبوت کے بعد خلافت ربانی کا کام شروع کیا اور اسلام کی دعوت دی، تو پورا مکہ، حجاز اور ساری قوم آپ کی دشمن تھی۔ عزیز اقرباء دشمن۔ صرف تین آدمی مسلمان ہوئے۔ بوڑھوں میں

صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ عورتوں میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور لڑکوں میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، باقی سارا خاندان دشمن۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ پورے استقلال کے ساتھ اس کلمہ کو لے کر چلے۔ تو قوت مکہ والوں کے ہاتھ میں تھی۔ تعداد ان کی زیادہ تھی۔ تیرہ آدمی جب مسلمان ہوئے، تو دار ارقم میں اندر سے زنجیر لگا کے نماز پڑھی جاتی تھی۔ خطرے کی وجہ سے مسلمان باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ ناداری اور مفلسی کا یہ عالم تھا، کہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں، ہم دار ارقم میں بند تھے۔ رات کو بارہ بجے میں پیشاب کرنے کے لئے باہر نکلا، صفا کی پہاڑی پر بیٹھا، پیشاب کیا، دھار جو پڑی تو ایسی کھنکھناہٹ کی آواز آئی جیسے کاغذ کے اوپر دھار گرتی ہے۔ میں نے پیشاب کرنے کے بعد ٹٹولا۔ معلوم ہوا چمڑے کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا تھا، اس کے اوپر پیشاب گر رہا تھا، اس چمڑے کے ٹکڑے کو لائے اور پانی سے پاک کیا، کئی وقتوں کے بھوکے تھے۔ اس چمڑے کو منہ میں ڈالا، جس سے تسلی ہوئی کہ میں بھی کچھ کھا پی رہا ہوں۔ یہ مفلسی اور ناداری کی کیفیت تھی۔ تو تعداد مسلمانوں کی تیرہ اور مشرکین مکہ کی تعداد کہیں زیادہ۔ افلاس کا یہ عالم کہ کھانے کو نہ ملے، خزانے سارے ان کے ہاتھ میں ہیں۔ مگر اس کے باوجود زندگی کا مقصد یہ تھا کہ اس کلمہ کو اونچا کرنا ہے۔ ہم خواہ مٹیں یا رہیں۔ تیرہ برس کے بعد پورا مکہ اور پورا حجاز اسلام میں داخل ہوا۔ یہی قوم جو اقلیت میں تھی، اکثریت میں آ گئی، وہ قوم جو بے شوکت تھی، ساری شوکتیں اس کے ہاتھ آ گئیں اور جو قومیں شیر بنی ہوئی تھیں، وہ اس کے سامنے جھک گئیں۔ اللہ کا نام لے کر کھڑے ہونے میں جب استقلال وثبات دکھلائے، تو دنیا کی قومیں جھک جاتی ہیں۔ ہمیں دوسری قوموں کی دولت وعزت نہیں چھیننی۔ ہمیں تو خدا کا نام پہنچانا ہے۔ چاہے ہم مر جائیں، مگر یہ کلمہ قبول کرو۔ اگر اس شان سے چلیں گے، دنیا کی قومیں ممنون ہوں گی۔

حدیث میں فرمایا گیا: جب کوئی قوم میرے قانون کی خلاف ورزی کرتی اور گناہوں میں ملوث ہوتی ہے، میں دنیا کی اقوام کے دلوں میں ان کے لئے دشمنی اور عداوت ڈال دیتا ہوں۔ وہ سزائیں دیتی ہیں۔ یہ درحقیقت میری طرف سے وہ قومیں جلاد بن کے کھڑی ہوتی ہیں، تاکہ معصیت چھڑا دیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: اگر یہ چیز تمہیں ناگوار ہو کہ دنیا کی قومیں تم پر غالب آئیں اور تمہیں سزائیں دیں، ان کے بادشاہوں کو برا مت کہو، میرے سے معاملہ درست کرلو۔ میں عداوت کی بجائے ان کے دلوں میں محبت ڈال دوں گا۔ آج جو قومیں نفرت کرتی ہیں۔ کل کو وہ تمہاری طرف مائل ہو جائیں گی۔ دشمنی کرنے کی بجائے تمہاری خادم بن جائیں گی، قلوب تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ جب آدمی اللہ کا نائب بن کے اس کے کام کے لئے کھڑا ہو، تو کوئی وجہ نہیں کہ دنیا اس کی عداوت پر ہی کمر بستہ رہے؟ ایک نہ ایک دن عداوت ختم کر دینی پڑے گی۔ مگر شرط یہی ہے کہ نہ ہمیں دوسروں کا اقتدار چھیننا ہے نہ دولت چھیننی ہے۔ نہ کسی قوم سے حسد ہے۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ بس نیک اور صالح بن جاؤ۔ ہم نمونہ بن کے سامنے آئیں۔ اگر ہم کہیں کچھ اور نمونہ دوسرا پیش کریں، دنیا ہماری بات کو کبھی نہیں مانے گی۔ کہنے کی ضرورت

نہیں۔ کرکے دکھلانے کی ضرورت ہے۔ دنیا جھک جائے گی۔

اخلاقی قوت سے ہی انسان اونچا ہو سکتا ہے..... حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم جب ہندوستان میں آئے ہیں، تو سب سے پہلے سندھ میں داخل ہوئے۔ مؤرخین لکھتے ہیں سندھ کے بازاروں سے جب صحابہ گزرے، تو ہزاروں لوگوں نے ان کے چہرے دیکھ کر اسلام قبول کیا اور کہا کہ یہ چہرے جھوٹوں کے چہرے نہیں ہو سکتے۔ ان کے چہروں پر سچائی برستی ہے۔ انکا کردار اور چہرہ مہرہ سب اسلام کا مبلغ تھا۔ ہم اپنے کردار سے دنیا کی اقوام کو اسلام سے نفرت دلا رہے ہیں۔ دنیا کی اقوام ہمارے عمل کو دیکھ کر اسلام کو سمجھتی ہیں۔ جب وہ ہمارے اعمال کو دیکھتی ہیں، کہتی ہیں کہ ایسے اسلام کو سلام ہے، اسے قبول کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اسلام کے مبلغ کیا ہوئے، ہم خود اسلام کی تبلیغ میں روڑا بنے ہوئے ہیں۔ تو اس کی ضرورت ہے کہ ہم اپنی عملی زندگی درست کریں، ہمیں علم و تعلیم اور اسلامی اعمال سے واقفیت ہو۔ جہالت کے ساتھ دنیا کی کوئی قوم اونچی نہیں ہو سکتی۔ انسان کے لئے ترقی کا پہلا زینہ علم ہے۔ تو تعلیم بھی ہو اور اخلاق درست ہوں۔ ہم میں صبر و تحمل، بردباری، حیاء، غیرت، حمیت، جذبہ خدمت ایسے اخلاق ہوں۔ جب یہ اخلاق اور علم ہوگا تو ایسی قوم کبھی نیچے نہیں رہ سکتی۔ یہ علم اور اخلاق ایک قوت ہے جو انسان کو گرنے نہیں دیتی۔ یہ انسان کو اونچا بنا دیتی ہے۔ یہ جب نکل جاتی ہے تو کوئی چیز آدمی کو اونچا نہیں کر سکتی۔ جیسے ربڑ کی گیند میں ہوا بھری ہوئی ہے۔ اگر اسے آپ زمین پر زور سے پٹخ دیں تو اتنا ہی اوپر جائے گی۔ اس لئے کہ اس میں ہوا کی قوت بھری ہوئی ہے۔ وہ نیچا نہیں دیکھ سکتی۔ اگر ہوا نکال دیں، وہ پھس سے ہو کے وہیں رہ جائے گی۔ ایک مسلمان کو مثل گیند کے سمجھو۔ اس میں جب تک دین اور علم و اخلاق کی ہوا بھری ہوئی ہے۔ اگر اس کو کوئی زمین پر پٹخے گا بھی یہ اوپر ہی جائے گا۔ اور اگر یہ روح اس کے اندر سے نکل گئی پھر جس قوم کا جی چاہے، اسے تھپڑ مارے اور نیچے گرا دے۔ ہوا کی طاقت تو اس میں ہے نہیں۔ اس لئے ہوا اندر ہی بھری چاہئے جس سے اندر طاقت آئے۔ اور طاقت روح سے آتی ہے، پھر روح کی طاقت علم و اخلاق سے، اسی سے آدمی کو خلافت کا مقام ملتا ہے۔ اسی سے انسان کے اندر عبادت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ جب تک کسی چیز کا مقصد پورا نہ ہو۔ اس کی زندگی بے کار ہوتی ہے۔ مثلاً مدرسہ ہے، اس کا مقصد تعلیم ہے۔ اگر تعلیم نہ ہو، مدرسہ بے کار ہے۔ گھر کا مقصد رہن سہن ہے، اگر اس میں رہن سہن نہ ہو گھر بنانے کا فائدہ کیا؟ بازار کا مقصد یہ ہے کہ سامان ملے، اگر سامان نہ ملے تو بے کار ہے۔ اگر انسان کا مقصد عبادت و خلافت ہے۔ جب یہ مقصد نہ ہو، یہ انسان گولی مار دینے کے قابل ہے۔ اگر مقصد پورا کر رہا ہے تو وہ زندگی کا ثبوت دے رہا ہے۔

مسلمان کا دنیا میں مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہے...... دنیا کی اقوام کے مقاصد مختلف ہوتے ہیں۔ کسی کا مقصد دولت، کسی کا روٹی، کسی کا اقتدار۔ اسلام اور مسلمان کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہے، کہ میں رہوں یا نہ رہوں خدا کا نام اونچا ہونا چاہئے۔ میں اللہ کا نائب بن کے آیا ہوں۔ میں تو اسی کے نام کا ڈھنڈورچی ہوں۔ جب تک

آپ اللہ کے نام کا ڈھنڈورا پیٹیں گے۔ اللہ کی حکومت کی قوت آپ کی پشت پر رہے گی۔ جب اسے چھوڑیں گے، قوت ختم ہو جائے گی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بادشاہ جب کوئی قانون نافذ کرتا ہے، تو قانون کو گورنروں کے پاس بھیجتا ہے۔ گورنر کمشنر کے پاس اور کمشنر کلکٹر کے پاس اور کلکٹر تحصیل دار کے پاس بھیجتا ہے۔ اور تحصیل دار کیا کرتا ہے؟ وہ بھنگی بلاتا ہے ڈھول اس کے گلے میں ہوتا ہے اسے کہتا ہے کہ اس قانون کی منادی کر دے۔ تو بھنگی کی کیا قدر و قیمت ہے۔ معمولی اس کی تنخواہ ہوگی۔ لیکن جب سرکاری قانون کی منادی کرتا ہے، گورنمنٹ کی پوری قوت اس کی پشت پر ہوتی ہے۔ اگر اس وقت آپ اس کے گلے میں سے ڈھول نکال کر تھپڑ ماریں، پوری گورنمنٹ مدعی بن جائے گی۔ کیونکہ تم نے گورنمنٹ کے قانون کی منادی کرنے والے کی توہین کی، گویا گورنمنٹ کی توہین کی۔ مقدمہ قائم ہو جائے گا۔ تو بھنگی کی کوئی قوت نہیں۔ اصل قوت گورنمنٹ کی ہے۔ جب ایک مسلمان منادی بنے گا اور اللہ کا بھنگی بن کر اس کے قانون کو دنیا میں پکارتا پھرے گا، اس حالت میں اگر اس کی کوئی توہین و تذلیل کرے، وہ گویا خدا کی گورنمنٹ کی توہین کر رہا ہے۔ اللہ کی مدد شامل حال ہوگی۔ وہ کبھی نیچا نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں آپ اپنے کو اونچا بنائیں گے، تو ہماری قدر و قیمت نہیں۔ ہمیں جس کا جی چاہے نیچا دکھا دے۔ مگر جب خدا کی روح بھری ہوئی ہو، اسے لے کر چلیں تو اسے کوئی نیچا نہیں دکھا سکتا۔ تو بات وہ کرنی چاہئے جس سے ہم میں طاقت پیدا ہو۔ ہماری طاقت نہیں ہے۔ ہماری طاقت تو اللہ کے نام اور کام میں ہے۔ جو آیت کریمہ میں نے پڑھی، اس میں زندگی کے دو مقصد بتلائے۔ ایک عبادت اور دوسرے خلافت۔ عبادت کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا۔ ﴿یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ﴾ ① حضرت لقمان علیہ السلام فرماتے ہیں اے میرے بیٹے! نماز قائم کر، نماز ہی چونکہ اصل میں عبادت ہے۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ خدا کا عبادت گزار بندہ بن۔ اللہ کے آگے اپنی ذلت پیش کر، اسی میں تیری عزت اور رفعت و سربلندی ہے۔ تو یہ فریضہ عبادت کا ہے جو زیادہ سے زیادہ نماز کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

دوسری بات فرمائی: ﴿وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ② معروف کا امر کر اور منکر سے ممانعت کر۔ یعنی دنیا میں نیکی پھیلاؤ اور برائیاں مٹاؤ۔ دنیا کی قوموں کو اچھے کاموں کی عادت ڈالو، برے کاموں سے روکو۔ فحش و بے حیائی کو مٹاؤ، بے غیرتی و بے حمیتی کا دنیا سے خاتمہ کرو۔ حیا، ایثار، سخاوت، مروت اور شجاعت، ان اخلاق کو دنیا میں پھیلاؤ، تاکہ اللہ کی طاعت و عبادت دنیا میں پھیلے اور بغاوت ختم ہو۔ اس کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہا گیا۔ امر بالمعروف یعنی نیکی کا آرڈر دینا۔ نہی عن المنکر، برائی سے روک دینا۔ اصل میں یہ کام اللہ کا ہے، وہ سب سے بڑا امر فرمانے والا اور برائیوں کو روکنے والا ہے۔ مگر اس نے انسان کو اپنا نائب بنایا، کہ تم میری طرف سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو۔ تو اس سے خلافت دنیا بھی ثابت ہوئی ہے۔ جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا

① پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۱۷۔ ② پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۱۷۔

عَنِ الْمُنْكَرِ، وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْأُمُوْرِ﴾ ① حق تعالیٰ فرماتے ہیں: اگر ہم ان مسلمانوں کو طاقت واقتدار اور بادشاہت دے دیں۔ تو ان کا مقصد کیک پیسٹری کھانا نہیں ہوگا۔ ان کا مقصد اللہ کی ترجمانی ہوگا۔ یہ نمازوں کا نظام قائم کریں گے، صدقات پر دنیا کو مائل کریں گے۔ اچھی باتوں کا آرڈر جاری کریں گے برائیوں کو دنیا سے روکیں گے، یہ ان کا کام ہوگا۔ معلوم ہوا سلطنت دینے کا بڑا مقصد امر بالمعروف کا نظام قائم کرنا اور منکرات کو دنیا سے مٹانا ہے، اس کا نام خلافت ہے۔

قربانی سے نصب العین دنیا میں پھیلتا ہے..... ظاہر بات ہے جب مسلمان امر بالمعروف اور نصیحت لے کر کھڑا ہوگا۔ ساری دنیا نہیں مانا کرتی، کچھ دوست بن جاتے ہیں، کچھ دشمن۔ مبلغ کے سامنے مقابلہ بھی کرتے ہیں۔ برا بھلا بھی کہتے ہیں۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کتنی گستاخیاں کی گئیں، اس میں صبر وتحمل، عالی ظرفی اور بڑے اخلاق کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے آگے فرمایا گیا: ﴿وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ﴾ ② اور اس راستے میں جتنی مصیبتیں آئیں، ان کو جھیلنے کی عادت ڈالو اور اپنے اندر صبر وتحمل پیدا کرو، جس قوم میں صبر وتحمل اور برداشت آ گئی۔ وہ قوم کامیاب ہے۔ چاہے وہ ابتداء میں تکلیف اٹھائے۔ مگر چند دن کے بعد غلبہ اسی کا ہوگا۔ تو تین چیزیں فرمائی گئیں۔ عبادت وخلافت کا نظام اور اخلاق کا نظام، کہ صبر وتحمل اور اولوالعزمی ہو جو آدمی ذرا ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جائے۔ کسی نے گالی دے دی، بس لڑنے مرنے کو تیار، کسی نے اشارہ ہی کیا تو مکا دکھانے کو تیار، وہ کبھی کام نہیں کر سکتا۔ کام وہ کرے گا کہ قتل کی بھی دھمکیاں ہوں، دولت بھی چھین لی جائے، غلامی کی بھی دھمکی دی جائے۔ مگر وہ پرواہ نہ کرے، کہ یہ چیزیں مجھے مقصود نہیں مجھے تو اللہ کا نام بلند کرنا ہے۔ فاقہ کروں یا کچھ کروں مگر مجھے تو آگے بڑھنا ہے وہ کبھی نیچا نہیں ہو سکتا۔

اس واسطے اس آیت کی روشنی میں میں نے یہ تین باتیں عرض کیں۔ ایک عبادت درست ہونی چاہئے۔ ایک خلافت کا جذبہ ہونا چاہئے اور ایک اخلاق اور کردار درست ہونا چاہئے۔ تب جا کے قوم کی زندگی بن سکتی ہے، اگر عبادت اور خلافت کا جذبہ نہ ہو، اخلاقی قدریں بھی نہ ہوں آخر پینے اور زندہ رہنے کی صورت کیا ہے؟

روٹی زندگی نہیں، زندگی انسان کا کردار اور نصب العین ہے۔ وہ ہوگا تو قوم زندہ ہے۔ آج دنیا میں جتنی قومیں بڑھ رہی ہیں، وہ کھانے پینے سے نہیں، یہ تو آثار میں سے ہے، خود ہی آ جاتا ہے۔ اصل نصب العین ہے، جو قوم کوئی مقصد لے کر کھڑی ہوئی اور وہ اس مقصد کی خاطر قربانیاں دے، وہ بڑھے گی اور اقتدار پائے گی۔ ہم کوئی بھی مقصد نہ رکھیں۔ بس کھا پی لیا اور سو گئے۔ یہ کوئی زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ اگر یہ مقصد ہے تو ہر جانور بھی یہ مقصد لئے ہوئے ہے، تو پھر انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ انسان تو کوئی کمال لے کر آیا ہے۔ جامع تو اتنا کہ ساری مخلوقات اور خالق کے کمالات کے نمونے موجود اور مقصد صرف روٹی۔ اتنا اعلیٰ کردار لے کر آئے اور

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۴۱. ② پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۱۷.

مقصد اتنا پھسپھسا، جو ہر جانور کو بھی میسر۔ جیسا جامع ہے ویسا ہی مقصد بھی ہونا چاہئے۔ وہ مقصد یہی ہے کہ ایک طرف عبادت ہو، یعنی اللہ کا سچا بندہ اس کے نام پر مرمٹنے والا۔ اور ایک طرف اس کا نائب کہ اس کا خلیفہ بن کر پوری دنیا میں اصلاح کا پیغام پہنچانے والا۔ اور اس میں مضبوط اتنا کہ جو مصیبت آئے، اسے خوشدلی سے جھیلنے کو تیار، ایسے افراد اور ایسی قومیں ہمیشہ بلند و بالا ہوتی ہیں۔ غور کیا جائے جو تین چیزیں میں نے پیش کی ہیں یہ قوم کی برتری اور سربلندی کا پیغام ہیں۔ تفصیلات اس کی بہت ہیں۔ وہ تعلیم اور غور وفکر سے معلوم ہونگی، مگر اصولاً یہی تین چیزیں ہیں جس سے قومیں بڑھتی ہیں۔ ایک صحیح نصب العین کہ سچا عابد اور دوسرا نصب العین کہ سچا خلیفہ ربانی اور تیسرا کہ سچا اخلاقی نمونہ رکھنے والا اس سے انشاء اللہ برتری ہوگی۔

یہ آیت ہے تو دو تین لفظوں کی، مگر اس نے بڑا عظیم پروگرام پیش کر دیا ہے اور یہی اللہ کے کلام کی خصوصیت ہے۔ میرا آپ کا کلام نہیں خدا کا کلام ہے کہ دو لفظ فرمائے جاتے ہیں۔ اور علوم کے دریا اس کے اندر بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ جتنا کھودتے جاؤ، نکالتے جاؤ۔ جتنا غرق ہوتے جاؤ موتی نکالتے جاؤ۔ اس لئے قرآن کریم کو معجزہ کہا گیا۔ جیسے سمندر میں موتی اور ہزاروں جواہرات بھرے ہوئے ہیں مگر کوئی غوطہ لگانے والا اور نکالنے والا ہونا چاہئے، جس میں دم اور سانس ہو کہ نیچے پہنچے، موتی نکال کے لائے اور جو دم توڑ دے گا، وہ تو اپنی جان کھو کے آئے گا، موتی تو کیا نکال کے لائے گا؟ جو تیراکی کے فن سے واقف نہ ہو، تو وہ جائے گا جان کھو کر ہی آئے گا۔ تیراکی کا فن سیکھ کر پھر سمندر میں گھسا جائے، تو موتی نکالتا ہے۔ قرآن حکیم ایک سمندر ہے اور اس میں تیرنے کا فن تعلیم ہے۔ علم سیکھ کر جب آدمی اس میں گھسے گا تو ہزاروں موتی اور علم کے جواہرات نکلیں گے، قرآن کے معجزہ ہونے کا یہی حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک لفظ ہوتا ہے اور کوزے کے اندر ہزاروں دریا بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر میں اس کی تفسیر کروں تو کتنے ہی دن چاہئیں، تفسیر پھر بھی پوری نہیں ہوگی۔ اس لئے بالا جمال یہ تین مقاصد نکال کر پیش کئے، ان کی تفصیلات کے لئے لمبی مدت کی ضرورت ہے بالا جمال ان مقاصد کو یاد رکھ کے اپنی زندگیوں کا جائزہ لینا چاہئے کہ کس حد تک ہم ان مقاصد کو پورا کر رہے ہیں۔ اور اگر پورا نہیں کر رہے، تو اس کے اسباب کیا ہیں؟ معلوم کر کے انہیں زائل کیا جائے۔ اس واسطے میں نے یہ تین چیزیں پیش کیں۔ امید ہے کہ آپ حضرات ان تینوں پر وقتاً فوقتاً غور کریں گے اور اپنی زندگی کو بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ کامیابی دے گا۔ ہزاروں مسائل کا اس میں علاج ہے۔ ہزاروں مصائب دنیوی واخروی کا حل اسی کے اندر ہے۔ حق تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمادے کہ ہم اپنے پروردگار کے کلام پر چلنے کی کوشش کریں اور اپنی زندگی کو قرآن وحدیث میں ڈھالیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی مرضیات پر چلائے اور اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نصیب فرما دے۔ (آمین)

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَآاَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ .

اخلاص فی الدین

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَـرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَـدُ اَنَّ سَیِّـدَ نَـاوَسَـنَـدَ نَـا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّا بَعْدُفَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿قُلْ اِنَّنِیْ ھَدٰنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ، دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّۃَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا ، وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ٥ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ٥ لَاشَرِیْکَ لَہٗ ، وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ (1)

طریقِ سنّت پر عمل سے عادت بھی عبادت بن جاتی ہے..... بزرگانِ محترم! حق تعالیٰ کا شکر اور احسان ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور اس پر ہم کو فخر ہے لیکن ہم کبھی اس پر غور نہیں کرتے کہ اسلام کا کیا معنی ہے؟ اس لئے مختصر سے وقت میں اس کا معنی بیان کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے دو لفظ "عادت اور عبادت" سنے ہوں گے۔

عادت تو ان کاموں کو کہا جاتا ہے جو ہم روز مرہ (کی زندگی میں) کرتے ہیں۔ مثلاً کھانا، پینا، دوستوں سے ملنا، گھریلو زندگی، اجتماعی زندگی اور ایسے ہی جتنے طبعی افعال ہیں ان کو عادت کہا جاتا ہے۔ اور عبادت یہ ہے کہ انہی (مذکورہ بالا) افعال کو طریق سنت کے مطابق کیا جائے اور یہ جو ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ مسجد میں جانا تو عبادت ہے لیکن گھر میں رہنا عبادت نہیں۔ یہ خیال غلط ہے کیونکہ اگر ہم گھریلو معاملات میں بھی سنت طریقہ پر عمل کریں گے تو وہ بھی عبادت ہو جائیں گے۔ صرف نیت کی ضرورت ہے یہی روزہ ہے اگر ایک آدمی بلا نیت سارا دن بھوکا رہے تو کوئی ثواب نہیں ہوتا۔ لیکن اگر روزے کی نیت کرے تو تھوڑی نیت کی تبدیلی سے یہی عبادت بن جاتی ہے۔ تو اگر ہم ساری دنیا کو دین بنالیں تو کتنا اچھا سودا ہے اور اگر ہم نیت کے ذرا سے فرق سے دین کو دنیا بنالیں تو کتنا مہنگا سودا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ: اگر ایک آدمی "بِسْمِ اللّٰہِ" سے کھانا شروع کرے اور "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کَثِیْرًا" پر ختم کرے تو اس کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ صرف نیت کرنے سے اتنا بڑا اجر ملا کہ دنیا تو بنی ہی

---

(1) پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۶۱-۱۶۳.

لیکن دین بھی ساتھ ہی بنا۔ اسلام چاہتا ہے کہ تمام دنیاوی کاموں کو دین بنادیا جائے۔ ①

حدیث میں ہے: "اَلسِّوَاکُ مَطْهَرَةٌ لِلْفَمِ وَمَرْضَاةٌ لِلرَّبِّ" ② مسواک کرنا منہ کی صفائی کا ذریعہ اور خوشنودی الٰہی کا باعث ہے۔ تو مسواک کرنا دنیا بھی ہے۔ (جب کہ محض یہی نیت ہو کہ دانت اچھے ہوں گے) اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا بھی سبب ہے اس لئے دین بھی ہے۔ احادیث میں ہے کہ: آپ بہت مسواک فرماتے تھے۔ نمازوں کے اوقات، تہجد کے وقت اور اکثر اپنے دوستوں سے فارغ ہو کر مسواک فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ مرض وفات میں بھی آپ نے مسواک کی طرف دیکھا تھا۔ تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سمجھ گئیں کہ آپ کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسواک دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسواک فرمایا، پھر وہی مسواک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا باقی ازواج مطہرات پر اس بنا پر فخر کیا کرتی تھیں کہ آپ کا لعاب مبارک میرے حلق میں گیا اور آپ کی وفات اس حالت میں ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک میری گود میں تھا۔

اسلام کا ہر عمل دو حیثیت کا حامل ہے..... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ: یا رسول اللہ! آپ اس قدر کثرت سے مسواک کیوں فرماتے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ملائکہ علیہ السلام سے میری گفتگو ہوتی ہے اور ان کو بو سے نفرت ہے ایسے ہی اسلام کے ہر عمل میں ایک راستہ دنیا کی طرف اور ایک راستہ دین کی طرف جاتا ہے"۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عیادت کے لئے ایک نوجوان حاضر ہوئے۔ جب واپس جانے لگے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ انکو بلاؤ۔ جب ان کو بلایا گیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "یَا اَخِیْ اِرْفَعْ ثَوْبَکَ فَاِنَّهٗ اَنْقٰی لِثَوْبِکَ وَاَرْضٰی لِرَبِّکَ" ③ اے بھائی! (ٹخنوں سے نیچے جو آپ کا کپڑا ہے اس) اپنے کپڑے کو اوپر اٹھاؤ، کیونکہ اس سے کپڑا بھی صاف رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی راضی ہوتے ہیں۔ (تو کپڑے کی صفائی بھی ہے اور رضائے خداوندی بھی ہے، عمل ایک ہے لیکن دونوں حیثیتیں اس میں بھی ہیں)

مسلم شریف میں ایک حدیث ہے کہ: قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تین آدمیوں کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائیں گے۔ ان میں سے ایک "اَلْمُسْبِلُ" ازار کو نیچے کرنے والا بھی ہے ④ (ٹخنوں سے ازار کا نیچا ہونا علامت تکبر ہونے کے باعث غضب خداوندی کو دعوت دیتا ہے۔ اس لئے ازار کا اوپر ہونا اگرچہ اس سے صفائی بھی رہتی ہے لیکن اللہ کی رضا کا ذریعہ بھی ہے) تو ہر عمل میں حیثیتیں دو ہی ہیں، آپ کو جو ثواب ملتا ہے وہ آپ کے تعیین

① الصحیح للبخاری، کتاب الأطعمة، باب مایقول اذا فرغ من الطعام، ص: ۱۰۱۔

② الصحیح للبخاری، کتاب الصوم، باب سواک الرجل الصائم، ج: ۷، ص: ۱۸۔

③ الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب قصة البیعة والاتفاق علی عثمان بن عفان، ج: ۱۲، ص: ۳۵۔

④ الصحیح للبخاری، کتاب الإیمان، باب بیان غلظ تحریم الإسبال، ج: ۱، ص: ۲۲۷۔

حیثیت ہی پر تو ملتا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ: "وَفِي بُضْعِ أَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ." ① تمہاری شرمگاہوں میں بھی صدقہ ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ: "أَيَأْتِي أَحَدُنَا شَهْوَتَهُ وَلَهُ فِيهَا أَجْرٌ"؟ یعنی ہم میں سے کوئی اپنی شہوت کو پورا کرے تو اس میں بھی اسکے لئے اجر ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: یہی پانی اگر حرام موقع میں ڈالتا تو گناہ نہ ہوتا؟ جب اس نے حرام سے اجتناب کیا تو یہی عبادت ہوگی۔ تو شہوت کے پورا کرنے میں بھی دو حیثیتیں تھیں۔ ایک محض شہوت رانی اور ایک یہ ہے کہ اجتناب عن الحرام کی نیت سے شہوت کو پورا کیا جائے۔ تو اس حیثیت کے متعین کرنے کی وجہ سے وہ عبادت بن گئی۔

اتباعِ حکم ہی عبادت ہے...... حاصل یہ کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کے لئے نامزد ہو جائے وہ عبادت بن جاتی ہے۔ حتیٰ کہ بعض گناہوں کی بھی اگر شریعت کی طرف سے اجازت مل جائے تو وہ عبادت بن جاتے ہیں۔ مثلاً جھوٹ بولنا اگر چہ بہت بڑا گناہ ہے۔ لیکن صلح اور دفعِ فتنہ کے لئے واجب ہے۔ تو یہ عبادت میں شامل ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ عبادت کسی کام کے کرنے کا نام نہیں بلکہ حکم ماننے کا نام ہے۔ (اسی لئے باوجود اس کے کہ ایک چیز اپنی ذات کے لحاظ سے درست ہوتی ہے مگر شریعت حقہ خلافِ حکم ہونے کے باعث اس کے نتائج کو غلط قرار دیتی ہے مثلاً) جب نماز پڑھنے کا حکم دیا جائے تو پڑھنا عبادت ہے اور جب روکا جائے تو عبادت نہیں۔ جیسا کہ تین اوقات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ تو ان اوقات میں نماز پڑھنا حرام ہے۔ ایسے ہی روزہ ایک عبادت ہے لیکن جب اس سے روکا جائے تو عبادت نہیں۔ مثلاً عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہے، کیونکہ اس سے روکا گیا ہے۔ اسی طرح سچ کہنا عبادت ہے لیکن اگر سچ کہنے سے فتنہ وفساد بڑھے تو ناجائز ہے۔ جیسے غیبت کرنا جو کہ واقع میں تو سچ ہوتا ہے۔ (کیونکہ خلافِ واقعہ بموجب حدیث بہتان ہے) لیکن شریعت نے اس سچ سے منع فرمایا ہے۔ معلوم ہوا کہ عبادت حکم ماننے کا نام ہے (کسی خاص فعل یا قول کا نام نہیں) اور حکم دینے والے اللہ تعالیٰ ہوتے ہیں، وہی جانتے ہیں کہ کس جگہ حکم دینا مناسب ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: زمین پر اکڑ کر نہ چلو۔ کیونکہ اکڑ کر نہ ہی تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ ہی پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان بندہ ہے، بندگی کے لئے آیا ہے۔ اس کی مشیت (اس کا چلنا پھرنا) بھی بندگی ہی ہونی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ ② یعنی اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں۔ غرض اترا کر چلنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ یہ جہالت کی علامت ہے۔ اور اکڑ کر وہی چلتا ہے جو اپنی اصلیت کو بھول جاتا ہے۔ ایک متکبر آدمی بہت اکڑ کر چل رہا تھا۔ ادھر سے ایک بزرگ بھی آ رہے تھے، جن کی چال سے تواضع اور عاجزی ٹپک رہی تھی۔ تو اس بزرگ نے کہا کہ بھائی

① الصحيح لمسلم، كتاب الزكاة، باب بيان ان اسم الصدقة ...... ج: ۵، ص: ۱۷۷.

② پارہ: ۱۹، سورة الفرقان، الآية: ۶۳.

اکڑ کر نہ چھوتو اس کو غصہ آیا اور کہنے لگا کہ تم جانتے نہیں میں کون ہوں؟ تو یہ شخص اگر اپنے مال میں مست تھا تو وہ بزرگ اپنی کمال میں مست تھے۔ انہوں نے فرمایا، جانتا ہوں تم کون ہو؟ اور تمہارا تعارف یہ ہے کہ:

"اَوَّلُکَ نُطْفَةٌ وَاٰخِرُکَ جِیْفَةٌ وَاَنْتَ تَحْمِلُ بَیْنَهُمَا قَذِرَةً" یعنی تیری ابتدا تو اس پانی سے ہوئی جو بدن کو لگ جائے تو پلید ہو جائے، کپڑے کو لگ جائے تو ناپاک ہو جائے اور بدن سے نکلے تو غسل واجب ہو۔ اور انتہا میں تو ایک مردار ہے اور ان دونوں حالتوں کے درمیان گندگی اٹھائے پھرتا ہے۔ تو اس شخص کو اپنی حقیقت نظر آئی تو بہ کی اور کہا۔

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی   مرا با جان جاں ہمراز کردی

انسان کی ذات میں کوئی کمال نہیں ...... کمال درحقیقت جو بھی ہو وہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ انسان کی اپنی ذات تو گندگی ہی ہے۔ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اس میں عقل بھی نہیں ہوتی۔ فخر تو انسان اس وقت کرے جب اس کی ذات میں کوئی کمال ہو۔ ورنہ فخر کرنا جہالت ہے۔

انسان کا سب سے بڑا کمال ایمان ہے۔ لیکن اس پر غرور کرنا ٹھیک نہیں، شکر کرنا واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایمان کی توفیق دی۔ ورنہ جیسے دنیا میں سینکڑوں کفار پھرتے ہیں، اگر ہمیں بھی انہیں میں سے کردیتے تو ہماری کیا مجال تھی؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿یَمُنُّوْنَ عَلَیْکَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَکُمْ بَلِ اللّٰهُ یَمُنُّ عَلَیْکُمْ اَنْ هَدٰکُمْ لِلْاِیْمَانِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ یعنی اپنے اسلام کا احسان اللہ پر نہیں کرنا چاہیے بلکہ اللہ تعالیٰ کا احسان ماننا چاہیے کہ اس نے ایمان کی توفیق بخشی۔

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی   منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

بادشاہ کے خادم کو بادشاہ پر احسان نہیں رکھنا چاہیے کہ وہ اس کی خدمت کررہا ہے، بلکہ اس کو بادشاہ کا احسان ماننا چاہیے کہ اس نے اسی کو خدمت کے لئے چن لیا ہے (ورنہ بادشاہ کے ہزاروں لوگ خدام بننے کی خواہش رکھتے ہیں)

بہرحال میں یہ عرض کررہا تھا کہ انسان کو اکڑ کر نہیں چلنا چاہیے لیکن اگر اکڑ کر چلنے کا خود حکم دیں تو یہ عبادت بن جاتی ہے۔ جیسا کہ حج کرتے وقت طواف کے پہلے تین چکروں میں رمل (اکڑ کر چلنا) کرنا واجب ہے۔ لہٰذا یہ عبادت بن گئی۔

گر طمع خواہد زما سلطان دیں   خاک برفرق قناعت بعد ازیں

معلوم ہوا جو چیز اللہ تعالیٰ کے لئے نامزد ہو جائے وہ عبادت ہو جاتی ہے۔ پس یہی عبادت عادت ہے اور یہی عادت کے ساتھ عبادت ہے۔

اسلام کا سہل راستہ ...... اگر انسان نماز پڑھتا ہے تو زیادہ سے زیادہ سوا گھنٹہ لگتا ہے تو گویا سوا گھنٹہ عبادت ہوئی۔ لیکن اسلام ایک ایسا (سہل اور آسان) راستہ بتاتا ہے کہ ہر ایک کام عبادت بن جائے۔ چنانچہ کھانا، پینا،

سونا تمام عبادت ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اس نیت سے انسان سوئے کہ میں اٹھ کر تہجد پڑھ سکوں یا بیت الخلاء میں اس لئے جائے کہ گندگی نکل جائے اور طبیعت میں نشاط پیدا ہو تو فراغت سے عبادت کر سکوں۔ روٹی اس نیت سے کھائے کہ اس سے قوت پیدا ہو تو اللہ کی عبادت کروں۔ تو یہ ساری چیزیں عبادت بن جاتی ہیں۔

حدیث شریف میں ہے کہ: ''مَنْ قَادَ اَعْمٰی اَربعین خطوۃ غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ'' ① یعنی جس نے اندھے کو لاٹھی پکڑ کر چلایا تو اس کے اگلے پچھلے تمام صغائر (چھوٹے گناہ) معاف ہو جاتے ہیں۔

ایسے ہی جنازہ اٹھانا ایک طبعی امر ہے۔ ثواب نہ بھی ہو تو بھی انسان اٹھاتا ہے۔ لیکن حدیث میں ہے کہ: جو شخص جنازے کے چاروں پاؤں کو کندھا دے تو اس کو چالیس نیکیاں ملتی ہیں۔ مردہ کو دفن کرنا ایک امر طبعی ہے۔ لیکن اتباعِ سنت کی نیت سے کیا جائے تو عبادت ہے۔ یتیم پر شفقت تو ہر ایک کو ہوتی ہے لیکن لوجہ اللہ کی جائے تو عبادت ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ: جو شخص یتیم کے سر پر ہاتھ رکھے تو جتنے بال اس کے ہاتھ کے نیچے آ ئیں تو اس کو اتنی نیکیاں ملتی ہیں۔

عمل کے لوجہ اللہ ہونے کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں...... اور عمل کے لوجہ اللہ ہونے کے لئے دو چیزوں کی رعایت ضروری ہے۔ ایک اخلاص یعنی خالص اللہ کے لئے ہو۔ ریا یا شہرت کے لئے نہ ہو۔ اور حظِ نفس کے لئے بھی نہ ہو۔ عبادت میں اگر اخلاص نہ ہو تو وہ قبول نہیں ہوتی۔ پس ہر عبادت میں توحید کا رنگ ہونا چاہئے۔ اگر نماز پڑھی جائے تو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے۔ روزہ رکھا جائے تو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے۔ نذر مانی جائے تو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے اور دوسرے کو شریک نہیں کرنا چاہئے۔

مشرکین کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں: ﴿وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ﴾ ② یعنی کفار نے کھیتوں اور جانوروں میں تقسیم کی ہوئی تھی کہ یہ حصہ اللہ تعالیٰ کا ہے اور یہ حصہ ان کے دوسرے معبودوں کا ہے۔ پس یہ عبادت مشترک ہوئی اور مشترک عبادت اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اَنَا اَغْنَى الشُّرَكَآءِ عَنِ الشِّرْكِ ③

کسی دوسرے کو عبادت میں شریک کیا جائے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دوسرے حصے کو بھی تو ہی رکھ لے مجھے تیری عبادت کی ضرورت نہیں۔ ایسے ہی اگر خیرات دی جائے تو چھپا کر دینی چاہئے۔ ہاں اگر کسی دینی مصلحت

① المعجم الكبير للامام الطبرانی، ج: ۱، ص: ۳۶۲ علامہ عجلونی فرماتے ہیں: رواہ الخطيب عن ابن عمر، قال المناوی: وفيه عبد الباقی ابن قانع اورده الذهبی فی الضعفاء واورده الذهبی فی الميزان عن ابن عباس رفعه بلفظ: من قاد مكفوفا اربعين ذرا عاد خل الجنة، وقال فی سنده عبدالله بن ابان الثقفی لايعرف وخبره منكر باطل دیکھئے: كشف الخفاء ج: ۲ ص: ۲۱۹.

② پارہ: ۸ سورة الانعام، الآية: ۱۳۶. ③ الصحيح لمسلم، كتاب الزهد، باب من اشرك فی عمله غير الله، ص: ۲۵۴.

کے لئے اظہار ہو تو یہ بھی اچھا ہے۔ مثلاً اس نیت سے مشہور کر کے دے تاکہ دوسرے بھی دینے لگیں تو بہتر ہے۔ ورنہ اصل میں صدقہ کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ اس طرح دیا جائے کہ بائیں ہاتھ کو بھی علم نہ ہو۔ اور جو کچھ مانگا جائے وہ بھی اللہ تعالیٰ سے ہی مانگا جائے۔ حدیث میں ہے کہ: اگر انسان کا تسمہ ٹوٹ جائے اور اس کو ٹھیک کرانے کے لئے پیسے بھی موجود ہوں تو جیب میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے مانگنا چاہئے۔ اس پر بھی ثواب ملتا ہے۔ کیونکہ نافع حقیقت میں صرف اللہ تعالیٰ ہیں۔ یہ چیزیں اسباب نفع ہیں اور اسباب نفع پر خاصیت کا مرتب ہونا عقلاً ضروری نہیں۔ مثلاً آگ پر جلانے کا مرتب ہونا ضروری نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ اس کی خاصیت بدل دے تو یہی پانی کا کام دے سکتی ہے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جس آگ میں پھینکا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے جلانے کی خاصیت چھین لی، تو آپ علیہ السلام صحیح سالم رہے۔ ایسے ہی روپیہ سبب نفع تو ہے لیکن نافع نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ اس سے اس کی خاصیت چھین لیں تو بے کار ہے۔ ایسے ہی تلوار گلا کاٹنے کا سبب تو ہے لیکن خود نہیں کاٹتی۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے گلے پر چھری کو پھیرا، لیکن اس نے کاٹا ہی نہیں۔ یہی پانی آب حیات ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ ① لیکن یہی پانی قبطیوں کے لئے سبب موت بن گیا۔ اسی پانی سے بنی اسرائیل کیلئے راستے بن گئے اور ایک ایک قبیلہ ایک ایک راستے سے گزرنے لگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ڈبونے کی خاصیت اس سے سلب کر لی اور قبطیوں کو اسی پانی میں ڈبو دیا۔ ماں باپ انسان کے لئے خالق نہیں۔ سبب تخلیق ہیں اور اللہ تعالیٰ چاہے تو بدوں اس سبب کے پیدا کر دے۔ جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو بدوں ماں باپ کے پیدا کیا۔ البتہ "عادت اللہ" یوں ہی جاری ہے کہ اولاد میاں بیوی دونوں سے ہوتی ہے۔ سینکڑوں کیڑے مکوڑے بدوں ماں باپ کے صرف گندگی جمع ہونے سے پیدا ہو جاتے ہیں۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ءَأَنْتُمْ تَخْلُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ﴾ ② اور کاشتکار سے فرماتے ہیں: ﴿ءَأَنْتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ﴾ ③ اور اگر ظاہری طور پر کاشتکار ہی بوتا ہو تو بونے کے لئے اعضاء، اسباب، بیج اور پھر بیج کا اگنا سب ہی تو اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ حقیقت میں نافع اور ضار اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔

اللہ کی عبادت کیوں کی جائے؟...... اور عبادت نافع اور ضار ہی کی ہوتی ہے۔ اسباب نفع و ضرر کی نہیں ہوتی۔ یہی دھوکہ دوسری قوموں کو لگا تو کوئی سورج کو سجدہ کرنے لگا تو کوئی درخت کو۔ کیونکہ کچھ نہ کچھ نفع تو ہر چیز

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۳۰.

② پارہ: ۲۷، سورۃ الواقعۃ، الآیۃ: ۵۹.

③ پارہ: ۲۷، سورۃ الواقعۃ، الآیۃ: ۶۴.

میں موجود ہے۔پس تمام عبادتیں (جانی و مالی ہمہ قسم) اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہونی چاہئے۔نہ غیر اللہ کی نذر ماننی چاہئے۔نہ غیر اللہ کو سجدہ کیا جائے اور نہ رکوع کیا جائے۔البتہ جو چیزیں جائز ہیں ان کی تعظیم جائز ہے۔حضرات انبیاء نے بھی یہی تعلیم دی ہے فرمایا گیا: ﴿اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ﴾ ① یعنی اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرو اور اسی سے ڈرو۔اور میری اتباع کرو اور حضرات انبیاء علیٰ نبینا و علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شان تو یہ تھی کہ اگر تکلیف ہوتی تو شکوہ بھی اللہ تعالیٰ سے کرتے تھے۔جب حضرت یوسف علیہ السلام گم ہو گئے تو یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: ﴿اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ﴾ ② یعنی میں اپنے غم کی شکایت اللہ تعالیٰ سے کرتا ہوں۔کیونکہ ان کو علم تھا کہ یوسف علیہ السلام انہی کی مرضی سے گم ہوئے ہیں اور انہیں کی مرضی سے ملیں گے۔

حدیث شریف میں ہے: ''اِذَا اسْتَعَذْتَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ وَاِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ.'' ③ یعنی جب تو پناہ پکڑے تو اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ۔اور جب تو مدد چاہے تو بھی اللہ تعالیٰ سے مدد مانگ۔مثلاً حضرت زکریا علیہ السلام نے بیٹے کی دعا کی تو پہلے ولادت کے تمام اسباب کے نہ ہونے کا ذکر فرمایا چنانچہ فرمایا: کہ اے اللہ! میری ہڈیاں کمزور ہو گئیں اور جب ہڈیوں تک کمزوری پہنچ گئی ہو تو گوشت اس سے اوپر ہوتا ہے، وہ بطریق اولیٰ کمزور ہوگا۔یہ تو اندرونی حالت تھی۔اور باہر کے متعلق فرماتے ہیں کہ میرا سر بڑھاپے سے سفید ہو گیا۔لیکن اے اللہ! میں تجھ سے مانگ کر کبھی نامراد نہیں گیا۔اور اولاد طلب کرنے کی وجہ بیان فرمائی کہ یہ میرے رشتہ دار ہیں۔ان سے مجھے ڈر ہے کہ یہ میرے مشن کو چلا نہیں سکیں گے۔اور تربیت و ہدایت نہیں کریں گے۔پھر فرمایا کہ: میری بیوی بانجھ ہے۔اس میں اولاد کی صلاحیت ہی نہیں۔گویا اولاد کی صلاحیت نہ خاوند میں نہ بیوی میں اور نہ رشتہ داروں سے تعلیم و تربیت کی امید، جو میرے مشن کو آگے بڑھا سکیں۔

بعد ازاں فرماتے ہیں اے اللہ! ایسا بیٹا دے جو میرا وارث ہو اور حضرات انبیاء علیہم السلام کی وراثت مال نہیں ہوتا بلکہ علم الٰہی ہوتا ہے۔حدیث میں ارشاد ہے: ''اِنَّ الْاَنْبِيَآءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِيْنَارًا وَّلَا دِرْهَمًا وَلٰكِنْ وَرَّثُوا الْعِلْمَ'' ④ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ انسان جب دعا کرے تو تردد نہ کرے بلکہ عزم کے ساتھ کرے۔جیسا کہ ایک بدوی حج کو آیا تو بیت اللہ کے پاس کھڑے ہو کر کہنے لگا: ''يَا رَبَّ الْبَيْتِ يَا رَبَّ الْبَيْتِ جِئْتُكَ وَاَهْلِيْ فِي الْبَيْتِ اِلَّا تَغْفِرْلِيْ فَاغْفِرْلِيْ.''

پھر دعا کے بعد بعض دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ بعینہ وہی چیز مل جاتی ہے۔اور بعض دفعہ اس سے اچھی چیز مل جاتی ہے۔اور کبھی کبھی دیر سے بھی ملتی ہے جیسا کہ بیٹا باپ سے کچھ پیسے مانگے تو باپ نہ دے اور کچھ دن گزرنے کے

---

① پارہ: ۲۹، سورۃ النوح، الآیۃ: ۳۔ ② پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۸۶۔ ③ المستدرک علی الصحیحین للإمام الحاکم ولفظہ: اذا سئلت فاسئل اللہ واذا استعنت فاستعن باللہ، ج: ۳، ص: ۷۷۲۔
④ الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب العلم قبل القول والعمل، ج: ۱، ص: ۱۱۹۔

بعد دے۔ بیٹا کہے کہ جب میں نے مانگے تھے اس وقت تو آپ نے دیئے نہیں تھے تو باپ کہتا ہے کہ بیٹا اس وقت تو بیمار تھا اگر میں تمہیں پیسے دے دیتا تو تو ایسی چیزیں کھاتا جن سے تمہاری صحت بگڑتی۔ (بلاشبہ) ایسے ہی اللہ تعالیٰ سے اگر کوئی مال مانگے تو بعض اوقات مال نہیں ملتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ فضول خرچ ہے۔ اگر اس کو مال دیا گیا تو یہ اور زیادہ معاصی میں مبتلا ہو جائے گا۔ لیکن جب مفلس ہو جاتا ہے اور معاصی سے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ دے دیتے ہیں۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بیٹا ساری زندگی مانگتا رہتا ہے باپ کچھ بھی نہیں دیتا۔ لیکن جب بیٹا بڑا ہو جائے تو باپ اس کو خزانہ دے دیتا ہے۔ بیٹا کہتا ہے کہ آپ نے ساری زندگی تو مجھے کچھ دیا نہیں باپ کہتا ہے کہ میں دیتا رہتا تو تو سارا مال ضائع کر دیتا۔ تو جتنا مجھ سے مانگتا رہا میں جمع کرتا رہا۔ اور آج اتنا خزانہ ہو گیا ہے۔ ایسے ہی انسان کی دعا بعض اوقات ساری زندگی قبول نہیں ہوتی۔ لیکن قیامت میں نیکیوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا ہوگا تو یہ انسان کہے گا کہ اے اللہ! میں نے تو اتنی نیکیاں نہیں کی تھیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو دنیا میں دعائیں کرتا رہا۔ میں ان کو تیری آخرت کے لئے جمع کرتا رہا۔ چنانچہ یہ تیری دعائیں ہیں۔ اس لئے انسان کو دعا سے کبھی تنگ نہیں ہونا چاہئے۔ اور میں کہتا ہوں کہ کچھ بھی نہ ملے تو بھی دعا کو چھوڑنا نہیں چاہئے۔ اس لئے کہ حدیث میں ہے۔ ''اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ'' ① دعا عبادت کا مغز ہے۔ مغز کو چھوڑ کر محض چھلکے پر اکتفا کرنا کون سی دانش مندی ہے؟

غیر اللہ میں سے کس کی تعظیم ضروری ہے؟...... اور دعا و طلب صرف اللہ تعالیٰ سے ہونی چاہئے۔ لیکن جو چیزیں اللہ تعالیٰ کے لئے نامزد ہو جائیں ان کی تعظیم بھی ضروری ہے۔ مثلاً حضرات انبیاء کی تعظیم ضروری ہے کہ ان کی اتباع کی جائے۔ اور قرآن مجید کی تعظیم بھی ضروری ہے کہ اس کو بے وضو ہاتھ نہ لگایا جائے۔ بیت اللہ المکرم کی تعظیم کرنی چاہئے کہ قضاء حاجت کے وقت اس کی طرف منہ یا پیٹھ نہ کی جائے، کیونکہ وہ جہت صلوٰۃ ہے لیکن معبود نہیں۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دفعہ حج کو تشریف لے گئے تو حجر اسود کو بوسہ دینے کا موقع نہ ملا۔ اور اس وقت ایسی حکومت تو نہ تھی کہ بذریعہ پولیس آپ کے سامنے سے سب کو ہٹا دیا جاتا۔ تو آپ رضی اللہ عنہ نے لاٹھی کو حجر اسود کے ساتھ لگا کر اس کو بوسہ دے لیا۔ اور حجر اسود سے خطاب کر کے فرمانے لگے: ''اِنِّیْ اَعْلَمُ اَنَّکَ حَجَرٌ لَا تَنْفَعُ وَلَا تَضُرُّ لَوْلَا اَنِّیْ رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَبَّلَکَ مَا قَبَّلْتُکَ'' ② یعنی میں خوب جانتا ہوں تو ایک پتھر ہے نہ کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ کسی کو ضرر دے سکتا ہے اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھا ہوتا کہ وہ تجھے بوسہ دے رہے ہیں تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا۔ حدیث میں ہے: ایک صحابی رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ کہنے لگے میں نے قیصر و کسریٰ کو دیکھا کہ لوگ ان کو سجدہ کر رہے ہیں۔ میں

① السنن للترمذی، کتاب الدعوات، باب ماجاء فی فضل الدعاء، ج: ۱۱ ص: ۲۲۰۔

② الصحیح للبخاری، کتاب الحج، باب تقبیل الحجر، ج: ۶، ص: ۳۷۔

نے خیال کیا کہ اللہ کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس کو سجدہ کیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ اس لئے کہ عبادت و سجدہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے ذات عالی کے لئے مخصوص ہے۔ کسی اور کی نہ عبادت ہے نہ کسی کو سجدہ ہے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام نے خود بھی تعلیم دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ ① یعنی ایسا نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ کسی بشر کو کتاب اور نبوت دے۔ پھر وہ نبی کہنے لگے کہ میری عبادت کرو، اللہ تعالیٰ کی عبادت نہ کرو۔ تو حاصل اخلاص کا یہ ہوا کہ تمام عبادتیں صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے کرنی چاہئیں۔

قبولیت اعمال کے لئے اخلاص کے ساتھ اتباع نبوی ضروری ہے...... دوسرا اصول یہ ہے کہ عمل میں اتباع کی شان موجود ہو۔ ہر فعل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی جائے۔ جو عبادت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے نمونہ پر ہوگی، وہ مقبول ہوگی ورنہ نہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص اخلاص کے ساتھ ظہر کی چھ رکعتیں پڑھے تو یہ عند اللہ مقبول نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونہ کے خلاف ہے۔ ایسے ہی اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ روزہ مغرب تک تو ہوتا ہی ہے۔ میں آج عشاء کے وقت افطار کروں گا۔ تو یہ قبول نہیں۔ نیز نمونے بنانے کی ضرورت نہیں بلکہ نمونے بنے ہوئے موجود ہیں۔ کیونکہ دین کامل اور مکمل ہو چکا ہے۔ اس میں ہر قسم کی ہدایات موجود ہیں۔ چنانچہ بعض مشرکین حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے کہ تمہارا نبی تمہیں ہر چیز کی تعلیم دیتا ہے حتیٰ کہ قضائے حاجت کا طریقہ بھی بتلاتا ہے۔ تو آپ رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا کہ: ہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں حتیٰ کہ قضائے حاجت کا طریقہ بھی بتاتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں حکم فرمایا ہے کہ ہم فارغ ہوتے وقت قبلہ کی طرف منہ نہ کریں اور نہ ہی پیٹھ کریں۔ تو جب حدیث میں ایسی ایسی چیزیں موجود ہیں تو اور کس چیز کی کمی ہوگی۔ اس لئے جتنا اخلاص کم ہوتا جائے گا اتنا شرک بڑھتا جائے گا اور جتنی اتباع میں کمی ہوگی اتنی ہی بدعات داخل ہوتی جائیں گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام زندگی ہمارے سامنے نمونہ کے لئے موجود ہے۔

سیر حضرات انبیاء علیہم السلام میں سے صرف اسوۂ محمدی ہی موجود ہے...... یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے دنیا کی کوئی قوم اپنے مقتدا کی سیرت دنیا کے سامنے پیش نہیں کرسکتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گھریلو زندگی کا آج ہمیں کوئی علم نہیں۔ اور نہ ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عملی زندگی ہمارے سامنے ہے۔ صرف مسلمان ہی یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی ہمارے سامنے موجود ہے۔ چنانچہ

① پارہ: ۳ سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۷۹۔

کھانے، پینے، سونے، غرض زندگی کے ہر کام کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔

چین میں آٹھ صحابہ رضی اللہ عنہم تشریف لے گئے اور وہاں جاکر تجارت شروع کردی۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم چونکہ دیانتدار تھے۔ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے۔ ''اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُم عُدُولٌ'' تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عادل ہیں۔ دیانتداری سے وہاں تجارت شروع کی تو تمام بازار ٹھنڈا پڑ گیا۔ تاجروں نے حکومت کے پاس شکایت کی کہ یہ لوگ عرب سے آئے ہیں اور ملک لوٹنا چاہتے ہیں۔ اگر ان کو ایسے ہی چھوڑ دیا گیا تو یہ تمام دولت نکال کر عرب میں لے جائیں گے۔ اس شکایت کا ردعمل یہ ہوا کہ ایک کمیشن صرف اس مقصد کے لئے بنا اور وزیراعظم خود اس کے صدر بنے۔ اور آ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کہنے لگے: ''تم ہمارے ملک کو ویران کرتے ہو اس لئے تم یہاں سے نکل جاؤ''۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ: آپ کے تاجروں نے غریبوں کو لوٹ رکھا تھا جب ہم نے دیانتداری سے کام شروع کیا تو ان کا بازار ٹھنڈا پڑ گیا اور حسد کی وجہ سے شکایات لے کر آپ کے ہاں پہنچے ہم تو آپ کے ملک کو آباد کرنے آئے ہیں۔ ویران کرنے نہیں آئے۔ وزیراعظم نے کہا کہ ہم کو بہرحال شکایت ہے اس لئے تم یہاں سے چلے جاؤ۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا: اگر ہمارا قصور ہو تو ہم اقرار کرنے کے لئے تیار ہیں اور بلاقصور تم نکالنا چاہتے ہو تو ہماری طرف سے اعلان جنگ ہے۔ رعایا نے کہا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ چنانچہ حکومت دب گئی۔ انہی آٹھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی برکت ہے کہ آج چین میں آٹھ کروڑ مسلمان ہیں۔ (تو نیت کی درستی اور دیانت کی وجہ سے آٹھ نفوس قدسیہ پر مشتمل یہ چھوٹا سا گروہ اپنی زندگی کا مقصد اتباع نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بنا چکا تھا۔ اتنی بڑی تعداد پر غالب آیا اور رہتی دنیا تک اپنے انمٹ نقوش چین پر ثبت کر دیئے۔ آج بھی توحید کی آواز چین کے در و دیوار سے بلند ہو رہی ہے)

توحید کی قوت اور شرک کی بے بسی...... ایران پر چڑھائی کے لئے جب مسلمانوں کا لشکر گیا تو راستے میں دریا آ گیا۔ حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لشکر سے فرمایا کہ جس خدا کے بندے ہو اسی کے قبضہ قدرت میں یہ دریا ہے۔ اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دو۔ چنانچہ سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیئے اور تیرتے ہوئے دریا کو عبور کر گئے۔ ایک صحابی کا پیالہ دریا میں گر پڑا، دوسروں نے کہا کہ اس کو پکڑ لو۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر پیالہ میرا ہو تو یہ نہیں ڈوبے گا۔ (اللہ اس کی حفاظت فرمادیں گے) چنانچہ دریا کی موجوں نے پیالے کو دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچا دیا تھا۔ جب وہ صحابی رضی اللہ عنہ وہاں پہنچے تو پیالہ وہاں پڑا ہوا تھا۔ یہ تمام چیزیں قلب کے قوت سے ہوتی ہیں اور قلب کی قوت توحید سے پیدا ہوتی ہے۔ شرک سے دل میں تذبذب آ جاتا ہے۔ ان کے ہاں نہ شرک کا واہمہ تھا نہ بدعت کا شبہ۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ آٹھ سو صحابہ رضی اللہ عنہم کو لے کر ماہان آرمنی عیسائی کے مقابلہ میں

تشریف لے گئے۔ ماہان ارمنی حضرت خالد سے کہنے لگا، میں تو سمجھا تھا کہ مسلمان عقلمند ہیں لیکن تم تو احمق ہو کہ اتنے آدمیوں کو لے کر ہزاروں کے لشکر کے مقابلہ کے لئے آ گئے۔ مجھے تمہارے نوجوانوں پر رحم آتا ہے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے ماہان! تو کمانڈر انچیف بن کے آیا ہے یا واعظ بن کر آیا ہے؟ تو اگر لڑنا نہیں چاہتا تو صاف کیوں نہیں کہہ دیتا کہ میں لڑائی نہیں کر سکتا۔ ماہان کو غصہ آیا تو فوجوں کو لڑنے کا حکم دے دیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کو کفار میں گھس جانے کا حکم فرمایا راوی کہتے ہیں کہ سات گھنٹے تک لڑائی ہوئی آخر کفار شکست کھا کر بھاگ گئے مسلمان صرف سات شہید ہوئے اور عیسائیوں کے تیرہ ہزار آدمی مارے گئے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ آدمی جب دین کے لئے لڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ مدد فرماتے ہیں۔ اور ہمت تو صرف توحید سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ مشرک میں یہ جان نہیں کہ وہ اتنی قوت پیدا کر سکے حاصل یہ کہ ایک طرف اخلاص کامل اور دوسری طرف اتباع کامل کی ضرورت ہے، آج مسلمانوں میں شرک و بدعات داخل ہو رہی ہیں۔ اس لئے آج ذلت کی بھی یہ حالت ہے کہ خدا کی پناہ۔

اقوامِ عالم کی اصلاح کا ذمہ دار مسلمان ہے..... اس کی اصلاح کی صورت یہ ہے کہ ایک دوسرے سے حسن ظن رکھنا چاہئے، بدظنی سے بچنا چاہئے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ضروری ہے لیکن کسی کو رسوا نہیں کرنا چاہئے۔ حدیث میں ہے کہ اے اللہ! میں اس مکار دوست سے پناہ مانگتا ہوں، جو دوستی کا دعویٰ کرے لیکن جب میری بھلائی دیکھے تو اس کو دفن کر دے اور جب میری برائی دیکھے تو اس کو افشاء کر دے۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "لَنْ يُصْلِحَ آخِرُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ إِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ أَوَّلُهَا" اس امت کے آخر میں فتنہ وفساد رونما ہونے کی اصلاح قطعی طور پر اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ امت اس راستہ پر نہ آ جائے گی جس راستہ پر امت کا پہلا طبقہ تھا۔ اور امت کی اصلاح پہلے اخلاص کامل اور اتباع کامل سے ہوئی تھی۔

آج مسلمان یہ شکایت کرتے ہیں کہ مجھے فلاں سکھ نے ایذا پہنچادی، فلاں ہندو یا عیسائی نے مجھے تکلیف دی۔ میں کہتا ہوں کہ تمام اقوام عالم کی برائیوں کی ذمہ داری مسلمانوں پر ہے۔ کیونکہ یہ دنیا کے معلم تھے۔ جب معلم درست ہوں تو دوسرے خود بخود درست ہو جاتے ہیں۔ حدیث میں ہے: "اَلْإِسْلَامُ يَعْلُوْ وَلَا يُعْلٰى" ① اسلام غالب ہوتا ہے مغلوب نہیں ہوتا۔ لیکن ہم اسلام کے دائرے میں ہی نہ آئیں تو ہم پست ہوں گے۔ ورنہ اسلام میں پستی نہیں ہے۔

بندہ کو اپنی مرضی ختم کر دینی چاہئے..... تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ نیت تبدیل کرنے سے عادت عبادت بن جاتی ہے۔ ایک شخص نے ایک مکان بنوایا اور اس میں روشندان بھی لگائے۔ بن جانے پر اپنے شیخ کو بلوایا۔ انہوں

① الصحیح للبخاری، کتاب الجنائز، باب اذا اسلم الصبی، ج: ۵، ص: ۱۳۹۔

نے پوچھا کہ یہ روشندان کس لئے بنوائے ہیں؟ اس نے عرض کی ہوا آنے کے لئے بنوائے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اللہ کے بندے! اگر یہ نیت بھی کر لیتے کہ اذان کی آواز آئے گی ثواب بھی ہوتا اور ہوا بھی اس سے بند نہ ہوتی۔ کیونکہ نیت تو ان چیزوں کے لئے ضروری ہے جو نیت پر موقوف ہیں تو ثواب تو نیت پر موقوف ہے لیکن ہوا کا آنا نیت پر موقوف نہیں۔ پس ہر کام میں ثواب کی فکر ہی ہونی چاہئے اور اللہ کی رضا کی طلب ہونی چاہئے۔ عبداللہ (اللہ کا بندہ) کا معنی ہی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی کی مرضی کے موافق کام کرے۔

کسی شخص نے ایک غلام سے پوچھا کہ تو کیا کھائے گا؟ اس نے کہا جو کچھ مولا کھلائے گا۔ اس نے کہا کہ پیئے گا کیا؟ غلام نے جواب دیا کہ جو کچھ مولا پلائے گا۔ اس نے پوچھا کہ تو پہنے گا کیا؟ اس نے جواب دیا کہ جو کچھ مولا پہنائے گا۔ اس شخص نے کہا کہ اللہ کے بندے تیری بھی کچھ مرضی ہے یا نہیں؟ غلام نے جواب دیا کہ اگر اپنی مرضی ہوتی تو غلام نہ ہوتا۔

آیت متعلقہ بیان...... جو آیت میں نے پڑھی تھی اس میں اسی اخلاص اور اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اے ابراہیم! کہہ دو کہ میری نماز، میری قربانی، میرا مرنا، میرا جینا، سب اللہ ہی کے لئے ہیں۔ اسی ملت ابراہیمیہ کی تکمیل کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ﴾ ① یعنی اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی ملت کا اتباع کرو۔ ابراہیم علیہ السلام نے اس امت کو خود امت مسلمہ فرمایا ہے: ﴿هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ﴾ ابراہیم علیہ السلام نے ہی تمہارا نام مسلمان رکھا ہے اور اسلام کے معنی اطاعت اور سونپ دینے کے ہیں۔ اسلام کا اقرار کرنے کے بعد اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد نہ کرنا غداری ہے پسندیدگی کا بھی اظہار اور ناپسندیدگی کا بھی اظہار یہ اجتماع ضدین ہے۔

نام کے اور کام کے مسلمان...... پنجاب کے ضلع انبالہ میں ایک بزرگ جمنا کے کنارے ایک بستی میں رہتے تھے۔ ایک دفعہ دریا کو طغیانی آئی تو وہ گاؤں بھی غرق ہونے لگا۔ لیکن ایک دیوار کی وجہ سے کچھ بچاؤ تھا۔ لوگ ان بزرگ صاحب کے پاس گئے اور عرض کی حضرت شاہ صاحب! گاؤں غرق ہونے لگا ہے۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس کو غرق کرنے سے بچائے۔ تو شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے پھاوڑا لیا اور جو دیوار باقی تھی اس کو بھی توڑنے لگے۔ لوگوں نے کہا حضرت یہ کیا کر رہے ہیں؟ انہوں نے کہا۔ "جدھر مولیٰ ادھر شاہ دولا" تم مجھ سے اللہ تعالیٰ کا مقابلہ کرانا چاہتے ہو؟ اگر اللہ تعالیٰ چاہے کہ یہ بستی ڈوب جائے تو بندہ کو بطریق اولیٰ کہنا چاہئے کہ یہ بستی ڈوب جائے۔

اسی طرح ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت کیا حال ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ اس کا کیا حال پوچھتے ہو جس کی مرضی کے موافق دو جہاں کا کارخانہ چل رہا ہے۔ اس نے کہا کہ دونوں جہاں کا کاروبار آپ کی مرضی کے موافق چل رہا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں! اس طرح کہ دونوں جہاں کا کاروبار اللہ کی مرضی کے موافق چل رہا

① پارہ: ١٧، سورۃ الحج، الآیۃ: ٧٨.

ہے۔اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی میں ایسا فنا کر دیا ہے کہ اللہ کی مرضی ہی میری مرضی ہے۔

نازم بچشم خود کہ روئے تو دیدہ است　　　افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

عوام صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایک صحابی رضی اللہ عنہ زمین کاشت کر رہے تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر سنی تو وہیں کھڑے ہو کر دعا کی کہ اے اللہ مجھے آنکھیں اس لئے عزیز تھیں کہ ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی وفات پا گئے تو ان آنکھوں کے ساتھ اب کسی دوسرے کو دیکھنا نہیں چاہتا۔بس اسی وقت وہ صحابی رضی اللہ عنہ نابینا ہو گئے۔یہ تو بہر حال صحابی تھے۔ان کا تو مقام ہے ہی۔اس کے علاوہ اولیاء اللہ میں ایسے بزرگ ہوئے ہیں،امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ جن کی کتاب مدارس عربیہ میں پڑھائی جاتی ہے،ان کے شیوخ میں سے ایک شیخ ہیں جب وہ بازار نکلتے تو کانوں میں روئی ٹھونس لیتے تھے۔ لوگوں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے حافظہ بہت قوی دیا ہے جو چیز سنتا ہوں یاد ہو جاتی ہے۔چاہتا ہوں جن کانوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سنوں،ان کانوں میں کوئی دوسری آواز نہ پڑے۔یہ لوگ کام کے مسلمان تھے۔ہم تو نام کے مسلمان ہیں۔

آج اگر چہ ہم ان جیسے تو نہیں ہو سکتے بلکہ جو بزرگ ہمارے قریب زمانے کے ہیں ان کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ مثلاً جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ان کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔لیکن ہم کم از کم ان کے راستہ پر تو چل پڑیں۔وہ تو دوڑتے جاتے ہیں ہم چلیں تو سہی۔ہم بھی کبھی نہ کبھی انشاء اللہ منزل مقصود تک پہنچ جائیں گے۔اور بغیر سلف صالحین کے نقش قدم پر چلے دین و دنیا نہیں ملتی۔

بہر حال دین و دنیا کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے اندر اخلاص کامل اور اتباع کامل پیدا کرے۔یہی دو چیزیں کلید نجات ہیں اور کامیابی کی ضمانت ہیں۔جو بھی کامیاب ہوا وہ اسی طریق پر چل کر ہوا اور جو راستہ سے ہٹ گیا وہ منزل مقصود تک نہ پہنچ سکا۔اور زندگی کا مایہ یوں ہی گم کر بیٹھا۔

یہ چند باتیں میں نے عرض کیں۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عمل نصیب فرمائے۔آمین

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَيْنَآ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ.

صُحبتِ صَالح

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ①

کثرتِ علم کے باوجود بے عملی کثرت سے ہے..... بزرگانِ محترم! یہ آیت جو میں نے تلاوت کی ہے۔ اس میں حق تعالیٰ نے ایک بہت اہم مضمون بیان فرمایا ہے۔ جس پر انسان کی دینداری کی بقا موقوف ہے۔ اگر کوئی دیندار بننا چاہے تو اس کے لئے اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ یہ مشاہدہ ہے کہ آج کل تقریروں، جلسوں اور لٹریچر کی کمی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کی دینی حالت تنزلی میں ہے۔ صرف دین ہی نہیں بلکہ دنیا کے اعتبار سے بھی تنزلی کا شکار ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ جب تک اسبابِ مرض معلوم نہ ہوں، اس وقت تک مریض کا علاج نا ممکن ہے۔ اب دین میں کمی اس وجہ سے تو نہیں کہ کم علمی ہو۔ کیونکہ اس زمانے میں علم کے ذرائع اشاعت جتنے موجود ہیں وہ پہلے کبھی موجود نہ تھے۔ اسی طرح آج جو جلسے ہوتے ہیں وہ بھی ایسے ہوتے ہیں کہ جن میں ایک ہزار دو ہزار آدمی تو معمولی بات ہے اور بعض جگہ تو لاکھوں تک بھی شرکت ہوتی ہے۔ بلکہ آج کل تو تمام دنیا ایک جلسہ گاہ بنی ہوئی ہے۔ ایک شخص ریڈیو میں بولتا ہے مشرق و مغرب تک اس کی آواز پہنچتی ہے اور صرف دنیوی باتیں ہی نہیں بلکہ ترجمے اور تفسیریں بھی مختلف ممالک میں کی جاتی ہیں۔ آپ کا ریڈیو پاکستان روزانہ ترجمہ قرآن مجید نشر کرتا ہے۔ اور مسائل تو بچہ بچہ جانتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود دین میں وہ پختگی نہیں جو پہلے زمانوں میں تھی۔ دوسرا ذریعہ نشرِ علم کا قلم ہے۔ آج کے زمانے میں اس کی بھی کمی نہیں۔ قلم کی علماء نے دس قسمیں لکھی ہیں۔ پہلی قسم لوحِ محفوظ والی قلم ہے۔ جس کے متعلق حدیث شریف میں ہے کہ: "خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ فَقَالَ لَهٗ: اُكْتُبْ قَالَ مَا أَكْتُبُ؟ قَالَ اُكْتُبْ مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ." ②

---

① پارہ ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۱۹. ② السنن لابی داؤد، کتاب السنۃ، باب فی القدر، ج: ۱۲ ص: ۲۰۹، رقم: ۴۰۷۸. حدیث صحیح ہے، دیکھئے: صحیح و ضعیف سنن ابی داؤد ج ۱۰ ص: ۲۰۰ رقم: ۴۷۰۰.

اور ایک قلم وہ ہے جس سے روزانہ کے حالات لکھے جاتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج میں جب عرش کے قریب پہنچے، تو قلموں کی کھسکھساہٹ سنی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کس چیز کی آواز ہے۔ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ: یہ دفتر ہے جس میں مخلوق کے واقعات کو لکھا جاتا ہے اور ایک ایک انسان دن میں لاکھوں حرکتیں کرتا ہے۔ معلوم نہیں وہ دفتر بھی کتنا بڑا ہوگا۔

ایک قلم وحی ہے۔ وہ یہ کہ وحی آتی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ یا کسی دوسرے صحابی کو بلوا کر لکھوا دیتے تھے۔ اسی قلم پر ہمارے دین کی بقا موقوف ہے۔ ایسے ہی اگر حدیث کی کتابت نہ ہوتی تو اتنی کتب بھی ہمارے پاس موجود نہ ہوتیں۔ پس یہ ذخیرہ احادیث اور قرآن کریم قلم کے ذریعہ ہی محفوظ کئے گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے آج ہم نماز، روزہ، حج وغیرہ کے احکام پمفلٹوں میں شائع کرتے ہیں۔

ایک قلم تصوف ہے۔ جس کے ضروری مسائل اور تزکیہ نفوس کے طریقے محفوظ کئے جاتے ہیں۔ اور ایک قلم سیاست ہے، جس سے تمام سیاسی معاملات محفوظ کر لئے جاتے ہیں۔ دین کے سلسلہ میں آج جتنی قلمکاریاں ہیں، وہ پہلے کسی زمانہ میں نہ تھیں۔ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: دنیا میں کوئی قوم تصنیف میں مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ حجاز کے کتب خانوں میں لاکھوں بلکہ کروڑوں کتابیں محفوظ ہیں۔ اندلس کے کتب خانوں کے متعلق ایک عیسائی عورت اپنی کتاب "حَاضِرُ الْاَنْدَلُسِ وَغَابِرُهَا" میں لکھتی ہے کہ: تعصب میں آ کر عیسائیوں نے ارادہ کیا کہ مسلمانوں کا لٹریچر ضائع کر دیا جائے۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے اس کام کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا، جس کا کام یہ تھا کہ کتب خانوں کو جلائے یا دریا برد کر دے۔ وہ عورت لکھتی ہے کہ پچاس برس تک یہ مہم جاری رہی۔ تاتاریوں نے حکومت بغداد کے کتب خانوں کو دریا میں ڈال دیا، تو وہ ایک بڑا پل بن گیا۔ تاریخ کی کتب میں لکھا ہے کہ ایک ماہ تک دریا کا پانی سیاہ رہا۔ جب ایک کتب خانہ کی یہ حالت تھی تو بقیوں کا کیا حال ہوگا۔ انجیل کے شباب کے زمانہ میں بھی عیسائی اتنے کتب خانے نہ بنا سکے اور نہ ہی یہود کی تورات کے شباب کے زمانہ میں ایسے کتب خانے بن سکے۔ اور آج بھی جو انہوں نے تصانیف کی ہیں اور موجودہ یورپ کی ترقی انہیں مسلمانوں کی مرہون منت ہے۔ وہیں سے یورپ کے لوگ پڑھ کر آئے اور اپنے ملک میں علم پھیلایا۔ اسی کی برکت ہے کہ آج عیسائی اس قابل ہیں کہ تصنیف کر سکیں اور ان کو اقرار ہے کہ یہ مسلمانوں کے فیض سے ہے۔

ماحول کا اثر..... الغرض مسائل کی اشاعت کثرت سے ہے لیکن اس کے باوجود دین مسلمانوں میں نہیں پھیلتا۔ اور نہ ہی سلف کی طرح ایمان میں مضبوطی ہے اور نہ ہی ہمارا دل ایسا ہے کہ اعمال صالحہ اس کی طبیعت ثانیہ بن جائیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہماری معاشرت غیر اسلامی ہے۔ اور ماحول بھی غیر اسلامی بن گیا۔ دارالعلوم دیوبند میں دو ہزار کا عملہ ہے۔ ممکن نہیں کہ وہاں کوئی بے نمازی ہو۔ اذان ہوتی ہے سب کے سب ہر طرف سے دوڑتے ہیں۔ یہ تمام ماحول کا اثر ہے۔ ورنہ وہاں کوئی نماز کے متعلق کہنے والا نہیں ہوتا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ہر کام پہلے ریا ہوتا ہے، پھر عادت ہوتی ہے، پھر عبادت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے: ''مُرُوْا صِبْيَانَكُمْ بِالصَّلٰوةِ إِذَا بَلَغُوْا سَبْعًا وَاضْرِبُوْهُمْ عَلَيْهَا إِذَا بَلَغُوْا عَشْرًا.'' ''اپنے بچوں کو نماز کا حکم دو جب کہ وہ سات سال کے ہو جائیں اور مار کر نماز پڑھاؤ جب کہ دس سال کے ہو جائیں''۔ ①

یہ مار کر نماز پڑھانا حقیقی نماز نہیں، کیونکہ وہ ڈر کے مارے پڑھتا ہے، یہاں تک کہ سجدہ کرتے ہوئے بھی ایک آنکھ سے دیکھتا رہے گا۔ جب دیکھا کہ باپ نہیں ہے بھاگ جائے گا۔ لیکن جب اس کو عادت پڑ گئی اور ساتھ ساتھ کچھ علم آ گیا، تو خیال کرے گا کہ یہ بہت ضروری چیز ہے۔ تو یہی عبادت بن جائے گی۔

عارف رومی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

بہر دنیا بہر دین و بہر نام ۔۔۔ اللہ اللہ کردہ باید و السلام

اس لئے نمازی کو اس وجہ سے نہیں رکنا چاہئے کہ شاید یہ ریا ہو۔

ظاہر کا اثر باطن پر..... حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ جو فقہ کے امام ہیں۔ مگر ان کا مذہب مدون نہیں ہوا۔ وہ فرماتے ہیں: ''طَلَبْنَا الْعِلْمَ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَأَبٰى أَنْ يَكُوْنَ إِلَّا لِلّٰهِ.'' ② ''ہم نے علم غیر اللہ کے لئے طلب کیا لیکن علم تو صرف اللہ تعالیٰ کا ہو کر رہا''۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ ظاہر کا اثر باطن پر بھی پڑتا ہے۔ مثلاً اگر ایک آدمی عورتوں کا سا لباس پہن لے، تو چند دن کے بعد اس کا دل یہ چاہے گا کہ وہ کلام بھی عورتوں کی طرح کرے، بلکہ تمام حرکات و سکنات عورتوں جیسی کرے۔ اسی طرح اگر کوئی جعلساز علماء کا سا لباس پہن لے تو وہ مخلوق کی خاطر بہت سے گناہوں سے بچے گا۔ ایسے ہی اگر کوئی درویشوں کا سا لباس پہن لے، تو اس کا اثر بھی قلب پر پڑے گا۔ اگر کفار کا سا لباس پہننا شروع کر دے تو چند دنوں میں دیگر افعال بھی کفار کی طرح ہی کرنے لگے گا۔

اسی طرح حدیث شریف میں ہے کہ: ''فَإِنْ لَّمْ تَبْكُوْا فَتَبَاكَوْا'' ③ یعنی اگر تمہیں رونا نہ آئے تو رونے کی شکل ہی بنا لو۔ مقصد یہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی ظاہری افعال کا اثر حقیقی افعال کا سا مرتب ہوتا ہے۔ رونے کی شکل بنانے میں وہی اجر و ثواب ملے گا، جو حقیقۃً الحاح و زاری پر ملتا ہے۔ بہر حال ظاہر کا اثر نہ صرف باطن پر مرتب ہوتا ہے، بلکہ ایک درجہ میں عند اللہ بھی بلحاظ اجر و ثواب اس کا اعتبار ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوہ حنین سے واپس آ رہے تھے راستہ میں ایک جگہ پڑاؤ کیا، کفار کے بہت

① المسند للإمام احمد، ج: ۱۳، ص: ۳۴۰۔ اس حدیث کو علامہ البانی نے صحیح فرمایا ہے۔ صحیح وضعیف الجامع الصغیر ج: ۱۲، ص: ۱۲۰، رقم: ۵۸۶۸۔ ② المسند لابن الجعد، ج: ۱، ص: ۳۰۳۔

③ السنن لابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلوۃ، باب فی حسن الصوت بالقرآن، ص: ۴۳۵۔

سے بچے مسلمانوں کے لشکر کے پاس جمع ہو گئے، ان میں حضرت ابو محذورہ بھی تھے۔ جب مؤذن نے اذان کہی تو ان بچوں نے بھی نقل اتارنا شروع کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ان کو پکڑ کر لاؤ۔ سب بچے تو بھاگ گئے مگر حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ ان میں سے کچھ بڑے تھے۔ انہیں بھاگتے ہوئے شرم آئی وہ نہ بھاگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب ان کو حاضر کیا گیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اب اسی طرح نقل اتارو۔ اور کہو اللہ اکبر۔ اللہ اکبر، حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ نے کہہ دیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کہو "اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ" اُن کو تامل ہوا۔ کیوں کہ اس میں توحید کا اقرار تھا۔ لیکن دبے لفظوں سے کہہ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا کہ کہو: "اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ" ابو محذورہ رضی اللہ عنہ نے دوبارہ کہہ دیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کہو "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ" ۔ اس میں حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کو زیادہ تامل ہوا۔ کیونکہ توحید کے تو کسی درجہ میں مشرکین مکہ بھی قائل تھے۔ چنانچہ وہ کہا کرتے تھے۔ (المسند للامام احمد، احادیث ابی محذورہ ج: ۳۹) "لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ اِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ" ①

اور قرآن مجید میں بھی ہے کہ: ﴿قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ﴾ ② یعنی اگر آپ ان سے پوچھیں کہ ساتوں آسمانوں اور زمین کو اور اس کے بڑے عرش کو کس نے پیدا کیا، تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا۔ توحید کے تو کسی درجہ میں قائل تھے۔ تو توحید کے کلمات کہنے میں اس قدر تامل نہ ہوا۔ لیکن رسالت کے وہ منکر تھے اور سارا جھگڑا رسالت کے نہ ماننے پر تھا۔ اس لئے ابو محذورہ رضی اللہ عنہ پہلے چپ ہو گئے۔ لیکن پھر دبے لفظوں میں کہا "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زور سے کہو تو ابو محذورہ رضی اللہ عنہ نے زور سے دوسری مرتبہ بھی کہا۔

ابو محذورہ رضی اللہ عنہ نے یہ اذان اسلام کی حالت میں نہیں کہی تھی۔ محض نقالی تھی۔ لیکن اس کا اثر دل پر اتر گیا۔ کہنے لگے کہ یا رسول اللہ! اب تو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہوں۔ اب اذان میں شوافع احناف کے خلاف ہیں۔ شوافع کہتے ہیں کہ ترجیع صفت اذان میں سے ہے۔ احناف کہتے ہیں کہ یہ تعلیم تھی۔ یہ فقہاء کے اختلاف ہیں۔ لیکن میرا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ نے جب ظاہر سے اسلام کا اقرار کیا تو اس کا اثر دل میں بھی اتر گیا۔ اور اسلام قبول کر لیا۔ اس لئے نبی کریم نے ارشاد فرمایا کہ: اگر رونا نہ آئے تو رونے کی شکل ہی بنا لو۔ بس اگر نماز کو جی نہ بھی چاہے تو بھی نماز نہ چھوڑنی چاہئے۔ مگر یہ ماحول سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر ماحول اچھا ہو تو بچے بھی نمازی بن جاتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ مطالبہ پاکستان کے وقت بچوں کے کھیل بھی جلسے اور جلوس بن گئے تھے کیونکہ اس وقت ماحول ہی ایسا تھا۔

حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ایک نوجوان طالب علم آیا۔ اور جلدی سے نماز

---

① المعجم الكبير للطبراني، ج: ۰ ا، ص: ۲۲۹ ② پارہ: ۱۸، سورۃ المؤمنون، الآیۃ: ۸۶، ۸۷.

پڑھ کر چل دیا۔ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: تو نے نماز اچھی طرح سے کیوں نہ پڑھی؟ اس کے منہ سے نکلا کہ حضرت میں چھوٹی کتابیں پڑھتا ہوں۔ حضرت کو غصہ آیا اور فرمایا کہ یہ اعمال تو ماں باپ سے ورثہ میں ملتے ہیں۔ ان میں کتابوں کی ضرورت نہیں لیکن یہ جب ہوتا ہے جب ماں باپ بھی ایسے ہی ہوں۔ اگر عیسائی ذہنیت کا ماحول بن جائے تو دل اسی طرف مائل ہونے لگے گا۔

تربیت میں ماحول کا اثر..... حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک دفعہ ایک شادی کے سلسلے میں تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ تو خیال ہوا کہ حضرت حاجی (امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ) صاحب کی زیارت بھی کرلوں۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو معلوم ہوگیا، کہ یہ فطرت سلیمہ رکھتے ہیں۔ تو آپ نے پوچھا کہ آپ کسی سے بیعت بھی ہوئے یا نہیں؟ آپ نے کہا کہ نہیں۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ پھر مجھ سے بیعت ہو جاؤ۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ میں اس شرط پر بیعت ہوں گا کہ آپ مجھے ذکر و شغل کا حکم نہ فرمائیں گے۔ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے تو بیعت ہونے کو کہا ہے شغل کا تو میں نے کہا ہی نہیں اور وعدہ بھی فرمایا کہ آئندہ بھی نہیں کہوں گا۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیعت فرمایا اور یہ فرمایا کہ دو تین دن یہاں ٹھہر جاؤ۔ آپ وہیں تھانہ بھون میں تین دن ٹھہرے جب رات کے وقت اڑھائی تین بجے دیکھا کہ سب لوگ اٹھ کر تہجد ادا کر رہے ہیں۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو شرم آئی انہوں نے بھی اٹھ کر تہجد پڑھی۔ پھر جب لوگوں کو ذکر و شغل میں دیکھا، آپ بھی ذکر میں مشغول ہو گئے۔ دوسرے دن پھر یہی حالت ہوئی۔ تیسرے دن خود بخود خوشی سے تہجد پڑھی اور ذکر و شغل میں مشغول ہو گئے۔ تیسرے دن حضرت کے پاس گئے اور کہنے لگے کہ حضرت آپ نے تو سب کچھ ہی کرا دیا۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے تھوڑا ہی کہا تھا۔ میں نے وعدہ خلافی نہیں کی۔ اب آپ جا سکتے ہیں، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ اب تو میں نہیں جاتا۔ چالیس دن وہاں ٹھہرے اور اس تھوڑے عرصہ کے بعد خلافت لے کر واپس ہوئے۔ بس یہ عبادت پہلے ریا تھی، پھر عادت ہوئی، پھر عبادت ہوگئی اور ساتھ ہی خلافت بھی مل گئی۔

میرا مشاہدہ ہے کہ جب میری عمر آٹھ برس کی تھی۔ ایک دفعہ میرا گنگوہ جانا ہوا وہاں ذکر و شغل کا ماحول تو تھا ہی۔ گنگوہ کی مسجد میں بہت سے دھوبی کپڑے دھوتے تھے، وہ جب کپڑے کو مارتے تو اِلَّا اللّٰہ کی ضرب ساتھ کہتے۔ یہ ماحول کا اثر تھا ورنہ ان کو پڑھنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ مقولہ مشہور ہے۔

"ہرچہ درکان نمک رفت نمک شد"

بس ماحول کا اثر یہی ہے۔ جو نیک ماحول میں ہوگا اس کا بھی اثر ضرور ہوگا۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی ایک ماحول تھا کہ جو بھی اس میں آتا وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ اور ان کا ماحول بھی بہت قوی تھا۔ حتیٰ کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے بعد انہی کا درجہ تھا۔ امت کا اجماع ہے کہ: "اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ" وہ

معصوم تو نہیں تھے لیکن محفوظ تو ضرور تھے۔ امت کا اتفاق ہے کہ کوئی شخص کتنا بڑا غوث اور قطب بن جائے لیکن ادنیٰ صحابی کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے کہ جو ماحول ان کو میسر آیا وہ کسی کو میسر نہ آ سکا۔ ایسے ماحول سے ابوجہل جیسا بدبخت ہی متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے۔ اور جبری طور پر تو وہ بھی مؤمن تھا۔ چنانچہ اپنے گھر میں کہتا تھا کہ بات تو ٹھیک ہے لیکن اگر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مان لیں، پھر ان کی غلامی کرنی پڑے گی۔ اسی سے ان کو عار تھی۔ بہر حال اگر ایک گھرانہ یہ عہد کرے کہ ہم گناہ چھوڑ دیں گے تو ان کے ماحول میں جو داخل ہوگا۔ انہی کی طرح ہو جائے گا۔

قول و فعل میں مطابقت کا اثر...... حضرت مولانا عبید اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سندھی ایک سیاسی مفکر تھے۔ روس کے انقلاب میں وہیں تھے۔ فرماتے تھے کہ: اسٹالن سے ملا اور اسلامی نظام اور اس کے اصول مع دلائل اس کے سامنے رکھے۔ تو اسٹالن نے کہا کہ یہ بالکل ٹھیک ہے اور اگر دنیا میں کوئی نظام جاری ہوا تو اسلام ہی جاری ہو کر رہے گا۔ لیکن یہ بتایئے کہ اس کا کوئی عمل دنیا میں بھی موجود ہے...... اس پر مولانا خاموش ہوگئے۔ تو آج دنیا قول کو نہیں دیکھتی بلکہ فعل کا مطالبہ کرتی ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''فَمَنْ وَّافَقَ قَوْلُهٗ فِعْلَهٗ فَنَجَا وَمَنْ لَّمْ يُوَافِقْ قَوْلُهٗ فِعْلَهٗ فَقَدْ هَلَكَ'' ① یعنی جس آدمی کا قول اس کے فعل کے موافق ہوا نجات پا گیا اور جس کا قول فعل کے موافق نہ ہوا، وہ ہلاک ہوگیا۔ آج اسلامیہ جمہوریہ کا اعلان کیا گیا۔ لیکن دنیا اس قول کو نہیں دیکھتی بلکہ عمل کو دیکھتی ہے۔ اس لئے ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم دنیا کے سامنے عملی نقشہ پیش کریں۔ ایک شخص بڑے سے بڑا عالم ہو۔ لیکن جب تک وہ اپنے کہے کے مطابق عمل نہ کرے، اس کو اپنے قول کا خود بھی تذبذب رہتا ہے۔

ماحول قوانین حکومت سے بھی بڑھ کر ہے...... حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آنے والوں میں نماز روزہ وغیرہ کا اہتمام تو تھا ہی۔ مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں یہ بھی قانون تھا کہ کوئی کسی کے لئے اذیت کا موجب نہیں ہوگا۔ چنانچہ تھانہ بھون کی خانقاہ میں ایک دفعہ کسی صاحب کا ایک رومال گر پڑا۔ لیکن کسی نے وہاں سے نہ اٹھایا اور تین دن تک پڑا رہا۔ ماحول کی وجہ سے کسی کو چرانے کی ہمت نہ ہوئی، اسی وجہ سے حجروں کو تالا لگانے کا دستور ہی نہیں تھا۔

حجاز کی حکومت ہے۔ وہاں بادشاہ کا جذبہ یہ ہے کہ اسلامی قانون نافذ ہو۔ اب ایک عورت زیور پہن کر سفر کرتی ہے۔ تو اس کو کسی قسم کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ تلواروں اور بندوقوں سے دلوں میں ڈر پیدا نہیں ہوتا۔ پولیس اور ہتھیاروں کی کمی نہیں۔ لیکن دنیا میں فسق و فجور کی کثرت ہو رہی ہے۔

ہم حج پر گئے تو دیکھا کہ چند بوریاں بھری ہوئی رکھی ہیں۔ ایک شخص نے پولیس میں جا کر خبر دی کہ فلاں جگہ دو کھجوروں کی بوریاں پڑی ہیں۔ پولیس نے کہا یہ ٹھیک ہے۔ لیکن آپ کو کیسے پتہ چلا کہ ان میں کھجوریں ہیں؟ معلوم ہوا کہ تو نے ٹٹول کر دیکھی تھی؟! اور چرانے کا موقع تلاش کرتا رہا۔ لیکن موقع نہیں ملا۔ اس شخص کو اس پر بھی سزا ملی۔

① مختصر تاریخ دمشق ج: ۳، ص: ۳۰۲۔

ہندوستان میں مختلف میلے ہوتے ہیں، مسلمان بھی ہندوؤں کو دیکھ کر میلے کرنے لگے ہیں۔ ان میں ہر طرح سے فسق وفجور اور چوریاں ہوتی ہیں۔ لیکن مکہ مکرمہ میں لاکھوں کا مجمع ہوتا ہے اور کبھی چوری نہیں ہوتی۔ مکہ والے کبھی چوری نہیں کرتے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان سے غلطی سرزد نہیں ہوتی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ غلبہ دیانت کا ہے۔ مگر چور کا ہاتھ ایک دفعہ کاٹا جائے تو برسوں تک چوری سے نجات ملتی ہے۔ اسلامی حدود رجم اور قطع ید وغیرہ کو وحشیانہ سزا کہنا انہی سے ہوسکتا ہے جن کے نزدیک زنا یا چوری کوئی غیر وحشی فعل ہیں۔ ادیان سماویہ میں زنا سے بڑا کوئی جرم نہیں تھا۔ ایک عورت کے زنا کرنے سے سارا خاندان بدنام ہو جاتا ہے۔ شہرت پر الگ دھبہ آتا ہے اور نسل کا بھی اختلاف ہوتا ہے۔ تو یہ فعل بھی تو وحشی ہے اگر وحشی فعل پر وحشیانہ سزا ہو، اس میں کیا جرم ہے؟ طرہ تو یہ ہے کہ آجکل قانون میں اس کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ کہ صرف جبراً زنا کرنا ہی جرم ہے۔ فریقین کی رضا ہو جائے تو جرم ہی نہیں۔ بہر حال ان چیزوں کا ماحول کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔

حکومتوں کے قوانین جرائم کے افعال کو تو روک سکتے ہیں لیکن جرائم کی نفرت دل میں نہیں بٹھلا سکتے۔ زانی زنا سے اور چور چوری سے قانون کی وجہ سے رک سکتا ہے لیکن زنا اور چوری کی نفرت اس کے دل میں قوانین سے نہیں بیٹھ سکتی۔ جرائم کی نفرت اور معصیت سے بیزاری اہل اللہ کی صحبت ومعیت سے نصیب ہوتی ہے۔

غیبت کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِهْتُمُوْهُ﴾ (۱) ''کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے'' تو غیبت کو مردہ بھائی کے گوشت کھانے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو کہ نجس ہے۔ لیکن غیبت سے بچے گا کب؟ جب دل میں معاصی سے نفرت ہوگی۔ ورنہ حکومت کا قانون تو یہاں نہیں لاگو ہوگا۔ جھوٹ کے بارے میں حدیث شریف ہے کہ: انسان جب جھوٹ بولتا ہے، اس کے منہ میں ایک بدبو پیدا ہو جاتی ہے اور فرشتہ اس کی وجہ سے اس سے دور ہو جاتا ہے۔ جب وہ جھوٹ ختم کر لیتا ہے تو وہ واپس آ جاتا ہے۔ گویا فرشتے کو معصیت سے نفرت ہے۔ اسی طرح انسان میں جب ملکوتی صفات آتی ہیں۔ وہ بھی معاصی سے متنفر اور بیزار ہو جاتا ہے تو یہاں حکومت کی طرف سے احتساب نہیں ہے۔ جس کی بنا پر جھوٹ سے بچے لیکن دل میں معاصی سے نفرت آ چکی ہے اس لئے جھوٹ سے بھی بچے گا اور معاصی سے بھی بچے گا۔ مشرکین کے بارے میں اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں: ﴿اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ﴾ (۲) یعنی مشرکین (اعتقادی طور پر) نجس اور ناپاک ہیں۔ معلوم ہوا کہ شرک اور ایسے ہی دوسرے معاصی معنوی نجاستیں ہیں۔ آدمی جس طرح ظاہری نجاست کی آلودگی سے بچتا ہے اور دور بھاگتا ہے۔ اسی طرح جن کا باطنی احساس زندہ ہے وہ معنوی نجاستوں سے بچتے ہیں۔ اور اپنے باطنی احساس سے ان نجاستوں کو پہچانتے بھی ہیں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں ایک شخص آپ کے پاس آ رہا تھا کہ راستے میں ایک عورت پر نظر پڑ گئی۔ تو

(۱) پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۱۲۔ (۲) پارہ: ۱۰، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۲۸۔

یہ نظر تو گناہ نہیں تھی۔ کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ: "اَلنَّظْرَةُ الْاُوْلٰى لَکَ وَالثَّانِيَةُ عَلَيْکَ" ① یعنی پہلی نظر میں کوئی گناہ نہیں اور دوسری میں گناہ ہے۔ لیکن اس شخص نے قصداً دوسری دفعہ بھی نظر اٹھا کر دیکھا۔ جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے فرمایا کہ: "مَا بَالُ الرِّجَالِ يَاْتُوْنَنَا وَفِيْ قُلُوْبِهِمْ اَثَرُ الزِّنَا" یعنی لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے پاس آتے ہیں اور ان کے دلوں میں زنا کا اثر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کے قلب اور روح کا حاسہ تیز تھا جس سے یہ گناہ نظر آ گیا تھا اور وہ تیز کیوں تھا؟ اس لئے کہ آپ کو صحبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میسر تھی۔ اسی کا یہ اثر تھا کہ گناہ نظر آ جاتے تھے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جب مسجد میں آتے اور لوگ وضو کرتے ہوتے تو آپ نظر نیچی کر لیتے۔ لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی۔ آپ نے فرمایا: حدیث شریف میں ہے کہ جب انسان وضو کرتا ہے تو اس کے اعضاء کے تمام گناہ جھڑ جاتے ہیں، جب کلی کرتا ہے تو منہ کے گناہ جھڑتے ہیں۔ جب سر کا مسح کرتا ہے تو سر کے گناہ جھڑتے ہیں اور جب پاؤں دھوتا ہے تو پاؤں کے گناہ جھڑتے ہیں۔ تو فرمایا کہ: جب گناہ جھڑتے ہیں، مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شخص فلاں گناہ کا مرتکب ہوا ہے اور اس سے مجھے بدظنی پیدا ہوتی ہے تو میں نظریں نیچی کر لیتا ہوں تاکہ گناہ کا علم نہ ہو اور بدظنی پیدا نہ ہو۔ جن کی روحانیت قوی ہوتی ہے ان کو معاصی نظر آ جاتے ہیں۔

محاسبہ آخرت کی دنیا میں صورت مثالی...... اور قیامت میں تو اعمال بھی سب کو نظر آنے لگیں گے۔ حدیث میں ہے کہ: قیامت میں انسان کے سامنے دو چیزیں ہوں گی۔ ایک جہنم اور دوسرے اعمال کی صورت مثالی۔ اعمال کی صورت مثالی کی مثال یہ ہے کہ دیوان غالب اب چھپا ہے۔ تو غالب نے جس شعر میں جس خیال کا اظہار کیا ہے۔ اس شعر کے نیچے اس کی تصویر کھینچ کر اس خیال کو ظاہر کیا گیا ہے۔ حدیث میں علم کی صورت مثالی دودھ بتائی گئی ہے اور نماز کی صورت مثالی حسین عورت اور سخاوت کی صورت مثالی ایک عظیم الشان درخت بتائی گئی ہے۔ جس کے سایہ میں سخی آدمی بیٹھے گا، جیسا کہ اس کی سخاوت سے دنیا میں غریبوں نے فائدہ اٹھایا۔ یہ تو اعمال صالحہ کی صور مثالیہ ہیں۔ اسی طرح اعمال سیئہ کے بارے میں بھی حدیث میں ہے کہ: جو شخص مالدار ہو اور وہ زکوٰۃ ادا نہ کرے تو قیامت کے دن اس کا وہ خزانہ سانپ کی شکل میں متشکل ہو گا۔ اور اس مالدار کے گلے کا طوق بن جائے گا جو اس کو کاٹے گا اور کہے گا کہ میں تیرا مال ہوں' کیونکہ مال کی ظاہری صورت بہت عمدہ ہوتی ہے اور اس کا تصور بھی دل کو خوش کرتا ہے۔ چنانچہ ایک آدمی کے پاس اگر مال ہو وہ اسے خرچ بھی نہ کرتا ہو تو چوری ہو جانے پر اس کو بہت رنج ہوتا ہے۔ اور اگر ناجائز طریق سے حاصل کیا جائے مثلاً چوری کی جائے تو اس میں ایک قسم کا زہر بھی ہوتا ہے کیونکہ اس پر سزا ہوتی ہے۔ اس لئے اس عمل بد (یعنی عدم اداءِ زکوٰۃ) کو سانپ کی شکل دی گئی۔ حاصل یہ ہے کہ ہر عمل کو اس کے اوصاف کے مطابق شکل دی جائے گی۔ اور یہی صفات مذمومہ اگر خود آدمی میں راسخ ہو جائیں تو آخرت

① السنن لابي داؤد، كتاب النكاح، باب مايؤمر به من غض البصر، ج: ٦، ص: ٥٣ برقم: ١٨٣٧۔

میں بھی آدمی پر اس کا پرتو پڑتا ہے۔ دیکھنے میں وہ صحیح شکل وصورت کے لحاظ سے آدمی ہی کے لباس میں ہے مگر حقیقت آدمیت اس میں نہیں ہوتی۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے بینائی دی ہے وہ اس کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں۔

شیخ تقی الدین ابن دقیق العید رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے عارف باللہ، صاحب کشف وکرامت تھے۔ جب بغداد کی مسجد میں داخل ہوتے تو منہ پر نقاب ڈال لیتے۔ لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی۔ آپ نے فرمایا کہ: جب میں مسجد میں جاتا ہوں تو کوئی کتا نظر آتا ہے اور کوئی خنزیر نظر آتا ہے تو میں منہ پر نقاب ڈال لیتا ہوں تاکہ مسلمانوں سے بدظنی پیدا نہ ہو۔ یہ ایک الگ عالم ہے جو اہل اللہ پر مخفی نہیں۔ وہ خوب واقف ہیں۔ اقبال رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

اس جہان کی ایجادات نے اس صورت مثالی کو سمجھنا تو اب اور بھی آسان کر دیا ہے۔ چنانچہ سی۔ آئی۔ ڈی (C.I.D) کے محکمے کے پاس ایسے آلات موجود ہیں جن کے ذریعے سے وہ ہر خفیہ بات کو معلوم کر لیتے ہیں اور تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ مجرم کو انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔ امریکہ میں فیصلے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ حق تعالیٰ بھی اس وقت تک کسی کو سزا نہیں دیں گے۔ جب تک پہلے اس کو تمام زندگی کا ریکارڈ نہ دے دیں گے۔ اور پھر تمام اعمال کی صورت مثالیہ صف کی صورت میں اس کے سامنے پیش کر دی جائے گی۔ (جیسے کہ آج کل ٹی وی میں اعمال بعینہٖ موجود و متشکل باقی رہتے ہیں)

حدیث شریف میں ہے کہ زمین کے جس ٹکڑے پر کوئی نیک عمل کیا ہوگا، نماز پڑھی ہوگی تو وہ ٹکڑا گواہی دے گا۔ اور جس ٹکڑے پر کوئی گناہ کیا ہوگا، تو وہ ٹکڑا بھی گواہی دے گا کہ اس نے فلاں گناہ میرے اوپر کیا تھا۔ اسی پر بس نہیں بلکہ ملائکہ علیہم السلام بھی گواہی دیں گے۔ اس سے بڑھ کر تمام اعضاء میں قوت گویائی دے دی جائے گی۔ اور زبان سے یہ قوت سلب کر لی جائے۔ تو جس عضو سے جو کام کیا ہوگا، وہ خود گواہی دے گا کہ اس نے فلاں کام میرے اوپر کیا ہے۔ اتنی حجتوں کے بعد اس کو انکار کی ہمت نہ ہوگی اور خود زبان حال سے اقرار کرے گا کہ میں اس سزا کا مستحق ہوں۔ پھر خواہ اللہ تعالیٰ معاف ہی فرما دیں یا سزا دیں۔ لیکن معافی اقرار گناہ کے بعد ہوگی۔

ترتیب اصلاح...... دلوں کو متقی بنانا دین کا کام ہے۔ اور یہ ماحول کے بہتر ہونے سے ہوتا ہے اور اس کی ابتداء اپنے گھر سے کرنی چاہیے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے یہ فرمایا گیا: ﴿قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ ① یعنی اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ۔ جب گھر نیکی کا نمونہ بن گیا پھر حکم فرمایا: ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ ② تو آپ نے اپنے رشتہ داروں کو بلایا اور ایمان لانے کو تبلیغ کی۔ جن میں کچھ سعادت تھی، وہ متوجہ ہوئے اور ایمان قبول کر لیا اس کے بعد فرمایا: ﴿لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا﴾ ③ وحی

① پارہ: ۲۸، سورۃ التحریم، الآیۃ: ۶. ② پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۲۱۴.

③ پارہ: ۲۵، سورۃ الشوریٰ، الآیۃ: ۷.

آپ کی طرف بتا ردی گئی تھی کہ آپ مکہ والوں کو اور اردگرد والوں کو ڈرائیں۔ پھر فرمایا ﴿لِيَكُونَ لِلْعٰلَمِينَ نَذِيرًا﴾ ① تاکہ آپ تمام جہان والوں کے لئے ڈرانے والے ہوں۔ چنانچہ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام بادشاہوں کی طرف خطوط لکھے، اور ایمان کی تبلیغ کی۔ بس اصلاح کا یہی طریقہ ہے کہ اصلاح کی ابتدا پہلے اپنے گھر سے کرنی چاہئے۔ نیکی بدی میں انسان ایک بھیڑ چال ہے۔ بار ہا کا میرا مشاہدہ ہے کہ اگر مجلس میں ایک نے مصافحہ کیا تو تمام ہی شروع ہو جاتے ہیں ایسے ہی اگر ایک ابتداء کرے تو دوسروں سے بھی تمام بری عادتیں چھوٹ جاتی ہیں۔ اور ترتیب بھی یہ ہونی چاہئے کہ اولاً گناہوں کو چھوڑنا چاہئے، پھر نیکیوں کو اختیار کرنا چاہئے۔ اور گناہوں میں بھی پہلے کبائر کو، پھر صغائر کو چھوڑنا چاہئے۔ حدیث میں ہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا۔ اور اس نے عرض کیا کہ حضور ایمان تو لاتا ہوں مگر جتنے برے کام کرتا ہوں ان سب کو چھوڑ نہیں سکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم صرف جھوٹ کو چھوڑ دینے کا وعدہ کرتے ہو؟ اس نے کہا جی ہاں۔ اور خوشی خوشی یہ وعدہ کر کے چلا گیا۔ مگر پھر جب گناہ کا خیال آتا تو محاسبہ کا خیال پہلے آتا۔ چنانچہ جب شراب پینے چلا تو خیال ہوا کہ یہ فعل چھپے گا نہیں۔ یا جھوٹ بولوں گا۔ یا پھر حد لگے گی اور رسوائی ہوگی۔ جب چوری کا جذبہ پیدا ہوا تو بھی خیال ہوا کہ چوری چھپے گی نہیں، خواہ مخواہ رسوائی ہوگی۔ کیونکہ جھوٹ نہ بولنے کا سچا عہد کر کے ایمان قبول کیا تھا۔ تو اس عہد سے تمام ہی گناہ از خود چھوٹ گئے۔ چنانچہ یہ تینوں گناہ اس سے چھوٹ گئے صبح کو حاضر ہوا تو عرض کی۔ یا رسول اللہ! آپ نے چھڑائی تو ایک برائی اور چھوٹ گئیں ساری برائیاں۔ طبیب کامل مختصر سا نسخہ ہی تجویز کیا کرتا ہے۔ جس سے تمام امراض کا علاج ہو جاتا ہے۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک دیہاتی آیا اور بیعت ہو گیا۔ کہنے لگا کہ مولوی جی! آپ نے پوچھا ہی نہیں میں تو افیون بھی کھاتا ہوں۔ تو آپ نے حرام کہہ کر افیون نہیں چھڑائی بلکہ فرمایا کہ: جتنی افیون کھاتے ہو، بیس روز تک اس سے نصف کھایا کرو۔ پھر بیس دن اس سے نصف کھایا کرو۔ کرتے کرتے انشاء اللہ تعالیٰ چھوٹ جائے گی۔ لیکن وہ آدمی پکا تھا۔ جب سنا کہ یہ حرام ہے تو ایک دم ہی چھوڑ دی۔ خانقاہ سے چلا گیا۔ اور بیمار ہو گیا، خوب دست جاری ہوئے چھ ماہ تک بیمار رہا۔ آخر صحت ہوئی تو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور پانچ روپے بھی آپ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کئے۔ حضرت چونکہ غریب آدمی سے کچھ لیتے نہیں تھے واپس کر دیئے۔ اس نے کہا کہ حضرت میں چھ ماہ میں پانچ روپے کی افیون کھاتا تھا تو میرا نفس خوش ہوا کہ اچھا ہوا پانچ روپے بچ گئے۔ میں نے کہا یہ پانچ روپے اب نفس کے لئے نہیں ہیں، اب یہ افیون چھڑوانے والے کو ہی دیئے ہیں۔ پھر آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں سے کچھ تھوڑا اسے لے لیا۔

اصلاح کا عزم: ...آج ساری مصیبت ہی یہ ہے کہ اصلاح کا عزم ہی نہیں ہوتا۔ لوگ شکایت کرتے ہیں کہ ماحول

بہتر نہیں۔ماحول کوئی ایسی بارش تو نہیں جوآسمان سے برسے۔آخر ماحول کا بہتر بنانا بھی تو عزم ہی سے ہوتا ہے ؎

تو ہی اگر نہ چاہے تو بہانے ہزار ہیں

ہر کسے ناصح برائے دیگراں۔شریعت نے یہ تعلیم دی ہے کہ اپنے نفس سے ہمیشہ بدظنی رہے اور اپنے سوا ہر ایک سے حسن ظن ہو۔اور دنیا نے اس کے برعکس کیا ہوا ہے۔دہلی کے آخری تاج دار بادشاہ ظفر ان سے سلطنت چھن گئی۔آخر عمر میں صوفی ہو گئے تھے۔وہ کہتے ہیں ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر ۔۔۔ رہے دیکھتے اور وں کے عیب وہنر

پڑی جب اپنی برائیوں پہ نظر ۔۔۔ تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

تو میں نے عرض کیا کہ دین کا اثر اس وجہ سے کم نہیں کہ علم نہیں، بلکہ معاشرہ خراب ہے۔اس لئے پہلے ماحول اور معاشرہ کی اصلاح کرنے چاہیے۔

آج خیر خواہی سے اسلامی نظام کا مطالبہ ہو رہا ہے اور حکومت بھی خیر خواہی سے اس کو نافذ کرنا چاہتی ہوگی۔ لیکن تمام کام قانون سے نہیں ہوتے۔زنا کا اعلان حکومت تو نہیں کر رہی۔یہ جو زنا ہو رہے ہیں یہ ماحول کی خرابی سے ہیں۔اسی طرح چوری دیکھ لیجئے آج بھی چوری، زنا قانوناً جرم ہے گویا اسلامی نظام اگر مکمل طور پر نافذ نہیں، بعض اسلامی قوانین تو آج بھی نافذ ہیں۔اس کے باوجود زنا، چوری آج بھی ہو رہے ہیں۔اگر کل اسلامی نظام نافذ ہو گیا اور معاشرت ایسی ہی رہی تو بھی زنا چوری ہوتے رہیں گے اس لئے تمام کام حکومت پر ہی نہیں چھوڑنا چاہئے۔کم از کم جتنے اجزا اسلامی قانون کے نافذ ہیں ان پر تو عمل کرنا چاہئے۔ان پر بھی عمل نہیں۔

میں نے یہ آیت پڑھی تھی جس میں صرف تقویٰ ہی نہیں بلکہ صحبتِ صالح اختیار کرنے کا بھی حکم ہے۔اس لئے اہل علم اور درویش صوفیاء کی صحبت اختیار کرنی چاہئے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھی صحبت کی مثال عطار کی دکان سے دی ہے۔اگر انسان جائے تو خوشبو لے کر آتا ہے اگر چہ عطر نہ خریدے۔اور بُری صحبت کی مثال لوہار کی دکان سے دی ہے۔اگر آدمی جائے اور کچھ نہیں تو دھواں اس کو ضرور پہنچے گا۔اگر چہ کپڑے نہ جلیں۔بہر حال نیک صحبت اور صالحین کی معیت اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔بقدرِ ضرورت آیت کی تشریح ہو گئی۔اب میں ختم کرتا ہوں۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو حُسنِ خاتمہ نصیب فرماوے اور اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرماوے۔(آمین)

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

راہ نجات

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ ۔ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ ، وَالْعَالِمُوْنَ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْعَامِلُوْنَ. وَالْعَامِلُوْنَ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْمُخْلِصُوْنَ. وَالْمُخْلِصُوْنَ عَلٰى خَطَرٍ عَظِيْمٍ. ① صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

تمہید..... میرے محترم بھائیو اور بہنو!...... یہ ایک حدیث ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ جو اس وقت میں نے آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی ہے۔ اس میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چند بنیادی باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ کہ انسان کی نجات دنیا میں بھی آخرت میں بھی، انہی باتوں میں منحصر ہے۔ انہی چند اصولوں کی اس وقت مجھے تشریح کرنی ہے اور میں کوشش کروں گا کہ مختصر وقت میں ان کی کچھ ضروری شرح آپ حضرات کے سامنے عرض کروں۔

آدمی کی نجات اس کے اندرونی جوہر سے ہے..... پہلے اتنا اصول سمجھ لیجئے کہ انسان کو جو کچھ بھی نفع پہنچتا ہے، وہ جبھی پہنچتا ہے، جب کوئی خوبی اور بھلائی اس کے نفس میں آ جائے۔ نفس کے اندر پیوست ہو جائے۔ باہر کتنی ہی خوبیاں پھیلی ہوئی ہوں، لیکن وہ انہیں اپنے اندر نہ لے، اس کے لئے نفع کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ ایک باغ ہے اس میں قسم قسم کے پھول مہک رہے ہیں اور خوشبوؤں سے فضا بھری ہوئی ہے، لیکن آدمی ناک بند کر کے بیٹھ جائے اور کوئی خوشبو اندر نہ جانے دے، اس کو کوئی نفع نہیں پہنچے گا۔ دنیا میں خوشبوئیں بھری ہوئی ہیں، بھری رہیں، اسے نفع جب پہنچے گا جب خوشبو اندر پہنچے اور دماغ اس سے مستفیض ہو۔ اگر دنیا کے اندر ہزاروں خوب صورت اور خوش رو نوجوان پھر رہے ہوں، بہتر سے بہتر حسن و جمال کا نقشہ سامنے ہو، مگر ایک آدمی آنکھ بند کئے بیٹھا ہے، اسے کچھ پتہ نہیں کہ کون خوب صورت ہے کون بد صورت؟ تو اس کا دل نہ عشق سے آشنا ہوگا، نہ محبت سے

① دیکھئے تذکرۃ الموضوعات، ج: ۱، ص: ۲۰۰۔

آشنا ہوگا، نہ اسے کوئی نفع پہنچ سکے گا۔ دنیا کے فضا میں ہزاروں نغمے گونج رہے ہوں، بہتر سے بہتر آوازیں پھیلی ہوئی ہوں، لیکن اس کے کان میں سننے کی قوت نہیں ہے، یا اس نے کانوں میں روئی ٹھونس لی ہے، کوئی نغمہ اس کے کان میں نہیں پہنچتا، اسے اس سے کوئی نفع نہیں ہوگا۔ کتابوں میں ہزاروں مسائل لکھے ہوئے ہوں، علم پھیلا ہوا ہو لیکن اس کے دل کا دروازہ بند ہو، علم اندر نہ پہنچے، اسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ دنیا میں ایمان بھرا ہوا ہو، لاکھوں مؤمن موجود ہوں، لاکھوں اولیاء موجود ہوں اور اگر نبوت کا زمانہ ہو، تو نبی بھی موجود ہو، مگر وہ اپنے دل کے دروازے بند کر دے، نہ ایمان کو اندر داخل ہونے دے، نہ علم و معرفت کو، اسے انبیاء و اولیاء کے وجود سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اتنی بات آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ آدمی کی نجات اور اس کا نفع، اس کے اندرونی جوہر سے ہے۔ باہر کی چیز کو جب تک اندر نہ داخل کرے، اسے کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا۔ نہ اس کے لئے کوئی عزت کا سامان ہو سکتا ہے۔

اصل کمال وہی ہے جو انسان کی ذات میں ہو...... آپ نے نام سنا ہوگا حکیم سقراط کا۔ یہ یونان کا ایک بڑا حکیم گزرا ہے۔ فن طب کا یہ موجد ہے۔ اس فن کو اس نے مرتب کیا ہے۔ غرض بہت بڑا طبیب، حکیم، فلسفی اور عالم ہے۔ اس کی کیفیت یہ تھی کہ رات اور دن جنگلوں میں، پہاڑوں میں اور باغات میں جڑی بوٹیوں کا امتحان کرنے کے لئے مارا مارا پھرتا تھا۔ گل بنفشہ کی کیا خاصیت ہے، ملٹھی کی کیا خاصیت ہے، فلاں بوٹی کیا نفع پہنچائے گی اور کسی چیز کو چکھ کر دیکھ رہا ہے اور کسی کو سونگھ کر دیکھ رہا ہے۔ غرض محقق تھا۔ دن بھر اسی میں گزارتا تھا۔

یہ ایک دفعہ، دن بھر کا تھکا ماندا شہر میں آیا۔ شہر میں آ کر کسی دکان پر بیٹھا، تو اس کی آنکھ لگ گئی۔ بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ بادشاہ وقت کی سواری نکل رہی تھی۔ جلوس آ رہا تھا۔ بادشاہ ہاتھی پر سوار تھا، سامنے سے فوجیں، سپاہی، نقیب اور چوب دار گزر رہے تھے۔ ہٹو اور بچو کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ مگر یہ بے چارا اتنا سویا ہوا تھا، خدا جانے کتنے دنوں کا جاگا ہوا ہوگا، اس کی آنکھ نہ کھلی یہاں تک کہ بادشاہ کی سواری قریب آئی۔ تو بادشاہ کو بڑا غصہ آیا، کہ یہ بڑا بد تہذیب آدمی ہے۔ میں اس ملک کا بادشاہ ہوں، میری سواری آ رہی ہے اور یہ پیر پھیلائے ہوئے لیٹا ہوا ہے۔ اور سو رہا ہے، کوئی ادب اس کے اندر نہیں ہے۔ بادشاہ نے غصے میں اپنے ہاتھی یا گھوڑے سے اتر کے اس کے ایک ٹھوکر ماری اور کہا او بے ادب! جانتا نہیں ہے کہ میں کون ہوں؟ یہ بے چارہ آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا اور آنکھیں ملنے لگا۔ جیسے سویا ہوا آدمی جاگنے کے وقت آنکھیں ملا کرتا ہے۔ بادشاہ نے پھر ڈانٹ کر کہا ارے نامعقول! تو جانتا نہیں کہ میں کون ہوں؟ اس نے بڑے اطمینان سے آنکھیں ملتے ہوئے کہا کہ جی ہاں! ابھی تو میں جاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ آپ کون ہیں؟ اسی لئے آنکھیں مل رہا ہوں۔ اور اب تک میں اتنا جان چکا ہوں کہ آپ شاید جنگل کے درندے معلوم ہوتے ہیں۔ اس واسطے کہ درندوں کی عادت ہے کہ زمین پر پیر مارتے ہوئے چلا کرتے ہیں۔ ٹھوکریں مارتے ہیں۔ چونکہ آپ نے ٹھوکر ماری ہے۔ میں سمجھا کہ کوئی بھیڑیا یا شیر آ گیا ہوگا، کوئی جنگل کا درندہ ہے۔

بادشاہ کو اور زیادہ غصہ آیا کہ اب تک یہ ٹانگیں پھیلائے ہوئے لیٹا ہوا تھا اب اس کی زبان بھی میرے سامنے پھیل گئی ہے۔ ایسی بدتہذیبی کے کلمات۔! بادشاہ نے ڈانٹ کر کہا، ارے احمق، جاہل! تو نہیں جانتا کہ میں بادشاہ وقت ہوں۔ اتنے قلعے میرے قبضے میں ہیں۔ اتنے خزانے میرے قبضے میں ہیں۔ تاج شاہی میرے سر پر ہے۔ قبا، شاہی میرے کندھے پر ہے۔ اتنی فوجیں کھڑی ہوئی ہیں۔ اتنے ملک میرے تحت میں ہیں۔ اور تو میرے ساتھ گستاخی کر رہا ہے؟

اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ: آپ نے اپنی بڑائی بیان کرنے کے لئے تاج شاہی کو پیش کیا، قبا کو پیش کیا' قلعوں کو پیش کیا' پیسوں اور روپوں کو پیش کیا' ملکوں کو پیش کیا۔ ان میں سے ایک چیز بھی تو آپ کے اندر کی نہیں ہے۔ یہ تو باہر کی چیزیں ہیں۔ اس میں تیرا کیا کمال ہوا۔ اگر چاروں طرف سونا پھیلا ہوا ہے اور تیرے دل میں جہالت کی گندگی بھری ہوئی ہے، اس میں تیرا کیا کمال نکلا؟ تو نے بہترین لباس پہن رکھا ہے اور دل جہالت و بداخلاقی سے بھرا ہوا ہے۔ تو لباس سے تجھے کیا فائدہ پہنچا؟ یہ تو باہر کی چیز ہے۔ تو نے جتنی چیزیں پیش کیں، قلعہ، فوج، ان سے تو نے اپنا فخر پیش کیا۔ یہ سب چیزیں تیرے باہر کی ہیں۔ اپنے اندر کی بات بتلا، کہ تیرے اندر کیا کمال ہے؟ جس کی بنا پر تو دعویٰ کرتا ہے۔ اگر تیری عزت پیسے سے ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے اگر کوئی پیسہ چھین کر لے جائے تو تو بے عزت ہو گیا۔ عزت ختم ہو گئی۔ تیری عزت اگر تاج سے ہے، تو کسی نے تاج اتار لیا، یا تو رات کو میز پر رکھ کر سو یا، تو تو بے عزت ہو گیا۔ اس لئے کہ تاج سر پر نہیں رہا، لباس اتار دیا تو بے عزت ہو گیا۔ اس لئے کہ عزت تو کھونٹی پر ٹنگ گئی۔ تیری عزت اگر ان چیزوں پر ہے، تو یہ سب چیزیں تیرے سے باہر کی ہیں۔ تیرے اندر کا جوہر کون سا ہے؟ اور کہا کہ اگر تجھے فخر کا یا شیخی کا دعویٰ ہے تو یہ تاج بھی اتار، لباس بھی اتار، یہ قلعہ اور فوج بھی چھوڑ اور ایک لنگی باندھ کر دریا میں میرے ساتھ کود پڑ اور وہاں اپنے کمالات دکھلا، کہ تیری ذات میں کون سا جوہر ہے، تب تو میں سمجھوں گا کہ تو باکمال ہے تو نے تو کمال میں باہر کی چیزیں پیش کر دیں۔ ان میں ایک چیز بھی تیرے اندر نہیں اس میں تیرا کوئی کمال نہیں۔ اب بادشاہ بے چارہ شرمندہ، کیا جواب دے اس کا، بادشاہ چپ ہو گیا۔ میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ گویا سقراط نے یہ بتلایا کہ انسان کا کمال اندر کے جوہر سے حاصل ہوتا ہے۔ باہر کے جوہر سے اس کا کمال نہیں۔ سونا اگر اچھا ہے، اس سے آپ کی اچھائی تو ثابت نہیں ہوئی۔ کپڑا اگر بہت بے نظیر ہے، کپڑے کی خوبی ثابت ہوئی، آپ کی خوبی تو اس سے ثابت نہیں ہوئی۔ محل اور بلڈنگ اگر بہت اعلیٰ ہے، تو وہ خوب اور اچھی نکلی، لیکن آپ کی خوبی تو اس سے ثابت نہیں ہوتی۔ خوبی وہ ہے جو انسان کے نفس کے اندر پیوست ہو۔ ایسا کمال ہو کہ اگر آپ زمین کے اوپر رہیں تو بھی باکمال۔ زمین کے نیچے دفن کر دیا جائے، تب بھی باکمال، لباس پہن لیں، جب بھی باکمال۔ لباس اتار دیں، جب بھی باکمال۔ کمال اپنے اندر ہونا چاہئے۔ باہر نہ ہونا چاہئے۔ ورنہ یہ تو ایسا ہو جائے گا جیسے فن نحو کا امام سیبویہ تھا۔ عربی گرائمر کا بہت بڑا عالم

گزرا ہے، بڑے اونچے درجے کا امام سمجھا گیا ہے۔ جب یہ تعلیم پاتا تھا۔ تو استاذ جو تقریریں کرتے تھے، یہ نوٹ کرتا رہتا تھا۔ اور اتنی بڑی ایک کاپی اس نے بنائی کہ کئی سیر کے کاغذات تھے، جس میں تمام یادداشتیں لکھی ہوئی تھیں۔ تو طالب علمی کے زمانے کی وہ کاپیاں اور نوٹ بکیں اس کے پاس بیٹھے ہوئے رکھے تھے، اتفاق سے روٹی جو لینے گیا، تو اس دسترخوان میں جس میں روٹیاں تھیں، اسی میں اس نے وہ کاغذ بھی لپیٹ دیئے۔ کتا جو آیا، روٹی لے کر چلا، تو وہ کاغذات بھی پوٹلی میں ساتھ لے گیا۔ اب یہ چیختا ہوا اس کے پیچھے بھاگ رہا ہے اور کتا آگے آگے جا رہا ہے۔ لوگوں نے کہا سیبویہ! کہاں جا رہا ہے؟ اور کہاں بھاگ رہا ہے؟ اس نے کہا، کتا میرا علم لے کر چلا گیا، اس کے پیچھے جا رہا ہوں۔ لوگوں نے کہا: کمبخت! وہ علم ہی کیا ہو' جسے کتا لے کر بھاگ جائے۔ اس نے کہا، واللہ باللہ میری تو عمر بھر کی کمائی اس میں تھی، جو کتا لے جا رہا ہے۔

تو جیسے سیبویہ نے سارا علم کتے کے سپرد کر دیا تھا۔ اس کے اندر کوئی چیز نہیں رہی تھی، اسی طرح اگر آدمی کے اندر کوئی کمال نہ ہو، تو اسے کتا بھی لے کر بھاگ جائے گا۔ شیر بھی لے کر بھاگ جائے گا، بھیڑیا بھی لے جائے گا، دشمن بھی لے جائے گا وہ کمال ہی کیا ہوا کہ دوسرا لوٹ کر لے جائے اور آدمی کورا رہ جائے۔ کمال وہ ہے کہ انسان کے نفس میں ہو۔ ہزار آفتیں آئیں مگر وہ باکمال رہے۔ ہزار مصیبتیں آئیں۔ دشمن چڑھ آئیں، مگر وہ باکمال بنا رہے کمال اس کے نفس میں پیوست اور چھپا ہوا ہو، وہی اصل کمال ہے۔

دل ایک عجیب کیمیا ہے...... آپ نے مولانا رومی رحمہ اللہ تعالیٰ کا نام تو سنا ہوگا، بہت بڑے عارف کامل ہیں، مثنوی لکھی ہے، جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ ۔

ہست قرآن در زبان پہلوی

گویا فارسی زبان میں اللہ نے ان سے قرآن لکھوا دیا۔ بہر حال بہت بڑے تصوف کے امام گزرے ہیں۔ انہوں نے ایک عجیب واقعہ لکھا ہے۔ اس واقعے سے عبرت دلانی مقصود ہے۔ اس کو آدمی اگر غور سے سنے اور تدبر کرے۔ اس سے بڑی عبرت اور نصیحت حاصل ہوگی۔ مولانا نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ رومیوں اور چینیوں میں باہم لڑائی ہوگئی۔ رومیوں کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم بڑے صناع، دستکار ہیں اور بہترین صنعتیں بناتے ہیں، ہمارے ہاتھ میں حکمت ہے۔ بلڈنگیں بھی اعلیٰ سے اعلیٰ بناتے ہیں کپڑا بھی بہتر سے بہتر بناتے ہیں، برتن وغیرہ، غرض ہر سامان بہتر بناتے ہیں۔ چینیوں نے کہا ہم سب سے زیادہ صناع ہیں۔ ہم سے بڑا دستکار اور ماہر کوئی دوسرا نہیں ہے۔ دونوں میں لڑائی ہوئی، جھڑپ شروع ہوئی۔ دونوں میں سے ہر ایک کہتا ہے کہ ہم زیادہ ماہر ہیں۔ اتنی جھڑپ ہوئی کہ آخر مقدمہ بادشاہِ وقت کے پاس پہنچا۔ بادشاہ نے کہا کہ جھگڑا کیا ہے؟ رومیوں نے کہا کہ ہم بڑے صناع، دستکار اور ماہر ہیں، چینیوں نے کہا کہ ہم زیادہ ماہر ہیں۔ بادشاہ نے کہا دعویٰ سے کام نہیں چلتا، اپنی اپنی صنعت بنا کر دکھلا دو۔ ہم مقابلہ کر کے سمجھیں گے کہ کون زیادہ تم میں ماہر ہے۔ بادشاہ نے ایک بہت بڑا ہال بنوایا اور بیچ میں پارٹیشن

کر کے ایک دیوار کھڑی کر دی اور رومیوں سے کہا کہ آدھے مکان میں تو تم اپنی صنعت دکھلاؤ کویا نقاشی کرو اور چینیوں سے کہا کہ آدھے مکان میں تم اپنا کام دکھلاؤ، اس کے بعد میں ہم ایک دوسرے کے کام کا مقابلہ کر کے دیکھیں گے، جس کا کام اعلیٰ ہوگا، اسے ڈگری دیں گے، اسے پاس کریں گے۔

چنانچہ مکان میں ایک طرف رومیوں نے اپنی دستکاری دکھلائی شروع کی اور ایک طرف چینیوں نے۔ چینیوں نے تو یہ کیا کہ دیوار کے اوپر پلاسٹر کر کے رنگ برنگ پھول، بوٹے اور بیلیں ایسی بنائیں کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ باغ و بہار ہے، ساری دنیا کے چمن اور گلشن اسی دیوار کے اندر آ گئے ہیں۔

رومیوں نے کیا کیا؟ ایک پھول نہیں بنایا، ایک بوٹا نہیں بنایا، دیوار پر پلاسٹر کر کے اس کو صیقل کرنا شروع کیا اور اسے مانجھنا شروع کیا۔ مانجھتے مانجھتے اتنا چکا دیا کہ دیوار بالکل آئینہ بن گئی۔ جب دونوں اپنے کام سے فارغ ہوئے، تو بادشاہ کو اطلاع کی کہ ہم نے اپنی اپنی دستکاری بنالی ہے اور محنت کر کے اپنے کاموں کا نمونہ تیار کیا ہے۔ آپ دونوں کو دیکھ کر فیصلہ دیجئے کہ کس کی صنعت زیادہ اعلیٰ ہے۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ دیوار بیچ میں سے ہٹادی جائے، جو پارٹیشن کے طور پر درمیان میں قائم کی تھی۔ دیوار کا ہٹنا تھا کہ چینیوں نے جتنے بوٹے بنائے تھے وہ سب کے سب ادھر نظر آنے لگے، کیوں کہ دیواریں تو صیقل ہو چکی تھیں۔ اب بادشاہ حیران ہے کہ جو پھول پتے اُدھر بنے ہوئے ہیں، وہ ادھر بھی نظر آ رہے ہیں، جو رنگ اُدھر لگے ہوئے تھے، وہ ادھر بھی ہیں۔ بلکہ ادھر یہ زیادہ دیکھنے میں آیا کہ ادھر کے پھولوں پتوں میں چمک بھی تھی۔ بادشاہ نے کہا کہ رومیوں کی صنعت بڑھ گئی، چینی ہار گئے، اس لئے رومیوں نے اپنی صنعت بھی دکھلائی اور ان کی بنی بنائی صنعت کو چھین کر اپنا کر لیا، تو دوگنی صنعت ہوگئی۔ لہٰذا رومی کامیاب ہیں۔ ہم انہیں پاس کرتے ہیں اور چینی فیل ہو گئے۔ ان کی صنعت کوئی بڑی صنعت نہیں نکلی۔

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ یہ مثال دے کر کہتے ہیں کہ: اے عزیز! تو بھی رومیوں کی صنعت اختیار کر، چینیوں کی مت کر، تو اپنے دل کو مانجھ کر صیقل کر کے ایسا آئینہ بنالے کہ دنیا کے سارے نقش و نگار تجھے گھر کے اندر بیٹھے ہوئے دل کے اندر نظر آئیں۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو و چمن درآ   تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ ای در دل کشا بچمن درآ

بڑے ستم کی بات ہے کہ دنیا کی رنگینیوں پر فریفتہ ہو کر کبھی اس باغ میں کبھی اس چمن میں کبھی اس بوٹے پہ کبھی اس پتی پر پھر رہا ہے۔ تو اگر رومیوں کی صنعت اختیار کر کے دل کو مانجھ لے یہ ساری پھول پتیاں گھر بیٹھے تجھے دل ہی میں نظر آئیں گی اور ساری دنیا تیرے دل میں چمک اٹھے گی۔ دل کو مانجھ کر رومیوں کی صنعت پیدا کر تو اللہ میاں کے ہاں تو بھی پاس ہو جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دل اللہ نے بڑی عجیب کیمیا بنائی ہے۔ باہر کی چیزیں آدمی چھان کر اندر لے آئے تو

اس کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔ اور باہر چمن کھلے رہیں اور دل اندر سے خالی رہے۔ اس کے لئے نہ نجات کی صورت ہے نہ نفع کی صورت تو اصل چیز یہ ہے کہ انسان اپنے دل کو مانجھے صیقل کرے، آئینہ بنائے۔

قلب کے دو دروازے...... اللہ نے انسان کے دل میں دو دروازے رکھے ہیں، ایک دروازہ کھلتا ہے، تو اسے عرش کی چیزیں نظر آتی ہیں اور ایک دروازہ کھلتا ہے تو اسے فرش کی چیزیں نظر آتی ہیں۔ دل میں، آنکھ، کان، ناک کے راستہ سے جب آدمی دیکھے گا، تو ظاہری چمک دمک، پھول بوٹے سب نظر آئیں گے۔ اور ان آنکھ، کان، ناک کے دروازوں کو بند کر کے دل کے اندر کے دروازے کھولے گا، تو عرش کی چیزیں نظر آئیں گی، وہاں کے علوم اور کمالات اترنے شروع ہوں گے، تو قلب کے اندر دونوں راستے ہیں۔ اگر اوپر کے دروازے بند کر دو گے، صورتیں، شکلیں نظر پڑیں گی۔ نیچے کا دروازہ بند کر دو گے، حقیقتیں کھلنی شروع ہو جائیں گی۔ دل میں دونوں قسم کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ اعلیٰ ترین صلاحیت یہ ہے کہ آدمی اوپر کی چیز کو جذب کرے، علم خداوندی کو، کمالات کو، معرفت خداوندی کو، اخلاق ربانی کو اور ملائکہ کی صفات کو جذب کرے، تو صحیح معنی میں کامل انسان اور کامل بشر بنے گا۔

مولانا روی رحمہ اللہ تعالیٰ کے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اندر کی صنعت پیدا کرو۔ باہر کی صنعت کے اوپر فریفتہ ہونا مت سیکھو، باہر کی چیزیں بھی اگر لو گے، وہ بھی جبھی کام دیں گی۔ جب اندر کچھ جوہر موجود ہو اور اگر اندر خالی ہے، تو باہر کی چیزیں نفع نہیں دے سکتیں۔ اس واسطے اپنے دل کو صاف کر کے اسی طرف آنا پڑے گا۔

علم روشنی اور غلبہ کا ذریعہ ہے...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں ایسی ہی بنیادی چیز کا ذکر فرمایا ہے کہ: جس سے انسان کا اندرون روشن ہو، قلب میں روشنی اور آراستگی پیدا ہو۔ آپ نے فرمایا: "اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ" سارے انسان تباہ و برباد ہونے والے، سب ہلاک ہو جانے والے ہیں، اگر بچیں گے تو اہل علم بچ سکتے ہیں، یعنی جہالت میں انسان کی نجات نہیں ہے۔ علم میں انسان کی نجات ہے، دنیا کا علم ہو، یا دین کا علم ہو، علم ہی سے راستہ نظر پڑ سکتا ہے۔ جہالت سے راستہ نظر نہیں پڑتا۔ جہالت فی الحقیقت ایک اندھیری ہے اور علم فی الحقیقت ایک چاندنا ہے تو چاندنے میں راستہ نظر پڑا کرتا ہے، اندھیرے میں راہیں نظر نہیں پڑتیں، جہالت میں نہ دنیا کی بھلائی سامنے آسکتی ہے نہ آخرت کی بھلائی۔

آج دنیا بھی اگر بنی ہوئی ہے اور آراستہ ہے، تو وہ بھی انسان کے علم کی وجہ سے بچ رہی ہے اگر آخرت درست ہے، وہ بھی انسان کے علم ہی کی وجہ سے درست ہے۔ آج یہ آپ کا شہر جگمگا رہا ہے، لاکھوں قمقمے بجلی کے روشن ہیں، شہر میں چاندنا ہے۔ کوٹھیاں اور بنگلے روشن ہیں۔ چاندنا آپ کے علم کا ہے، بجلی کا نہیں ہے۔ اگر آپ علم وسائنس کی قوتیں استعمال نہ کرتے۔ تو نہ قمقمہ بنتا، نہ بجلی اور قمقمہ نہ ہوتا تو یہ گھر اور شہر روشن نہ ہوتا۔ علم نے قمقمہ بنایا، بجلی کو دریافت کیا اور علم نے یہ صناعیاں کیں، اس کی وجہ سے روشنی ہوئی۔ تو درحقیقت یہ علم کا چاندنا پھیلا ہوا ہے، اگر انسانوں میں جہالت ہوتی، فن سائنس کو نہ جانتے، یہ چاندنا سامنے نہ آتا۔ یہ چھت میں آپ کو جو چمک نظر

آ رہی ہے۔ یہ آپ کے علم کی چمک ہے، بجلی کی نہیں ہے۔ بجلی تو خود آپ کے علم سے آئی ہے۔
جہالت ذریعہ مغلوبیت ہے ...... یہی علم کی قوت ہے جو انسان کو اونچا بناتی ہے۔ اور دنیا کے اوپر غالب کرتی ہے۔ اگر جہالت ہو تو آدمی مغلوب ہو جاتا ہے۔ زمین بیچاری علم نہیں رکھتی، رات دن جوتیوں میں پامال ہے، جانور علم نہیں رکھتے، رات دن آپ کی غلامی میں مبتلا ہیں کسی جانور کے کندھے پر آپ نے ہل رکھا ہے، اس سے کھیتی باڑی کرا رہے ہیں، کسی جانور کی پشت پر زین کس رکھا ہے اور انسان سوار ہوا پھر رہا ہے۔ گھوڑا طاقت میں انسان سے چوگنی طاقت رکھتا ہے۔ مگر انسان کے آگے دبا ہوا ہے اس لئے کہ غریب کے پاس علم کی قوت نہیں۔ اور یہ بھی اللہ کا فضل ہے کہ اللہ نے جانوروں کو علم نہیں دیا، عقل نہیں دی۔ اگر کہیں گھوڑے اور بیل میں عقل آ جاتی اور انسان اس پر زین کسنے لگتا، گھوڑا کہتا کہ ٹھہر جایئے، پہلے دلیل سے ثابت کیجئے کہ آپ کو مجھ پر سوار ہونے کا حق ہے۔ میں کیوں نا آپ پر سوار ہو جاؤں؟ اور میں کیوں نہ زین کس دوں؟ تو دو گھنٹے تو مناظرہ ہوتا، معلوم نہیں بحث میں کون جیتتا۔ کون ہارتا، نہ سواری ہوتی، نہ کھیتی باڑی ہوتی۔ تو شکر کرو کہ اللہ نے انہیں جاہل بنایا اور انہیں عقل نہیں دی۔

اس سے اتنی بات بھی معلوم ہوئی کہ کہیں جہالت بھی نفع دیتی ہے، محض علم ہی نفع نہیں دیتا۔ اگر دنیا میں جاہل نہ ہوں تو غلامی کرنے والا کوئی نہ ہو اور جب غلام کوئی نہ ہو، تو آقا کی آقائی کیسے کام دے گی؟ لیڈروں کی لیڈری جبھی چلتی ہے۔ جب پبلک جاہل ہو۔ اگر سارے پڑھے لکھے عالم بن جائیں تو لیڈر کام نہیں کر سکتا۔ بے چارے لیڈروں کی عزت تبھی بنتی ہے، جب پبلک میں جہالت ہو۔ تو جانوروں سے فائدہ جبھی اٹھایا جا سکتا ہے جب جانوروں کے اندر عقل و شعور نہ ہو۔ ان میں شعور ہوتا، تو نہ کھیتی ہوتی، نہ سواری ہوتی، نہ حشم و خدم ہوتا۔ بہر حال ان تمام چیزوں پر انسان نے غلبہ پایا ہے، وہ بدن کی طاقت سے نہیں پایا۔ بدن میں تو طاقت میں گھوڑا، بیل ہم سے زیادہ ہے، وہ غلبہ علم اور عقل کی طاقت سے پا رکھا ہے۔

بچپن میں ہم نے ایک حکایت عورتوں سے سنی تھی، واللہ اعلم قصہ واقعی ہے یا فرضی۔ واقعہ اگر فرضی بھی ہو تو مثال دینے اور عبرت پکڑنے کے لئے کافی ہے۔ وہ قصہ ہم نے یہ سنا تھا اپنی ماں بہنوں سے جو انہوں نے نصیحت کے لئے سنایا تھا کہ ایک شیر کا انتقال ہونے لگا تو اس نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی کہ دیکھو بیٹا! ہر ایک سے ملنا، ہر ایک کے پاس جانا۔ اس انسان کے پاس مت جانا، یہ بڑی ظالم چیز ہے، اگر کہیں اس کے پاس چلے گئے تو تم خطا اٹھاؤ گے، مصیبت میں مبتلا ہو گے، وہ شیر صاحب جو سارے جنگل کے بادشاہ تھے، انتقال فرما گئے۔ ان کی جگہ ان کے صاحبزادے "یعنی شیر کا بچہ" ولی عہد بنے۔

شیر کا بچہ تجربہ نہیں رکھتا تھا، جوان ہوا، مگر عقل تو آتے آتے ہی آتی ہے۔ کیسی بھی عقل ہو، جانور ہونے کی یا انسان ہونے کی ہو، عمر گزرنے کے بعد آتی ہے۔ بچہ ہر ایک کا ناتجربہ کار ہوتا ہے، جانور کا ہو یا انسان کا ہو۔ تو شیر کے بچے کا بچپن تھا باپ تو اٹھ گیا، شیر کا انتقال ہو گیا۔ اس شیر کے بچے نے کہا کہ میرے باپ نے کہا تھا کہ تو انسان

کے پاس مت جانا، یہ بڑی ظالم چیز ہے، دیکھنا تو چاہئے انسان ہوتا کیا ہے؟ اور میرا باپ بہت ڈرر ہا تھا، میرا باپ تو سارے جنگل کا بادشاہ تھا، اتنی طاقت والا تھا، وہ بھی ڈرر ہا تھا، انسان معلوم نہیں کوئی دس گز لا نبا ہو گا، بیس گز کا ہوگا، کیا چیز ہوگی انسان؟ دیکھنا تو چاہئے، تو جو پاس کے حالی موالی تھے۔ انہوں نے کہا کہ دیکھو بڑوں کی نصیحت پر عمل کرنا چاہئے۔ باپ نے کہا کہ انسان کے پاس بھی مت جانا، یہ بڑی ظالم چیز ہے، تم ارادہ مت کرو، کہیں کسی مصیبت میں مبتلا نہ ہو جاؤ، اس نے کہا نہیں بھائی کم سے کم ایک دفعہ دیکھنا تو چاہئے کہ یہ انسان کیا چیز ہے۔

باپ کی نصیحت نہیں مانی اور انسان کو دیکھنے کی خاطر چلے۔ اتفاق سے سب سے پہلے گھوڑے پر نظر پڑی کہ چھلانگیں مارتے ہوئے جارہا ہے۔ شیر کے بچے نے سمجھا کہ یہی انسان معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ باپ تو ڈیڑھ گز لانبا تھا اور یہ تو بہت ڈیل ڈول کا ہے، میرا باپ جو ڈرتا تھا، یہ اس سے دوگنا چوگنا ہے واقعی ٹھیک ڈرتا تھا۔ تو گھوڑے کے قریب جاکے ڈرتے ڈرتے اس نے کہا کہ جناب ہی کا نام انسان ہے؟ گھوڑے نے کہا کس ظالم کا نام لیا۔ میرے سامنے انسان کا نام مت لینا' وہ تو بڑی ظالم چیز ہے جسے انسان کہتے ہیں۔ میں بہت ڈیل ڈول کا ہوں مگر انسان میری کمر پر زین کستا ہے، اس پر سوار ہوتا ہے، اس کے ہاتھ میں کوڑا ہوتا ہے۔ میری پیٹھ پر کوڑے پڑتے ہیں۔ میں بھاگتے بھاگتے تھک جاتا ہوں، انسان ہے کہ مارتے مارتے باز نہیں آتا۔ تو سب چیزوں کا ذکر کرنا مگر اس ظالم انسان کا نام مت لینا، یہ بڑی مصیبت کی چیز ہے۔ شیر کے بچے نے کہا، یا اللہ! انسان کتنے ڈیل ڈول کا ہوگا۔ یہ ایسا لانبا چوڑا جانور، یہ بھی انسان سے ڈررہا ہے اور میرا باپ بھی ڈرتے ڈرتے مر گیا، کیا چیز ہوگی انسان؟ اور آگے چلے تو اتفاق سے اونٹ نظر پڑا۔ اس نے کہا یہ ہوگا انسان۔ کوئی کل ہی سیدھی نہیں۔ گردن ادھر کو جارہی ہے، کمر ادھر کو جارہی ہے۔ ٹانگیں ادھر کو نکل رہی ہیں۔ بس یہی انسان ہوگا۔ یہ تو گھوڑے سے بھی چار ہاتھ اونچا ہے۔ اس نے قریب جاکر اونٹ سے کہا، کیا آپ ہی کا نام انسان ہے؟

اس نے کہا ارے: "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ" کس ظالم چیز کا نام لے دیا۔ یہ بڑی ظالم چیز ہے، اس کا نام میرے سامنے مت لینا، اس واسطے کہ میں تو اکیلا ہوں۔ میرے علاوہ میرے سوسو بھائی بند اور ناک میں نکیل، جو آگے جا رہا ہے۔ اس کی دم میں پچھلے کی نکیل بندھی ہوتی ہے اس طرح سوسو کی قطاریں ہوتی ہیں اور انسان کا ایک بچہ ہمیں ہنکاتا ہے، ہم گڑگڑاتے ہیں بلبلاتے ہیں مگر ایک بچہ ہنکا کر لے جاتا ہے سو اونٹ کی بھی ایک انسان کے آگے نہیں چلتی۔ یہ بڑی ظالم چیز ہے۔ اس کا نام میرے سامنے مت لینا۔ شیر کے بچے نے کہا، یا اللہ! کتنی بڑی چیز ہوگا۔ یہ اتنے بڑے ڈیل ڈول کا، یہ بھی ڈررہا ہے، گھوڑے نے تو اپنی مصیبت بیان کی۔ اس نے تو اپنی برادری کی مصیبت بیان کی کہ سو اونٹ مل جائیں، تب بھی انسان کے ایک بچے سے عاجز ہیں۔ پھر یہ ڈرتا ڈرتا آگے بڑھا تو اتفاق سے ہاتھی نظر پڑ گیا، اس نے کہا یہ انسان ہوگا، اس لئے کہ اچھے خاصے چار ستونوں پہ بلڈنگ بنی ہوئی ہے۔ چھت پڑی ہوئی ہے۔ اس پر ایک بڑا حوضہ رکھا ہوا ہے۔ یہ انسان ہوگا۔ ڈرتے ڈرتے ہاتھی سے جاکر کہا، کہ جناب ہی کا

نام انسان ہے؟ آپ ہی کو آدمی کہتے ہیں۔

اس نے کہا، ارے ''اَسْتَغْفِرُ اللّٰہ'' کس مصیبت کا نام لے لیا، میرے سامنے اس کا نام مت لے، یہ بڑی ظالم چیز ہے، میرے ڈیل ڈول پر مت جانا، قد وقامت میرا اونچا نظر آ رہا ہے کہ ایک عمارت سی کھڑی ہوئی ہے۔ مگر ایک انسان کا بچہ میری پشت پر سوار ہوتا ہے، لوہے کا ہنٹر اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ذرا میں چیخا، اس نے میرے سر پر لوہے کا ہنٹر مارا، میں چنگھاڑتا ہوں اور کچھ نہیں کر سکتا۔ گھوڑے کے منہ میں تو لگام بھی ہوتی ہے۔ میرے سر پر بے لگام ہی سوار ہوتا ہے، تو نہ لگام، نہ نکیل، مگر انسان کے سامنے میں مجبور ہوں۔ شیر نے کہا، یا اللہ! انسان کیا چیز ہوگی، جو ملتا ہے ڈرتے ڈرتے ملتا ہے، جو ملا وہ کانپ رہا ہے کہ انسان بڑی ظالم چیز ہے۔

آگے چلا تو اتفاق سے ایک بڑھئی کا بچہ دس برس کا، وہ ایک بڑا بھاری شہتیر چیر رہا تھا اور بہت بڑا آرہ اس میں ڈال رکھا تھا، اسے چیرے جا رہا تھا اور جتنا وہ چیر چکا تھا، اس میں ایک کھونٹی ڈال دی تھی، تا کہ اور نیچے نہ مل سکے۔ تو شیر کو یہ وہم بھی نہیں گزرا کہ یہ انسان بھی ہو سکتا ہے، وہ دیکھ کر آیا تھا، اونٹ کو گھوڑے کو اور ہاتھی کو اور سب کو دیکھا کہ انسان سے ڈر رہے ہیں۔ تو وہ اس بچے سے تھوڑا ہی ڈر سکتے ہیں۔ اسے وہم بھی نہیں گزرا کہ یہ انسان ہوگا۔

مگر تحقیق کے لئے اس سے پوچھا کہ انسان کہاں ملے گا؟ بڑھئی نے کہا کہ انسان تو مجھے ہی کہتے ہیں۔ اس نے کہا اچھا تو تو انسان ہے؟ آدھ گز کا اتنا سا بچہ؟ کہا جی ہاں، انسان تو مجھے ہی کہتے ہیں۔ اس نے کہا: ''لاحول ولا قوۃ'' میرا باپ بڑا بے وقوف تھا، جو تجھ سے ڈر رہا تھا، میں ایک چپت میں تیرا کام تمام کر دوں گا اور شیر نے یہ کہہ کر اٹھایا پنجہ۔ بڑھئی کے بچے نے سمجھ لیا کہ یہ تو شیر ہے۔ اب موت آ گئی۔ اگر اس نے ایک طمانچہ بھی مار دیا، میں تو ختم ہو جاؤں گا، تو تدبیر سے کام کرنا چاہئے، بڑھئی کے بچے نے کہا کہ آپ تو جنگل کے بادشاہ ہیں، میں کیا چیز ہوں آپ کے آگے۔ آپ بڑی طاقت والے۔ مگر ایک کام ہے جو میں نہیں کر سکتا، آپ ہی جیسا طاقت ور کر سکتا ہے اگر آپ اس کام کو انجام دے دیں؟

شیر نے کہا، ہاں بتلاؤ، کیا کام ہے؟ کہا یہ شہتیر جو میں نے چیرا ہے بڑی مصیبت سے اسے چیرتے چیرتے یہاں تک لایا ہوں۔ اوپر میں نے کھونٹی لگا رکھی ہے۔ اب وہ کھونٹی مجھ سے نکلتی نہیں، آپ اگر اس میں ہاتھ ڈال کے یہ کھونٹی نکال دیں، تو بڑا کام ہوگا۔ اس نے کہا یہ کونسا بڑا کام ہے، میں ابھی نکالتا ہوں۔ تو شیر نے دونوں ہاتھ اس میں دیئے، بڑھئی کے بچے نے چپکے سے وہ کھونٹی نکال دی، دونوں پھٹے برابر ہوئے تو شیر صاحب پھنس گئے؟ اور چیں چیں کر رہے ہیں، نکلا جاتا نہیں اور وہ بڑھئی کا بچہ کھڑا ہوا ہنس رہا ہے۔ دیکھ لیا انسان کو؟ اب وہ شیر ہے کہ پھنس رہا ہے، نہ نکل سکتا ہے نہ جا سکتا ہے۔ اس کے ہاتھ پیر ان دونوں پھٹوں کے اندر پھنس گئے وہ کھونٹی نکل گئی اور بڑھئی کے بچے نے ہنسنا شروع کیا۔ اس وقت شیر کے بچے نے کہا کہ واقعی جو اپنے ماں باپ کی نصیحت نہیں مانتا، وہ اسی ذلت وخواری کا شکار بنتا ہے۔ گویا عورتوں نے ہمیں یہ قصہ عبرت دلانے کے لئے سنایا تھا کہ اپنے بڑوں کی نصیحت

مانگی چاہئے۔ جو اس نصیحت کے خلاف کرتا ہے، وہ یوں ذلت میں مبتلا ہوتا ہے اور مصیبت کا شکار ہوتا ہے۔

مجھے اس سے یہ سنانا مقصود ہے کہ بڑھئی کے اتنے سے بچے نے جو شیر پر قابو پایا۔ اور ہاتھیوں پر قابو پایا، اونٹوں اور گھوڑوں پر قابو پایا، وہ بدن کی طاقت سے قابو نہیں پایا۔ بدن کی طاقت اونٹ کی انسان سے زیادہ ہے۔ اگر اونٹ بلا ارادہ انسان پر گر پڑے تو انسان پس کر رہ جائے، چکنا چور ہو جائے۔ ہاتھی اگر کسی انسان پر آ پڑے، تو انسان تو بے چارہ پس کے رہ جائے۔ کچھ بھی طاقت نہیں۔ تو بدن کی طاقت سے انسان غالب نہیں آیا۔ علم اور عقل کی طاقت سے غالب آیا ہے۔ وہ طاقت آنکھوں سے نظر نہیں آتی۔ وہ دل میں رہتی ہے۔ انسان کی انسانیت فی الحقیقت اس طاقت میں چھپی ہوئی ہے۔ اگر بدن ہمارا بہت ڈیل ڈول کا ہو جائے، پہلوان بن جائیں اور اندر عقل نہ ہو، ہم غلبہ نہیں پا سکتے۔ انسان کا غلبہ تو علم و عقل اور فضل و کمال سے ہے۔

انسانی عقل و شعور کی قوت...... یہ جو ساری دنیا عاجز ہے۔ شیر نے بھی کہا کہ انسان کا نام مت لو، بھیڑیے نے بھی کہا، یہ اس کی عقل سے ڈر رہے تھے، بدن سے نہیں ڈر رہے تھے۔ آج یہ مشینیں چل رہی ہیں۔ مشین لگا دی اور پہاڑوں کے بڑے بڑے پتھر پس پس کر اس میں چونا بن رہے ہیں۔ تو نہ پہاڑ کی پیش چلتی ہے، نہ درختوں کی پیش چلتی ہے۔ ساری چیزیں کٹ رہی ہیں دنیا ہے کہ پسی جا رہی ہے، انسان کے آگے عاجز ہے، انسان کھڑا ہوا ہے، کہیں چکی بنا دی کہیں مشین بنا دی۔ زمین کے خزانے انسان نے نکال نکال کے استعمال کئے اور زمین بے چاری چوں نہیں کر سکتی۔ اب آپ کے افریقہ میں جگہ جگہ سونے کی کانیں ہیں۔ ہزار فٹ گہرے غار کھود کر گویا انسان نے زمین کا جگر نکال لیا، مگر زمین کچھ بھی نہیں بول سکتی۔ سونا اس کا نکال باہر کیا۔ چاندی اس کی نکالی، ہیرے اس کے نکال ڈالے۔ انسان کے آگے سب چیزیں عاجز ہیں اور یہ تصرف کر رہا ہے، یہ بدن کا تصرف نہیں، یہ علم و عقل کا تصرف ہے۔ تو سائنس انسان کے بدن سے نہیں، انسان کے دماغ سے پیدا ہوئی، عقل سے نکلی، دنیا میں جتنی سجاوٹ ہے جتنی زینت اور آرائش ہے، وہ انسان کے علم کی ہے۔ آخرت جتنی منور ہوگی، وہ انسان کے علم سے منور ہوگی، عمل سے منور ہوگی۔ بدن کے ڈیل ڈول سے منور نہیں ہوگی۔

امت محمد یہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیغام...... حدیث میں ہے کہ: معراج کی شب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ساتویں آسمان پر پہنچے ہیں تو ساتویں آسمان پر فرشتوں کا قبلہ ہے جس کو بیت المعمور کہتے ہیں۔ انسان کا قبلہ مکہ میں ہے جس کو بیت اللہ اور کعبہ محترمہ کہتے ہیں۔ اس میں آپ لوگ طواف و سجدے کرتے ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں، ادھر کا رخ کرتے ہیں۔ استقبالِ قبلہ ضروری سمجھتے ہیں۔ ساتویں آسمان پر فرشتوں کا قبلہ ہے۔ فرشتے اس میں طواف کرتے ہیں۔ اور حدیث میں ہے کہ روزانہ ستر ہزار فرشتہ طواف کرتا ہے اور آج جنہوں نے طواف کیا ہے اب ابدالآباد تک انہیں نوبت نہیں آئے گی، اگلے دن پھر ستر ہزار، اس سے اگلے دن پھر ستر ہزار ابد تک اسی طرح نئے نئے ستر ہزار آتے رہیں گے، اور طواف کرتے رہیں گے، پھر چھٹے آسمان

میں اس کی سیدھ میں دوسرا قبلہ ہے۔ چھٹے آسمان کے فرشتے اس کا طواف کرتے ہیں۔ پانچویں آسمان میں اس کی سیدھ میں اور قبلہ ہے، اس کا وہاں کے لوگ۔ غرض ساتوں آسمانوں میں اوپر نیچے ایک سیدھ میں قبلے ہیں۔ حدیث میں ہے اگر بیت المعمور سے کوئی پتھر ڈالا جائے، تو ٹھیک بیت اللہ الکریم کی چھت پر آکر گرے گا، اس سیدھ میں ہے۔ اصل میں قبلہ یہ محل اور مکان ہے، عمارت قبلہ نہیں ہے اگر عمارت نہ بھی رہے۔ معاذ اللہ اس کو ڈھا دیا جائے، نماز جب بھی ادھر ہی کو منہ کر کے پڑھنی پڑے گی۔ اس واسطے کہ قبلہ ان پتھروں کا، یا اس مکان کا نام نہیں ہے، بلکہ اس موضع اور محل کا ہے، جہاں وہ عمارت بنی ہوئی ہے اور ساتویں زمین سے لے کر ساتویں آسمان تک ایک ہے، وہی قبلہ ہے۔ وہ ایک محل ہے جس کے اردگرد ساتوں آسمان اور زمینیں گھوم رہی ہیں۔

اسی لئے اگر آپ فضا میں جائیں، پچاس ہزار نہیں پچاس لاکھ فٹ بلندی پر جائیں، تب بھی رخ ادھر ہی کو کرنا پڑے گا، کیونکہ قبلہ کی فضا یہاں سے آسمانوں تک ایک ہی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ایک لاکھ میل اوپر پہنچ کر آپ نیچے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں گے۔ سامنے رخ کریں گے، کیونکہ نیچے سے اوپر تک وہ ایک محل ہے جو درحقیقت اوپر تک چلی گئی ہے۔ وہی کعبہ محترمہ ہے۔ اس محل اور مقام کا نام کعبہ ہے، عمارت کا نام نہیں ہے۔ تو فرشتوں کا کعبہ ساتویں آسمان پر ہے۔ چھٹے آسمان والوں کا قبلہ چھٹے آسمان پر ہے، پانچویں والوں کا پانچویں پر، اسی طرح سے قبلے ہیں۔

اسی طرح جو یہ زمین پر قبلہ ہے، اس کی سیدھ میں نچلی زمین پر بھی قبلہ ہے۔ اس کے سیدھ میں اس کے نیچے کی زمین پر۔ سات زمینیں ہیں، سات آسمان ہیں۔ تو نیچے سے اوپر تک قبلہ ہے۔ بہر حال ساتویں آسمان پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی، جو بیت المعمور کی دیواروں سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اور وہ جگہ غالباً اس لئے دی گئی کیونکہ دنیا میں انہوں نے بیت اللہ الکریم کی تعمیر کی ہے۔ تو جیسا عمل تھا، ویسی جزا سامنے آئی۔ ساتویں آسمان پر بیٹھنے کے لئے بھی انہیں بیت اللہ دیا گیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ: "اے محمد! اپنی امت کو میرا اسلام کہہ دینا اور کہہ دینا کہ: "اَلْجَنَّةُ قِيْعَانٌ" جنت تمہارے حق میں چٹیل میدان ہے۔ ① اس میں کوئی چیز بنی ہوئی نہیں، جو بھی محلات اور باغات ہوں، وہ تمہارے لئے کچھ نہیں۔ تم جب کوئی عمل کرو گے۔ تمہیں جب ہی ان محلات کا استحقاق پیدا ہوگا۔ تم اپنی جنت خود بناؤ گے، بنی بنائی جنت تمہاری نہیں ہے، خود تمہیں بنانی پڑے گی، جیسے عمل کرو گے، ویسا ہی وہاں ثمرہ مرتب ہو جائے گا، جیسی نیکی کر کے بھیجو گے، ویسی ہی وہاں جزاء مہیا ہو جائے گی۔ تو تم یہاں بیٹھ کر جنت بناؤ، جب جا کے تمہارا مقام جنت میں ہوگا۔ تم نے کچھ عمل نہ کیا اور تمنا یہ امید لگائے بیٹھے رہے کہ

---

① الجامع للترمذی، کتاب الدعوات، باب ماجاء فی فضل التسبیح..... ج: ۱۱ ص ۳۶۵، رقم ۳۳۸۴۔ حدیث حسن ہے دیکھئے: السلسلة الصحيحة ج ۱ ص ۱۰۳ رقم ۱۰۵۔

جنت میں محلات ملیں گے، تم نے بنائے ہی نہیں تو ملیں گے کہاں سے؟ تم خود تعمیر کرو گے، جب تمہیں ملیں گے"۔
دنیا میں ہر انسان معمار ہے..... ہمارے دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ صاحب کشف بزرگوں میں سے تھے اور اولیائے کاملین میں سے تھے۔ مولانا میں کچھ تھوڑی سی مجذوبیت کی شان تھی، جیسے مجذوب ہوتے ہیں کہ کوئی لٹک لگ گئی، کوئی بات لگ گئی، بس اسی طرف چل پڑے۔ یہ کچھ عادت تھی۔

ایک دن رات کو بیٹھے اور لٹک لگی، یہ دعا مانگنا شروع کی، کہ یا اللہ! مجھے تین لاکھ روپے دے دے۔ اب کیوں دے دے تین لاکھ، کا ہے کیلئے دیدے، بس کچھ نہیں۔ آدھی رات گزر گئی دعا مانگتے مانگتے۔ یا اللہ مجھے تین لاکھ روپے دے دے۔ مجذوب جو ٹھہرے، تو مجذوبیت میں ایک بڑا ہاتھ لگ گئی۔ اور دعا شروع کر دی۔ تین چار گھنٹے گزر گئے، رات کے دو بج گئے۔ اسی دعا مانگنے کی حالت میں بیٹھے ہی بیٹھے مولانا کو نیند آ گئی۔ تو خواب میں دیکھا کہ ایک بہت بڑا محل سفید رنگ کا ہے، کئی میلوں میں چلا گیا ہے اور بالکل ایسا جیسے انڈا سفید ہوتا ہے۔ گویا اعلیٰ قسم کا وہائٹ ہال بنا ہوا ہے۔ اور اس کے اوپر دیواروں کے کناروں پر بڑے بڑے موتی لگے ہوئے ہیں، جو سورج سے بھی زیادہ روشن ہیں۔ تمام محل کے اردگرد چاندنا پھیلا ہوا ہے۔ ہزاروں سورج لگے ہوئے ہیں۔ مولانا کو محل بہت پسند آیا۔ ہزاروں لوگ وہاں پھر رہے ہیں۔ مولانا نے ان سے پوچھا کہ بھائی! یہ محل کس کا ہے؟ لوگوں نے کہا یہ مولانا محمد یعقوب صاحب کا محل ہے اور یہ جنت ہے۔ اور جنت میں یہ اللہ نے انکا مکان بنایا ہے۔ مولانا بہت خوش ہوئے۔ اس میں داخل ہونا چاہا۔ تو دربانوں نے روک دیا کہ ابھی داخلہ کا وقت نہیں آیا۔ جب وقت آئے گا جب داخل ہوں گے۔ بڑا پسند آیا سبحان اللہ! بڑا عجیب محل ہے، جس کے باہر اتنی چمک دمک ہے، تو اندر کیسے کیسے سامان ہوں گے۔ ایک طرف کو جو گئے تو دیکھا کہ ایک کونے میں ایک موتی ندارد۔ وہ موتی ٹوٹا ہوا ہے اور وہاں اندھیرا پڑا ہوا ہے۔ سارے محل کے اردگرد تو چاندنا اور روشنی اور کونے میں ایک موتی نہیں ہے، وہاں اندھیرا، مولانا نے لوگوں سے پوچھا کہ یہاں موتی لگایا ہی نہیں گیا، یا تھا اور نہیں رہا۔ پوچھا تو پتہ چلا کہ نہیں تھا تو، ابھی ٹوٹا ہے۔ کیوں ٹوٹ گیا؟ کہا کہ: مولانا محمد یعقوب صاحب اللہ تعالیٰ سے تین لاکھ روپے مانگ رہے تھے، تو حکم ہوا کہ محل کا ایک موتی توڑ کے بھیج دو، یہ تین لاکھ سے زیادہ قیمت کا ہے۔ تو وہ توڑ کر بھیج دیا گیا۔

اب مولانا کی آنکھ کھلی۔ اب دوسری دعا مانگنا شروع کی یا اللہ! مجھے نہ تین لاکھ چاہئے نہ تین ہزار چاہئے نہ تین سو چاہئے۔ اگر میری جنت کے محل کی اینٹیں توڑ توڑ کر میرے دنیا کے مکان کی تعمیر ہوئی تو میری آخرت تو ویران ہو جائے گی۔ مجھے یہاں نہیں چاہئے میں تو وہیں لوں گا۔ اب یہ دعا شروع کر دی کئی گھنٹے اسی میں لگ گئے کہ مجھے تین لاکھ نہیں چاہئے میں نہیں لینا چاہتا پھر آنکھ لگی۔ دیکھا تو پھر وہی محل ہے۔ اب جو کنارے پہ گئے تو وہ موتی لگا ہوا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ مولانا نے مانگتے مانگتے یہ عرض کر دیا کہ اس وقت یہ مجھے نہیں چاہئے۔ موتی پھر لگا دیا گیا۔ مجھے یہ

بات اس پہ یاد آ گئی کہ جنت کی تعمیر تو ہم کرتے ہیں، اگر ہم تعمیر نہ کریں۔ وہاں اندھیرا پڑا رہے گا۔ بلاشبہ اللہ نے جنت میں بڑی بڑی نعمتیں بنائی ہیں۔ مگر ہمارے حق میں کچھ نہیں جب تک ہم کچھ کر کے نہ جائیں۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ زمین میں سونا بھی ہے چاندی بھی ہے۔ مگر آپ کے حق میں کچھ بھی نہیں جب تک محنت کر کے مشین نہ لگائیں۔ مشین لگاؤ پھر نکالو سونا ایک شخص گھر میں بیٹھا رہے چاہے ساری زمین میں سونا بھرا ہوا ہو اس کے لئے کچھ نہیں۔ یہ تو کہا جائے گا کہ افریقہ سونے سے بھرپور ہے مگر ملے گا اسے جو محنت کرے گا یہ نہیں کہہ سکتے کہ افریقہ میں سونا نہیں۔ تو جنت میں سونے اور چاندی کے محلات ہیں مگر ملیں گے تب جب آپ یہاں محنت کریں گے۔

حدیث میں ہے کہ: جنت میں ایک محل تعمیر کیا جاتا ہے۔ ملائکہ اس کی تعمیر کرتے ہیں۔ تعمیر کرتے کرتے ایک دم تعمیر رک جاتی ہے۔ دوسرے فرشتے پوچھتے ہیں کہ تم تعمیر کر رہے تھے رک کیوں گئے؟ وہ کہتے ہیں کہ فلاں آدمی فلاں عمل کر رہا تھا ہم اس کے لئے مکان بنا رہے تھے اس نے عمل کرنا چھوڑ دیا۔ میٹریل بھیجنا چھوڑ دیا ہم نے تعمیر روک دی۔ تو درحقیقت جنت کی تعمیر آپ یہاں بیٹھ کر کرتے ہیں۔ ہر انسان معمار ہے۔ کوئی دنیا میں بیٹھ کر جہنم بنا رہا ہے کوئی جنت بنا رہا ہے۔ اپنی اپنی محنت کر رہا ہے۔ مگر جو کچھ کرے گا اسی کا نتیجہ سامنے آئے گا۔ تو مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے وہ دعا روک دی اور کہا کہ: مجھے وہ موتی نہیں چاہئے۔ اس واسطے کہ اگر میری آخرت دنیا میں مل گئی آخرت میں کچھ نہیں رہے گا۔ تو اصل چیز محنت اور کمال ہے وہ ہوگا تو وہاں ملے گا ورنہ نہیں۔

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا، اے محمد! اپنی امت کو میرا اسلام کہہ دینا اور کہہ دینا کہ اَنَّ الْجَنَّةَ قِيْعَانٌ جنت تمہارے حق میں چٹیل میدان ہے، اس میں تمہارے لئے کوئی چیز نہیں۔ جتنا کرلو گے، وہ تمہارے لئے ہو جائے گا، ورنہ اس میں کچھ نہیں۔ تو جو کچھ آدمی کو ملتا ہے، اپنی محنت سے ملتا ہے تمنائیں کرنے سے نہیں ملتا۔ دنیا کو دارالکسب بنایا گیا ہے، جو محنت اٹھائے گا، وہ پالے گا۔ اگر آپ صبح سے شام تک دکان پر بیٹھ کر محنت نہ کریں، تو آپ پیسے لے کر گھر نہیں آ سکتے۔ اگر کاشت کار کھیت پر جا کر محنت نہ کرے، تو چار دانے لے کر اپنے گھر نہیں آ سکتا۔ اگر ایک صناع محنت نہ کرے، برتن نہ بنائے، بازار میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی۔ کیونکہ دنیا تو محنت کی جگہ ہے، جو کرے گا، وہ پائے گا۔ جو نہیں کرے گا، اسے کچھ نہیں ملے گا۔

سب سے زیادہ محنت طلب، **ایمان کا علم ہے** ..... سب سے بڑی چیز جو انسان کے لئے محنت طلب ہے وہ علم ہے۔ علم ہی سے دنیا میں اور آخرت میں بھی چاندنا ہے۔ سائنس کا علم ہوگا، تو دنیا سجے گی۔ ایمان کا علم ہوگا، تو آخرت سجے گی۔ دنیا کا سجانا بھی ایک حد تک ٹھیک ہے۔ مگر بھائی! اس کو اگر سجاؤ گے بھی، تو ایک دن ختم ہو جائے گی، اس لئے اگر سارا سرمایہ اس کے اوپر لگا دیا، تو ہاتھ سے چھننے والی ہے، تو پھر سرمایہ اس چیز میں کیوں نہ لگایا جائے، جو باقی رہنے والی ہے۔ بقدر ضرورت اس میں لگاؤ۔ بقایا سرمایہ اس میں لگاؤ جس کی ابدالآباد تک ضرورت ہے۔

کیسی حکمت کی بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی۔ فرمایا: ''اِعْمَلْ لِلدُّنْيَا بِمِقْدَارِ بَقَائِكَ فِيْهَا. وَاعْمَلْ لِلْآخِرَةِ بِمِقْدَارِ بَقَائِكَ فِيْهَا'' ① ''دنیا کے لئے اتنی محنت کرو، جتنا دنیا میں رہنا ہے۔ آخرت کے لئے اتنی محنت کرو جتنا آخرت میں رہنا ہے''۔ دنیا میں رہنا ہے پچاس برس، چالیس برس، دس بیس برس، آخرت میں ابداً باد رتک کے لئے رہنا ہے، تو کم سے کم وہاں کی محنت زیادہ ہونی چاہیے۔ یہ ہم نہیں کہتے کہ آپ یہاں کے لئے کچھ نہ کریں۔ نہیں یہاں کے لئے آپ سب کچھ کریں۔ رہنے کے لئے گھر بھی بنائیں، کپڑا بھی بنائیں، کھائیں بھی، مگر سارا سرمایہ اسی میں نہ لگائیں۔ کچھ سرمایہ آگے کے لئے بھی چھوڑیں۔ کرنا دھرنا تو وہاں ہے سب کچھ، اس واسطے جب تک وہاں کی کوئی چیز حاصل نہیں ہوگی، وہاں کا کام نہیں بنے گا۔ اور وہاں کی سب سے بنیادی چیز علم ہے۔ جب تک وہ قلب کے اندر نہیں ہوگا، چاند تارا نہیں پیدا ہوسکتا۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ.'' ''سارے انسان ہلاک ہونے والے ہیں، تباہ ہوجانے والے ہیں، مگر علم والے بچیں گے''۔

جو اہل علم ہیں ان کے لئے نجات ہے۔ جہالت کے ساتھ نجات نہیں ہے۔ جاہل کو بھی اگر نجات ملتی ہے، تو کسی عالم کے ساتھ لگ کر ملتی ہے۔ اگر مزدور کو بھی کچھ ملے گا تو وہ کسی سرمایہ والے سے ملے گا۔ جب اس کی نجات بنے گی۔ سرمایہ دار وہ ہے جو اپنے علم اور قابلیت سے دکان پر بیٹھ کر لاکھوں روپے کی کمائی کر رہا ہے۔ وہ اپنے علم کے زور سے پل رہا ہے۔ جو بے چارے علم نہیں رکھتے، وہ اس کے ساتھ لگ گئے ہیں، تو ہزار پانچ سو کی روزی اس کے ذریعہ سے ہو رہی ہے۔ مگر انجام یہی نکلا کہ ان کی سمجھداری اور قابلیت سے دولت پیدا ہوئی ہے، جہالت سے پیدا نہیں ہوئی۔ دنیا کی بات ہو یا آخرت کی، دونوں چیزیں ہیں علم سے متعلق۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ ''تمام انسان ہلاک ہونے والے ہیں علم والے بچیں گے''۔

علم محض کار آمد نہیں..... مگر علم والے بھی غرہ نہ کریں، علم والے بھی ناز نہ کریں کہ بس ہمارے لئے تو نجات ہے، نہیں۔ دوسرا جملہ بھی فرمایا: ''وَالْعَالِمُوْنَ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْعَامِلُوْنَ.'' ''علم والے بھی سب تباہ و برباد ہیں۔ بچیں گے وہ جو اپنے علم کے مطابق عمل کرتے ہیں''۔

اگر عمل نہ ہو، تو علم محض کوئی کار آمد چیز نہیں ہے، بلکہ اور زیادہ وبال بن جاتا ہے۔ علم جب کار آمد بنتا ہے، جب اس کا استعمال کیا جائے، اس کو عمل میں لایا جائے۔ علم محفوظ بھی جبھی رہتا ہے جب عمل میں آئے۔ اگر آپ ایک علم سیکھ لیں، لیکن استعمال میں نہ لائیں، چند دن کے بعد بھول جائیں گے۔ کام کے اندر لاتے رہیں، وہ ذہن کے اندر حاضر رہے گا، محفوظ رہے گا۔ ہم تو اپنا تجربہ آپ سے عرض کرتے ہیں۔ اور غالباً ہر طالب علم کو یہی تجربہ ہوگا کہ جن مسائل پر ہمارا عمل ہے، ان کا علم محفوظ ہے اور جن مسائل پر عمل کی نوبت نہیں آتی، وہ یاد ہی نہیں رہتے۔ مثلاً

① دیکھئے تذکرۃ الموضوعات، ج: ۱، ص: ۲۰۰۔

نماز کے مسائل جو ہیں، اگر آپ پوچھیں تو شاید میں فوراً بتلا دوں۔ لیکن اگر حج کے مسائل پوچھیں گے تو ذرا کتاب دیکھنی پڑے گی۔ اس لئے کہ ہر روز عمل کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ عمر میں ایک مرتبہ حج کر لیا۔ یاد ہی نہیں رہتے۔ اور اگر بیع وشراء کے مسائل پوچھیں اس میں تو شائد ایک مسئلہ بھی بے کتاب دیکھے بتانا مشکل ہوگا، اس لئے کہ خرید وفروخت کی نوبت تو کبھی آتی ہی نہیں۔ جو یہ یاد رہے کہ یہ بیع باطل ہے، یہ بیع فاسد ہے۔ یہ بیع اچھی ہے۔ یہ بیع مکروہ ہے اس لئے کہ ان مسائل پر ہمارا عمل نہیں۔ بلکہ آپ لوگوں کو اگر مسائل معلوم ہو جائیں۔ آپ کو نسبت عالم کے بیع وشراء کے مسائل زیادہ یاد رہیں گے۔ کیوں کہ رات دن آپ کو سابقہ پڑے گا۔ جن مسائل پر عمل ہوتا رہتا ہے، ان کا علم محفوظ رہتا ہے اور جن مسائل پر عمل نہ ہو، علم محفوظ نہیں رہتا۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علم محض کارآمد نہیں ہے، جب تک اس کا استعمال نہ ہو، جس پر عمل نہیں، وہ علم بیکار ہے، بلکہ وہ اور اللہ کی طرف سے زیادہ حجت بن جاتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ: قیامت کے دن علماء کی ایک جماعت کو بلایا جائے گا، حق تعالیٰ فرمائیں گے، ہم نے تمہیں علم دیا اور بڑا علم دیا، بلکہ کئی کئی قسم کے علوم دیئے۔ تم نے ہمارے لئے کیا کیا؟۔ وہ عرض کریں گے، ہم نے مسائل بتائے، ہم نے نصیحت کی، ہم نے کتابیں تصنیف کیں۔ فرمایا: کیں مگر کیوں کیں؟

"لِیُقَالَ اِنَّکَ عَالِمٌ" تاکہ دنیا میں شہرت ہو جائے کہ تم بڑے عالم تھے۔ تو وہ ہو گئی۔ وہ چیز مل گئی جس کے لئے تم نے محنت کی تھی۔ مجھ سے اب کیا چاہتے ہو؟ اس قسم کے علماء کو گھسیٹ کر اوندھے منہ جہنم میں ڈالا جائے گا۔ علم ان کے کام نہیں آئے گا۔ اس لئے کہ اس کے اوپر عمل نہیں تھا۔ تو علم محض بیکار ہے۔ جب تک اس کے ساتھ عمل نہ ہو، بلکہ احادیث کے دیکھنے سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جو بے چارے بے پڑھے لکھے لوگ ہیں مگر کچھ نہ کچھ نیکی کرتے ہیں۔ ان کی نجات جلدی ہو جائے گی، علماء کی دیر سے ہوگی۔ اس واسطے کہ عالم سے تو یہ کہا جائے گا کہ آپ تو یہ بات بھی جانتے تھے۔ پھر اس پر عمل کیوں نہ کیا؟ یہ مسئلہ معلوم تھا، اس پر کیوں نہ عمل کیا؟ اور جو بے چارہ بے پڑھا لکھا ان پڑھ تھا، اس سے اجمالاً کہا جائے گا کہ نماز پڑھی تھی؟ اس نے کہا حضور پڑھی تھی۔ زکوٰۃ دی تھی؟ جی ہاں دی تھی۔ اچھا جاؤ جنت میں۔ اس لئے کہ نہ زیادہ علم نہ زیادہ عمل، اس لئے زیادہ علم بھی ایک مصیبت کی چیز ہے، مواخذہ بڑھ جاتا ہے۔ ①

آپ کے سامنے کوئی بے وقوف سا سیدھا سادھا، آدمی آجائے، تو ایک آدھ بات پوچھ کے آپ کہیں گے، جاؤ چھٹی اور جو ذرا سمجھ دار ہے، جو کچھ زیادہ بولتا ہے، اس سے سوالات بھی زیادہ کریں گے۔ امتحان لینے والا جب بیٹھتا ہے، اگر کوئی طالب علم سیدھا سادھا بے وقوف سا ہے، ایک دو موٹی بات پوچھی، نمبر دے دیئے، جاؤ تمہیں پاس کر دیا۔ اور اگر کوئی ذکی ہے، بولتا زیادہ ہے۔ ممتحن اس سے زیادہ سوالات کریں گے، کہ یہ بات تم نے

① الصحیح لمسلم، کتاب الامارۃ، باب من قاتل للریاء والسمعۃ استحق النار ج: ۱۰ ص: ۹ رقم: ۳۵۲۷.

کیوں کہی؟ اور یہ کیوں کہی؟ اس کے نمبر مشکل سے آتے ہیں۔ اسی واسطے حدیث میں ہے کہ: "عَلَيْكُمْ بِدِيْنِ الْعَجَائِزِ" "بوڑھیوں کا دین اختیار کرو"۔

پرانے زمانے کی بڑی بوڑھیاں جو ہیں، وہ اپنے دین پر چل رہی ہیں، نہ ان کے دل میں شک ہے نہ شبہ، نہ زیادہ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا پکا دین ہے۔ ایسا دین اختیار کرو، جس میں نہ شکوک ہوں نہ سوالات ہوں۔ جلدی سے نجات مل جائے۔ زیادہ علم وبال بن جاتا ہے، اگر اس پر عمل نہ ہو اور اگر عمل ہوا، پھر اس میں شک نہیں کہ ترقی بھی بڑی ہے، درجات بھی بڑے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محض علم پر غرہ مت کرو۔ علم کارآمد نہیں ہے جب تک اس کے ساتھ عمل نہ ہو۔ اور اس کا استعمال نہ ہو، تو دو چیزیں فرمائی گئیں کہ آدمی کی نجات جہالت میں نہیں بلکہ علم میں ہے اور محض علم میں نہیں ہے بلکہ عمل میں ہے۔

بڑا عمل بلا اخلاص معتبر نہیں ...... پھر آگے ایک بات اور ارشاد فرمائی: "وَالْعَامِلُوْنَ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْمُخْلِصُوْنَ" عمل کرنے والے سب تباہ و برباد ہیں، ان کے عمل کو بھی نہیں پوچھا جائے گا۔ عمل کرنے والے بھی سب تباہ و برباد، بچیں گے کون؟ مخلصین، جو اپنے عمل میں خلوص رکھتے ہیں، للٰہیت رکھتے ہیں۔ دکھلاوے کے لئے عمل کرے، وہ وبال کی چیز ہے۔ شہرت پسندی کے لئے عمل کرے، وہ تباہی کی چیز ہے۔ خالص خدا کی رضا کے لئے عمل کرے، کارآمد ہوتا ہے، اسی پر انسان کی نجات ہے۔

تو فرمایا: لوگوں کی نجات شکل و صورت سے نہیں ہوگی، علم سے ہوگی۔ پھر فقط علم سے نہیں ہوگی، عمل سے ہوگی، پھر فقط عمل سے نہیں ہوگی، اخلاص سے ہوگی، للٰہیت سے ہوگی۔ دور خے پن سے عمل کرے کہ خدا کو بھی خوش کرلوں اور کچھ بندوں کو بھی خوش کرلوں۔ وہ عمل معتبر نہیں ہے۔ فقط اللہ کی رضا کے لئے ہو، وہی عمل معتبر ہوگا، ورنہ نہیں ہوسکتا۔ تو فرمایا کہ: "وَالْعَامِلُوْنَ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْمُخْلِصُوْنَ" "عمل کرنے والے بھی سب تباہ و برباد ہیں۔ خلوص والے بچیں گے"۔ اگر کسی عمل کی شکل و صورت بڑی ہو، لیکن اس میں اخلاص نہ ہو، تباہی کا ذریعہ ہے۔ اور چھوٹا سا عمل ہو، بالکل معمولی سا ہو، مگر خلوص اور للٰہیت ہو، تو وہ عمل نجات کا ذریعہ بن جائے گا۔ حدیث میں خلوص کی تین مثالیں فرمائی گئیں اور تین ہی مثالیں حدیث میں بلا خلوص کے عمل کی فرمائی گئیں۔ اور نتائج الگ الگ۔

ابھی جیسے میں نے ایک حدیث کا جز سنایا، کہ علماء کی ایک جماعت بلائی جائے گی۔ حق تعالیٰ اپنا احسان جتلائیں گے کہ ہم نے تمہیں قسم قسم کے علم دیئے، تم نے کیا کیا؟ کہیں گے، ہم نے نصیحت کی۔ ہم نے درس و تدریس کیا۔ ہم نے تبلیغ کی، ہم نے تصنیف کی، فرمائیں گے، کیں مگر کیوں کی؟ "لِيُقَالَ اِنَّكَ عَالِمٌ" تاکہ دنیا میں شہرت ہو جائے کہ تم بڑے عالم تھے، تو فَقَدْ قِيْلَ۔ وہ شہرت ہوگئی تمہارا مقصد مل گیا۔ اب ہم سے کیا چاہتے ہو۔ یہاں تمہارے لئے اب کیا ہے؟ انہیں جہنم میں ڈالا جائے گا۔ ①

① الصحیح لمسلم، کتاب الامارۃ، باب من قاتل للریاء والسمعۃ استحق النار ج: ۱۰ ص: ۹ رقم: ۳۵۲۷۔

حدیث میں ہے کہ: مالداروں کی ایک جماعت بلائی جائے گی، جن کو لاکھوں کی رقم اللہ نے دی تھی۔ حق تعالیٰ احسان جتلائیں گے۔ ہم نے تمہیں لکھ پتی، کروڑ پتی بنایا، لاکھوں کا مال دیا۔ اور ایک ہی قسم کا نہیں۔ نقد الگ دیا، باغات الگ دیئے، بلڈنگیں الگ دیں۔ تم نے ہمارے لئے کیا کیا۔ وہ کہیں گے، ہم نے صدقہ کیا، خیرات کیا۔ ہم نے یتیموں کو، بیواؤں کو دیا۔ فرمایا، دیا مگر کیوں؟ لِیُقَالَ اِنَّکَ جَوَادٌ. تا کہ دنیا میں شہرت ہو کہ تم بڑے سخی داتا ہو۔ بڑے دینے والے ہو۔ تو وہ تو ہو چکی شہرت۔ ہم سے کیا چاہتے ہو؟ یہ جماعت بھی اوندھے منہ جہنم میں ڈالی جائے گی۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ: ایک جماعت شہیدوں کی بلائی جائے گی۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے ہم نے تمہارے بدنوں میں طاقت دی۔ تمہیں پہلوانی کے بدن دیئے۔ تم میں قوتیں دیں۔ تم نے ہمارے لئے کیا کیا؟ عرض کریں گے کہ: ہم نے جہاد کیا، ہم نے جانیں لڑادیں۔ ہم نے گردنیں کٹادیں، خون بہادیا۔ فرمائیں گے یہ کیا، مگر کیوں؟ لِیُقَالَ اِنَّکَ جَرِیْءٌ. تا کہ دنیا میں تمہاری شہرت ہو کہ تم بڑے بہادر ہو، تم بڑے جواں مرد تھے۔ فَقَدْ قِیْلَ وہ شہرت ہو گئی۔ اب ہم سے کیا چاہتے ہو؟ اس جماعت کو بھی اوندھے منہ یہ جہنم میں ڈالا جائے گا۔

آپ نے دیکھا کہ علم سے تبلیغ کرنا، کتنا بڑا عمل ہے، پیغمبروں کا عمل ہے، مگر اکارت ہو گیا۔ اس لئے کہ اس میں خلوص نہیں تھا۔ سخاوت کتنا بڑا عمل ہے صدقہ خیرات لاکھوں کروڑوں دیا۔ اتنا بڑا عمل ہے بے کار ہو گیا۔ اس لئے کہ اس میں خلوص نہیں تھا۔ شہرت پسندی کا جذبہ تھا۔ جہاد کتنا بڑا عمل ہے کہ آدمی نے جان تک دیدی۔ مگر عمل مقبول نہیں ہوا۔ اس لئے کہ اس میں خلوص نہیں تھا۔ تو عمل کا ڈھانچہ کام نہیں دیتا جب تک عمل کے اندر جان نہ ہو، روح نہ ہو، روح اخلاص اور خلوص ہے اس سے عمل میں جان پیدا ہوتی ہے، اگر جان نہ ہو تو مردہ لاش کتنی ہی موٹی ہو پہلوانوں جیسی ہو، وہ تو دفن کرنے کے قابل ہوتی ہے، کارآمد نہیں ہوتی۔ کارآمد جبھی ہے جب اس کے اندر جان اور روح ہو۔ تو عمل کی شکل کتنی ہی بڑی ہو، اگر اس میں اخلاص کی روح نہیں ہے، خلوص کی روح نہیں ہے، وہ عمل کارآمد ثابت نہیں ہوگا۔ تو بڑے بڑے اعمال کی تین مثالیں آپ نے سنیں۔ جو خلوص نہ ہونے کی وجہ سے بیکار ہوئے۔

چھوٹا عمل خلوص کی وجہ سے ذریعہ نجات ہے..... تین مثالیں حدیث میں چھوٹے چھوٹے اعمال کی بیان کی گئیں۔ کوئی بڑے عمل نہیں تھے۔ خلوص کی وجہ سے نجات کا ذریعہ بنے۔ حدیث میں ہے کہ: تین آدمی سفر کے لئے نکلے، چند میل دور نکلے تھے کہ زور کی بارش آگئی۔ سامان کچھ پاس تھا نہیں۔ تو انہوں نے کہا بھائی بارش شدید آگئی، پہاڑ میں قریب یہ غار نظر آ رہا ہے، اس میں چھپ کر بارش سے بچو، جب بارش تھم جائے گی، پھر اس غار سے اپنا سفر شروع کریں گے، تو تینوں مل کر اس کے اندر اتر گئے، وہ صاف ستھرا تھا۔ اس میں بیٹھ گئے۔ حدیث میں ہے کہ: جب بارش شدید ہوئی تو اوپر سے ایک بڑی چٹان اور پتھر جو منوں وزن کا تھا۔ رڑکا، تو وہ ٹھیک اس غار کے منہ کے اوپر آکر رک گیا۔ اور غار کا منہ بند ہو گیا۔ اب نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔ تینوں نے دیکھا تو سمجھ گئے کہ ہماری موت کا وقت آ گیا ہے۔ اس لئے کہ چٹان کو ہلا نہیں سکتے۔ اس کا ہٹنا ممکن نہیں۔ کوئی صورت نہیں۔ وہ وقت کا

ہمارے پاس کھانا پینا ہے۔کھاتے پیتے رہیں گے۔اس کے بعد سسک سسک کر مرنا اور جان دینا ہے۔ چنانچہ مرنے کے ارادے سے بیٹھ گئے۔غم انکے دلوں پر چھا گیا، آنسو جاری۔اب بے چارے کچھ نہیں کر سکتے۔جب ایک دن گزر گیا اور وہ کھانا بھی ختم ہونے لگا اور یقین ہو گیا کہ اب ہماری موت لازمی ہے۔تو ایک نے دوسرے سے کہا کہ بھئی! مرنا تو ہے ہی،کوئی تدبیر ہی کرنی چاہئے۔دوسروں نے کہا بھئی تدبیر کر بھی کیا سکتے ہیں۔یہ تو منوں وزن کی چٹان ہے، نہ اسے ہلا سکتے ہیں، نہ اسے توڑ سکتے ہیں۔سوائے اس کے کہ مریں اور کیا کریں گے۔اس نے کہا نہیں،میری سمجھ میں ایک تدبیر آئی ہے۔کم سے کم وہی کرلو۔دونوں نے کہا کہ بھئی! کیا تدبیر ہے؟ اس نے کہا مادی تدبیر تو ہے نہیں۔کہ کسی پھاوڑے سے پتھر کو توڑ دیں۔یہ تدبیر نہیں بلکہ روحانی تدبیر ہے۔اور وہ یہ کہ ہم تینوں بیٹھ کر اپنی پوری زندگی کا جائزہ لیں۔اگر کسی کی زندگی میں کوئی نیک عمل ایسا ہوا ہے، جس میں کامل خلوص اور للّٰہیت تھا۔اس عمل کا واسطہ دے کر اللہ سے دعا کریں۔یہ تو ہم کر سکتے ہیں۔سب نے کہا بالکل ٹھیک ہے۔اب باری باری سب نے اپنے اعمال پیش کرنے شروع کر دیئے۔

ایک کھڑا ہوا اور اس نے کہا اے اللہ! تو دانا اور بینا ہے،تو جانتا ہے کہ میں ایک غریب آدمی تھا۔میرے ہاتھ پلے کوئی پیسہ نہیں تھا مگر صورت حال یہ تھی کہ میرے پاس ایک بکری تھی،اسی کے دودھ پر میرا گزر تھا۔تو میں یہ کیا کرتا تھا۔کہ میری ایک ماں تھی، بیوی تھی، چند بچے تھے۔میں بکری کا دودھ نکالتا اور رات کو سب سے پہلے دودھ اپنی ماں کے سامنے پیش کرتا کہ اس کا حق مقدم ہے۔یہ بڑی بوڑھی ہے،اس کی وجہ سے ہم میں اس کا حق مقدم ادا ہونا چاہئے۔تو وہ دودھ اس کے سامنے پیش کرتا۔جب وہ پیٹ بھر لیتی اور دودھ بچ جاتا تو اس میں سے بچوں کو پلاتا اس میں سے بچ رہتا تو بیوی کو پلاتا اس میں سے بچ جاتا تو آخیر میں میں پیتا تھا،کبھی نہیں بچتا تھا تو میں فاقہ کر لیتا تھا، مگر ان کے حقوق کو مقدم سمجھتا تھا۔

ایک دن میں دودھ لے کر آیا۔ذرا دیر ہو گئی،تو میری ماں کی آنکھ لگ گئی۔میں اس کی پائنتی دودھ کا پیالہ لئے کھڑا رہا کہ جب بھی اس کی آنکھ کھلے گی، میں دودھ کا پیالہ پیش کروں گا۔بچے رو رہے تھے بلک رہے تھے،ان کا حق مقدم نہیں،ماں کا حق مقدم ہے۔میں دودھ کا پیالہ لئے کھڑا رہا۔آدھی رات کہیں اس کی آنکھ کھلی، جب کہ بچے سو چکے تھے۔آدھی رات گزر چکی تھی۔اس نے بھوک سے بیتاب ہو کر کہا کہ دودھ! میں جھٹ پیالہ لے کر پہنچا، اس نے دودھ پیا اور مجھے بڑی دعائیں دیں، جو بچا میں نے بیوی اور بچوں کو پلایا، جو کچھ بچا تو میں نے بھی پی لیا۔اے اللہ! یہ جو میں نے عمل کیا،اس میں کوئی دورخی نہیں تھی،کوئی دکھلاوا اور سناوا نہیں تھا،صرف تیری رضا کے لئے میں نے یہ عمل کیا تھا،اگر واقعی تیرے ہاں میرا یہ عمل خلوص کی وجہ سے قبول ہوا۔تو اے اللہ! اس مصیبت سے ہمیں نجات عطا فرما۔حدیث میں ہے کہ:ایک تہائی پتھر ہٹ گیا اور غار کا منہ کھل گیا۔اب دوسرا کھڑا ہوا،اس نے کہا،اے اللہ! تو جانتا ہے۔دانا بینا ہے، میں ایک مزدور قسم کا آدمی تھا، کچھ روپیہ میرے ہاتھ میں نہیں تھا۔میرے

ایک چچا کی بیٹی تھی، جو بڑی حسین وجمیل تھی۔ مجھے اس کے ساتھ عشق پیدا ہوا۔ میں نکاح کا پیغام نہیں دے سکتا تھا، اس لئے کہ میرے ہاتھ پلے کچھ بھی پیسہ نہ تھا اور وہ ذرا بڑے گھرانے کی تھی۔ میں نے اس کے سامنے تنہائی میں جا کر اپنا مقصد پیش کیا۔

مطلب یہ تھا کہ میں بدکاری میں مبتلا ہوں۔اس نے کہا میری ایک شرط ہے۔اور وہ یہ ہے کہ ایک ہزار گنی یا ایک ہزار پونڈ کی تھیلی جب تو لا کر دے گا۔تب میں اس بدعملی پر آمادہ ہو سکتی ہوں۔ورنہ نہیں۔میں نے جا کر مزدوری کی محنت کی کئی برس دن میں جا کر کوئی ایک ہزار گنی جمع کی۔اور وہ سونے کے ٹکوں کی تھیلی بھر کر میں لے آیا، اور تنہائی میں اس عورت کو بلایا۔اور میں نے کہا کہ تیری یہ شرط پوری کر دی اور یہ ایک ہزار گنیوں کی تھیلی سامنے موجود ہے، اب تجھے انکار کرنے کی ضرورت نہیں،اس نے کہا بے شک اب میں انکار نہیں کر سکتی،شرط پوری ہو گئی۔ میں نے پورا ارادہ کیا کہ میں بدعملی اور سیاہ کاری میں مبتلا ہو جاؤں۔

جب میں پوری طرح آمادہ ہوا،اس عورت نے کہا اے شخص! ''اِتَّقِ اللہَ'' اللہ سے ڈر، یہ جو تو بدعملی کرنا چاہ رہا ہے،قیامت کے دن کھلنے والی ہے مجھے اور تجھے اللہ کے آگے جواب دینا ہے۔خدا سے ڈر اور تقویٰ اختیار کر۔تو میرا دل لرز گیا اور کانپ گیا۔میں اسی وقت کھڑا ہو گیا۔میں نے کہا میں نے یہ ہزار گنی چھوڑی۔اور ہمیشہ کے لئے توبہ کرتا ہوں، میں کبھی بدی کا ارادہ نہیں کروں گا۔تو محض تیرے ڈر کی وجہ سے اے اللہ میں چھوڑ کر چلا آیا۔ بدعملی سے بچا اور وہ ہزار گنی بھی میں نے چھوڑ دی،اس میں میرا کوئی ذاتی مفاد سامنے نہیں تھا۔محض تیری رضا کے لئے میں نے یہ کام کیا۔اگر تیرے ہاں مقبول ہوا تو ہمیں نجات دے حدیث میں ہے کہ ایک تہائی پتھر اور سرک گیا۔دو تہائی غار کا منہ کھل گیا۔ اب تیسرا کھڑا ہوا،اور اس نے کہا اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں بھی ایک غریب آدمی تھا۔کھانے پینے کو میرے پاس کچھ نہیں تھا۔میرے ایک دوست نے سفر کا ارادہ کیا اور سو روپے میرے پاس امانت رکھوائے اور یہ کہا کہ جب میں سفر سے واپس ہوں گا،میری امانت واپس کر دینا اور تجھے اجازت ہے کہ تو میرے عدم موجودگی میں خرچ کر لینا۔جب میں آؤں گا تو دے دینا' کیونکہ امانت کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس روپے رکھوائے جائیں،تو بعینہ انہیں روپوں کا واپس کرنا ضروری ہے۔وہی نوٹ بعینہ واپس کرنے پڑیں گے۔یہ نہیں ہے کہ انہیں خرچ کر کے یا بدل کر نوٹ دے دے اور سو روپے پورے کر دے۔سوائے اس کے کہ رکھوانے والا اجازت دے دے کہ تم خرچ کر سکتے ہو، جب تو آپ خرچ کر سکتے ہیں، بدلے میں نوٹ دے سکیں گے۔اگر وہ اجازت نہ دے تو بعینہ اسی چیز کا واپس کرنا واجب ہے، جو آپ کے پاس رکھوائی گئی تھی۔تو اس شخص نے سو روپے امانت رکھوائے اور ساتھ ہی اجازت دے دی، کہ تم خرچ کر سکتے ہو۔اے اللہ! میں نے انہیں خرچ کیا،ان سو روپے سے میں نے چند بکریاں خریدیں۔بکریوں کا دودھ بیچنا شروع کیا،تو اس کی رقم آنی شروع ہوئی۔اس رقم سے کچھ اور بکریاں خریدیں،ان بکریوں کا دودھ بڑھا تو اور خریدیں۔تو نقد بھی جمع ہونا شروع ہوا۔بکریوں کا گلہ بھی

بڑھ گیا۔ اس نقد سے پھر میں نے گائے خریدی، تو گائے کا گلہ بڑھنا شروع ہوا، اور بڑھا تو میں نے اونٹ خریدے غرض گائے، بیل، بکری، اونٹ اور بہت سا سامان جمع ہو گیا۔

پھر میں نے کچھ جائیداد خریدی، کھیت خریدے، باغات خریدے، اس سے لاکھوں روپے کی آمدنی شروع ہوگئی۔ جب دس پندرہ برس گزر گئے، تو لاکھوں روپے میرے پاس جمع ہوگئے، تو اس شخص نے کہا بھائی میرا سو روپیہ واپس کرو۔ تو میں بجائے اس کے کہ سو روپیہ دے دیتا، میں نے ساری تجوریاں پیش کیں، سارے جانور پیش کئے، سارے باغات پیش کئے، کہ یہ ہے تیری امانت، اس نے کہا کہ میری امانت تو سو روپے تھی۔ یہ لاکھوں روپے تو نہیں تھے۔ میں نے کہا کہ لاکھوں روپے ان سو روپے سے ہی بنے ہیں۔ یہ لاکھوں روپے بھی تیرے ہی ہیں۔ اس لئے کہ سو روپیہ تیرا تھا۔ اس نے کہا نہیں مجھے سو چاہئے۔ لاکھوں نہیں چاہئے۔ میں نے کہا یہ لاکھوں بھی تیرے ہی ہیں۔ آخر میں نے اس کو قبضہ دلا دیا۔ اور ساری بلڈنگیں، سارے باغات اور سارے چوپائے سپرد کر دیئے۔ اور میں پھر وہی بھک منگا بن گیا۔ پھر وہی فاقہ مستی ہوگئی۔ ایک پائی میرے ہاتھ میں نہیں تھی۔ اے اللہ! میں نے یہ عمل تیری رضا کے لئے کیا۔ میں نے اپنے ذاتی مفاد کو سامنے رکھ کر نہیں کیا۔ اگر یہ عمل تیرے ہاں مقبول ہے تو ہمیں نجات دے۔ حدیث میں ہے کہ جو ایک تہائی چٹان رہ گئی تھی وہ بھی سرک گئی، غار کا پورا منہ کھل گیا اور انہیں نجات ہوئی۔ یہ باہر آئے اور خدا کا شکر ادا کیا۔

دیکھئے سخاوت، تبلیغ، شہادت اور علم پڑھانے جیسے عمل بے کار ہو گیا، جہنم سے نہیں بچا سکا۔ اس لئے کہ ان میں خلوص نہیں تھا اور یہ چھوٹے چھوٹے اعمال کہ ماں کا حق ادا کیا۔ وہ تو فرض، واجب ہے، ادا کرنا ہی ہے۔ اسی طرح زنا کاری سے بچ گیا، وہ تو اس کا فرض ہے زنا سے بچنا، اس نے کوئی بڑا کام نہیں کیا، اسی طرح سے امانت سپرد کر دی، اس کے فرائض میں تھا کہ امانت سپرد کرتا۔ کوئی بڑا کام نہیں کیا۔ یہ چھوٹے چھوٹے اعمال تھے مگر خلوص سے کئے تو دنیا میں نجات کا سبب بن گئے اور اللہ کے ہاں مقبولیت کا سبب بن گئے۔

اللہ اگر عمل قبول نہ کرتا۔ تو یہ نجات نہ ہوتی، اور چٹان نہ ہٹتی۔ تو خدا کے ہاں بھی مقبولیت ہوئی، دنیا میں بھی نجات ملی، حالانکہ عمل بالکل حقیر سے تھے لیکن خلوص تھا۔ اور وہ بڑے بڑے تین اعمال تھے۔ وہ جہنم سے نہیں بچ سکے، اس لئے کہ ان میں خلوص نہیں تھا۔ تو اصل بنیادی چیز اخلاص ہے۔ خلوص سے جو عمل ہوگا، وہی اللہ کے ہاں قبول ہوگا، اس لئے کہ خلوص عمل کی روح ہے۔ کسی چیز کے ڈھانچے کی قیمت نہیں ہوتی، اس کی جان کی قیمت ہوتی ہے۔ لاش کی قیمت نہیں، جاندار میں جان کی قیمت ہوتی ہے۔

تو عمل کا ڈھانچہ مقبول نہیں۔ کتنا ہی بنا سنوار کے نماز پڑھیں۔ نیت یہ ہو کہ لوگ ہمیں نمازی کہیں، وہ کوئی مقبول چیز نہیں ہے۔ منہ پر مار دینے کے قابل ہے۔ بنیادی اور اساسی چیز انسان کے لئے خلوص، للّٰہیت اور اخلاص ہے اللہ کی رضا کے لئے عمل کرنا ہے، مخلوق کے دکھاوے کے لئے عمل کرنا یہ اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہے۔ اس لئے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”وَالْعَامِلُوْنَ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْمُخْلِصُوْنَ“ ”عمل کرنے والے بھی سب کے سب برباد ہیں۔ خلوص والے بچیں گے، جنہوں نے سچائی اور اخلاص سے عمل کیا“۔

گویا تین بنیادی چیزیں فرمائی گئیں کہ: ”اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ“ انسان ہلاکت اور بربادی سے بچنے والے نہیں ہیں مگر علم والے بچیں گے۔ علم اور عمل ہی نجات کا ذریعہ بنے گا، خلوص للّٰہیت نجات کا ذریعہ بنے گا۔ گویا علم بھی ہو، اس کے ساتھ عمل ہو، اس کے ساتھ اخلاص بھی ہو، تب جا کے نجات کا ثمرہ پیدا ہوگا۔

غرور اخلاص کو ختم کر دیتا ہے..... مگر اخلاص کے بعد ایک چیز اور ارشاد فرمائی: ”وَالْمُخْلِصُوْنَ عَلٰى خَطَرٍ عَظِيْمٍ“ خلوص ہو تو آدمی غرہ نہ کرے، اترائے نہیں کہ میں نے بڑے خلوص سے عمل کیا، مرتے دم تک خطرہ ہے، جب خاتمہ اخلاص پر ہو جائے، تب اطمینان کرے کہ اب نجات ہوئی ہے۔ ورنہ خاتمہ سے پہلے پہلے اگر کہیں اترا ہٹ پیدا کی، کہیں دل میں کبر و غرور آ گیا کہ میں بڑا مخلص ہوں سارا عمل ختم ہو جائے گا۔ سب عمل نامقبول ہو جائے گا۔ تو اخلاص اس وقت تک معتبر نہیں ہوتا جب تک انسان کے اندر خدا پر بھروسہ کرنے کا جذبہ نہ ہو۔ نہ اترا ہٹ نہ ہو، کبر اور غرور نہ ہو کہ میں کوئی چیز ہوں۔ میں نے کوئی عمل کیا۔

مدارِ نجات، صرف اللہ کا فضل ہے..... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک واقعہ ارشاد فرمایا، حدیث میں آتا ہے کہ: بنی اسرائیل میں ایک شخص عابد زاہد تھا۔ رات دن اللہ کی یاد میں لگا رہتا تھا۔ اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ میں عمل کرتا ہوں، محنت بھی کرتا ہوں، مگر بہر حال بیوی ہے، بچے ہیں، کھیتی باڑی ہے، کمائی ہے، کچھ نہ کچھ اس میں بھی وقت لگانا پڑتا ہے، کوئی ایسی صورت ہو کہ یہ سارے جھگڑے ختم ہوں اور چوبیس گھنٹے میں خدا ہی کی یاد میں لگا رہوں۔ اس زمانے کی شریعتوں میں یہ بات جائز تھی؛ اب کی شریعت میں یہ بات جائز نہیں ہے، اس زمانے میں یہ جائز تھا کہ آدمی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے پہاڑ کی چٹان پر چلا جائے، تو اس شخص نے رہبانیت اختیار کی اور وہ یہ کہ بیوی بچے اور مال و دولت کو چھوڑ کر سمندر کے بیچ میں پہاڑ کا ایک ٹیلہ تھا، وہاں جا کے ڈیرہ ڈالا، کہ یہاں بیٹھ کے اللہ کی عبادت کروں گا، اب یہاں نہ بیوی سامنے ہوگی، نہ اولاد و تجارت نہ دکان سامنے ہوگی۔ بس میں ہمہ تن اپنے خدا کو یاد کروں گا، وہاں بیٹھ گیا۔

اب کھانے پینے کے لئے تو چاہئے؟ اللہ نے اس کے لئے یہ سامان کیا کہ اسی کڑوے سمندر میں ٹیلے کے اوپر نہایت میٹھا چشمہ نکل آیا اور اسی سے ٹھنڈا پانی بہہ پڑا۔ اور اسی ٹیلے کے اوپر انار کا درخت اگایا، جس کو بڑے بڑے انار لگنے لگے اور بڑا میٹھا اور بہت ہی قوی قسم کا انار۔ اس عابد کا کام یہ تھا کہ روز ایک انار کھا لیتا اور ایک کٹورا پانی کا پی لیتا۔ اور صبح و شام اللہ کے ذکر میں مصروف۔ نہ رات کو سونا، نہ دن کو آرام کرنا بس دن بھی اور رات بھی اللہ کے ذکر میں مصروف پانچ سو برس اس عابد نے اسی طرح گزارے ہیں کہ ایک کٹورا پانی کا اور ایک انار روز اور چوبیس گھنٹے خدا کی یاد اور عبادت۔ مرتے وقت اس نے اللہ سے دعا کی کہ یا اللہ! جب تو نے مجھے عمر بھر عبادت کی توفیق دی اور پانچ سو

برس عبادت میں لگے میری موت سجدہ کی حالت میں ہو اور میرے بدن کو تو قیامت تک محفوظ رکھ تا کہ میں قیامت تک تیرا سجدہ گزار بندہ سمجھا جاؤں۔ بقیہ زمانہ بھی گویا میں نماز ہی میں لگا ہوا رہوں۔ جب میرا بدن قیامت تک سجدہ میں پڑا ہوا ہے تو یہ ایسا ہے جیسے میں قیامت تک نماز ہی پڑھتا رہا۔ یہ دعا قبول ہوئی۔ عین سجدہ کی حالت میں اس کا انتقال ہوا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں آج تک اس کا بدن اس پہاڑ کے ٹیلے پر محفوظ ہے۔ لیکن اللہ نے اس کے اردگرد بڑے بڑے گنجان درخت پیدا کر دیئے ہیں۔ لوگ وہاں جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ہیبت پیدا کردی، اس لئے کہ اگر لوگ جاتے اور دیکھتے کہ ایک مردہ سجدہ میں پڑا ہوا ہے، تو بڑا فتنہ پھیل جاتا، کوئی پوجا پاٹ شروع کر دیتا، کوئی اس کی عبادت شروع کر دیتا۔ اللہ نے مخلوق کو بچانے کے لئے بڑے بڑے عظیم درخت اگا دیئے، ان کی وجہ سے اندھیرا ہو گیا اور اندھیرے سے وہاں ایک ہیبت پیدا ہوئی، تو لوگ جاتے ہوئے ڈرتے ہیں، اس لئے نگاہوں سے وہ قصہ اوجھل ہے۔ اس طرح سے اس عابد نے پانچ سو برس گزارے ہیں۔

حدیث میں آپ فرماتے ہیں کہ: مرنے کے بعد اس کی پیشی ہوئی حق تعالیٰ کے سامنے، حق تعالیٰ نے فرمایا: اے بندے میں نے تجھے اپنے فضل و کرم سے بخشا اور ملائکہ سے فرمایا کہ: جنت کے اعلیٰ مقامات میں اس کا نام لکھ دو اور اس کا داخلہ جنت میں منظور ہے اور جہنم سے اس کو بچا دیا گیا۔

اس عابد کے دل میں خطرہ یہ پیدا ہوا کہ پانچ سو برس تو میں نے محنت کی، بیوی، بچوں کو چھوڑا، شہر کو چھوڑا، اور اب بھی انہوں نے اپنے ہی فضل و کرم سے بخشا۔ کم سے کم میری تسلی کے لئے ہی کہہ دیتے کہ تیری نمازوں کی وجہ سے تجھے نجات دی۔ اب بھی اپنے ہی فضل و کرم سے بخشا۔ گویا میں نے ان کے سامنے کچھ کیا ہی نہیں، یہ ایک وسوسہ پیدا ہوا، عقیدہ تو کفر کا تھا، لیکن وہ عقیدے سے بری تھا مگر دل میں ایک خطرہ گزرا، ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ ① وہ تو دلوں کی کھٹک سے واقف ہے۔ وہ تو دلوں کے خطروں کو جانتے ہیں۔ جوں ہی یہ وسوسہ پیدا ہوا، حق تعالیٰ نے ملائکہ سے فرمایا۔ بجائے جنت میں لے جانے کے اس عابد کو جہنم کی طرف لے جاؤ، جہنم میں داخل نہیں کرنا، مگر اتنی دور کھڑا کر دو کہ وہاں سے جہنم پانچ سو برس کے راستہ پر ہو، وہاں لے جایا گیا۔ ایک دم جو جہنم کی طرف سے گرم ہوا اور لپٹ آئی ہے اور اس کے بدن کو لگی! تو تمام بدن میں کانٹے پڑ گئے۔ پیاس پیاس چلانا شروع کیا، جیسے معلوم ہو کہ اس کا اندر بالکل خشک ہو گیا، تری باقی نہیں رہی، جہنم میں جل کر تو کیا کیفیت ہوتی، اتنی دوری پر ہے، جہنم کی لو اور اک لپٹ لگی۔ سارا بدن لکڑی کی طرح خشک ہو گیا۔

حدیث میں ہے ایک ہاتھ نمایاں ہوا، جس میں ٹھنڈے پانی کا کٹورا تھا۔ یہ عابد دوڑا کہ اے خدا کے بندے! یہ پانی مجھے دیتا، وہ ہاتھ پیچھے ہٹ گیا، آواز یہ آئی، کہنے والا تو کوئی نظر نہیں آ رہا تھا، پانی تو ملے گا، مگر اس کی قیمت ہے۔ مفت نہیں دیا جا سکتا۔ اس نے کہا کیا قیمت ہے؟ آواز یہ آئی جس نے پانچ سو برس خالص عبادت کی

ہو۔ وہ عبادت اگر کوئی دے تو اس کے بدلے میں ایک کٹورا مل سکتا ہے، ورنہ مفت نہیں دیا جا سکتا۔ اس نے کہا میرے پاس پانچ سو برس کی عبادت ہے اور بڑی خالص عبادت ہے۔ اس میں کوئی نفاق شامل نہیں۔ اس نے وہ پانچ سو برس کی عبادت پیش کی، بدلے میں کٹورا مل گیا، پی کر ذرا اس کے دم میں دم آیا۔

حق تعالیٰ نے ملائکہ کو ارشاد فرمایا: اس کو واپس لاؤ، واپس لایا گیا، اس کی پھر پیشی ہوئی۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: اے بندے! تیرے پانچ سو برس کی عبادت کی قیمت تو ادا ہوگئی اور وہ قیمت تو نے از خود تجویز کی کہ پانچ سو برس عبادت کی قیمت ایک کٹورا پانی ہے۔ وہ تو ہم دے چکے، معاملہ برابر ہوگیا، تو نے پانچ سو برس کی عبادت دی۔ ہم نے ایک کٹورا پلایا اور وہ تو نے خود تجویز کی کہ یہ قیمت ہے ہم نے نہیں کہا تھا۔ لہٰذا اس سے تو ہم ادا ہو گئے۔ اب حساب دے، وہ جو دنیا میں تو نے لاکھوں کٹورے پانچ سو برس میں پیئے، ان کے بدلے میں کیا عبادت لے آیا ہے اور وہ جو انار کے لاکھوں دانے تو نے کھائے ہیں۔ تو انار کے ایک ایک دانے کے بدلے میں کیا عبادت لے کر آیا ہے اور وہ جو انار کے لاکھوں دانے تو نے کھائے ہیں۔ تو انار کے ایک ایک دانے کے بدلے میں کتنے سجدے لے کر آیا ہے؟ یہ تو دانہ اور پانی تھا۔ وہ جو تو نے ہماری ہوا کے ذریعے سانس لئے ہیں، جس سے تیری زندگی قائم تھی۔ اب ایک ایک سانس کا حساب دے کہ اس کے بدلے میں کتنی عبادتیں لے کر آیا ہے، اور وہ جو تیری آنکھوں میں ہم نے نور پیدا کیا تھا، جس سے تو اچھے اور برے کو دیکھتا تھا۔ ایک ایک تار نگاہ کے بدلے میں کتنے سجدے لے کر آیا ہے؟ کتنی عبادتیں کیں اور وہ جو تیرے دل میں توفیق و ارادہ پیدا کیا تھا اس کے بدلہ کیا لے کر آیا؟ تو طاقت ہم نے دی۔ ارادہ تیرے قلب میں ہم نے پیدا کیا۔ توفیق ہم نے دی، دانہ پانی ہم نے پیدا کیا، تیرے بدن میں جان اور ہمت ہم نے پیدا کی، اور پھر بھی تجھے دعویٰ ہے کہ میں نے کچھ کیا، اور میرے کئے کے بدلے میں کچھ ملے۔ ارے یہ تو ہمارا کیا کرایا ہے، تو نے کیا کیا جس کے بدلے میں تو چاہتا ہے تجھے صلہ ملے۔ لیکن اگر کیا تو اب حساب دے، یہ عابد تھرا گیا، اور کہا: "یا اللہ! بے شک نجات آپ کے فضل سے ہوتی ہے، کسی کے عمل سے نہیں ہوتی۔

عمل کی یہ قدر و قیمت ہے کہ پانچ سو برس کی عبادت کرے، تو وہ ایک کٹورا پانی کے برابر بھی نہیں"۔ اور وہ بھی اللہ کا فضل ہے، اگر وہ توفیق نہ دے، آدمی عبادت نہیں کر سکتا۔ بدن میں جان بھی ہو سب کچھ ہو، مگر دل میں ارادہ ہی پیدا نہ ہو۔ ارادہ بھی ہو مگر ہمت نہ ہو، کسل اور سستی بڑھ جائے، وہی توفیق دیتے ہیں، وہی ہمت دیتے ہیں، تب تو آپ سجدے کرتے ہیں۔ وہ ہمت نہ دیں تو سجدہ کیسے کریں؟ تو غرہ اور اترانے کے کیا معنی؟ ادھر کی ہی ساری چیزیں ہیں۔

ہر عمل توفیقِ خداوندی سے ہی وجود میں آتا ہے...... وہ ایک شخص کا قصہ مشہور ہے کہ ایک لکھ پتی آدمی تھا، اس کے ہاں ایک ملازم تھا، تو وہ لکھ پتی، ایک وقت کی بھی نماز نہیں پڑھتے تھے۔ انہیں پتہ بھی نہیں تھا، کہ نماز کہتے کسے ہیں۔ اور یہ جو بوڑھا ملازم تھا، وہ بڑا پکا نمازی، فرض ہی نہیں سنتیں بھی، اور پچاسوں نفل پڑھ کے بھی دم نہ

لے۔ یہ رات دن کو سے کہ اسے جب دیکھو نماز، جب دیکھو نماز، جب دیکھو بوڑھے کو تو نماز۔ یہ نماز ہی نماز کا رہ گیا۔ ایک دن اس کے آقا بازار میں کچھ سامان لینے گئے اور ملازم سے کہا کہ ہمارے ساتھ چل۔ بوڑھا ساتھ ہو گیا۔ راستے میں مغرب کی اذان ہوئی۔ بوڑھے نے کہا صاحب؟ میں تو جاتا ہوں مسجد میں نماز پڑھنے، آقا نے چلا کر کہا کہ کمبخت جب دیکھو نماز، جب دیکھو نماز، ارے تجھے اور بھی کوئی کام نماز کے سوا رہ گیا۔ خیر کہا کہ جا، اچھا، جلدی سے پڑھ کے آ۔ اب آقا صاحب مسجد کی سیڑھیوں پہ کھڑے ہو گئے۔ وہ مسجد میں داخل ہوا، جماعت کے ساتھ نیت باندھ لی، جب فرض پڑھ لئے، تو اس کے بعد سنتیں پڑھیں، اب یہ آقا کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کا جی گھبرایا۔ کہ جلدی آئے۔ بازار کا وقت نکلا جا رہا ہے، سنتیں پڑھ کے اس نے اوابین کی نیت باندھ لی۔ اب ان کے دل میں غصہ اور گھٹن، کہ اس کمبخت کو اس کی بھی خبر نہیں۔ اب خدا جانے کب تک نفلیں پڑھے گا، جب اس نے نفلوں سے سلام پھیرا، اس نے دوسری نفلوں کی نیت باندھنے کا ارادہ کیا، تو انہوں نے چلا کر کہا ارے کمبخت! آتا کیوں نہیں۔؟ تو جواب میں بوڑھے نے کہا کہ جی آنے نہیں دیتے، اور یہ کہہ کر بوڑھے نے پھر نیت باندھ لی۔ یہ گھٹ کے کھڑے ہوئے، اب بڑے خشوع و خضوع سے دو رکعتیں پڑھیں۔ پانچ دس منٹ میں سلام پھیرا، اور بوڑھا پھر نیت باندھنے کے لئے کھڑا ہونے لگا تو، انہوں نے چلا کے کہا کہ او منحوس! آتا کیوں نہیں؟ کہ جی آنے نہیں دیتے، اور یہ کہہ کر پھر نیت باندھ لی، اب یہ اور غم و غصہ میں، جب چھ پوری ہو گئیں اور پھر لگا کھڑا ہونے۔ تو انہوں نے کہا کہ آتا کیوں نہیں؟ کہ جی آنے نہیں دیتے کہ بھئی کون نہیں آنے دیتا؟ کہ جو آپ کو اندر نہیں آنے دیتے وہ مجھے باہر نہیں آنے دیتے۔ تمہیں وہاں روک رکھا، مجھے یہاں روک رکھا ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ جو نماز نہیں پڑھتا اسے پڑھنے نہیں دیتے۔ اس کو دھتکار دی ہے۔ بندہ کی کیا مجال تھی وہ اللہ سے گریز کرے اور بھاگے۔ اور جب توفیق دیتے ہیں، تو آپ کا نہ بھی جی چاہے تب بھی آپ نماز پڑھیں گے، تب بھی آپ روزہ رکھیں گے، وہ دل میں اترائے نہیں، کہ میں نے کچھ کیا ہے، شکر ادا کرے کہ اللہ نے مجھے توفیق دے دی، ہزاروں بندے ہیں جنہیں توفیق نہیں ہوتی توفیق ملنا یہ خود مستقل نعمت ہے، اللہ نے توفیق دے دی۔

تو اصل یہی ہے کہ نجات ہمارے عمل سے نہیں بلکہ محض اللہ کے فضل سے ہوگی، مگر بھئی اس کا یہ مطلب مت سمجھ جائیو کہ آج سے نماز صفر ہو جائے کہ نجات اللہ کے فضل سے ہوگی۔ مگر فضل کی علامت یہ ہے کہ آپ عمل کر رہے ہیں۔ تو یہ عمل کرنا علامت ہے کہ فضل آپ کی طرف متوجہ ہے، اگر عمل نہ کرتے، تو یہ اسکی علامت تھی کہ فضلِ خداوندی آپ کی طرف متوجہ نہیں ہے، تو عمل ضروری ہے، کیونکہ وہ فضلِ خدا کی علامت ہے، نجات بے شک اللہ کے فضل سے ہوگی۔

جو عبادت ہی صُورۃً ہو تو اس پر اترانا کیا؟..... غرض تعلیم یہ دی گئی کہ کتنا بھی عمل کرے، مگر غرہ نہ کرے، ناز نہ کرے کہ میں نے کیا ہے، شکر ادا کرے کہ اللہ نے مجھے توفیق دے دی۔ میرے اندر کچھ کرنے کی قوت نہیں تھی،

ملائکہ علیہم السلام قیامت کے دن یوں کہتے ہوئے ہوں گے "مَا عَبَدْنٰکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ وَ مَا عَرَفْنٰکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ"۔ "اے اللہ! ہم نے کوئی حق تیری عبادت کا ادا نہیں کیا۔ ہم تجھے پہچان بھی نہیں سکے جیسے پہچاننے کا حق ہے"۔

ہم اب تک جاہل اور لاعلم ہیں، تیرے کمالات کا اب تک بھی ہم اندازہ نہیں کر پائے۔ تیری ذات بہت بڑی ہے۔ تو فرشتے جو لاکھوں برس سے عبادت کررہے ہیں، وہ بھی یہ کہیں گے کہ ہم کچھ بھی نہیں کر سکے ہم ایک پچاس، ساٹھ برس کی عمر لے کر آئے اور اس میں بھی چودہ برس لڑکپن کے نکال دو، اس میں عبادت فرض نہیں ہوتی' اور اخیر کے دس پندرہ برس بڑھاپے کے نکال دو، جس میں آدمی معطل ہو جاتا ہے، مشکل سے تیس پینتیس برس رہ جاتے ہیں، وہ اس میں بھی سارے اوقات نماز کے نہیں ہیں، چوبیس گھنٹے میں سے بھی ہم بیس گھنٹے سونے اور اپنا مال و دولت کمانے میں لگاتے ہیں، گھنٹہ سوا گھنٹہ نماز پڑھنے اور تلاوت کرنے میں لگاتے ہیں اور اس پر بھی لگے غرہ کرنے کہ ہم نے بھی کچھ کیا ہے، یہ بڑی نادانی کی بات ہوگی، ہم تو کچھ بھی نہ کرسکے، جب لاکھوں برس عبادت کرنے والے ملائکہ جو نہ کھاتے ہیں، نہ پیتے ہیں، نہ سوتے ہیں، نہ غفلت میں ہیں، وہ کہیں کہ ہم کچھ نہیں کرسکے، اور ہماری یہ چند منٹ کی عبادت، اور عبادت بھی حقیقی نہیں، عبادت کی صورت بنا رکھی ہیں، کھڑے ہوئے اللہ کے سامنے ہیں، اور دل میں وسوسے بھرے ہوئے ہیں، دل میں کہیں یہ ہے کہ جلدی سے دو رکعت پوری ہوں، تو دکان پہ جاؤں، سودا بیچنے کا حرج ہو رہا ہے، تاکہ جلدی پہنچ جاتا، آج شنبہ کا دن ہے، گاہک زیادہ آئیں گے، یہ نماز جلد سے جلد ختم ہو، تاکہ پیسے کماؤں، یہ صورت اور تصویر عبادت کی ہم نے بنائی، عبادت نہیں ہے، یہ تو اللہ کا فضل اور انعام ہے کہ وہ اسے عبادت مان لیں، ورنہ یہ عبادت اس قابل نہیں کہ اسے قبولیت نصیب ہو، یہ محض ان کا فضل ہے، اور ان کا مفتی فتویٰ دے دے کہ ہاں ہوگئی نماز، تو اترانے کا، اور غرہ و غرور کا کوئی موقع نہیں ہے، بلکہ جتنا بھی ہو، آدمی شکر ادا کرے کہ میرے پروردگار نے مجھے توفیق دے دی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: لَنْ يُنْجِيَ اَحَدَكُمْ عَمَلُهٗ۔ "تم میں سے کسی کا عمل نجات نہیں دلائے گا۔ اللہ کا فضل نجات دلائے گا"۔ صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا: "وَلَا اَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ." "یا رسول اللہ! کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی آپ کو نجات نہیں دلائیگا؟ فرمایا: "لَا اِلَّا اَنْ يَتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِرَحْمَتِهٖ." "مجھے بھی میرا عمل نجات نہیں دلائے گا، جب تک اللہ ہی کا فضل و دستگیری نہ کرے"۔ اور مجھے اپنی رحمت میں نہ ڈھانپ لے، میرا عمل بھی نجات دلانے والا نہیں ہے۔ فضلِ خداوندی ہی نجات دلانے والا ہے۔ ①

حق تعالیٰ کے سامنے اعترافِ قصور ہی شکر ہے..... جب انبیاء علیہم السلام بلکہ سردار انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام جن سے بڑھ کر مخلوقات میں کوئی نہیں ہے، فرمائیں کہ مجھے بھی میرا عمل نجات نہیں دلا سکتا۔ اللہ ہی کا فضل

① الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومة علی العمل، ص: ۱۱۹۱.

نجات دلائے گا، تو میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے کہ ہم اپنے کسی عمل پر ناز کرنے لگیں، ہم کسی عمل پر اترائیں کہ ہم نے بڑا کام کیا۔ بندہ کا کام یہی ہے کہ سب کچھ کر کے کہے کہ میں کچھ نہیں کر سکا، خدا کی ثناء خوانی یہی ہے ہم سے کچھ ثناء خوانی ممکن نہیں، نہ ہم اللہ کی پوری تعریف کر سکتے ہیں، نہ پوری پوری عبادت کر سکتے ہیں، نہ ہم شکر ہی ادا کر سکتے ہیں، سوائے اس کے کہ عاجزی اور قصور کا اعتراف کریں۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے حکم دیا: ﴿اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا﴾ ① واقعی انبیاء علیہم السلام ہی اللہ کے کلام کو سمجھتے ہیں، جیسے سمجھنے کا حق ہے، حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا، اے اللہ! شکر میں ضرور ادا کروں گا، جب آپ ارشاد فرما رہے ہیں، میرا فرض ہے کہ میں تعمیل کروں، اور میں ضرور ادا کروں گا مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ شکر کس طرح سے ادا کروں؟ اس واسطے کہ جب شکر ادا کرنے بیٹھوں گا، تو اس کے ادا کرنے کی توفیق بھی آپ ہی دیں گے، تو توفیق ایک نعمت بن گئی، پھر اس کا بھی شکر ادا کرنا چاہئے، ہر نعمت سے پہلے تو نعمت نکلتی ہے، شکر ادا کروں تو کس طرح، میں تو شکر کی ابتدا بھی نہیں کر سکتا آپ کے شکر ادا کرنے سے قاصر ہوں۔

جواب آیا حق تعالیٰ کی طرف سے کہ اے داؤد! اگر تم نے یہ سمجھ لیا کہ تو ہمارا شکر ادا کرنے سے عاجز ہے تو یہی شکر کی ادائیگی ہے، اس کے معنی شکر ادا کرنے کے ہیں، اس لئے کہ حقیقی معنی میں کوئی ہمارا شکر ادا نہیں کر سکتا، شکر نعمت کے مقابلے میں ہے، اور نعمتیں غیر محدود ہیں، ان کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اور ہمارا دماغ بھی محدود، ہماری قوتیں بھی محدود، الفاظ و آواز بھی محدود، تو ہم شکر ادا کریں گے، تو اس میں حد لگی ہوئی ہوگی اور نعمتوں کی کوئی حد نہیں، تو لا محدود کا شکر محدود ادا کیسے کر سکتا ہے؟ سوائے اس کے کہ اپنی ہار مان لے، قصور کا اعتراف کرے، اپنے عجز کا اقرار کرے، یہی ہے فی الحقیقت شکر کی ادائیگی کہ آدمی اپنی عاجزی مان لے، کہ میں بالکل عاجز ہوں، اللہ کے ہاں تو سب سے بڑی عبادت یہی ہے کہ اپنے نفس کا قصور مان لے، کون ہے جو اس عبادت کا حق ادا کر سکے لاکھوں برس عبادت کر کے جب ملائکہ کہیں گے ہم کچھ نہیں کر سکے ہم کیا چیز ہیں جو ہم کہیں کہ ہم نے عبادت کر لی، ہماری عبادت یہی ہے کہ جو حکم ہے اس کی پوری طرح تعمیل کر کے یوں کہیں، کہ یا اللہ! قصور ہوا ہے، ہم پوری طرح کچھ نہیں کر سکے، آپ معاف کر دیں، بس یہی ہماری عبادت ہے، یہ جبھی ہوگا، جب آخرت کا فکر چڑھا ہوا ہو، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَلنَّاسُ کُلُّھُمْ ھَالِکُوْنَ'' سب انسان تباہ و برباد ہیں، بچیں گے خلوص والے علم والے تباہ و برباد ہیں، بچیں گے عمل والے، عمل والے تباہ و برباد ہیں، بچیں گے خلوص والے اور خلوص والے خطرے میں ہیں جب تک خلوص کے اوپر موت نہ ہو جائے، خاتمہ جب ایمان پر ہو جائے، جب مطمئن ہو کہ ہوگی نجات۔ ممکن ہے کہ اس سے پہلے مرتے دم تک خدانخواستہ کوئی بات پیش آجائے، دل میں ایمان نہ رہے، دل ہی ایمان سے ہٹ جائے، عمل کی توفیق چھن جائے، بہت سے لوگ دیکھے گئے ہیں کہ پوری زندگی نیکیوں میں گذاری، مرنے کا وقت آیا

① پارہ: ۲۲، سورۃ السبا،الآیۃ: ۱۳۔

تو لہو ولعب اور بری باتوں میں مبتلا ہو گئے، بہت سے دیکھنے میں آئے ہیں کہ پوری زندگی تو بری باتوں میں گذاری، خاتمہ کے وقت ایسی اچھی زندگی ہوئی کہ رات دن طاعت اور عبادت، اور بہترین خاتمہ ہوا، تو آدمی غرہ نہ کرے معلوم نہیں، خاتمہ کیسے ہونے والا ہے، تو فرمایا گیا: ''وَالْمُخْلِصُوْنَ عَلٰی خَطَرٍ عَظِیْمٍ'' ''مخلصین خطرہ میں ہیں''۔ خطرہ جب ٹلے گا، جب موت آجائے گی، اب اطمینان کا وقت آیا، کہ اس چیز سے نجات پاگئے۔

روحانی زندگی کے عناصرِ اربعہ...... نجات کے گویا چار اصول فرمائے گئے، ایک علم، ایک عمل، ایک اخلاص، اور ایک اپنی آخرت کی فکر، یہ چار بنیادیں ہیں، جس سے آدمیت بنتی ہے، انسان کی انسانیت ترقی کرتی ہے اگر انسان میں علم نہ ہو، جہالت ہو، تو یہ اندھیرا ہی اندھیرا ہے، جہالت سے نجات نہیں مل سکتی اگر علم آگیا، روشنی آگئی، مگر عمل نہیں ہے، تو گویا علم کسی کو نجات نہیں دلائے گا، بلکہ وبال بن جائے گا، اگر علم کیساتھ عمل بھی ہو، مگر عمل کیساتھ نفاق ہے، اخلاص نہیں ہے، وہ علم بھی بے کار ہے، نجات نہیں دلائے گا، اگر علم بھی ہے، عمل بھی ہے، اور اخلاص بھی ہے، مگر انسان میں ناز اور شیخی ہے، کہ میں سب سے بڑا عبادت کرنے والا ہوں، آخرت کا خطرہ نہ ہو، وہ اخلاص بے کار ہے وہ ختم ہو گیا، چاروں چیزیں جمع ہوں گی، تب انسان کی انسانیت بنے گی، علم، عمل خلوص، اور فکر۔ تین چیزیں اس میں قلب کی ہیں اور ایک چیز ہاتھ پیر کی ہے، علم بھی قلب میں ہوتا ہے، ہاتھ پیر میں نہیں ہوتا، اخلاص اور للہیت کا جذبہ بھی قلب میں ہوتا ہے، ہاتھ پیر میں نہیں ہوتا، آخرت کا خوف اور خطرہ یہ بھی قلب میں ہوتا ہے، ہاتھ پیر میں نہیں ہوتا، ہاتھ پیر صرف عمل کرتے ہیں، دین کامل فی الحقیقت علم، خلوص اور تفکر ہے یہ تین چیزیں قلب میں ہوں، اور ایک باہر، تب آدمی آدمی بنے گا، اس کی نجات کا سامان ہوگا۔ یہ گویا ایسا ہے جیسے آپ کا بدن چار چیزوں سے بنا ہے، آگ، پانی، مٹی، ہوا یہ نہ ہوں تو بدن ختم ہو جائے گا، اور اگر یہ چار چیزیں نہ ہوں، تو روح ختم ہو جائے گی۔

اصل بنیادی چیز صحبت اور معیت ہے...... انسان کی حقیقی زندگی ان چار چیزوں سے ہے۔ علم درسگاہوں میں، مکاتیب میں اور علماء کے پاس ملے گا، عمل عمل کرنے والوں کی ہیئت دیکھ کر ملے گا، خلوص ملے گا، مخلصوں کی جماعت میں بیٹھ کر فکر پیدا ہوگا، متفکروں کی جماعت میں بیٹھ کر، غافل لوگوں میں رہ کر فکر نہیں پیدا ہوتا، وہ تو اور غفلت میں مبتلا کریں گے، بدعمل لوگوں کی صحبت ہوگی وہ تو بدعملی پیدا کریں گے عمل کہاں سے آئے گا؟ جاہلوں کی صحبت رہے گی، جہالت ملے گی عمل کہاں سے آجائے گا؟ تو سب سے بڑی بات صحبت و معیت ہے جس سے علم، عمل، اخلاص اور تفکر پیدا ہوتا ہے۔

صحبتِ صالح ترا صالح کند ‏ ‏ ‏ صحبتِ طالح ترا طالح کند

نیکوں اور سچوں کی صحبت اختیار کریں گے تو سچائی آئے گی بروں کی صحبت اختیار کریں گے، لہو ولعب اور کھیل کود کے جذبات پیدا ہوں گے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نیک صحبت کی مثال ایسی ہے، جیسے عطار کی دکان، جو عطر بیچتا ہو،

کہ اس کی دکان پر جا کے آپ عطر نہیں خریدیں گے تو کم از کم خوشبو تو آہی جائے گی، دماغ تو معطر ہو ہی جائیگا فرحت تو پیدا ہو ہی جائیگی، اور بری صحبت کی مثال ایسی ہے، جیسے لوہار کی دکان، کہ کچھ بھی نہیں ہوگا، آگ کا کوئی چنگا ہی لگ جائیگا، کچھ دھواں ہی چڑھ جائیگا، بدبو پیدا ہو جائیگی، تو کچھ تکدر، کدورت اور انقباض ہی لے کر آئیں گے، نیک لوگوں کے پاس جب جائیں گے، کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا، تو ان کے ایمان کی گرمی قلب میں کچھ نہ کچھ گرمی پیدا کرے گی، اللہ کی طرف توجہ بڑھ جائے گی، کچھ آخرت کی طرف توجہ بڑھ جائیگی، کوئی کلمہ ان کی زبان سے نکلے گا، دل کی گرہیں ہی کھلتی چلی جائیں گی، عمل کا راستہ ہی صاف ہو جائیگا نیک کی صحبت میں بیٹھ کر کوئی نہ کوئی فائدہ پہنچے گا، اور برے کی صحبت میں بیٹھ کر برائی کی طرف طبیعت چلے گی۔

اور اس دنیا میں بری صحبت جلدی اثر کرتی ہے، نیک صحبت دیر میں اثر کرتی ہے، بروں کے پاس بیٹھ کر تو اگلے ہی دن برا بن جائے، اور نیکوں کے پاس بیٹھ کر کہیں مہینے بھر میں صلاحیت پیدا ہوتی ہے، تو دنیا میں بدی جلدی اثر کرتی ہے، نیکی دیر میں اثر پیدا کرتی ہے، اس واسطے نیک صحبت آدمی کی زیادہ چاہئے، بری صحبت سے زیادہ سے زیادہ بچنے کی ضرورت ہے، اصل بنیادی چیز صحبت و معیت ہے، کہ آدمی اچھا ماحول تلاش کرے، اچھے نیک لوگوں میں رہنے کا جذبہ پیدا کرے۔

اب یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ نیک لوگ علماء ہی ہوں، نیک وہ ہے، جو اللہ کے راستے پر پڑا ہو، چاہے وہ بڑا عالم نہ ہو، معمولی مسئلے جانتا ہو، مگر مخلص ہو للّٰہیت ہو، بہت سے لوگ ایسے دیکھے گئے ہیں کہ علم کا تو نشان نہیں، لیکن تقویٰ اور تقویٰ اس درجہ میں بڑھا ہوا کہ بڑے بڑے علماء کو نصیب نہیں، تو بعض مرتبہ عمل کی دولت صحبت سے نصیب ہوتی ہے، صحبت یافتہ لوگ بڑے پکے دیندار ہوتے ہیں، بعضے علماء میں بھی وہ دین نہیں ہوتا جو بزرگوں سے صحبت یافتہ لوگوں میں ہوتا ہے، ان کا دین مضبوط ہوتا ہے، ایسے لوگوں کی صحبت میسر ہو تو وہ کیمیا ہے، انسان کے دل میں پھر دین گھر کر لیتا ہے، اور آدمی دیندار بن جاتا ہے، تو تاکید کی گئی ہے کہ نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرو۔

صحبت و معیت کی ثمرات ...حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا ہے: "**سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظِلِّهٖ يَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلُّهٗ**." ① "سات قسم کے لوگ ہوں گے کہ قیامت کے دن ان کو عرش کے سائے میں جگہ دی جائے گی جب کہ کوئی سایہ بجز اللہ کے سائے کے نہ ہوگا"۔

ان میں سے ایک کے بارے میں فرمایا گیا کہ وہ کون ہوں گے: "رَجُلَانِ تَحَابَّا فِي اللّٰهِ" "وہ دو آدمی جنہوں نے آپس میں اللہ کے واسطے محبت کی اور دوستی اختیار کی" اور یہ معاہدہ کیا کہ بھائی ہم اس لئے دوستی کرتے ہیں، تاکہ ایک دوسرے کے دین کی حفاظت کریں اگر نماز میں سستی کروں، تو تم مجھے کھینچ کے لے جانا، اور سزا دینا کہ خبردار! جو تو نے نماز چھوڑی اگر تم سستی اختیار کرو گے، تو میں تمہیں لے جاؤں گا، اگر تم نے تلاوت قضا کی تو میں

---

① الصحيح للبخاري، كتاب الحدود، باب فضل من ترك الفواحش، ج: ٢، ص: ٢٣.

تمہارے سر پر مسلط ہوں گا، کہ تلاوت کرو قرآن کریم کی اور میں سستی کروں تو تم، تو ہم ایک دوسرے کے دین کی حفاظت کے لئے دوستی کریں گے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ان میں سے جب ایک انتقال کرے گا اور وہ اللہ کی رضا میں اور مقام کریم میں داخل ہوگا، بہشت بریں میں جائے گا، تو دعا کرے گا کہ اے اللہ! میں فلاں دوست کی دوستی کی وجہ سے اس اعلیٰ مقام پر پہنچا ہوں، میرے فلاں دوست کو بھی اسی مقام پر پہنچا، اس کا خاتمہ بھی ایمان پر فرما، اس کی دعا قبول ہوگی۔ تو دونوں جنتی بنیں گے، محبت و معیت ہی سے تو یہ بات ملی، نیک صحبت اختیار کی، دونوں کے لئے نجات کا ذریعہ ہوگئی۔

اور یہی صورت اس کے برعکس سمجھ لیجئے اگر دو آدمی اس لئے دوستی کریں کہ بھئی! سینما میں ایک ساتھ جایا کریں گے، تھیٹر میں ساتھ جایا کریں گے، فلاں برائی میں ساتھ جایا کریں گے، چار آدمیوں نے مل کے دوستی کر لی کہ چوری کیا کریں گے، لوگوں کی جیبیں کترا کریں گے، یہ بھی آپس میں دوستی ہوئی یہ بھی محبت ہے، مگر یہ صحبت و معیت بدعملی کے لئے ہے اس لئے اگر ایک جہنم میں جائے گا تو وہ کہے گا خدا کرے وہ پہلا دوست بھی جہنم میں آئے، اسی کی وجہ سے میں اس مصیبت میں مبتلا ہوں، یہ دونوں چیزیں اپنا اپنا اثر دکھلائے بغیر نہیں رہتیں، تو علم اتنا اثر نہیں پیدا کرتا، جتنی صحبت اثر پیدا کرتی ہے، تو بڑی چیز یہ ہے کہ آدمی سچا ماحول تلاش کرے، نیک لوگوں کے پاس اٹھنا بیٹھنا ہو، کبھی نہ کبھی یہ چیز کارآمد ثابت ہوتی ہے، کبھی نہ کبھی اس کا اثر پڑتا ہے، بہر حال اس حدیث میں چار باتیں بتلائی گئیں، علم، عمل، اخلاص، اور فکر اس کے بغیر آدمی آدمی نہیں بنتا، اس میں جوہر نہیں پیدا ہوتا، وہ کھاتا پیتا ایک حیوان ہوگا، خوبصورت سہی کہ اور کوئی جانور اتنا خوبصورت نہیں، جتنا انسان ہے، مگر ہے جانور، جب علم اور عمل آئے گا تو کہیں گے، اب یہ جانور نہیں، اب اس میں انسانیت آگئی، یہی انسان اور حیوان میں فرق کی چیز ہے، اس واسطے سب سے بڑی توجہ مسلم قوم کو بالخصوص تعلیم کی طرف کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ علم کا جوہر پیدا ہو، جہالت سے کوئی قوم دنیا میں آج تک نہیں پنپی، یہ ضروری نہیں ہے کہ پوری قوم مولوی بنے سب کے سب عالم بنیں، یہ نہ فرض ہے، نہ واجب، نہ لازم، لیکن یہ ہر ایک پر فرض ہے کہ اتنا علم سیکھ لے کہ اپنے دین پر چل سکے، یہ معلوم ہو جائے کہ ہم مسلمان ہیں، اور مسلمان ہونے کے معنی کیا ہیں؟ اور اسلام کے کیا ارکان ہیں، جن کے کرنے سے آدمی مسلمان رہتا ہے یہ بے شک لازم اور واجب ہے، اس کے بغیر نجات کی صورت نہیں ہے، تو سب سے بڑی چیز ادھر توجہ کرنے کی ضرورت ہے، کہ تعلیم عام ہو، دین کا ایک چرچا ہو، اور چرچا اس کے بغیر نہیں ہوا کرتا، کہ تعلیم عام ہو۔

ہمارے ہاں مدارس میں، جیسے ابھی مولانا صاحب نے دارالعلوم دیوبند پر یہ تبصرہ کیا، اور یہ کہ وہاں کے فضلاء نے جگہ جگہ مدارس قائم کئے، تو ہزاروں کی تعداد میں مدارس ہیں، کوئی قصبہ خالی نہیں، اور اس تقسیم ملک کے بعد سے تو تقریباً یوپی میں کوئی بڑا گاؤں بھی خالی نہیں رہا۔ جس میں لوگوں نے مدارس قائم نہیں کر دیئے ہزاروں کی تعداد میں دیہات اور گاؤں میں مدارس ہیں، تو علم کا اور مسئلے مسائل کا ایک چرچا ہے، اور دیہات کے لوگ

چونکہ بیچارے سادہ ہوتے ہیں، کوئی چالاکی، عیاری ان میں ہوا نہیں کرتی، ان میں جب علم آتا ہے تو سیدھا سیدھا اپنا عمل کرتے ہیں، کوئی فرق اور نفاق ان میں نہیں ہوتا علم وہاں زیادہ اچھا اثر کرتا ہے، جہاں دلوں کی صفائی اور سادگی ہوتی ہے۔ تو دیہاتی اتنے مسائل جانتے ہیں کہ چھوٹا موٹا مولوی اکے سامنے چل نہیں سکتا۔ اگر ذرا مسئلہ کی غلطی کر جائے تو کہیں گے مولانا صاحب! تمہاری بات تو سر آنکھوں پر، مگر کہی بات غلط، مسئلہ تو یہ ہے، ہم نے فلاں بڑے مولوی صاحب سے سنا تھا۔ فوراً دیہاتی غلطی بتلائے گا، اور مولوی کو ماننا پڑے گا، تو وہ صحبت یافتہ ہونے کی وجہ سے اور دل کی سچائی کی وجہ سے بہت سے مسائل جانتے ہیں، یہ جب ہوا، جب تعلیم کا چرچا ہے، قصبوں میں، شہروں میں دیہات میں دین پھیلا ہوا ہے۔

گناہ کا جمع ہونا بُرا ہے ...... عمل کی کوتاہی ہر ایک میں کچھ نہ کچھ ہوتی ہے، کچھ مجھ میں کوتاہیاں ہیں، کچھ آپ میں غلطیاں ہیں ہر ایک کچھ نہ کچھ مبتلا ہے، مگر علم اور فکر تو صحیح رہنا چاہیئے، تا کہ جب عمل کی توفیق ہو، تو ہم عمل کر گذریں، اور اگر علم ہی صحیح نہیں تو جی بھی چاہے گا عمل کو تو راستہ صحیح نہیں ملے گا، اس لئے قلب کے اندر علم رہنا چاہیئے، کوتاہی اللہ معاف کرنے والا ہے، بہر حال انسان بشر ہے اور بشر بھی ایسا جو بھول چوک سے مرکب ہے، بھول بھی ہوتی ہے، نفسانیت کا مادہ اس میں ہے، غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں، گناہ بھی ہو جاتا ہے، گناہ کا علاج اللہ نے توبہ بتلایا، جب تم گناہ کرو، ہاتھ کے ہاتھ توبہ کرلو، فرمایا گیا: اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ ① گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے گویا اس نے گناہ کیا ہی نہیں تھا، تو گناہ ہو جانا کوئی جرم نہیں، یہ تو انسان میں مادہ ہے، گناہ کا جمع رہنا بُرا ہے، کہ آدمی توبہ نہ کرے، توبہ کی، تو روز کا روز کھاتہ صاف ہوتا رہے گا، تو آدمی اپنا کچا چٹھا روزانہ درست کرتا رہے۔ جب ادھر سے کوئی اکاؤنٹنٹ حساب لینے والا آئے گا تو کھاتے آپ کے درست ہوں گے، آپ کہیں گے، دیکھ لیجئے اور اگر کوئی کلرک ایسا غافل ہے کہ اس کے حساب میں غلطیاں ہیں اور وہ سست پڑا ہوا ہے کہ جب اکاؤنٹنٹ نے بجائے ایک مہینہ بعد کے بیسویں دن آ کے کہا، لاؤ حساب، وہ سارا غلط پڑا ہوا تھا، اس نے اسی وقت حکم دیا، معطل یا برخواست، اس کی تنخواہ ضبط، اب حیران بیٹھے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔

موت کا کوئی وقت معین نہیں ...... انسان کے عمل کا کھاتہ کھلا ہوا ہے، جب موت کا وقت آئے گا، اسوقت کچا چٹھا درست کرلیں گے، یہ شیطانی وسوسہ ہے۔ موت کے لئے نہ بڑھاپا شرط ہے، نہ بیمار ہونا شرط ہے، ہزاروں انسان عارضہ قلب میں مبتلا ہو کر مر جاتے ہیں، نہ بیمار ہوئے نہ کچھ، رات دن ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی آج ہمارے سے مل رہا ہے، کل ہم سن رہے ہیں کہ اس کا انتقال ہو گیا، تو موت کیلئے بڑھاپا آنا ضروری نہیں ہے، کمزور ہونا ضروری نہیں، بڑے بڑے قوی بھی مر جاتے ہیں، جوان ہونا ضروری نہیں بچے بھی مر جاتے ہیں، تو موت بچپن میں بھی آتی ہے، جوانی میں بھی آتی ہے، بڑھاپے میں بھی آتی ہے، بیماری میں آتی ہے، بلا بیماری سے

① السنن لابن ماجه، کتاب الزهد، باب ذکر التوبة، ج: ۲، ص: ۳۰۱.

بھی آتی ہے، یہ خیال کرتا کہ مرنے کے قریب توبہ کرلوں گا۔ یہ شیطان کا محض ایک دھوکہ ہے، کسی کو کیا خبر ہے کہ موت کا وقت کب آنے والا ہے۔ اور کیا ضروری ہے کہ آدمی کے اوپر بڑھاپا آوے۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جوانوں کو زیادہ موت آتی ہے، بوڑھوں کو کم آتی ہے، جوان زیادہ مرتے ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ مجمعوں میں، بازاروں میں، درباروں میں دیکھیں تو بوڑھے کم نظر پڑیں گے، جوان زیادہ نظر پڑیں گے۔ اگر سارے بڑھاپے کو پہنچ کر ہی مرا کرتے تو بوڑھوں کی تعداد زیادہ ہوتی، سفید ڈاڑھیاں زیادہ نظر پڑتیں، مرتے ہی نہ جب تک بڑھاپے کی عمر کو نہ پہنچتے مگر بڑھاپے کو پہنچنے ہی نہیں پاتے، پہلے ہی مرجاتے ہیں اس لئے بوڑھوں کی تعداد کم نظر پڑتی ہے، جوان زیادہ نظر آتے ہیں۔

تو اس دھوکے میں رہنا کہ جب بڑھاپا آئے گا، اس وقت توبہ کرلیں گے بس اب چلنے والے ہیں، یہ غلط ہے، کیا خبر ہے کسی کو بیماری آئے تا آئے۔ روز کا روز اپنا حساب صاف کرتے رہنا چاہئے، یہ نہ آدمی سمجھے کہ آخیر میں توبہ کروں گا، اور جب اس نے آخیر میں کہا کہ کل کروں گا، کل کو ممکن ہے یہ کہے کہ کل کروں گا، تیسری کل آئی تو اس نے کہا نہیں کل کو کروں گا، بس کل میں کل ساری عمر گذر جائے گی، موت کا فرشتہ سامنے آجائے گا، اور اس وقت توبہ کا کوئی موقع نہیں رہے گا۔

حدیث میں ہے کہ: بعض لوگ ملک الموت سے کہیں گے اے ملک الموت! ذرا سا وقفہ دے دو کہ میں توبہ کرلوں فرمائیں گے ملک الموت کہ: میرے پچاسیوں قاصد تیرے پاس پہنچے، جب تو نے توبہ نہیں کی، اب میں اخیر میں آگیا ہوں، تو تجھے توبہ کی سوجھ رہی ہے، وہ کہے گا میرے پاس تو آپ کا کوئی قاصد نہیں آیا؟ ملک الموت کہیں گے، ایک دو نہیں میں نے تو بیسیوں قاصد تیرے پاس بھیجے انہوں نے تجھے نہیں سمجھایا، وہ کہے گا میرے پاس کوئی نہیں آیا تو ملک الموت کہیں گے تجھ پر بڑھاپا نہیں آیا؟ ارے بڑھاپا میرا ہی تو قاصد ہے جو خبر لے کر آیا تھا کہ موت کا وقت اب قریب ہے، کیا تیری ڈاڑھی اور سر میں سفید بال نہیں آئے؟ یہ سفید بال میرے ہی تو قاصد تھے بتلا رہے تھے کہ اب موت کا وقت قریب آگیا ہے، کیا تیرے پوتے اور نواسے نہیں پیدا ہوئے؟۔ یہ پوتے اور نواسے میرے ہی تو قاصد تھے، جو بتلا رہے تھے کہ اب قبر میں جانے کا وقت قریب آگیا ہے، جب اتنے قاصدوں پر بھی تو نہ سمجھا، اور توبہ نہ کی، تو میں آخری قاصد ہوں، میرے بعد کوئی قاصد آنے والا نہیں۔ اب کون سا موقع ہے توبہ کا۔؟ اب تو گذر گیا وقت، جو کچھ ہونا تھا، ہولیا۔

مقامِ عبرت ...... میں اس لئے عرض کررہا ہوں کہ جو کچھ کرنا ہو، جلدی سے کرلے اس لئے کہ وقت کم ہے، کسی کو اپنی عمر کا پتہ نہیں، سال بھر جو ہمارے سامنے موجود تھے، آج وہ ہمارے سامنے نہیں ہیں، آج جو ہیں ان سے کیا خبر کون رہے گا کون نہیں رہیگا تو روز موت کا بازار گرم ہے آنے والے آرہے ہیں جانے والے جارہے ہیں، اس میں آدمی آنکھ بند کئے غفلت میں پڑا رہے، یہ دانش مندی کے خلاف بات ہے، روزمرہ کا قصہ سامنے گذر رہا ہے۔

من نمی گویم زیاں کن یا بفکر سود باش　　　اے زفرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

نہ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ کرو یا وہ کرو میں یہ کہتا ہوں جو کرنا ہو جلدی کرو، اس لئے کہ وقت تھوڑا رہ گیا ہے، ہم میں سے کسی کی آدھی عمر گذر چکی ہے کسی کی آدھی سے زیادہ گذر چکی ہے، کوئی موت کے قریب پہنچ چکا ہے، کوئی قبر میں پیر لٹکائے ہوئے ہے روزانہ سلسلہ آنے والوں کا، جانیوالوں کا بھی جاری ہے، آخر پھر عبرت کا کون سا وقت آئے گا، جب اتنی چیزیں دیکھ کر عبرت نہ پکڑے؟ تو کیا ملک الموت کو دیکھ کر آدمی عبرت پکڑے گا، یا موت جب سر پر آ کھڑی ہوگی، جب عبرت پکڑے گا؟ اس لئے ابھی سے عبرت پکڑنی چاہئے، اور سمجھ لینا چاہئے کہ وقت آرہا ہے، اس کے لئے ہمیں کچھ کرنا ہے۔

اُخروی غذا بھی حاصل کرنی چاہئے...... اس کے لئے سب کچھ کرنے میں پہلی چیز ہے کہ اللہ کی رضا کا علم اور معرفت حاصل کرلیں، کہ وہ کن چیزوں سے خوش ہے، کن چیزوں سے ناخوش ہے، کونسا راستہ ہے جس پر چل کر اس کو خوشی ہوگی، کونسا راستہ ہے جس پر چل کر وہ ناراض ہوگا، وہ علم آپ کو شریعت سے معلوم ہوگا، وہ سائنس اور فلسفہ میں نہیں ملے گا، وہ ہیئت اور اقلیدس میں نہیں ملے گا، وہ قرآن و حدیث میں ملے گا کہ جس سے اللہ کی رضا اور نارضائی کا پتہ چلے، اس کی خوشی و ناخوشی کا پتہ چلے، تو اس علم کو حاصل کیجئے جس سے آخرت میں کچھ کام چلے، اور آخرت کا دروازہ کھلے، یہ جنتی نعمتیں ہیں، یہ یہیں کے لئے آرام دہ ہیں، یہ قبر میں آرام نہیں دیں گی، ہم یہاں بہترین مسہری اور گدے، تکیے پر لیٹ جائیں مگر قبر میں آرام دینے کے لئے یہ گدے، تکئے آرام نہیں دیں گے، وہاں کی چیز اعمال صالحہ ہے، وہاں کا گاؤ تکیہ نیکی ہے وہاں کا گاؤ تکیہ روئی، اون اور پلاسٹک کا نہیں ہے، وہاں دوسری چیزیں ہیں، یہاں روٹی، چاول اور غذاؤں سے پیٹ بھر جائیگا قبر میں یہ چیزیں غذا نہیں بن سکتیں وہاں عمل صالح کی غذا کام آئے گی، وہاں بستر بھی ہوگا تو عمل کا۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: جب میت سچا جواب دے دے گا کہ میرا رب اللہ ہے، میرا دین اسلام تھا، میرے پیغمبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے، تو ایک منادی ندا کرے گا ''اَنْ صَدَقَ عَبْدِیْ'' بندے نے جو کچھ کہا سچ کہا۔ ''فَافْرِشُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَأَلْبِسُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَافْتَحُوْا لَهٗ بَابًا مِنَ الْجَنَّةِ.'' ① ''اس کے لئے جنت کا فرش بچھاؤ، اس کے لئے جنت کا لباس بھی دو، اس کے لئے جنت کے دروازے بھی کھولو''۔

ہوائیں بھی اس کے لئے وہیں سے آنی چاہئیں، تو وہاں کی غذائیں اور نعمتیں دوسری ہیں، اس عالم کی دوسری ہیں جہاں اللہ نے یہاں کی غذائیں دیں، کچھ وہاں کی غذاؤں کے بھی فکر کرنے ضرورت ہے، یہاں تھوڑا بہت فکر تھا، وہاں کے لئے زیادہ فکر کی ضرورت ہے، مگر ہم نے الٹا قصہ کیا، کہ یہاں کی فکر زیادہ ہے وہاں کی ذرہ

① السنن لابی داؤد، کتاب السنة، باب فی المسئلة فی القبر ج: ۱۲ ص: ۳۶۸، حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحیح وضعیف ابی داؤد ج: ۱۰ ص: ۲۵۳ رقم: ۴۷۵۳۔

برابر نہیں ہے، یہاں ہر آسائش کا خیال ہے، وہاں کی آسائش کا خیال نہیں ہے، کم سے کم تھوڑا بہت وقت کچھ ادھر بھی لگانا چاہئے، اب موت کا بھی دھیان کر لینا چاہئے، تو پہلی چیز تو علم ہے کہ اللہ کی خوشی اور ناخوشی معلوم ہو، دوسری چیز راستہ ہے جو عمل صالح ہے کہ اس راستہ پر چل کر ہم پروردگار کے قریب ہوتے جائیں، تیسری چیز قلب کے مقامات ہیں، سب سے بڑی چیز اس میں اخلاص اور خلوص ہے، کہ قلب کی راہ ہو کر درست ہو جائے اور اس سے بھی بڑی چیز فکر ہے کہ آخرت کی دھن لگی ہوئی ہے، غفلت میں آدمی نہ گذارے۔

مسلمان کو متفکر پیدا کیا گیا ہے ...... مسلمان کو متفکر پیدا کیا گیا ہے، غافل پیدا نہیں کیا گیا، مسلم وہ ہے جو فکر مند ہو، ہر وقت اسے ایک فکر چڑھا ہوا ہو۔ حدیث میں ہے کہ: "اَلْكَافِرُ يَأْكُلُ بِسَبْعَةِ أَمْعَاءٍ، وَالْمُؤْمِنُ يَأْكُلُ بِمِعًى وَّاحِدٍ"① "کافر سات انتڑیوں سے کھاتا ہے اور مؤمن ایک انتڑی سے کھاتا ہے"۔

تو مؤمن کی غذا کم ہوتی ہے، کافر کی غذا زیادہ ہوتی ہے۔ ایک سائز کے دو آدمی لیں، ایک مسلم اور ایک غیر مسلم، وہ زیادہ کھائے گا، یہ کم کھائے گا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ کافر کے قلب میں فکر نہیں ہے، اور مؤمن کے قلب میں آخرت کا فکر لگا ہوا ہے، کتنے سے کتنا ہی بد عمل مسلم ہوگا، جب اندر ٹٹولو گے تو کچھ نہ کچھ فکر آخرت ضرور ہوگا، لگھ چکی ہے، مگر وہ پوچھ رہا ہے، مولانا یہ چیز جائز ہے، ناجائز ہے، یہ جائز ناجائز کیوں پوچھتا ہے؟ موت کی فکر لگی ہوئی ہے جبھی تو پوچھتا ہے، اگر اسے فکر نہ ہو کیا ضرورت تھی پوچھنے کی یہ کہنا کہ یہ معاملہ میں نے کیا ہے یہ حرام تو نہیں ہے؟ ناجائز تو نہیں ہے؟ کر بھی رہا ہے، مگر فکر چڑھی ہوئی ہے، اگر فکر نہ ہوتی سوال نہ کرتا، کوئی مؤمن ایسا نہیں ہے، جس کے اندر تھوڑا بہت آخرت کا فکر نہ ہو، اور جب فکر ہوتی ہے، تو کھانا بھی کم ہو جاتا ہے، عیش بھی کم ہو جاتی ہے، یہ کتنے ہی عیش میں مبتلا ہو، لیکن اسی درجہ کا غیر مسلم لیا جائے، وہ پانچ گنے عیش میں ہوگا، یہ ایک گنے عیش میں ہے، اس لئے کہ اس کے دل میں پھر بھی ایک فکر چڑھا ہوا ہے، کہ وقت آتا ہے، حساب دینا ہے، اسے اس کا کوئی فکر نہیں۔

فکرِ آخرت کو چمکانے کی ضرورت ...... تو فکر کا دہ اللہ نے رکھا، جو ہر مؤمن کے ایمان کے ساتھ دل میں لگا ہوا ہے مگر ذرا اسے اجاگر کرنے کی ضرورت ہے ایمان ہر ایک میں ہے، مگر عمل سے ذرا اسے چمکانے کی ضرورت ہے اسی طرح سے اس تفکر کو بھی چمکانے کی ضرورت ہے، فکر اس وقت تک چمکتا نہیں، جب تک خلوص نہ ہو، خلوص چلتا نہیں جب تک عمل کا جذبہ نہ ہو، عمل بنتا نہیں، جب تک علم نہ ہو، تو علم، عمل خلوص اور فکر ضروری ہے۔

اس واسطے یہ چند باتیں میں نے عرض کیں، کہ تعلیم میں بھی بہت کوتاہی ہو رہی ہے، تعلیم کی مردوں کو اور عورتوں کو بھی ضرورت ہے، اور اس کے ساتھ اپنے عمل اور اخلاص کی، اور فکر کی بھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: یہ چاروں چیزیں نہیں ہوں گی، تو ہلاکت ہی ہلاکت ہے، تباہی ہی تباہی ہے، نجات ان چار چیزوں میں ملے گی، تو فرمایا گیا،

---

① السنن للترمذی، ابواب الاطعمة، باب ماجاء ان المؤمن یاکل فی معی واحد، ج: ۱، ص: ۲۸۹۔ امام ترمذی فرماتے ہیں یہ روایت حسن صحیح ہے۔

لوگ تباہ و برباد ہیں بچیں گے علم والے، علم والے تباہ و برباد ہیں بچیں گے عمل والے، عمل والے تباہ و برباد ہیں، بچیں گے خلوص والے، خلوص والے تباہ و برباد ہیں بچیں گے فکر رکھنے والے، یعنی غفلت سے نجات نہیں ہوگی، ہلاکت ہوگی۔

اس واسطے یہ چند باتیں میں نے اس حدیث کی روشنی میں عرض کیں، امید ہے کہ آپ حضرات ان باتوں پر غور کریں گے اور وقتاً فوقتاً سوچیں گے دماغ میں یہ باتیں گھومیں گی تو اس کا فکر رکھیں گے کہ کس طرح سے اس حدیث پر ہم عمل کریں، کس طرح سے ہم اپنی انسانیت کو اجاگر کریں، تو سوچتے رہنا چاہئے اور فکر رکھنا چاہئے کہ ہم عمل کا کوئی نقشہ بنائیں، ایک آدمی ایک ہی نقشہ بنتا ہے، چار مل کر بناتے ہیں، تو ذرا نقشہ اچھا کھلا بڑا بن جائیگا اور قوم مل کر بنائیگی تو بڑا بہتر نقشہ بنے گا، سارے ہی عمل میں لگ جائیں گے، اس لئے بس اللہ سے دعا ہے کہ حق تعالیٰ ہمیں اور آپ کو مردوں اور عورتوں کو نیکی کی، عمل کی، خلوص و للّٰہیت کی اور فکر کی توفیق عطا فرماوے، دنیا میں بھی نجات عطا فرماوے، اور آخرت میں بھی نجات عطا فرماوے آمین۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا، اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِکَ يَآ اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ.

راہِ اعتدال

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةِ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ. ①

بزرگانِ محترم!...... پہلے اس آیت کا ترجمہ سمجھ لینا چاہئے "اللہ وہ ذات ہے جس نے اپنے بندے محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی کتاب یعنی قرآن مجید نازل فرمایا اس میں بعض آیات تو محکمات ہیں اور بعض متشابہات ہیں۔ پس جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کی اتباع کرتے ہیں گمراہی پھیلانے کے لئے یا ان کی تاویلیں کرنے کے لئے اور حالانکہ ان کی تاویلیں اللہ ہی جانتا ہے اور جو لوگ علم میں پختہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے تمام ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں اور نصیحت حاصل نہیں کرتے مگر عقل والے"۔

(پھر دعا کی تعلیم دی گئی) اے اللہ! ہمارے دلوں کو کجی سے بچا۔ بعد اس کے کہ تو نے ہمیں ہدایت نصیب فرمائی اور اپنی طرف سے رحمت عطاء فرما۔ بے شک تو بڑا بخشنے والا ہے۔ (دوسری دعا) اے اللہ! تو تمام لوگوں کو جمع کرنے والا ہے۔ ایک ایسے دن جس میں کوئی شک نہیں بے شک تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

شانِ نزول...... یہ تو آیات کا تقریباً لفظی ترجمہ ہوا۔ ان آیات میں ایک ایسا اصول بیان کیا گیا ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو دین محفوظ رہے گا۔ اس کا بیان کرنا میرا مقصد ہے۔ لیکن اس سے پہلے آیات کا شانِ نزول بھی سن لیں کیونکہ شانِ نزول سے آیات کے سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ نصاریٰ نجران کی ایک جماعت

① پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۷.

مدینہ منورہ میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مناظرہ کے لئے آئی۔ ان میں عبدالمسیح، ابوحارث، بن علقمہ تینوں موجود تھے۔ ان میں عبدالمسیح بڑا مدبر تھا اور ابوحارث بہت ذہین اور زکی تھا۔ اس کا حافظہ بہت قوی اور علم بہت وسیع تھا تورات و انجیل پر اس کی نظر تھی۔ تمام گرجاؤں کا لاٹ پادری اور اپنے مذہب کا قائد تھا۔

عقیدۂ نصاریٰ کی تردید...... ان کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں۔ اور اسی مسئلہ میں وہ مناظرہ کے لئے آئے تھے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ارشادات فرمائے۔ ان میں یہ بھی تھا کہ ''اللہ تعالیٰ حی یعنی خود زندہ ہے اور قیوم یعنی زندگی کو تھامنے والا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام پر فنا آئی اور اپنی زندگی کو وہ نہ سنبھال سکے وہ دوسرے کا الٰہ کیسے بن سکتا ہے؟'' نیز آپ ایک لامحدود زمانہ تک خود وجود میں نہ آئے اور الٰہ تو وہ ہونا چاہئے جو خود موجود ہو اور ہر زمانہ میں موجود ہو۔ یعنی ازل سے ابد تک۔ تو جو ایسا نہیں وہ خدا نہیں ہوسکتا۔

اور دوسری جگہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ ① یعنی حضرت عیسیٰ اور مریم علیہما السلام دونوں کھانا کھاتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کھانے پینے کے محتاج تھے اور جو کھانے پینے کا محتاج ہو وہ زمین کا بھی محتاج ہے کیونکہ غلہ اس سے پیدا ہوتا ہے اور سورج کا بھی محتاج ہے کیونکہ غلہ کی اصلاح اس سے ہوتی ہے۔ اس لئے عناصر اربعہ حتی کہ بیل اور چارہ وغیرہ نباتات کا بھی محتاج ہے اور حاجت مندی اور خدائی دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں ایک صفت ''صَمَد'' ہونا بھی ہے۔ جس کا معنی یہ ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہ ہو اور تمام کائنات اس کی محتاج ہو۔ جب عیسائیوں سے اس کا کوئی جواب نہ بن پڑا وہ آیات متشابہات میں چھڑ گئے اور کہنے لگے کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب میں ہی عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں موجود ہے۔ ﴿وَكَلِمَتُهُ﴾ و ﴿رُوحٌ مِّنْهُ﴾ اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے جز ہیں۔ (بہر حال وہ اصل بات کا جواب نہ دے سکے، پھر آیات متشابہات کے بارے میں کلام کرنے لگے)۔

آیات کی دو اقسام...... ایسی آیات کے بارے میں کچھ تفصیل اور وضاحت ضروری ہے جو اس طرح سے ہے کہ آیات کی دو قسمیں ہیں۔ محکم اور متشابہ۔ محکم وہ آیت ہے جو بیّن المراد ہوں اور اس کا معنی پوری طرح واضح ہو، خواہ لغۃً معنی ہی ایک ہو یا مختلف ہوں۔ تو دوسرے قواعد سے ایک کی تعیین ہو جاتی ہو۔

اور متشابہ وہ آیت ہے جس کی مراد واضح نہ ہو۔ مثلاً اس کے کئی معانی ہوں اور ایک کی تعیین نہ ہوسکتی ہو۔ یا ایک ہی معنی ہو، لیکن اس مقام پر صحیح نہ آتا ہو۔

اب یہاں ایک طریقہ تو اہلِ فتن کا ہے کہ محض اپنی رائے سے ایک معنی متعین کر لیتے ہیں۔ خواہ وہ محکمات کے خلاف ہو اور دوسرا طریقہ اہلِ حق کا ہے کہ متشابہات کا رجوع محکمات کی طرف کریں، جو معانی محکمات کے ہوں انہی پر متشابہات کو بھی محمول کریں۔ اس طریق پر دین میں کسی قسم کی تفریق پیدا نہیں ہوتی، اور اگر پہلے طریقے کو

① پارہ: ۲، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۷۵۔

اختیار کیا جائے تو چونکہ ہر شخص کی عقل ورائے مختلف ہے، اس لئے مذہب میں تفریق پیدا ہو جاتی ہے۔ عیسائیوں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ کیونکہ آیت ﴿وَرُوْحٌ مِّنْهُ﴾ سے بظاہر عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہنے کی گنجائش نکلتی ہے اور اس کو دوسری آیات پر محمول کیا جائے تو بیٹا نہ ہونے کی بھی گنجائش نکلتی ہے۔ اب صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کو آیات متشابہ کو آیت محکمات پر محمول کیا جائے اور آیت محکم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ﴾ ① یعنی عیسیٰ علیہ السلام تو ایک بندے ہیں جن پر ہم نے انعام کیا۔ اور بندہ ہونا الوہیت کے منافی ہے۔ اور دوسری جگہ فرماتے ہیں: ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ﴾ ② یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی مثال آدم علیہ السلام کی طرح ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا کیا اور پھر فرمایا کہ ہو جا پس ہو گئے۔ اس آیت میں عیسیٰ علیہ السلام کے مخلوق ہونے کی تصریح فرماتے ہیں اور مخلوق وابنہ میں منافات ہے۔

صفاتِ خداوندی کے بارے میں نصوصِ متشابہہ کا حکم...... جس طرح عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ آیت متشابہ ہے، ایسے ہی اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق بھی آیت متشابہات ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿يُرِيدُونَ وَجْهَهُ﴾ ③۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا بظاہر منہ ثابت ہوتا ہے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَن سَاقٍ﴾ ④ یہاں اللہ تعالیٰ کی پنڈلی ثابت ہوتی ہے۔ غرض انسان کے تمام اعضا ثابت ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ رحم اور امانت دونوں اللہ تعالیٰ کی کوکھ سے چپٹ گئے اور کہنے لگے کہ ''اے اللہ! جو ہم کو ملائے یعنی صلہ رحمی کرے تو اس کو ملا اور جو ہم کو قطع کرے تو بھی اس کو قطع کر''۔ اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا اور ایک حدیث میں ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو بہت اچھی صورت میں دیکھا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے سینے پر ہاتھ رکھا تو اس کی ٹھنڈک میرے دل کو محسوس ہوئی اور ایک حدیث میں ہے کہ تمام مخلوق کے قلوب اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان میں ہیں۔

اب ان نصوص کا ایک مطلب تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا جسم مان لیا جائے اور ایک صورت یہ تھی کہ ان کو آیاتِ متشابہات پر محمول کیا جائے۔ بعض تو یہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ ایک جسم ہیں۔ جیسے ہمارا جسم ہے۔ زیادہ سے زیادہ فرق یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کا جسم بہت بڑا ہوگا۔ یہ مجسمہ کہلائے۔ اور بعض نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ جسم کے مشابہ ہیں۔ یہ مشبہہ کہلائے اور ایک فرقہ کہنے لگا کہ الفاظ ہی بے معنی ہیں ان کا کوئی معنی مفہوم ہی نہیں۔ یہ معطلہ کہلائے۔

---

① پارہ: ۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۵۹۔

② پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۵۹۔

③ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۵۲۔

④ پارہ: ۲۹، سورۃ القلم، الآیۃ: ۴۲۔

اہل سنت والجماعت نے یہ عقیدہ رکھا کہ اللہ تعالیٰ کی یہ تمام صفات ثابت ہیں، لیکن ان کی کیفیات ہمیں معلوم نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ ① نیز ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ ② کی تفسیر میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "اَلْاِسْتِوَاءُ مَعْلُوْمٌ وَالْكَيْفُ مَجْهُوْلٌ وَالْاِيْمَانُ بِهٖ وَاجِبٌ وَالسُّؤَالُ عَنْهُ بِدْعَةٌ." ③ اور ان اعضاء کی طرح عوارضِ انسانیہ کا اثبات بھی اللہ تعالیٰ کے لئے نصوص میں ملتا ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر رات آسمانِ دنیا پر آتے ہیں اور کہتے ہیں: "اَنَا الرَّزَّاقُ فَهَلْ مَنْ يَسْتَرْزِقُنِيْ اَنَا الْمَلِكُ فَهَلْ مَنْ يَسْئَلُنِيْ اَنَا الْغَافِرُ فَهَلْ مَنْ يَسْتَغْفِرُنِيْ." ④

ایک اور حدیث میں ہے کہ: اللہ تعالیٰ کو تین جگہ ہنسی آتی ہے۔ ایک اس وقت جب کہ صفِ اول لینے کے لئے نمازی دوڑ رہے ہوتے ہیں۔ دوسرے اس وقت جب کہ پچھلی رات کو خاوند اٹھے اور اپنی بیوی کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور وہ بھی بیدار ہو کر نماز پڑھے۔ یا بیوی اٹھے، خاوند کے منہ پر چھینٹے مارے اور وہ اٹھ کر نماز پڑھے۔ تیسرے اس وقت جب کہ جہنم سے سب سے پیچھے جو شخص نکالا جائے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں تمنائیں ڈالیں گے۔ چنانچہ وہ کہے گا کہ اے اللہ! میرا چہرہ آگ سے پھیر دے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اگر چہرہ پھیر دیا جائے تو پھر تو کچھ نہیں مانگے گا؟ وہ کہے گا کہ کچھ نہیں مانگوں گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تیرا اعتبار نہیں، تو حلف اٹھا، کہ میں کچھ نہیں مانگوں گا۔ وہ قسم اٹھا کر کہے گا کہ میں کچھ نہیں مانگوں گا پھر اس کا چہرہ آگ سے پھیر دیا جائے گا۔ جب وہ جنت کی فضا کو دیکھے گا تو خیال کرے گا کہ میں تو ابھی تکلیف ہی میں ہوں اس لئے پھر تمنا کرے گا کہ اے اللہ! مجھے جہنم سے نکال دے۔

اللہ تعالیٰ فرمائیں گے "وَيْلَكَ يَا ابْنَ اٰدَمَ مَا اَغْدَرَكَ." (تیری بربادی ہو، بہت عہد شکن ہے؟) پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اور تو کچھ نہیں مانگے گا۔ تو وہ قسم اٹھا کر کہے گا کہ کچھ نہیں مانگوں گا۔ پس اس کو اللہ تعالیٰ جہنم سے نکال دیں گے اور گھٹنوں کے بل نکلتے ہوئے کہے گا کہ "تَبَارَكَ الَّذِيْ نَجَّانِيْ مِنْهَا." پھر جب نہرِ حیات کو دیکھے گا، پھر اپنے آپ کو تکلیف میں پائے گا تو پھر تمنا کرے گا کہ اے اللہ! مجھے اس نہر تک پہنچا دیا جائے، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے "وَيْلَكَ يَا ابْنَ اٰدَمَ مَا اَغْدَرَكَ." پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اگر وہاں پہنچا دیا جائے، پھر تو کچھ نہیں مانگے گا۔ وہ حلف اٹھا کر کہے گا کہ کچھ نہیں مانگوں گا۔ پس اس کو نہر تک پہنچا دیا جائے گا۔ وہ اس نہر میں نہائے گا تو سیاہ اور جلا ہوا جسم روشن چاند کی طرح ہو کر نکلے گا۔ اور وہ خیال کرے گا کہ جتنا انعام میرے اوپر

① پارہ: ۲۵، سورۃ شوریٰ، الآیۃ: ۱۱.

② پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۵.

③ نظم الدرر، ج: ۱ ص: ۲۹۲.

④ الصحیح للبخاری، کتاب الدعوات، باب الدعاء فی نصف اللیل، ص: ۳۸۹.

ہوا، وہ کسی پر بھی نہیں ہوا۔ پھر جب جنت کے دروازے دیکھے گا جن میں ہر ایک کی مسافت اتنی ہوگی جتنی مکہ مکرمہ اور عدن کے درمیان ہے، یہ سینکڑوں میلوں کا فاصلہ ہے اور ساتھ ہی جنت کی شفاف دیواروں سے اندر کی چیزیں دیکھے گا، تو پھر تمنا کرے گا کہ اے اللہ! مجھے جنت کے دروازے تک پہنچا دے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے۔ "وَيْلَكَ يَا ابْنَ آدَمَ مَا أَغْدَرَكَ." اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اگر تمہیں وہاں بھیج دیا جائے تو پھر تو کچھ نہیں مانگے گا۔ تو قسم اٹھا کر کہے گا کہ کچھ نہیں مانگوں گا۔ چنانچہ اس کو جنت کے دروازے کے قریب ہی پہنچا دیا جائے گا۔ پھر جب جنت کی نعمتوں کو دیکھے گا تو یہی خیال کرے گا، کہ میں تو تکلیف میں ہوں۔ تو پھر تمنا کرے گا کہ اے اللہ! مجھے جنت میں داخل کر دیجئے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ "وَيْلَكَ يَا ابْنَ آدَمَ مَا أَغْدَرَكَ." اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم کو ایک دنیا جتنا ملک جنت میں دیا گیا، وہ شخص جنت میں جگہ نہ پائے گا۔ تو پھر حاضر ہو کر کہے گا کہ جگہ تو کہیں بھی نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم کو دو دنیا جتنا ملک دیا۔ پھر واپس جائے گا، تو جگہ اور زیادہ تنگ ہو جائے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ کے پاس جائے گا تو وہی عرض کرے گا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ جاؤ تمہیں تین دنیا جتنا ملک دے دیا۔ وہ دیکھے گا تو جگہ بہت تنگ ہو چکی ہوگی۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ سے کہے گا "أَتَسْتَهْزِئُ بِي وَأَنْتَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ" آپ جل جلالہ تو میرے سے مزاح فرما رہے ہیں حالانکہ آپ رب العالمین ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ہنسی آئے گی اور فرمائیں گے کہ جا تمہیں دس دنیا جتنا ملک دے دیا۔ پھر جب واپس جائے گا تو اس کو اپنی جگہ نظر آئے گی۔ ① معلوم ہوا کہ جو شخص آخر کو جنت میں داخل کیا جائے گا اس کو دس دنیا جتنا ملک دیا جائے گا۔ اور حدیث سے اللہ تعالیٰ کا ہنسنا بھی معلوم ہوا۔ تو اہل سنت والجماعت کہتے ہیں کہ ایسی صفات تو ثابت ہیں اور کیفیت کا علم نہیں۔

انبیاء علیہم السلام کے بارے میں نصوصِ متشابہہ کا حکم...... اور جیسے متشابہ الفاظ کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی صفات پر کیا گیا، ایسے ہی بعض انبیاء کے متعلق بھی الفاظِ متشابہہ کا استعمال فرمایا گیا۔ تو ان میں طریق اعتدال یہ ہے کہ ایسی آیات کو محکمات پر محمول کیا جائے۔ ایسے ہی چونکہ نصوص میں تصریح ہے کہ انبیاء علیہم السلام صغائر اور کبائر سے منزہ ہوتے ہیں۔ اگر بعض انبیاء سے کوئی ایسا فعل صادر ہو جو بظاہر بہتر معلوم نہ ہوتا ہو تو وہاں بھی یہی کہا جائے گا کہ نبی جو کچھ کرتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی کرتا ہے۔ اگر عقل سے معانی متعین کئے گئے تو یہیں سے گمراہی شروع ہو جائے گی اور ایک نیا مذہب نکل آئے گا۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اختلاف کنندہ تو وہ ہیں جو اہل سنت والجماعت سے کٹ کر ایک فرقہ بنا لیتے ہیں اور جنگ کرنے والے بھی حقیقت میں اہل بدعت ہی ہوتے ہیں۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں الفاظِ متشابہہ کا حکم...... اور انبیاء علیہم السلام کی طرح ہی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا معاملہ ہے کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم خود غرضی اور بے دینی سے بمراحل دور تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ

بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ ① اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے راضی ہونے کا اعلان فرمادیا' جو قیامت تک کے لئے ہے۔

اور دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا. سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ﴾ ② پہلے تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے متعلق لفظ ''مَعَهٗ'' نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ ان کا سلسلہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے متصل ہے منقطع نہیں ہے اور ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ سے ان کے بغض فی اللہ کی تعریف فرمائی اور ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ سے ان کے حُب فی اللہ کا ذکر فرمایا۔ اور یہ صفات بغیر دین کامل ہوئے حاصل نہیں ہوسکتیں۔ اور پھر ﴿تَرٰهُمْ الخ﴾ میں اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ رکوع و سجود میں مشغول رہتے ہیں اور ہر وقت صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کی فکر میں لگے رہتے ہیں اور اسی پر بس نہیں بلکہ فرمایا کہ پہلی کتب میں بھی ان کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ گویا آدم علیہ السلام سے لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مقبول عند اللہ ہونے کی شہادتیں دی گئیں اور قرآن مجید میں بھی ان کے مقبول ہونے کی شہادتیں موجود ہیں جو قیامت تک باقی رہیں گی۔ پس اگر ان سے کوئی ایسی بات صادر ہو جو بظاہر نامناسب ہو، تو اللہ تعالیٰ کی رضا کے اعلان کو دیکھتے ہوئے مناسب تاویل کی جائے۔ مثلاً اگر بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے لفظ کذب استعمال کیا ہے تو یہ نہیں کہیں گے کہ ان کو جھوٹ بولنے کی عادت تھی اور نہ یہ کہ وہ ایک دوسرے پر چوٹیں کرتے تھے۔ بلکہ ان کے مناسب حال کذب کے معنی کی تعین کی جائے گی اور وہ خطاءِ اجتہادی سمجھی جائے گی، جس میں ان کو ایک نیکی ملے گی، مواخذہ پھر بھی نہیں ہوگا۔

اولیاء اللہ کے کلمات کے بارے میں مسلکِ حق ...... جیسا کہ حضرت منصور رحمہ اللہ علیہ نے ''اَنَا الْحَقُّ'' کہا تو صرف ان کلمات کو دیکھ کر ان کے حق ہونے میں گستاخی نہیں کی جائے گی۔ بلکہ ان کی تمام زندگی کو دیکھ کر ان کے مناسب ''اَنَا الْحَقُّ'' کا معنی بیان کیا جائے گا۔ دراصل یہ ہے کہ صوفیاء کرام کے نزدیک ایک درجہ فنائی اللہ کا ہوتا ہے حضرت منصور رحمۃ اللہ علیہ اس قدر فانی فی اللہ ہو چکے تھے کہ انا سے مراد ذاتِ متکلم نہیں بلکہ ذاتِ حق تھی۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد انا اور انت کا مصداق ایک ہو جاتا ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مقولہ ہے: مُلْكِيْ اَعْظَمُ مِنْ مُّلْكِ اللّٰهِ. (میرا ملک اللہ کے ملک سے بڑا ہے) واقعہ یوں ہے کہ ایک دفعہ آپ رحمۃ اللہ علیہ پر بے خودی کی کیفیت طاری ہوگئی، تو آپ کے منہ سے نکلا مُلْكِيْ اَعْظَمُ مِنْ مُّلْكِ اللّٰهِ. جب افاقہ ہوا تو مریدین نے عرض کیا کہ حضرت! آپ سے تو

---

① پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۰۰۔

② پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۲۹۔

آج کلمہ کفر صادر ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ پھر تم نے مجھے کیسے چھوڑ دیا؟

پھر دوسری دفعہ آپ پر ایسی ہی حالت طاری ہوئی، تو مریدین نے حضرت کو مارنا شروع کیا۔ لیکن معاملہ یہ تھا کہ مارتے پیر صاحب کو تھے اور لگتی ان کو خود تھی۔ چنانچہ وہ بے چارے بدحال ہو گئے۔ جب حضرت بایزید کو افاقہ ہوا تو انہوں نے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ مریدین نے عرض کی کہ آج بھی آپ سے وہی "کلمہ کفر" نکلا تھا، اس لئے ہم آپ کو مارنے لگے تو وہ ہمیں لگتی تھی۔ جس سے ہمارا یہ حال ہو گیا۔

حضرت بایزید نے فرمایا: بتاؤ وہ کلمہ کیا ہے؟ مریدین نے بتلا دیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ کلمہ تو عین ایمان ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ملک تو میں اور بقیہ ساری کائنات ہے۔ اور میرا ملک خود اللہ تعالیٰ ہے، جس میں میں ہر وقت سیر کرتا ہوں تو یقیناً میرا ملک اللہ تعالیٰ کے ملک سے بڑا ہے۔

اب یہاں بھی اہلِ زیغ کا طریقہ یہ ہے کہ اہل اللہ کی اس قدر تعریف کریں گے کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچا دیں گے اور یا قرآن و حدیث کے ظواہر پر نظر کرتے ہوئے اولیاء اللہ کی توہین کریں گے۔ اور ایک "اعتدال" ہے۔ وہ یہ کہ قواعدِ قرآن و حدیث بھی اپنی جگہ پر صحیح رہیں اور اولیاء اللہ کے کلام کا بھی ان کی زندگی کے مطابق معنی بیان کیا جائے اور یہ "طریق حق" مفرط اور مفرط کو نصیب نہیں ہوتا۔ بلکہ اعتدال پسند آدمی کو نصیب ہوتا ہے۔

حضرت نظامی رحمہ اللہ تعالیٰ کا عجیب واقعہ...... اس پر ایک واقعہ مولانا فخر الدین نظامی رحمۃ اللہ علیہ کا یاد آیا، جو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا۔ حضرت نظامی رحمۃ اللہ علیہ، بہت بڑے مرتبہ کے بزرگ تھے، چودہ برس کی عمر میں ہی اصلاح کا کام شروع کر دیا تھا۔ بہت خوبصورت تھے، جب آپ مسجد میں تشریف لاتے تو لوگ دیکھنے کے لئے سڑک کے کنارے پر جمع ہو جاتے۔ تو آپ جس کی طرف دیکھتے" وہ بے ہوش ہو کر گر پڑتا۔ آپ فرماتے کہ اور گھور کر دیکھو۔

وہ واقعہ یوں ہے کہ آپ کے ایک مرید نے عرض کی کہ اللہ تعالیٰ کی زیارت کی تمنا ہے اس کے لئے کوئی وظیفہ بتا دیجئے جس سے اللہ تعالیٰ کی زیارت ہو جائے۔ آپ نے فرمایا کہ نمازِ فرض ترک کر دو۔ مرید کو بہت تعجب ہوا کہ نمازِ فرض کیسے ترک کر دوں؟ تین دن کے بعد حاضر ہوئے اور پوچھا کہ حضرت! اللہ کے دیدار کی تمنا ہے، کوئی وظیفہ بتا دیں۔ حضرت نے فرمایا کہ تمہیں وظیفہ تو بتلا دیا کہ فرض نماز چھوڑ دو۔ وہ پھر بھی واپس چلا گیا۔ دو تین دن کے بعد حاضر ہوا، اور وہی عرض کی، تو آپ نے پھر وہی جواب دیا۔ آخر وہ مرید چلے گئے۔ فرض چھوڑنے کی تو ہمت نہ ہوئی۔ لیکن سنتیں چھوڑ کر سو گئے خواب میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی، آپ نے فرمایا کہ۔" اللہ کے بندے ہم نے کیا قصور کیا کہ ہماری سنتیں چھوڑ دیں"۔

اسی وقت جلدی اٹھے، وضو کر کے توبہ کی اور سنتیں ادا کیں۔ صبح کو یہ واقعہ حضرت نظامی رحمۃ اللہ علیہ کو سنایا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر فرض چھوڑتے تو اللہ تعالیٰ خود تشریف لاتے اور فرماتے کہ فرض کیوں چھوڑتے ہو؟

یہاں بھی دو راستے نکلتے ہیں۔ایک یہ کہ اولیاء اللہ کی ہر بات کو قرآن و حدیث سے قطع نظر کرتے ہوئے عینٗ و عنٗ تسلیم کر لیا جائے۔اور ایک یہ کہ قرآن مجید کے قواعد اپنی جگہ صحیح رہیں اور اولیاء اللہ کے کلام کے بھی مناسب معانی بیان کئے جائیں۔

اہل اللہ کی دو اقسام...... حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے والوں کی دو قسمیں ہیں۔ایک وہ جو ریاضت و مجاہدات سے اللہ تعالیٰ تک پہنچتے ہیں۔اور ایک وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ خود ہی چن لیتے ہیں اور ان کی تربیت کرتے ہیں۔تو جو مجاہدات سے اللہ تک پہنچیں ان کو صوفیاء کی اصطلاح میں مرید کہتے ہیں۔اور جن کو اللہ تعالیٰ خود چن لیں ان کو مراد کہتے ہیں۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک شخص تو اپنی دیانت،خلوص اور خدمت کی بناء پر اتنی ترقی کرے کہ بادشاہ اس کو اپنا نائب بنا دے۔اور ایک وہ لڑکا ہے جس کو بادشاہ خود چن لے اور اس کے لئے مربی مقرر کر دے جو اس کی تربیت کریں۔اگر وہ نہ پڑھے تو اسے زبردستی پڑھائیں۔زبردستی اس کی تعلیم و تربیت ہو۔

حدیث شریف میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے ان لوگوں پر تعجب آتا ہے جو جنت میں جانا نہیں چاہتے۔لیکن ان کو زنجیر سے باندھ کر لایا جاتا ہے کہ انہیں جنت میں جانا پڑے گا۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ﴿اَللّٰهُ يَجْتَبِىٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِىٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ﴾ ①
"یعنی اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں خود بخود اپنی طرف چن لیتے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں ان کو راستہ بتا دیتے ہیں"۔پس قرآن مجید کی اصطلاح میں جن کو اللہ تعالیٰ خود چن لیں اور ان کو مجتبے اور جو مجاہدات سے واصل ہوں ان کو منیب کہتے ہیں۔حضرت حاجی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ شخص (حضرت نظامی کے مرید باصفا) مرید نہیں تھے بلکہ مراد تھے۔اگر یہ نماز نہ پڑھتے تو اللہ تعالیٰ خود آ کر پڑھواتے۔اور حضرت نظامی رحمۃ اللہ علیہ کو معلوم تھا کہ ان کی نماز چھوٹ نہیں سکتی۔

اہلِ استقامت کا حال...... پس اللہ کی تعظیم کی بناء پر قرآن میں تاویل بھی گمراہی ہے اور قرآن مجید کے ظاہر قواعد پر نظر کرتے ہوئے اولیاء اللہ پر تنقید کرنا بھی گمراہی ہے۔اور ایسے لوگوں کی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے علم کے گھمنڈ میں رہتے ہیں اور جن کو اپنے علم پر غرور اور فخر نہیں ہوتا وہ کسی بات کو اگر نقل بھی کرتے ہیں تو موجد ہونے کی حیثیت سے نہیں،بلکہ متبع ہونے کی حیثیت سے نقل کرتے ہیں۔

اس پر حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ایک واقعہ یاد آیا۔وہ یہ کہ ایک دفعہ آپ بہت خوش معلوم ہو رہے تھے۔تو حاضرین نے کہا کہ حضرت آج بہت خوش معلوم ہو رہے ہیں۔اس کی کیا وجہ ہے۔آپ نے فرمایا کہ بتیس سال سے دل میں ایک رائے تھی۔اس کو ظاہر کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔کیونکہ متقدمین سے کسی کا قول نہیں ملتا تھا اور آج

① پارہ:۲۵ سورۃ الشوریٰ،الآیۃ:۱۳۔

ایک تابعی کا قول نظر آیا۔ جس سے اس رائے کی تائید ہوئی، اس وجہ سے خوشی ہوئی۔ اہل استقامت کا یہی حال ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک ہاتھ کتاب اللہ میں ڈال رکھا ہے اور ایک ہاتھ بزرگوں کے دامن میں۔ اور یہ چیز جب نصیب ہوتی ہے جب انسان عارفین سے وابستہ ہو۔ آج دنیا میں ایک طبقہ ہے جس نے قرآن کو پس پشت ڈال دیا ہے اور اولیاء کرام کی اتنی تعظیم کی کہ ان کی ہر بات کو مذہب بنا دیا۔ اگر ایک بزرگ نے سماع کیا جوان کی ایک خصوصی حالت تھی۔ تو اس کو بھی شریعت میں داخل کر دیا گیا۔

یہود اس لئے تباہ ہوئے کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام کو چھوڑا۔ حتیٰ کہ ان کی توہین بھی کی اور بعض کو قتل بھی کیا اور صرف کتابوں کو ہاتھوں میں رکھا اور جو مطلب اپنی خواہش کے مطابق ہوا، وہ لے لیا۔ اس سے ان میں غرور پیدا ہوا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاِنْ یَّرَوْا کُلَّ اٰیَةٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِهَا وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الرُّشْدِ لَا یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الْغَیِّ یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَکَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِیْنَ﴾ ① ”میں پھیروں گا اپنی آیتوں سے ان کو جو تکبر کرتے ہیں زمین میں ناحق اور اگر دیکھ لیں ساری نشانیاں تو ایمان نہ لائیں ان پر اور اگر ہدایت کا راستہ دیکھیں اس کو راہ نہ ٹھہرائیں اور اگر راستہ گمراہی کا دیکھیں تو اس کو راہ ٹھہرائیں۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور ان سے بے خبر رہے“۔

اس غرور کی اصلاح جب ہو سکتی ہے جب اہل اللہ کی صحبت اختیار کی جائے۔ اور نصاریٰ اس لئے گمراہ ہوئے کہ انہوں نے کتاب اللہ کو کلیتہً چھوڑ دیا اور انبیاء علیہم السلام کو حتیٰ کہ احبار و رہبان کو بھی معبود بنا لیا۔ یہ افراط و تفریط گمراہی کی طرف لے جاتی ہے۔ اس لئے اصل اعتدال یہ ہے کہ قرآن و حدیث کو بھی چھوڑا نہ جائے اور اہل اللہ کا دامن بھی ہاتھ میں رہے۔

محض حروفِ قرآن کافی نہیں..... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”تَرَکْتُ فِیْکُمْ اَمْرَیْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَاتَمَسَّکْتُمْ بِهِمَا کِتَابَ اللّٰهِ وَ سُنَّتِیْ.“ ② ”میں نے تمہارے پاس دو چیزیں چھوڑی ہیں جب تک ان کو مضبوطی سے تھامے رہو گے۔ گمراہ نہیں ہو گے ایک اللہ کی کتاب۔ اور دوسری اپنی سنت (طریق عمل)“۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ ③ ”البتہ تحقیق تمہارے لئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں عمدہ نمونہ ہے“۔ اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اللہ کے حروف کافی نہیں، بلکہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی بھی ضرورت ہے۔ تقویٰ کی کیفیت قلوب سے قلوب کی طرف آتی ہے، کاغذات

① پارہ: ۹، سورة الاعراف، الآیة: ۱۴۶.

② الموطا لمالک، کتاب الجامع، باب النهی عن القول بالقدر، ص: ۳۷۱

③ پارہ: ۲۱، سورة الاحزاب، الآیة: ۲۱.

سے نہیں آتی۔

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر پوری طرح مٹی بھی نہیں ڈالی تھی کہ ہم نے اپنے دلوں کو ''منکر'' (یعنی اوپرا) پایا۔ حالانکہ علم اور کتاب اللہ موجود تھی۔ اگر نہیں تھا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود موجود نہیں تھا۔ اس لئے کتاب اللہ کے ساتھ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی ضرورت ہے، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ.'' ① ''جس طرح میں نماز پڑھتا ہوں اسی طرح تم بھی نماز پڑھو''

کیونکہ عمل کا نقشہ آپ ہی کو معلوم تھا۔ حالانکہ صلوٰۃ کا لغوی معنی صرف دعا ہے۔ اور یہ معنی صحابہ بھی جانتے تھے۔ لیکن یہ معنی اللہ تعالیٰ کے مطلوب نہیں تھے۔ ایسے آپ نے وضو کر کے دکھایا۔ چنانچہ ایک ایک دفعہ اعضاء کو دھویا اور فرمایا کہ یہ وضو ایسا ہے کہ اس کے بغیر اللہ تعالیٰ نماز قبول نہیں فرماتے۔ اور پھر اعضاء کو دو دو دفعہ دھویا اور فرمایا کہ جو شخص ایسا وضو کرے گا، اس کو دو اجر ملیں گے، پھر اعضاء کو تین تین دفعہ دھویا اور فرمایا کہ یہ میرا وضو ہے اور مجھ سے پہلے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا وضو ہے۔

ایسے ہی حج کا حکم دیا تو حج کر کے دکھلایا۔ معاشرت کی تعلیم دی تو وہ کر کے دکھلائی۔ حالانکہ ان کے لغوی معانی سب کو معلوم تھے لیکن وہ معانی شرعاً مطلوب نہیں تھے۔ لہٰذا شخصیتوں کو چھوڑ کر صرف لٹریچر پر کفایت کرنے سے دین نہیں سیکھا جا سکتا۔

عقل محض سے دین فہمی کا انجام ...... کیونکہ ہر شخص کی عقل مختلف ہے اور عقل کے مطابق ہی عمل کیا جائے۔ تو دین میں تفریق پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا لٹریچر اور بزرگوں سے وابستگی دونوں چیزوں کی ضرورت ہے۔ یہی اعتدال کا راستہ ہے اور یہی اہل سنت والجماعت کا طریقہ ہے اور جو لوگ شخصیتوں کو تنقید سے بالاتر نہیں سمجھیں گے۔ وہ عمل صحیح سے محروم رہیں گے اور جو عمل کرتے بھی ہیں تو بھی انہیں شخصیتوں سے لیا گیا ہے۔

میں نے مشکوٰۃ شریف حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی۔ ایک طرف تو آپ احادیث کا ترجمہ کراتے تھے اور دوسرے آپ رکوع اور سجدہ کر کے کیفیت بھی بتلا دیتے تھے۔ میں نے عرض کی حضرت! اس کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو مجھے معلوم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس لئے تو معلوم ہے کہ کرنے والوں کو دیکھا ہے۔ پھر فرمایا کہ میں نے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے مشکوٰۃ شریف پڑھی تو آپ نے بھی رکوع اور سجدہ کی کیفیت عمل کے ساتھ بتلائی۔ میں نے عرض کی حضرت اس کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو مجھے معلوم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اسی وجہ سے تو معلوم ہے کہ کرنے والوں کو دیکھا ہے اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے مشکوٰۃ شریف حضرت شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی۔ انہوں نے بھی اسی ہیئت سے رکوع اور سجدہ بتایا۔ میں نے عرض کی

حضرت یہ تو مجھے معلوم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس لئے تو معلوم ہے کہ کرنے والوں کو دیکھا ہے۔ ایسے ہی شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ نے شاہ محمد اسحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے انہوں نے شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے شیخ ابو طاہر مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے اور ان سے اسی ہیئت کی سند رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے۔

مشکوٰۃ شریف میں ایک حدیث ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں رواج تھا کہ اگر کوئی مر جاتا تو چھ مہینے تک رونے کی وصیت کرتے اور رونے والی عورتیں نہ ہوتیں تو کرایہ پر رونے والی جاتیں، جو چھ مہینے تک روتیں تاکہ لوگ یہ خیال کریں کہ مرنے والا بہت بڑا آدمی ہے جس پر چھ ماہ تک ماتم ہوتا رہا۔ جب میں نے یہ حدیث پڑھی تو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے رونے کی ہیئت بنا کر مجھے بتایا پھر فرمایا کہ شاید تمہارے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ لیکن حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی ہیئت بتلائی تھی۔ اور فرمایا تھا کہ شاید تم کو یہ خیال ہو کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے ایسے ہی ہیئت بتلائی تھی، یہاں تک کہ یہ سلسلہ ایسے ہی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما تک پہنچتا ہے۔

دین فہمی کے لئے اشخاص بھی ضروری ہیں..... حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ کی سند بہت بلند تھی۔ ایک دفعہ سہارن پور کے سفر میں آپ کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا تو آپ نے فرمایا: کہ چونکہ میری سند عالی ہے، اس لئے تم مجھ سے اجازت حدیث لے لو، لیکن شرط یہ ہے کہ سہارن پور آنا پڑے گا۔ میں نے عرض کی بہت اچھا، لیکن اتفاق سے میں وہاں نہ جاسکا اور ایک سال گزر گیا۔ پھر میں نے وعدہ کیا، لیکن کچھ عرصہ گزر گیا اور میں نہ جاسکا۔ آخر آپ نے مدینہ منورہ کو ہجرت کر جانے کا ارادہ فرمایا تو میں یہ سن کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے فرمایا: کہ تم کو وقت پر خیال آیا دو تین سفر ابھی باقی تھے۔ پھر آپ نے حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مرحوم کو فرمایا کہ حدیث کی تمام کتابیں لے آؤ۔ وہ تمام کتابیں لے آئے۔ بعض کا اول آخر پڑھا اور بعض کا اول آخر مجھ سے پڑھایا اور فرمایا: کہ میں تم کو بھی اس عمل کی اجازت دیتا ہوں۔ اسی طرح دین کا سمجھنا اشخاص پر موقوف ہے، ورنہ عبارت سے بعض اوقات صرف ترجمہ بھی سمجھ نہیں آتا۔ مثلاً ''کیا بات ہے'' ایک جملہ ہے اس کو اگر ایک خاص لہجہ سے ادا کیا جائے تو یہ استفہام کے معنی میں ہوتا ہے۔ اور تفخیم شان، تحقیر شان اور تعجب کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن معنی مراد کی سمجھ الفاظ سے نہیں آتی۔ بلکہ لب ولہجہ سے آتی ہے۔ اسی طرح لٹریچر کے ساتھ عمل کی ہیئت کی بھی ضرورت ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب آیات ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ ① نازل ہوئی تو حضرت عدی ابن حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک سیاہ دھاگہ اور ایک سفید دھاگہ اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیا۔ صبح تک

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۷۔

کھاتے پیتے رہتے اور دونوں دھاگوں کو بھی دیکھتے رہتے۔ جب کافی روشنی ہوئی اور دونوں دھاگے ممتاز ہونے لگتے تو آپ کھانا پینا بند کر دیتے۔

جب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اِنَّ وِسَادَکَ لَعَرِیْضٌ'' ① ''یعنی تمہارا تکیہ بہت چوڑا ہے جس کے نیچے صبح صادق اور صبح کاذب دونوں آ گئیں''۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا کہ سیاہ دھاگے سے مراد صبح کاذب اور سفید دھاگے سے مراد صبح صادق ہے۔

اب حضرت عدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہی معنی سمجھا جو لغوی تھا۔ لیکن شرعاً وہ معنی مطلوب نہ تھا اور وہ معنی اللہ تعالیٰ کی مراد تھی۔ ایسے ہی قرآن مجید میں نماز کا حکم ہے، اس کا لغوی معنی دعا ہے۔ حالانکہ یہ معنی اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں۔ حج کا معنی قصد کرنا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں۔ پس جیسے قرآن مجید کا ماننا ضروری ہے۔ ایسے ہی ان کو تنقید سے منزہ سمجھنا ضروری ہے، جن کے واسطے سے قرآن مجید ہم تک پہنچا ہے اور جن کے تقویٰ کی شہادت خود اللہ تعالیٰ نے دی۔ ان سے راضی ہونے کا اعلان بھی فرمایا۔ اور جن کے متعلق فرمایا کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں اور ملامت کرنے والوں کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس ایک آدمی آیا۔ جو قدریہ خیال کا تھا۔ تو آپ نے اس کو سلام کا جواب نہ دیا۔ اور فرمایا کہ تو نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ مطلب کے خلاف کہا ہے۔ ایسے ہی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے بیٹے کے سامنے ایک حدیث بیان کی کہ عورتوں کو مسجد میں جانے سے نہ روکو تو آپ کے بیٹے نے کہا چونکہ یہ فتنہ کا زمانہ ہے۔ اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے ہم ضرور عورتوں کو مسجد میں جانے سے منع کریں گے۔ واقع میں یہ بات صحیح تھی، لیکن چونکہ یہ حدیث کا مقابلہ تھا۔ اس لئے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں تم سے حدیث بیان کرتا ہوں اور تم اپنی رائے پیش کرتے ہو۔ چلے جاؤ۔ میں ساری عمر تمہارا منہ نہ دیکھوں گا ② چنانچہ بہت سفارشیں کرائیں، لیکن ساری عمر اپنے لڑکے کا منہ نہیں دیکھا اور ان حضرات کا آپس میں اگر کوئی جھگڑا ہو جائے تو اس میں اتنی خیر ہوتی تھی کہ ہماری صلح میں بھی نہیں ہوتی۔

لوگوں کی دو اقسام..... غرض آیات کی دو قسمیں بیان کی گئیں۔ اور لوگوں کی بھی دو قسمیں بیان کی گئیں۔ فرمایا گیا کہ جن کے قلوب میں کجی ہوتی ہے وہ متشابہات کی عقل سے رکیک تاویلیں کرتے ہیں۔ پس ان معانی کی تعیین میں سلف صالحین کی اتباع ضروری ہے اور ان کو تنقید سے بالاتر سمجھنا بھی ضروری ہے۔ تعجب ہے کہ لوگ صحابہ کو مقتدا بھی مانتے ہیں پھر ان پر تنقید کیسے کرتے ہیں یہ دونوں چیزیں جمع نہیں ہو سکتی۔

① الصحیح للبخاری، کتاب التفسیر باب قولہ تعالیٰ کلوا واشربوا ... ص: ۱۵۱۴.

② الصحیح لمسلم، کتاب الصلوٰۃ باب خروج النساء الی المساجد، ج: ۲، ص: ۴۲۰.

اس پر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ یاد آیا۔ وہ یہ کہ حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ نے ایک کتاب لکھ کر مولانا قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو نقل کرنے کے لئے دی۔ اس میں ایک جگہ کتابت کی غلطی تھی۔ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بوجہ غایت ادب نہ تصحیح کرتے ہیں نہ ہی اس کو اس طرح غلط لکھنے کی جرأت ہوئی جب تحریر ختم ہوئی، حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ حضرت! اس لفظ کی سمجھ نہیں آئی۔ تو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ عین کی بجائے ہمزہ لکھ دو۔ پھر آپ نے تصحیح فرمائی۔

بہر حال ان اقسام کے بیان کے بعد زیغ سے بچنے کی دعا کی تعلیم ہے۔ اے اللہ! ہمارے دلوں کو کجی سے بچا اور کجی سے بچنا چونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت پر موقوف ہے۔ اس لئے طلب رحمت کی دعا بھی تعلیم فرمائی اور جب ہدایت نصیب ہو جائے تو اس کا تھامنا اور سنبھال کر رکھنا مشکل ہے۔ اس لئے موت کا استحضار ضروری ہوا، اس کے خوف سے ہدایت کو دانتوں میں مضبوط پکڑا جائے۔ اور یہ چیز تربیت سے، اصلاح سے آتی ہے، جو بزرگوں کی صحبت میں ہوتی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ بیٹا بن کر سب نے کھایا، باپ بن کر کسی نے نہیں کھایا۔ اس لئے انکساری اور بزرگوں کی خدمت ضروری ہے۔

حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تواضع کی یہ حالت ہے کہ قیامت کے دن کہیں گے "مَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ." اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اَللّٰھُمَّ لَآ اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَآ اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ." ①

آدم علیہ السلام سے ایک اجتہادی خطاء ہوئی تھی۔ اس پر بھی انہوں نے عاجزی اور زاری کی اور فرمایا: ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ ② اور ابلیس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی بھی کی اور بجائے معافی مانگنے کے تکبر کیا۔ اس کا علاج سوائے اہل اللہ سے تعلق کے مشکل ہے۔

قال را بگذار، مرد حال شو ۔۔۔ پیش مردے کاملے پامال شو

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تواضع اس وقت تک کامل نہیں ہوتی جب تک انسان یہ خیال نہ کرے کہ میں نصرانی کے کتے سے بھی بدتر ہوں۔

حدیث شریف میں ہے کہ بندہ جب دعوے سے کہتا ہے کہ میں نے عبادت کی، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قوت تو میں نے ہی دی تھی، اعضاء تو میں نے دیئے تھے، پھر تو نے کیا کیا؟ اگر بندہ تواضع اختیار کرے اور کہے کہ اے اللہ! سب کچھ تیری رحمت سے ہوا، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اولاً حرکت تو تو نے ہی کی تھی، ارادہ تو نے ہی کیا

① الصحیح لمسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب مایقول فی الرکوع، ج: ۳، ص: ۳۰۶.

② پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۲۳.

تھا، جل کر تو تو ہی آیا۔ گویا اس کو بلند فرماتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ: "لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ." ① "یعنی جس کے دل میں ایک ذرہ بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا"۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

پستی سے سر بلند ہو اور سرکشی سے پست　　　　اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں

بارش، پتھر اور مٹی دونوں پر برابر پڑتی ہے۔ لیکن پتھر کو اس سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اور مٹی سے قسم قسم کی اشیاء پیدا ہوتی ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیات کی قسمیں بیان کیں اور لوگوں کی اقسام بھی بیان کیں اور ایمان کی حفاظت کا طریق بھی بتا دیا۔ اب میں ختم کرتا ہوں، وقت بھی کافی ہو گیا۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا، إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.

① الصحيح لمسلم، كتاب الايمان، باب تحريم الكبر وبيانه ج: ۱ ص: ۲۴۷.

مقصدِ حیات

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ①

تمہید...... بزرگانِ محترم! دنیا میں انسان جب بھی کوئی حرکت کرتا ہے تو اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ کسی دانش مند اور عقلمند انسان کی حرکت بلا مقصد نہیں ہوتی۔ آپ جب مسجد کی طرف آنے کے لئے حرکت کرتے ہیں تو نماز مقصد ہوتی ہے۔ اس کے لئے آپ اپنا گھر چھوڑتے ہیں اور محنت مشقت اٹھا کر مسجد میں آتے ہیں۔ ایک طالب علم اسکول، مکتب یا مدرسہ کی طرف جاتا ہے تو محض حرکت مقصود نہیں ہوتی، بلکہ حرکت سے تعلیم مقصود ہوتی ہے، اسے پڑھنا اور علم حاصل کرنا ہے۔ اس لئے وہاں جاتا ہے۔ ایک شخص اگر اپنے شیخ کے پاس خانقاہ کی طرف جاتا ہے، تو اس حرکت کا مقصد اخلاقی تربیت ہوتی ہے کہ میرے نفس کی اصلاح ہو جائے۔ محض حرکت مقصود نہیں ہوتی۔ آپ ریل سے سفر کر کے کسی جگہ کے لئے حرکت کریں تو کوئی نہ کوئی اسٹیشن ضرور ہوگا جہاں آپ کو اترنا ہوگا جو آپ کی منزل مقصود ہوگی۔ بلا مقصد کے حرکت دیوانوں اور مجنون آدمی کا کام ہے۔ دانش مند جب بھی کوئی حرکت کرے گا، اس کا کوئی مقصد ضرور ہوگا۔ اور وہ مقصد اس کے عقلمند ہونے پر دلالت ہوگی ورنہ اس کو بے وقوف کہیں گے۔ غرض یہ عقلی اور حسی قاعدہ ہے کہ کوئی حرکت مقصود نہیں ہوتی۔ حرکت سے وہ منزل مقصود ہوتی ہے جس کی طرف آدمی جاتا ہے۔

سفرِ انسانی کی ابتداء و انتہاء...... اس اصول کے پیشِ نظر آپ غور کریں تو زندگی بھی ایک حرکت ہے ایک طرف سے آپ چلے ہیں اور ایک طرف جا رہے ہیں۔ اور یہ کوئی چھوٹی موٹی حرکت نہیں کہ دس بیس میل کا سفر

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ البینۃ، الآیۃ: ۸.

کرلیا، بلکہ ایک لامحدود حرکت ہے جو دور تک جانے والی ہے اور بہت پہلے سے ہوئی ہے۔

آپ تو یہ سمجھے ہوئے ہوں گے کہ جب ہم ماں کے پیٹ سے نکلے تو حرکت شروع ہوئی۔نہیں ایسا نہیں بلکہ ماں کا پیٹ تو ایک اسٹیشن ہے۔حرکت اوپر سے آرہی ہے۔اس جگہ جو انسان کی حرکت ہوتی ہے۔یہ ''عالم اَلَسْتُ '' سے چلی ہے جس کو قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا اور احادیث نے اس کی تفسیر بیان کی تفصیل اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو ان کی کمر پر داہنا ہاتھ مارا، جیسا ہاتھ اللہ تعالیٰ کی شان کے مناسب اور اس کی جناب کے لائق ہے۔ہم جیسا ہاتھ تو نہیں ہے۔ہمارا ہاتھ تو جسمانی ہے اور وہ جسم سے پاک ہے۔تو جیسا ہاتھ اس کی جناب کے لائق اور شان کے مناسب ہے ویسا ہی ہاتھ مراد لینا چاہئے۔تو داہنا ہاتھ مارا تو آدم علیہ السلام کی کمر سے ساری وہ اولاد نکل پڑی جو جنتی ہونے والی تھی اور قیامت تک آنے والی تھی۔اس کے بعد بایاں ہاتھ مارا تو ساری وہ اولاد نکل پڑی جو جہنمی ہونے والی تھی۔تو نیک اور بد سارے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکل آئے۔اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک وادی میں جمع کیا، اربوں، کھربوں انسان جو قیامت تک آنے والے تھے کا ایک مجمع تھا۔کوئی صف بندی نہیں تھی کہ ترتیب ہو۔بلکہ کسی کا منہ کسی کی طرف کسی کی پشت کسی کی طرف اور کسی کا مونڈھا کسی کی طرف، ایسے ہجوم میں ہوتا ہے۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے جن کے منہ آمنے سامنے تھے ان میں تو محبت قائم ہوگئی اور جن کی پشتیں ملی ہوئی تھی ان میں عداوت قائم ہوگئی اور جن کے پہلو ملے ہوئے تھے ان میں کچھ محبت اور کچھ عداوت۔یہی وجہ ہے کہ ایک انسان مشرق کا اور ایک مغرب کا، ایک ایشیاء کا اور ایک افریقہ کا، کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔لیکن جب جمع ہوتے ہیں تو ان میں دیرینہ محبت معلوم ہوتی ہے۔حالانکہ پہلے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

یہ وہی عالم الست کا اثر ہے۔تو فرمایا گیا: ''اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُجَنَّدَةٌ'' ① روحیں جمع کر دیں گئیں وہی آپس میں محبتیں اور عداوتیں قائم ہو گئیں، جو دنیا میں آ کر ظاہر ہوئیں۔

آپ دیکھتے ہیں کہ ایک ماں کے پیٹ میں دو بچے پاؤں پھیلاتے ہیں۔دونوں حقیقی بھائی ہیں۔لیکن آپس میں عداوت، کشمکش اور کسی وجہ سے مناسبت نہیں وہ اس سے لڑتا ہے اور یہ اس سے لڑتا ہے۔اور دو اجنبی اس طرح ملتے ہیں جیسے حقیقی بھائی ہیں۔یہ ازل سے ہی کسی میں محبت اور کسی میں عدوات ڈال دی گئی۔اس طرح سے یہ روحیں وہاں جمع کی گئیں۔

یہ بھی حدیث میں فرمایا گیا کہ وہاں جوڑیاں بھی قائم کردی گئیں۔جس کا جس سے نکاح ہونے والا تھا، وہ عورت اس کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔گویا وہیں تقرر کردیا گیا کہ یہ زوج اور زوجہ بنیں گے۔تو اس طرح سے لوگوں کی جوڑیاں بنا کر کھڑے کر دیے گئے۔ان سب کو حق تعالیٰ نے مخاطب فرمایا اور بلا واسطہ حق تعالیٰ نے ان

① الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب الارواح جنود مجندۃ، ج: ۱۱، ص: ۱۱۷۔

سب سے کلام فرمایا اور سب کو اپنا جمال دکھلایا۔ جس سے ہر ایک کے دل میں اپنے مالک کی محبت قائم ہوگئی۔ اور یہ فرمایا کہ: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ ① ”کیا میں تمہارا پروردگار نہیں؟“۔

حدیث میں ہے کہ: سب انسان ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے کہ اس کا کیا جواب دیں، سب سے پہلے جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بَلٰی۔ ”بے شک آپ ہمارے رب ہیں“۔

آپ کا فرمانا تھا کہ سارے انبیاء علیہم السلام کی زبان سے یہ کلمہ نکلا بَلٰی' بَلٰی بے شک آپ ہمارے رب ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے بول سے سب انسانوں کے دل میں ڈال دیا گیا۔ اور تمام انسان بولے کہ بَلٰی، بَلٰی، بَلٰی بے شک آپ ہمارے پروردگار ہیں۔ گویا سب سے پہلے معلم جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے سب انبیاء علیہم السلام بولے اور انبیاء علیہم السلام کے بولنے سے تمام انسانوں تک یہ تعلیم پہنچ گئی۔

تو سب نے اللہ کے مالک ہونے اور رب ہونے کا اقرار کیا اور اس کی ربوبیت کو مانا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ: اس عہد کو یاد رکھنا دنیا میں جب جاؤ گے تو اس عہد کو بھولنا نہیں ہم انبیاء علیہم السلام کو بھیجیں گے، جو آکر تمہیں یاد بھی دلائیں گے۔ پھر اپنی زندگی صحیح کر کے کل کو ہمارے سامنے آنا اور عہد کو دل میں رکھ کر لانا۔ یہ مت کہنا کہ ہمیں تو کسی نے کچھ بتلایا ہی نہیں تھا، ہم کو کسی نے تعلیم ہی نہیں دی تھی۔ ﴿اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ﴾ ② ”قیامت کے دن یہ کہنے کا موقع نہیں ہوگا کہ ہم تو غافل تھے۔ نہ کسی کو رب جانتے تھے نہ کسی کو مالک وخالق۔ ہمیں یہ کسی نے بتلایا ہی نہیں تھا“۔

تو فرمایا کہ: ہم اپنا ”رب ہونا“ بتلا رہے ہیں۔ اور ہم سب کے باپ آدم علیہ السلام کو اللہ نے گواہ بنایا اور فرمایا کہ آدم! میں تم کو گواہ کرتا ہوں کہ میں نے اپنی ربوبیت کا اقرار ان سب کے دل میں ڈال دیا۔ زمین کو گواہ کیا آسمان کو بھی گواہ کیا، کہ ہم نے تمہیں تعلیم دے دی اور جمال دکھلا کر اپنی محبت بھی پیدا کر دی اور سوال کا جواب دلا کر اپنی ربوبیت کا اقرار کرالیا کہ میں تم سب کا رب ہوں اور یہ کہ تم غافل نہیں ہو۔

یہی وجہ ہے کہ پیدا ہوتے ہی انسان اپنے دل میں ایک جمال محسوس کرتا ہے کہ میرا مالک اور خالق کوئی ضرور ہے۔ ”اور ہے بھی ایک“۔ یہ انسان کو سمجھ آتی ہے۔ اسی وجہ سے ہر ایک کی فطرت میں اقرار موجود ہے۔ ہر ایک کے اندر عشق ومحبت خداوندی ڈلی ہوئی ہے، جسے ہر انسان محسوس کرتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام آ کر اسے دعوت دیتے ہیں۔ اس کا طریقہ بتلاتے ہیں کہ محبت کو کس طرح ظاہر کیا جائے۔ اس ربوبیت کے اقرار کو کس عمل سے نمایاں کرے۔ وہ تعلیم دے کر اس کی تفصیل کر دیتے ہیں۔ اجمالاً ہر ایک انسان کے دل میں یہ جذبہ موجود ہے۔

احوالِ برزخ..... تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ: آپ کا یہ سفر وہاں سے شروع ہوا تھا، وہاں سے یہ

---

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۲۔

② پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۲۔

حرکت ہوئی آدم علیہ السلام کی اولاد ہوئی پھر اولاد کی اولاد اور آگے یہ سلسلہ چلتا رہا۔ انسان اپنے اپنے والد کی پشتوں میں منتقل ہوتے رہے۔ تو پہلی منزل جہاں سے انسان چلا ہے وہ آدم علیہ السلام کی پشت ہے اور پھر اپنے باپ در باپ کی طرف منتقل ہوا۔ اس کے بعد پھر ہر انسان اپنی اپنی ماں کے پیٹ کی طرف منتقل ہوا۔ نو مہینے وہاں قیام کیا۔ یہاں اسے غذا ملی کھلایا سمجھایا گیا، نو مہینے کی مدت گزار کر گاڑی آگے چلی، پھر دنیا کا اسٹیشن آ گیا۔ پھر دنیا میں کسی کی عمر چالیس برس، کسی کی پچاس برس، کسی کی ساٹھ اور سو برس اور کسی کی دو سو برس۔ پہلی امتوں کی بارہ بارہ سو، اٹھارہ سو برس عمریں ہوئیں۔ اب عمریں کم ہو گئیں۔ تو انسان آتے رہے اور اپنی اپنی عمر کے مطابق قیام کرتے رہے۔ جب دنیا میں اس کی عمر ختم ہوئی تو عالم برزخ میں پہنچ گیا، جس کو قبر کہتے ہیں۔ اور قبر یہ نہیں جس کو ڈیڑھ گز کا گڑھا بتلایا جاتا ہے۔ یہ تو اس کی علامت ہے۔ وہ ایک مستقل جہاں ہے جس کو برزخ کہتے ہیں، جو دنیا اور آخرت کے بیچ میں ہے۔ اس کا تعلق کچھ دنیا سے ہے اور کچھ آخرت سے۔ مرنے والا بالکل دنیا میں بھی نہیں رہتا اور بالکل آخرت میں بھی نہیں پہنچتا، بلکہ بیچ بیچ میں رہتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ: قبر میں جنت کی کچھ کھڑکیاں کھول دی جاتی ہیں اور آدمی جنت میں اپنے مقام کو دیکھ لیتا ہے اور تمنا کرتا ہے کہ: "يَـا رَبِّ أَقِمِ السَّـاعَةَ" ① اے اللہ جلدی قیامت کر دے تاکہ اس مقام کریم تک پہنچ جاؤں۔ وہاں سے خوشبوئیں آتی رہتی ہیں اس میں "بہ مست" رہتا ہے۔ تو آخرت بھی سامنے ہے اور دنیا بھی سامنے ہے کہ کوئی ثواب پہنچائے تو پہنچ جاتا ہے۔

قبر پر زیارت کے لئے کوئی جائے تو حدیث ہے کہ قبر کی زیارت کا ادب یہ ہے کہ قبلہ کی طرف پشت کر کے میت کی طرف منہ کرے میت اسے دیکھتا ہے اور پہچانتا ہے۔ تو ادھر اس کا رخ جنت کی طرف ہے اور ادھر اس کا رخ دنیا کی طرف ہے۔ وہاں سے ہوائیں آ رہی ہیں، ادھر سے دعائیں اور ثواب پہنچ رہا ہے۔ خود اہل برزخ بھی دنیا والوں کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ: مرنے والے کو جب نعمتیں ملتی ہیں اور قبولیت ہوتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اے اللہ! جتنے میرے عزیز اور مسلمان بھائی ہیں اس وقت تک انتقال نہ کریں جب تک انہیں توبہ نصیب نہ ہو جائے۔ جب تک وہ اپنے گناہوں سے معافی نہ چاہ لیں۔ تاکہ پاک صاف ہو کر یہاں پہنچیں جیسے تو نے مجھے پہنچایا ہے۔ تو ہر میت اہل دنیا کے لئے دعا کرتی ہے اور دنیا والے میت کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔ "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُمْ وَارْحَمْهُمْ" "اے اللہ ان کی مغفرت فرما کر ان پر رحم فرما" "اَعْلِ دَرَجَـاتِهِمْ فِي الْفِرْدَوْسِ" "ان کے درجات فردوس میں بلند فرما۔ تو ہم ان کے لئے دعا گو ہیں۔ وہ ہمارے لئے دعا گو ہیں۔ ان کی دعا کا ہدیہ ہم تک پہنچتا ہے اور ہمارے ثواب کا ہدیہ ان تک پہنچتا ہے۔

① المسند للامام احمد، ج: ۳۷، ص: ۴۹۰۔ حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے صحیح الترغیب والترھیب بالتعلیق للالبانی ج: ۳ ص: ۲۱۹۔

اس واسطے فرمایا گیا کہ: میت پر رونے کی ضرورت نہیں۔ روئے دھوئے تو تب جب ہمیشہ کے لئے جدائی ہو۔ یہ چندون کی جدائی ہے۔ ہم بھی وہیں پہنچ جائیں گے، جہاں وہ پہنچا ہے۔ تو زیادہ رونے دھونے کی کیا ضرورت ہے۔ قبر پہ جا کے آپ ثواب پہنچائیں ان کو مل گیا۔ انہوں نے دعا کا ہدیہ بھیجا وہ آپ کو مل گیا۔ تو یہ کیا جدائی ہوئی؟

یہ ایسا ہی ہے جیسے ہمارا کوئی عزیز ہندوستان چلا جائے تو وہاں سے خط کی بھی آمد و رفت ہے، ہدیہ بھی جاتا ہے۔ سلام و کلام بھی پہنچتا ہے۔ اس لئے آدمی روتا نہیں ہے۔ کہتا ہے کہ جب جی چاہے گا مل لوں گا اور آدمی کی ملاقات تو گویا ہوتی ہی رہتی ہے۔

اس واسطے فرمایا گیا کہ: میت پر اتنا رونا دھونا کہ آدمی نوحہ، بیان، بکاء کرے، ماتم کرنے لگے، گریبان پھاڑ ڈالے، رخسار نوچ ڈالے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ پر بے اعتمادی کا بھی اظہار ہے۔ اور بے وقوفی بھی ہے۔ اتنا تو تب روئے جب یہ بات ہو کہ اب کبھی ملنا نہ ہوگا۔ یہ چندون کی جدائی ہے پھر ملاقات ہوگی۔

حاصل یہ ہے کہ جس کو ہم قبر کہتے ہیں وہ ڈیڑھ گز کی جگہ نہیں ہے وہ دراصل عالم برزخ ہے، جو اتنا بڑا عالم ہے کہ دنیا جیسے لاکھوں عالم اس میں بن سکتے ہیں، تو انسان عالم برزخ کی طرف منتقل ہو گیا اور جب بھی منتقل ہوتا ہے ترقی کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

آدم علیہ السلام کی کمر سے جب نکلا تو حدیث میں ہے کہ: تمام انسان چیونٹیوں کی طرح تھے۔ ماں کے پیٹ میں آیا تو قد و قامت بڑھ گیا، غذا بھی ملنے لگی۔ دنیا میں آیا تو قد و قامت اور بڑھ گیا۔ غذا بھی بڑھ گئی۔ وہاں حیض کا خون ملتا تھا یہاں صاف دودھ ملنے لگا۔ مٹھائیاں عمدہ غلے، ترکاریاں، پھل، پھول اور فروٹ ملنے لگے۔ ماں کے پیٹ میں یہ نہ تھے وہ تنگ جہان تھا۔ جبکہ دنیا میں ماں کے رحم جیسے کروڑوں جہان بن سکتے ہیں۔

اب انبیاء علیہم السلام نے خبر دی کہ: تم آہستہ آہستہ ترقی کے عالم میں پہنچ رہے ہو۔ اس کے بعد ایک اور عالم آنے والا ہے اور وہ اتنا بڑا ہے، کہ دنیا جیسے کروڑوں عالم اس میں بن جائیں اور وہ عالم برزخ ہے۔ وہاں نعمتیں اور راحتیں بھی ہوں گی۔ دنیا میں اگر بے چین رہے گا مگر ایمان تھا تو قبر کے اندر راحت ملے گی۔

حدیث میں ہے کہ: جب سوال و جواب قبر میں ہو چکے گا۔ اور منکر نکیر کو سب کا جواب دے دے گا کہ میرا رب اللہ ہے۔ میرا دین اسلام تھا۔ میرے پیغمبر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ تو غیبی آواز پیدا ہوگی کہ "اَنْ صَدَقَ عَبْدِیْ۔" میرے بندے نے سچ کہا۔ "فَافْرِشُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَ اَلْبِسُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَ افْتَحُوْا لَهٗ بَابًا مِّنَ الْجَنَّةِ۔" اس کے لئے جنت کے دروازے کھول دو۔ جنت کے فرش بچھاؤ جنت کا لباس بھی دو۔ اور "وَيُوْسَعُ لَهٗ قَبْرُهٗ مَدَّ بَصَرِهٖ۔" قبر اتنی وسیع کر دی جاتی ہے کہ جہاں تک نگاہ پہنچتی ہے میدان ہی میدان نظر آتا ہے۔ آسمان تک ہماری نگاہ پہنچتی ہے زمین سے آسمان تک پانچ سو برس کا راستہ ہے۔ قبر میں ہر انسان کو اتنا بڑا عالم ملے گا جتنا زمین سے لے کر آسمان تک کا مقام ہے۔ تو عالم برزخ میں دنیا جیسے لاکھوں عالم بن جائیں معلوم ہوا کہ انسان

ترقی کی طرف ہے۔ ①

برزخ میں پہنچ کر پھر انبیاء علیہم السلام نے خبر دی کہ: ایک اور عالم آنے والا ہے جو اس سے بھی بڑا ہوگا۔ اور وہ محشر ہے۔ اس عالم کی کل عمر تو چند صدیوں کی ہوگی۔ اس عالم کا پچاس ہزار برس کا ایک دن ہوگا۔ ایک دن میں سارے اولین و آخرین انسان جمع ہونگے اسکے بعد پھر انبیاء علیہم السلام نے فرمایا کہ: ایک اور عالم آنے والا ہے جس کا نام جنت ہے وہ اتنا بڑا عالم ہے کہ عالم برزخ جیسے کروڑوں عالم اس میں بن جائیں۔ اس لئے عالم برزخ میں ایک آدمی کو اتنا حصہ ملتا ہے جتنا زمین سے لے کر آسمان تک کا مقام ہے اور جنت میں ادنیٰ جنتی کو جو حصہ ملے گا اس دنیا کے دس گنا کے برابر ہوگا۔ تو اندازہ کیجئے جنت کتنا بڑا عالم ہے۔

تو انسان "عالم الست" سے چلا، عالم رحم میں آیا۔ عالم رحم سے چلا، عالم دنیا میں آیا، عالم دنیا سے چلا، عالم برزخ میں آیا۔ عالم برزخ سے منتقل ہوا، عالم محشر میں پہنچا۔ عالم حشر سے منتقل ہوا، جنت میں پہنچا۔ اور جنت میں روزانہ ترقی ہوگی، نئے نئے عالم انسان پر کھلیں گے عجائبات ظاہر ہونگے۔ طرح طرح کی نعمتیں نمایاں ہوں گی۔ اس لئے کہ انسان میں تجدد پسندی کا جذبہ ہے کہ نئی نئی چیزیں اس کے سامنے آتی جائیں۔ اگر ہمیشہ پرانی چیزیں رکھی رہیں، تو آدمی کا دل گھبرا جاتا ہے۔ اگر روز پلاؤ کھانے کو ملے تو دوسرے دن جی گھبرا جائے۔ کسی دن دال، کسی دن چاول، کسی دن پلاؤ، روز نئی چیز ہو تو انسان کی طبیعت بہلتی رہتی ہے۔ اور روز ایک ہی غذا ہو، چاہے وہ اعلیٰ ہو تو بھی آدمی کا دل گھبرا جاتا ہے۔

اس واسطے دنیا میں موٹر کاریں ہیں، ہر سال ان کا نیا ماڈل تیار کیا جاتا ہے۔ مکانات کے نقشے بدلتے رہتے ہیں۔ کل کچھ اور رنگ کا مکان تھا۔ آج اور رنگ کا۔ آج کل امریکن اسٹائل مکان چلے ہیں۔ ان کا کچھ اور ہی نمونہ ہے۔ سو برس کے بعد دنیا میں معلوم نہیں کیا نمونہ بن جائے۔ تو یہ انسان کی فطرت ہے کہ نئی نئی چیز سامنے آئے۔ جنت کی نعمتیں کتنی ہی پر لطف ہوں لیکن اگر ایک ہی قسم کی نعمتیں ہوتیں اور ابد الآباد تک رہتیں، تو آدمی گھبرا جاتا اس لئے روز نئے نئے سامان ہوں گے۔

حدیث میں ہے کہ: جنت میں ایک عالیشان محل ہے۔ جس میں انسان مقیم ہے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر جو نگاہ اٹھاتا ہے اب تک معلوم تھا کہ سبز رنگ ہے۔ دوبارہ جو نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ اب سرخ ہو گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد نگاہ کی معلوم ہوگا کہ زرد رنگ ہو گیا۔ تو محلات کے رنگ نئے نئے آتے رہیں گے۔ نئے نئے جہاں کھلتے رہیں گے۔ نئی نئی نعمتیں سامنے آتی رہیں گی۔ اور نشاط پر نشاط کا پتار رہے گا۔ معلوم ہوا کہ جنت میں بھی حرکت ہی رہے گی۔ اور ختم ہونے والی نہ ہوگی بلکہ عروج ہوتا رہے گا گویا اصل ترقی وہاں ہوگی۔

بہرحال مجھے ان ترقیات کی تفصیل بیان کرنا نہیں صرف یہ بتلانا ہے کہ انسان حرکت میں ہے۔ اب بھی آپ حرکت میں ہیں۔ قبرستان میں بھی حرکت میں رہیں گے۔ جنت میں جا کر عالم متعین ہو جائے گا۔ مگر نعمتوں

اور لندائنڈ کی ترقی جاری رہے گی تو اتنی لمبی حرکت کا کوئی مقصد ہونا چاہئے۔ تھوڑی سی حرکت، گھر سے مدرسہ اور خانقاہ تک کی جائے تو اس کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ چند گھنٹوں کی حرکت ہوتی ہے یہ تو ہزاروں برس کی حرکت ہے۔ تو اتنی طویل حرکت ہو اور بلا مقصد ہو۔ یہ عقل بالغ نہیں مانتی۔ عقل سلیم یہ قبول نہیں کرے گی کہ انسان ایسے ہی بے کار حرکت کر رہا ہے، اس کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ عقل اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہے۔ اللہ نے اسے عبث و بے کار پیدا نہیں فرمایا۔

زندگی کی حقیقت...... بلکہ یہ آپ کی زندگی، یہ خود ایک مستقل حرکت ہے، جو آدمی کے اندر بہت دور تک چلتی رہے گی۔ جب تک آدمی کا بدن حرکت کرتا رہے گا، کہتے ہیں کہ وہ زندہ ہے۔ جب حرکت ختم ہو جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ آدمی مر چکا ہے۔ قلب حرکت کرتا رہے، کہتے ہیں کہ قلب زندہ ہے۔ اگر قلب کی حرکت ختم ہو جائے، تو کہتے ہیں کہ فلاں آدمی کا انتقال ہو گیا ہے۔ تو حرکت بند ہو جانے کا نام موت اور حرکت کے جاری رہنے کا نام زندگی ہے۔ انسان کی آنتیں جب تک حرکت کرتی رہتی ہیں فضلات خارج ہوتے رہتے ہیں، آدمی تندرست رہتا ہے۔ اگر آنتیں حرکت نہ کریں، ان میں غذا پڑی رہے، قبض ہو جاتا ہے، وہی موت کا پیش خیمہ ہے۔ تو آنتیں، دل، جگر اور دماغ سب حرکت میں ہیں، حتی کہ عقل انسانی بھی حرکت میں ہے۔ آدمی اس سے کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا ہے۔ کل کیا ہوگا؟ پرسوں کیا ہوگا؟ گویا ہر وقت دماغ حرکت میں ہے۔ اگر حرکت بند ہو جائے، کہا جائے گا کہ فلاں آدمی بے وقوف ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں عقل نہیں۔ تو ایک ایک قوت اور عضو حرکت کرتا رہتا ہے۔ دیکھا جائے تو نہ صرف انسان بلکہ زندگی بھی حرکت میں ہے۔ اس لئے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: انسان ازلی تو نہیں کہ ہمیشہ سے تھا، مگر ابدی ضروری ہے کہ پیدا ہو گیا تو اب مٹنے والا نہیں۔ ابد الآباد تک زندہ رہے گا۔ جگہیں بدلتی رہیں گی ایک عالم سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے اور پھر چوتھے عالم میں۔ تو مکان اور جہاں بدلتے رہیں گے اور انسان باقی رہے گا۔

کیا مقصدِ زندگی خورد و نوش ہے؟...... تو اس قدر طویل زندگی کا مقصد کیا ہے؟ مقصد بھی اتنا طویل ہونا چاہئے جتنا لمبا سفر ہے۔ سفر تو ہزاروں برس کا ہو اور مقصد معمولی سا ہو، وہ اس کے اوپر چسپاں نہیں ہوگا۔ مقصد اتنا اونچا اور بلند ہونا چاہئے جو اس کی لمبی عمر کے مناسب ہو، جتنا ہی بڑا سفر اتنا ہی بڑا اور شاندار ہونا چاہئے۔ تو وہ کیا مقصد ہے جس کے لئے ہم پیدا کئے گئے اور اتنا لمبا سفر اختیار کیا؟

فرض کیجئے یہ مقصد ہو کہ بس آپ روٹی کھا لیجئے۔ یہ بھی ایک مقصد ہے کہ کچھ پیسے جمع کیے، کچھ روٹیاں کھائیں کچھ مزے اڑائے۔ بس آدمی ختم ہو گیا۔ تو اتنا لمبا سفر اور اس کے لئے مقصد صرف روٹی۔؟ (کَلَّا وَ حَاشَا) روٹی تو جانور بھی کھاتے ہیں۔ پھر انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ جو گائے، بھینس، بکری ہیں وہ سب اس مقصد کو ادا کر رہی ہیں۔ انسان اشرف المخلوقات اتنی بلند مخلوق اور اس کی زندگی کا مقصد صرف یہ کہ روٹی

کھالے اور ختم ہو جائے۔ (یا ایسے اسباب و وسائل میں زندگی گنوا دے جن کا نتیجہ بہر صورت روٹی ہو۔ مثلاً تجارت اور صنعت و حرفت وغیرہ، یا باقی اسباب معاش جو روٹی کو نتیجہ کے طور پر میسر کرتے ہوں) یہ کوئی اہم مقصد نہیں ہے۔ اگر یہ اہم مقصد ہوتا تو جو اس مقصد کو زیادہ عمدگی سے انجام دیتا، وہ اشرف المخلوقات ہونا چاہئے تھا۔ وہ انسان نہیں ہو سکتا۔ اس لحاظ سے ہاتھی بھینس اور گائے وغیرہ اشرف المخلوقات بنتے۔ انسان نہ بنتا۔ یہ اتنا نہیں کھا سکتا جتنا یہ جانور کھاتے ہیں۔ اگر کھانے کے لئے بیٹھ جائے تو ہاتھی کے برابر نہیں کھا سکتا۔ نہ پیٹ اتنا ہے نہ ہاضمہ اس جیسا ہے۔ اس لئے اس طویل زندگی کا مقصد ظاہر ہے کہ وہ روٹی تو نہیں ہو سکتی۔ اتنی لمبی چوڑی حرکت کی زندگی، کیا محض اللہ نے اس لئے دی کہ چند لقمے کھالئے جائیں۔ یہ تو عارضی سی بات ہے پھر یہ کہ کھانے کا مقصد درحقیقت یہ ہوتا ہے کہ بدن باقی رہے۔ اس کے باقی رہنے کا کیا مقصد ہے؟ پھر مقصد کی تلاش شروع ہوگئی۔ تو روٹی اگر مقصد بنتی، وہ مستقل چیز بنتی، حالانکہ وہ بدن کے پالنے کا ذریعہ ہے۔ پھر سوال اپنی جگہ قائم، کہ روٹی بدن کے پلنے کا ذریعہ ہوتی۔ پھر بدن کے پلنے سے کیا مقصد؟

اور اگر فرض کیجئے روٹی مقصد ہو بھی تو اتنی لمبی چوڑی عمر اور یہ مقصد؟ یہ مقصد تو پھر جانوروں کو بھی حاصل ہے۔ جانور بھی آخر کھاتے پیتے ہیں۔ اگر آپ نے کھا پی لیا تو کونسا کمال کیا؟

آپ کہیں گے صاحب ہم تو پلاؤ، زردہ اور مرغ کھاتے ہیں۔ جانور تو یہ نہیں کھاتے۔ میں کہتا ہوں کہ جانور کیوں مرغ نہیں کھاتے۔ کیا بلی مرغی نہیں کھاتی اور شیر گائے کو نہیں پھاڑ کھاتا؟ آپ نے گائے کا گوشت کھالیا تو کیا کمال کیا؟ بھینسا وہ بھی کھالیتا ہے آپ بھی کھالیتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ مصالحہ نہیں ڈالتا تو مصالحہ ڈالنا بھی کون سے کمال کی بات ہے؟ مصالحوں سے تو بلکہ گوشت کا اصل ذائقہ ختم ہو جاتا ہے۔ صحیح طور پر گوشت کو پکایا جائے۔ تھوڑا سا نمک مرچ ملا کے کھایا گوشت کا اصل ذائقہ رہے گا۔ یہ مصالحوں کی بھرمار سے تو اصل ذائقہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

میں تو کہا کرتا ہوں کہ ہوائی جہاز کا کھانا بڑا اچھا ہوتا ہے۔ وہ گوشت کو خاص طریق سے پکاتے ہیں۔ نہ اس میں نمک، نہ مرچ، نہ مصالحہ۔ ترکاری سامنے رکھ دی۔ نمک مرچ ڈالو اور کھالو۔ اس طرح ترکاری کی اصل مٹھاس قائم رہتی ہے اور ہم اتنے مصالحے بھر دیتے ہیں کہ ترکاری کی اصل مٹھاس اور حلاوت ختم ہو جاتی ہے۔

تو عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے بھی مرغ کھایا اور بلی نے بھی مرغ کھالیا۔ اس نے اصل ذائقہ چکھا آپ نے بدلا ہوا۔ آپ تو گھاٹے میں رہے اور اس نے اصل گوشت کھایا۔ یہ کون سا کمال ہے؟ اگر یہ کمال ہوتا، پھر بلی بھی اشرف المخلوقات ہوتی۔ تو کھانا کوئی مستقل کمال نہیں۔ کھانا ضرورت کے لئے ہے تاکہ بدن باقی رہے اور کھانا کھاتے ہوئے انسان کا جی گھبراتا ہے۔ لوگ کہا کرتے ہیں کہ کام زیادہ ہے کھانا دانا تو ہوتا ہی رہے گا۔ معلوم ہوا کہ کھانے کو اصل مقصد نہیں سمجھتے ہیں۔ تو کھانا کوئی اہم چیز نہیں۔ اگر ہمیں کوئی ایسا طریقہ ہاتھ لگ جائے کہ بلا کھائے پئے ہم کام کرتے رہیں، تو شاید کھانے کی طرف رخ بھی نہ کریں۔ یہ تو مجبوری کی بات

ہے کہ بلا کھائے پیئے زندگی باقی نہیں رہتی۔

مجھے اس پر اپنے بزرگوں کی ایک حکایت یاد آ گئی۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند، جو میرے دادا بھی ہیں، ان کے زمانے میں آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی جنہوں نے آریہ سماج کی بنیاد رکھی۔ وہ یو۔ پی میں سہارن پور کے ایک قصبے میں آئے اور آ کر انہوں نے اعلان کیا کہ کوئی مسلمانوں کا عالم میرے مقابلے میں مناظرہ کرنے کے لئے آئے۔ اور یہ بھی اعلان کیا، کہ کسی چھوٹے موٹے عالم سے میں مقابلہ نہیں کروں گا۔ مولبی کاسم (مولوی قاسم) کو بلاؤ۔ ان سے مقابلہ کروں گا۔ حضرت اس زمانے میں کچھ بیمار تھے مگر وہاں کے خدام نے لکھا کہ حضرت یہ صورت حال ہے اس لئے آپ ہی کو آنا ہوگا کیونکہ اس نے تو اعلان اور چیلنج کیا ہے کہ مولبی کاسم سے مناظرہ ہوگا۔ اسی بیماری کی حالت میں حضرت تشریف لے گئے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ تو آئیں گے نہیں۔ جب حضرت پہنچ گئے تو جناب نے یہ سوچنا شروع کیا کہ جان کس طرح چھوٹے، بھاگوں کس طرح؟

منشی نہال احمد صاحب، حضرت کے خادم خاص تھے۔ یہ بڑے ذہین وذکی تھے۔ حضرت نے ان کو پنڈت جی کے پاس بھیجا کہ آپ جا کے مناظرہ کی شرائط طے کریں کہ کن احوال اور شرائط پر مناظرہ ہوگا۔ کیا صورت اختیار کی جائے گی تا کہ پھر مناظرہ ہو سکے۔ منشی صاحب پہنچے تو پنڈت جی کچھ کھانے میں مصروف تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ جس کمرے میں پنڈت جی تشریف رکھتے ہیں۔ وہاں ایک بہت بڑی پرات (تھال) جس میں بہت سا حلوئی پوری، ترکاری اور بہت کچھ۔ غرض دس پندرہ سیر وزن کا ملبہ اس کے اندر بھرا ہوا۔ وہ لے جایا گیا۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک آدمی کی خوراک تو نہ تھی، انہیں خیال گذرا کہ کمرے میں ایک آدمی تو نہیں ہوگا۔ ایک آدمی آخر کتنا کھالے گا؟ پنڈت جی کے اعزاز میں بڑی دعوت کا اہتمام کیا گیا ہوگا۔ اس لئے یہ انتظار میں کمرہ سے باہر بیٹھے رہے۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد جب وہ پرات آئی، وہ بالکل خالی تھی، وہ یہی سمجھے کہ کئی آدمی ہوں گے ایک آدمی تھوڑا اتنا کھا سکتا ہے۔ اس کے بعد ان کو بلایا گیا، دیکھا کہ پنڈت جی اندر اکیلے بیٹھے ہیں۔ یہ حیران ہوئے کہ ایک آدمی پندرہ بیس سیر کا ملبہ کس طرح کھا سکتا ہے؟ دل میں خیال کیا کہ جس کمرہ میں پنڈت جی بیٹھے ہیں۔ ممکن ہے اس میں کوئی دروازہ دوسری طرف ہو۔ لوگ کھا کے ادھر سے نکل گئے ہوں، مگر وہاں تو کوئی دروازہ نہیں تھا۔ یہی ایک دروازہ تھا جس سے یہ خود داخل ہوئے تھے۔ پھر انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ پنڈت جی کے ساتھ کسی اور نے بھی کھانا کھایا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ نہیں اور تو کوئی شریک نہیں تھا۔ اب یہ حیران ہوئے کہ یہ ایک آدمی ہے یا آدمی سے باہر کوئی خاص قسم کا انسان یا جانور ہے۔ جو اتنا کھا گیا (کہ خدا کی پناہ)۔

جب واپس آئے، انہوں نے حضرت کو شرائط بتلائیں۔ اس کا سنانا تو مقصود نہیں ہے۔ لیکن جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے بات چیت کر چکے تو باہر آ کے اپنے ہمجولی حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور

مولانا محمد حسن صاحب امروہی رحمتہ اللہ علیہ جو حضرت کے شاگرد اور ان کے ساتھ تھے، سے بات کی کہ بھائی مجھے تو ایک فکر پیدا ہو گیا ہے، بڑی پریشانی ہو گئی اور اس کا حل بھی کوئی نظر نہیں آتا۔ سب ساتھی متوجہ ہوئے کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا کہ پریشانی یہ ہے کہ جب مناظرہ ہو گا، حضرت انشاء اللہ جیتیں گے، اس لئے کہ حق پر ہیں اور مناظرہ علم میں ہو گا تو علم میں ہمارے حضرت سے بڑا کوئی عالم ہم نہیں دیکھتے۔ اس لئے حضرت ہی غالب آئیں گے۔ لیکن اگر کھانے میں مناظرہ ہو گیا تو پھر کیا ہو گا؟ یہ ایک ہنسی کی بات تھی۔ لوگ ہنس کے چپ ہو گئے۔ شدہ شدہ بات حضرت کے پاس پہنچ گئی۔

حضرت نے انہیں بلایا۔ اور فرمایا خشی جی! آپ نے کیا بات کی؟ یہ بے چارے بہت گھبرائے اس لئے کہ مذاق کی بات تھی۔ اپنے دوستوں میں کر دی۔ اب اپنے شیخ کے آگے خاموش۔ کہیں تو کیا کہیں؟

حضرت نے فرمایا کہ: جو تم نے کہا ہے میں سن چکا ہوں۔ ذرا تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں تاکہ تمہیں جواب بھی بتلا دوں۔ اس لئے کہ تم نے یہ ظاہر کیا کہ یہ مسئلہ بڑا پیچیدہ اور حل طلب ہے۔ تو مجھے اس کا حل بھی بتلانا ہے۔ مگر اپنی زبان سے کہو۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ حضرت میری زبان سے یہ نکلا تھا، کہ اگر علم میں مناظرہ ہوا تو انشاء اللہ ہمارے حضرت غالب آئیں گے۔ لیکن اگر کھانے میں مناظرہ ہوا تو کیا ہو گا؟ اس لئے کہ پنڈت تو تین سیر کا ملیدہ کھا جائے گا اور آپ سے آدھی چپاتی بھی نہیں کھائی جائے گی۔

حضرت نے فرمایا کہ: اس کے دو جواب ہیں۔ ایک ہنسی کا جواب ہے اور ایک حقیقی اور تحقیقی جواب ہے۔ ہنسی کا الزامی جواب یہ ہے کہ کیا سارے مناظروں کے لئے میں ہی رہ گیا ہوں تم لوگ کس کام کے لئے ہو؟ اگر کھانے میں مناظرہ ہو گیا۔ میں تم کو آگے کر دوں گا۔

اس کے بعد فرمایا کہ: تمہارے دل میں یہ خیال کیوں پیدا ہوا کہ کھانے میں مناظرہ ہو تو کون جیتے گا؟ فرمایا کہ کھانا بہائم اور جانوروں کی علامت ہے، تو مناظرہ بہیمیت اور جہالت میں ہوتا ہے یا علم میں؟ فرمایا اگر بہیمیت میں مقابلہ ہوا تو ہم پنڈت جی کے مقابلے میں بھینسے، ہاتھی کو پیش کریں گے کہ کھاؤ ان کے مقابلہ میں جتنا کھاتے ہو؟

اور فرمایا کہ: تمہارے دل میں یہ سوال کیوں نہ پیدا ہوا کہ اگر نہ کھانے میں مناظرہ ہوا تو پھر کیا ہو گا؟ فرمایا اس کے لئے بھی ہم تیار ہیں کہ کھانا کھلانے کے بعد پنڈت جی بھی ایک کمرے میں بند کر دیئے جائیں اور ہمیں بھی بند کر دیا جائے اور چھ مہینے کے بعد نکلیں جو زندہ ہو گا، وہ حق پر ہو گا۔ تو کھانا یہ بہائم کی عادت ہے جو جہالت کا سرچشمہ ہیں۔ اور نہ کھانا، یہ فرشتوں کی عادت ہے، جو علم کا سرچشمہ ہیں۔ اور مناظرہ علم میں ہوا کرتا ہے جہالت میں نہیں ہوا کرتا، جہالت میں مناظرہ ہوا تو جانوروں کو مقابلہ میں پیش کریں گے۔ علم میں مناظرہ ہوا تو ہم مناظرہ کریں گے۔

یہ بات اس پر یاد آ گئی تھی کہ انسان جب اشرف المخلوقات ہے تو کھانا کھانا اس کی کوئی ایسی خصوصیت نہیں

ہے کہ انسان ہی کھاتا ہو۔ انسان سے زیادہ بھینسا بھی کھا سکتا ہے۔ تو انسان کی زندگی کا یہ مقصد تو نہیں ہو سکتا کہ وہ روٹی کھالے۔ اور مقصد حاصل ہو گیا۔ اور اس لئے اتنا لمبا سفر کہ آدم علیہ السلام کی کمر سے نکلے۔ ماں کے پیٹ میں آئے۔ دنیا میں آئے اور مقصد یہ ہو کہ کچھ کھا پی لے۔ یہ کیا مقصد ہوا؟ یہ کوئی اہم چیز نہیں، یہ تو بہیمیت کی علامت ہے۔ گو انسان میں بہیمیت ہے اللہ نے اس کو اجازت دی ہے کہ وہ کھائے پیئے۔ وہ بھی اچھا کھاتا پیتا ہے۔ خوشنما بنا کے کھاتا پیتا ہے۔ مگر مقصدِ زندگی یہ نہیں ہو سکتا۔

روحانی قوت کی کرشمہ سازیاں...... ملائکہ علیہم السلام زندہ ہیں۔ وہ کون سا گوشت روٹی کھاتے ہیں؟ ذکر اللہ ہی سے تو زندہ ہیں۔ اصل زندگی ذکر اللہ کا نام ہے۔ چونکہ ہم اس کوچے سے واقف نہیں، ذکر اللہ کی کوئی کیفیت ہمارے قلب میں نہیں اس لئے ہم غلطی سے یہ سمجھ گئے کہ زندگی کھانے پینے کا نام ہے ورنہ اصل میں زندگی محبوب کا نام لینا ہے کہ آدمی محبوب کا نام لے۔

اگر دنیا میں کسی کو کسی سے محبت ہو جائے اور محبوب چلا جائے۔ وہ فراق و ہجر میں رو رہا ہے، پریشان ہو رہا ہے۔ روتے روتے ضعیف ہو گیا ہے۔ بالآخر چار پائی کو لگ گیا۔ اچانک اس نے کہا، او تیرا محبوب آ گیا۔ ایک دم اٹھ کر بیٹھ جائے گا کہ کہاں ہے؟ یہ جو ایک دم جان آ گئی یہ کہاں سے آئی کیا کوئی روٹی کھالی تھی۔؟ کوئی پانی پیا تھا؟ محبوب کا نام ہی تو سامنے آیا۔ معلوم ہوا کہ زندگی کی قوت درحقیقت محبوب کا وصال ہے، روٹی اور کپڑا یہ زندگی کی قوت نہیں ہے یہ تو عوارض میں سے ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے نا کہ۔

ہر چند کہ پیر و خستہ و ناتواں شدم ہر دم نگاہ بروئے تو کردم بس جواں شدم

میں بوڑھا بھی ہو گیا، خستہ و کمزور بھی ہو گیا، ناتواں بھی ہو گیا۔ مگر جب تیرے چہرے پر نگاہ ڈالتا ہوں تو ایک دم جواں ہو جاتا ہوں، قوت آ جاتی ہے اس لئے کہ محبوب کا جمال جب دل میں کھپ جاتا ہے تو قوت پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

دنیا میں آدمی جب ان چھوٹے چھوٹے محبوبوں کی قوت سے زندہ ہوتا ہے، اگر کسی کے دل میں اللہ کی محبت سما جائے تو اس کی زندگی کا کیا ٹھکانہ؟۔ انبیاء علیہم السلام حق تعالیٰ کی محبت میں غرق ہوتے ہیں اس لئے ان کی زندگی کی قوت محبوب کا نام اور اس کا ذکر ہے۔ روٹی پانی سے انبیاء علیہم السلام زندہ نہیں ہیں۔ ذکر اللہ سے زندہ ہیں۔ انبیاء علیہم السلام اگر ایک حب (دانہ) بھی نہ کھائیں تو بھی ان کی زندگی میں فرق نہیں پڑ سکتا۔ وہ اپنی عبدیت ظاہر کرنے کے لئے کھاتے پیتے ہیں اور امت کے لئے سنت قائم کرنا مقصد ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ عمل کر کے نہ دکھائیں ہم کس طرح سے کھائیں پئیں؟ ہمارے لئے نمونہ کیا ہے؟ تو اسوہ حسنہ کے طور پر کھاتے ہیں۔ زندگی کی بقاء کے لئے نہیں، وہ اللہ کے ذکر سے ہے۔

آج اگر ہمیں یہ مقام میسر آ جائے کہ ہم بھی ذکر اللہ سے زندہ رہ سکیں تو کبھی روٹی کی طرف رخ بھی نہ

کریں۔ یہ تو مجبوری کی بات ہے۔ ذکر اللہ سے ہم ناواقف، غلط فہمی میں مبتلا کہ زندگی روٹی سے قائم ہے اس لئے روٹی کی طرف لپکتے ہیں۔ حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ میرے دادا، جنہوں نے دارالعلوم دیوبند قائم کیا۔ اولیائے کاملین میں سے تھے، نے وفات سے دو مہینے پیشتر یہ فرمایا کہ ''بحمد اللہ مجھے زندہ رہنے کے لئے کھانے پینے کی حاجت باقی نہیں رہی۔ محض اتباع سنت کے لئے کھاتا اور پیتا ہوں، ورنہ حاجت نہیں''۔

یعنی ذکرِ خداوندی دل و دماغ کے اندر اتنا رچ چکا ہے کہ اب اسی سے زندہ ہوں۔ پھر بھی اتباعِ سنت کے لئے کھاتے تھے، تاکہ اس پر بھی اجر و ثواب مل جائے۔ اگر ہمارے ہاتھ میں کوئی ایسا طریقہ آ جائے کہ بلا کھائے پیئے ہم زندہ رہیں۔ کبھی کھانے پینے کی طرف دھیان نہ کریں۔ کون اس مصیبت میں پڑے کہ صبح سے شام تک چولہا جھونکو۔ اور کھیتی کرو، وہاں سے غلہ آئے، وہ پسے، ایک مصیبت ہے۔ جب ہم اس کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں تو کیا ضرورت اس مصیبت میں پڑنے کی؟

میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اول تو روٹی مقصد نہیں، جانور بھی کھاتے پیتے ہیں اور اگر کسی درجہ میں ہوتا بھی تو یہ مقصد جانوروں کو بھی حاصل ہے۔ انسان کو آخر اتنی بڑی زندگی کیوں دی گئی؟ یہ حقیر چیز ہے اور زندگی بڑی عظیم چیز ہے۔ عظیم چیز کے اوپر ایسا تھوڑا سا مقصد مرتب ہو۔ یہ حکمتِ خداوندی کے خلاف ہے۔

اصل میں کھانے کو چھوڑنا یہ کمال کی علامت ہے۔ کھانا کمال کی علامت نہیں انبیاء علیہم السلام بھی بقدر ضرورت کھاتے پیتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حالت یہ تھی کہ دن بھر گھوڑے کی پشت پر سوار رہتے، کھانے کی کچھ خبر نہ ہوتی تھی، ہر وقت جہاد میں مشغول ہیں۔ بعض کے پاس بغل میں چند ٹکڑے پڑے ہوتے، وہ کھا لیتے تھے۔ اور بعض کے پاس وہ چند ٹکڑے بھی نہیں ہوتے تھے۔ کھجور کی چند گٹھلیاں ہی پڑی ہوتی تھیں جب بھوک نے بہت ستایا۔ بس وہ منہ میں ڈال کے نفس کو بہلا دیا کہ ہم بھی کچھ کھا لیں۔ ورنہ وہ کھانے کی کیا چیز ہوتی ہے۔ کھانا تو یہ تھا اور محنت اور جدوجہد یہ کہ چوبیس گھنٹے گھوڑے کی پشت پر سوار ہیں اور جہاد میں مصروف ہیں۔ اعلائے کلمۃ اللہ کر رہے تھے۔ تو کمال ان کا سمجھا جائے گا۔ جنہوں نے کھانا ترک کیا۔ کھانا کھانا کوئی کمال کی چیز نہیں۔ اہل کمال جتنے بھی ہیں، وہ کم ہی کھاتے تھے۔ اس لئے انبیاء نے کم کھایا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی کم کھایا۔ حتی کہ اولیاء اللہ نے بھی کم کھایا۔

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس اللہ سرہ جو چشتیہ سلسلے کے مشائخ میں سے ہیں، وہ اپنے ملفوظات میں لکھتے ہیں کہ میں ایک ایسے شخص سے واقف ہوں جو چالیس برس سے ایک بادام یومیہ پر افطار کرتا ہے، چالیس برس سے روزے رکھ رہا ہے اور کوئی روزہ نہیں چھوڑتا۔

شراح لکھتے ہیں کہ یہ خود حضرت شیخ قطب عالم ہی ہیں۔ تو چالیس برس تک پوری غذا کل یہ تھی کہ ایک بادام یومیہ کھاتے تھے۔ اور طاقت کا یہ عالم تھا کہ رات کو جب ذکر اللہ میں مشغول ہوتے، تو شہر میں اس طرح آواز

گونجتی تھی کہ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ ہمارے گھر کے دروازے پر ذکر کر رہے ہیں۔ یہ قوت کھانے کی نہ تھی یہ روحانی قوت تھی جو ذکر اللہ سے پیدا ہوتی تھی۔

اور حدیث میں ہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم وصال رکھنا شروع کیا روزہ پر روزہ، بعض صحابہ نے بھی آپ کو دیکھ کر صوم وصال شروع کر دیئے۔ آپ کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا: ''اَيُّكُمْ مِثْلِي يُطْعِمُنِي رَبِّي وَيَسْقِينِي'' ① تم میں مجھ جیسا اور میری مثل کون ہے؟ مجھے تو میرا پروردگار کھلاتا پلاتا ہے۔ اس سے میرے اندر طاقت ہے۔ تو وہ کیا چیز کھلائی جاتی تھی؟ آسمان سے کوئی زردہ، پلاؤ اور بریانی کی رکابیاں نہیں اترتی تھیں۔ وہ ذکر اللہ کی طاقت تھی جو رگ وپے میں رچ بس گیا تھا اور سرایت کئے ہوئے تھا۔ یہ مادی قوت نہ تھی۔ اگر ساری عمر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک لقمہ بھی استعمال نہ فرماتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طاقت میں فرق نہیں آ سکتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے کھایا پیا ہے، تا کہ امت کے لئے نمونہ بن سکے۔ امت کے لئے راستہ بنے، جائز و ناجائز کا پتہ چلے، ورنہ کھانے کی محتاجگی نہیں تھی۔ حاصل یہ نکلا کہ کھانا پینا کمال نہیں ہے۔ کھانے کو ترک کرنا کمال ہے۔ دنیا بھی اسی کو کمال سمجھتی ہے۔ اگر ایک شخص بہت کھاتا ہے تو کوئی خیال بھی نہیں کرے گا۔ اگر آپ کسی سے کہیں میں بہت با کمال ہوں اس لئے کہ میں بہت کھاتا ہوں تو وہ کہے گا۔ یہ کون سے کمال کی بات ہے؟ سبھی کھاتے ہیں، جانور بھی کھاتے پیتے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص نظر پڑے جو ہفتہ عشرہ تک کھانا نہیں کھاتا، مخلوق اس کے پیچھے ہو لے گی کہ معلوم ہوتا ہے ولی اللہ ہیں۔ معلوم ہوا دنیا بھی نہ کھانے کو کمال سمجھتی ہے۔ دنیا کے نزدیک کمال بھی کھانے کو ترک کرنا ہے۔ کھا لینا یہ کمال نہیں۔ اسی لئے روزے کو اصل عبادت فرمایا گیا۔ روزہ میں ترک طعام ہے کھانا تو نیت سے عبادت بنتا ہے، اپنی ذات سے عبادت نہیں اور روزہ رکھنا اپنی ذات سے عبادت ہے۔ اللہ کے ہاں بھی مقبولیت نہ کھانے سے پیدا ہوتی ہے، کھانے سے نہیں ہوتی۔

تو اللہ والوں نے بہت ترک فرمایا ہے ہم تم اللہ والے تھوڑا ہی ہیں۔ ہم صبح سے شام تک کھاتے رہتے ہیں۔ صبح کا ناشتہ الگ، دوپہر کا کھانا الگ، شام کا الگ اور رات کا الگ۔ اور وہ اتفاق سے چار دفعہ کھانے کے بعد گنجائش نہیں ہوتی۔ ذرا بھی اور گنجائش ہوتی تو ایک دفعہ کا اور اضافہ کر لیتے۔ بہر حال یہ کوئی بڑا کمال نہیں ہے۔ کمال کھانے کو ترک کر دینا ہے۔ تو اتنی بڑی زندگی کا مقصد متعین کرنا ہو اور وہ ہو کھانا، یہ تو آپ بھی کمال نہیں سمجھتے اسی واسطے یہ اتنی لمبی حرکت کی منزل مقصود روٹی نہیں بن سکتی۔

کیا مقصدِ زندگی عزت واقتدار ہے؟...... پھر آخر کیا مقصد ہے؟ ہوسکتا ہے آپ کہیں دنیا میں اس سفر کا مقصد روٹی نہیں ہے، مگر کرسی، عزت، آبرو، جاہ واقتدار اور منزلت ہو۔ یہ روٹی سے بہر حال اونچے درجے کی چیز ہے آدمی اپنی عزت بچانے کی خاطر پیسہ اور روٹی داؤ پر لگا دیتا ہے، تا کہ آبرو پر حرف نہ آئے، تو آبرو روٹی سے

① الصحیح للبخاری، کتاب الصوم، باب التنکیر لمن اکثر الوصال، ج: ۷، ص: ۱۰۲.

زیادہ اونچی چیز ہے۔

لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ زندگی کا مقصد یہ عزت بھی نہیں ہو سکتا۔ اس واسطے کہ جس کو آپ عزت کہتے ہیں وہ کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ دوسرے آپ کو اچھا سمجھیں بس یہی تو عزت ہے۔ اس کے سوا تو کچھ نہیں کہ دوسرے یہ خیال کریں کہ آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی عزت خیالی چیز ہے۔ کسی نے خیال کر لیا کہ آپ بڑے ہیں تو بڑے بن گئے۔ کسی نے خیال نہ کیا تو آپ چھوٹے کے چھوٹے رہ گئے۔ تو ایک بے بنیاد چیز ہے جس کا نام عزت ہے، خیالی چیز ہے۔ اور پھر خیال بھی دوسرے کا، اپنا نہیں۔ اگر اپنا خیال ہوتا، چلو صبح سے شام تک یہ خیال کئے بیٹھے رہتے کہ ہم بہت بڑے آدمی ہیں۔ بڑے باعزت ہیں۔ یہ تو خیالی چیز ہے اور خیال بھی دوسرے کا، جس پر ہمیں قبضہ حاصل نہیں ہے۔ کوئی دوسرا اگر خیال کئے بیٹھا رہے تو بڑے ہوں گے اور اگر اس نے خیال یہ کر لیا کہ آپ بڑے نہیں، بس آپ حقیر ہو گئے۔ تو عزت ایک بے بنیاد چیز ہے، ایسی عزت، محض خیالی پلاؤ ہے اور کچھ نہیں۔

عزت فی الحقیقت اللہ کے ہاں مقبول ہونے کا نام ہے۔ عزت کسی کے خیال کر لینے کا نام نہیں ہے، اللہ جس کو قبول کر لے، وہ عزت ہے۔ جس کو رد کر دے، وہ بے عزت ہے۔ عزت و ذلت خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ بندے کے ہاتھ میں نہیں ہے اگر بندے سے عزت کرائیں تو اس کی خوشامد کرتے پھریں۔ تو ذلیل تو پہلے ہی تھے۔ اب ہاتھ جوڑتے پھریں کہ حضور میری عزت کی جائے۔ کیونکہ عزت سے پہلے ذلت ہے، اب خوشامد کے بعد اور ذلیل ہو گئے، عزت تو کیا ہوتی تھی؟

اور اگر آپ ڈنڈا لے کر کہیں کہ میری عزت۔ وہ آپ کے ڈنڈا رسید کرے گا، کہ تو میری عزت کر۔ یہ تو پہلے سے زیادہ تذلیل ہو جائے گی۔ تو عزت نہ انسان کے دبانے سے ملتی ہے نہ خوشامد سے ملتی ہے۔ عزت خدا کی طرف سے ملتی ہے، جب کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے، یا ان کا فرمانبردار بنے، وہ قبول کر لیں گے، ان کے قبول کرنے سے انسانوں میں مقبولیت پیدا ہو گی۔ یہ اصل عزت ہے۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ شانہٗ جب کسی سے راضی ہوتے ہیں تو جبرئیل علیہ السلام کو فرماتے ہیں کہ میں فلاں بندے سے راضی ہوں، تو بھی اس سے راضی ہو جا۔ جبرئیل علیہ السلام راضی ہو جاتے ہیں تو آسمان میں اعلان کرتے ہیں کہ فلاں بندہ میرے ہاں مقبول بن گیا ہے (جو قبولیت خداوندی کی علامت ہے)۔ لہٰذا تم بھی اسے مقبول بناؤ، پھر سارے فرشتے اس سے محبت کرتے ہیں۔ سب فرشتوں میں اس کی عزت قائم ہو جاتی ہے۔ ان ملائکہ کے اثرات زمین کے ملائکہ کے اوپر پہنچتے ہیں، وہ بھی عزت کرنے لگتے ہیں۔ زمین کے ملائکہ کے اثرات اولیاء اللہ کے قلوب پر پڑتے ہیں۔ تو اللہ والے بھی اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں اور جتنے لوگ اہل اللہ سے وابستہ ہیں، نیک ہیں، پھر ان کی وجہ سے عوام میں عزت آ جاتی ہے، الغرض اس شخص کی مقبولیت پوری امت میں پھیلا دی جاتی ہے۔ یہ مقبولیت کب ہے؟ کہ پہلے اس کو اللہ مقبول بنائے، پھر

دوسروں کے اندر اس کی مقبولیت پیدا ہوگی۔تو عزت یہ ہے کہ اللہ کسی کو مقبول فرمالے،اس سے راضی ہو جائے۔ انسان خیال باندھے کہ فلاں عزت والا ہے۔یہ خیال ہی بے بنیاد ہے۔تو عزت بنیاد والی کیا ہوگی؟ ورنہ دنیا میں انسانوں کی عزت ایسی ہی ہوتی ہے جیسے کہ ایک لیڈر کی ہے۔ پبلک میں اس کی مقبولیت ہوئی تو گلے میں پھولوں کے ہار ڈال دیئے اور کل جو پبلک خفا ہوئی اور بدلی تو گلے میں جوتیوں کے ہار ڈال دیئے۔ بے چارا بے عزت پھر رہا ہے۔اب اسے کوئی پوچھتا ہی نہیں۔یہ کوئی عزت نہیں ہے۔عزت کی بنیاد ہی یہ ہے کہ اللہ کسی کو عزت دے۔حق تعالیٰ قبول فرمالیں تو ہی عزت ہے۔اور حق تعالیٰ تب ہی قبول فرماتے ہیں،جب کوئی نیکی اختیار کرے۔مامورات کرے اور بدی سے بچے بدعمل و بدکار کبھی باعزت نہیں ہوسکتا۔تو اصل عزت نیکی ہے۔حق تعالیٰ کے سامنے جھکنے میں اور اس کی اطاعت میں ہے۔نہ یہ کہ لوگوں کے خیال میں آجائے کہ یہ باعزت ہیں۔یہ خیال ہی بے بنیاد ہے۔اس لئے کہ کل ہے،پرسوں کو نہیں۔

حاصل یہ نکلا کہ زندگی کی اتنی لمبی چوڑی حرکت اس کا مقصد نہ تو روٹی بن سکتی ہے اور نہ کرسی اور عزت بن سکتی ہے۔اس لئے کہ روٹی بہائم کی علامت ہے اور اقتدار پسندی یہ خیالی چیز ہے۔تو زندگی تو حقیقی ہو اور اس کا مقصد محض خیالی ہو۔یہ بے جوڑ بات ہے۔سمجھ میں آنے والی نہیں ہے،حکمتِ خداوندی کے بھی خلاف ہے۔

مقصدِ زندگی قرآن کریم کی روشنی میں.....تو یہ دونوں مقصد نہیں بن سکتیں۔تو آخر مقصد کیا ہونا چاہئے۔ لمبی زندگی کا مقصد بھی،خود اتنا لمبا ہونا چاہئے جو زندگی کے ساتھ آخرت تک جائے۔یہ دونوں باتیں،روٹی اور کرسی لمبا مقصد نہیں۔اس لئے کہ روٹی آپ اس وقت تک کھائیں گے،جب تک دنیا میں موجود ہیں اور جب قبر میں پہنچ گئے تو روٹی تو رہ گئی اور زندگی آگے تک جارہی ہے۔اس کا مقصد یہ ہے کہ زندگی آگے تک جاری ہے اور مقصد پہلے ہی ختم ہوگیا۔تو یہ مقصد کیسے بنے گا؟اس طرح دنیا کا جاہ و اقتدار تخیل اور خیال سے ہوتا ہے وہ بھی کوئی پائیدار چیز نہیں ہے۔جب انسان ختم ہوگیا اور یہاں سے منتقل ہوگیا،تو عزت بھی ختم ہوگئی۔ایک بادشاہ جب انتقال کر جاتا ہے،وہ اپنا سارا اقتدار دنیا میں چھوڑ جاتا ہے۔قبر میں اس کا اقتدار ساتھ نہیں جاتا۔اب زندگی باقی ہے اور حکومت ختم ہوگئی۔تو یہ اقتدار کیسے مقصدِ حیات بن سکتا ہے کہ زندگی تو آگے جارہی ہے اور مقصد پیچھے رہ گیا۔اس لئے نہ روٹی،نہ عزت واقتدار اور حکومت مقصد بن سکتی ہے،بلکہ صرف ایک چیز مقصد بن سکتی ہے،اس مقصد کو قرآن کریم نے پیش کیا۔فرمایا:﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ ① ”میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اسی لئے پیدا کیا وہ میری عبادت اور اطاعت کریں“۔

انسان کی خلقت اور پیدائش کا اصل مقصد یہ ہے،اگر ایک انسان عبادت میں لگ گیا۔اس نے زندگی کا مقصد پورا کر لیا عبادت میں نہ لگا،زندگی رائیگاں چلی گئی۔مقصد پورا نہ ہوا۔تو قرآن حکیم نے مقصد بتلایا کہ زندگی

① پارہ:۲۷،سورۃ الذاریات،الآیۃ:۵۶۔

کا مقصد فی الحقیقت اطاعت خداوندی اور عبادت خداوندی ہے۔ عبادت خداوندی ہوگی تو عزت بھی حاصل ہوگی۔ بھوکے نہیں رہو گے، روٹی بھی ملے گی۔ اصل مقصد یہ ہے۔ یہ مقصد کیوں ہے؟ اس لئے کہ روٹی اگر مقصد ہو تو عمر تو بہت آگے تک جا رہی ہے اور روٹی قبر کے کنارے پر ختم ہوگئی۔ وہ مقصد کیا ہوا جو پوری عمر پر مرتب نہ ہو۔ مقصد وہ ہے کہ جب تک عمر چلے، مقصد بھی چلتا رہے۔ وہ مقصد، مقصد نہیں بن سکتا کہ عمر تو آگے تک چلے اور وسیلہ قبل از وقت ختم ہو جائے۔ اسی طرح سے خیالی عزت بھی قبر سے آگے نہیں جا سکتی۔ جب قبر میں ہم پہنچ گئے، کوئی ہمارے لئے (بڑے ہونے کا) خیال باندھے نہ باندھے، ہمارے لئے برابر ہے۔ وہاں تو اپنے عمل کا امتیاز ہوگا۔ وہاں یہ تھوڑا ہی دیکھا جائے گا کہ پبلک ہمارے لئے کیا خیال لئے ہوئے ہے؟ یہ نہیں دیکھا جائے گا۔

اَبدی زندگی کا اَبدی مقصد...... اور اگر اطاعت وعبادت مقصد ہو تو یہ فی الحقیقت لمبا چوڑا مقصد ہے جو پوری عمر پر مرتب ہوتا ہے کہ جب تک انسان دنیا میں موجود ہے عبادت اس کے ساتھ رہے گی۔ قبر میں جب پہنچے گا، جب بھی عبادت موجود ہوگی۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کے لئے تو فرمایا گیا کہ: ''اَلْاَنْبِیَآءُ اَحْیَآءٌ فِیْ قُبُوْرِهِمْ یُصَلُّوْنَ.'' ① ''انبیاء علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں''۔

حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰی مُوْسٰی یُلَبِّیْ.'' میں موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ وہ ''لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ'' کہتے ہوئے میدان عرفات کی طرف جا رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام حج بھی کرتے ہیں اور نماز بھی پڑھتے ہیں۔ ②

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میں نے حضرت یونس علیہ السلام کو دیکھا، کہ وہ اونٹنی پر سوار ہیں اور وہ حج کر رہے ہیں۔ اس اونٹنی کا لگام اون اور صوف کا ہے۔ ③ حدیث میں ہے کہ: آپ علیہ السلام نے طواف فرمایا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام بھی طواف میں ساتھ تھے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک شخص ''مَرْبُوْعُ الْقَامَةِ'' یعنی چوڑا سینہ اور بہت موزوں قد اور سرخ وسفید چہرہ جیسے گلاب کا پھول ہوتا ہے اور اتنا تر وتازہ گویا ابھی حمام میں غسل کر کے نکلے ہیں کہ بالوں سے ابھی پانی ٹپک پڑے گا۔ اتنا شاداب اور تر وتازہ اور نہایت حسین وجمیل چہرہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا یہ کون طواف کر رہے ہیں؟ کہا یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسیح اللہ ہیں معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام طواف بھی کرتے ہیں، لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ کہتے ہوئے میدان عرفات میں بھی جاتے ہیں۔ نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔ قبر میں ذکر اللہ بھی کرتے ہیں۔ ④

① المسند لابی یعلی الموصلی، ج: ۷، ص: ۳۴۵۔ حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: السلسلة الصحیحة ج: ۲ ص: ۱۲۰ رقم: ۶۲۱.

② شعب الایمان للامام البیهقی، ج: ۹، ص: ۳۱. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے صحیح الترغیب والترهیب ج: ۲ ص: ۴۵۷ رقم: ۲۹۵۸.

③ شعب الایمان للامام البیهقی، ج: ۹، ص: ۳۱.

④ الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قول الله تعالیٰ واذکر فی الکتاب مریم، ج: ۱۱، ص: ۳۵۵.

تو انبیاء علیہم السلام کے لئے تو ذکر اللہ اور عبادت صراحۃً احادیث سے ثابت ہے۔ ہمارے آپ کے لئے اور عامۃ المومنین کیلئے تو یہ ثابت نہیں ہے کہ وہ ہاتھ پیر سے عبادت کرتے ہیں۔ مگر ہاں ایک عبادت ہم بھی کرتے ہیں۔ وہ عبادت ہم قلب سے کرتے ہیں۔ بدن تو رہتا نہیں۔ انبیاء کا تو بدن بھی محفوظ ہے، وہ تو بدن سے عبادت کرتے ہیں۔ ہمارا بدن تو مٹ جاتا ہے۔ اس لئے بدنی عبادت نہیں رہے گی مگر روحی عبادت ہم بھی کرتے ہیں اور وہ قلب کے جذبے اور تخیل کی عبادت ہے۔ اس لئے کہ بدنی عبادت تو جب کریں جب بدن ہو۔ یہ عمل کا آلہ ہے۔ جب بدن نہیں رہے گا۔ آگے صرف روح ہی رہ جائے گی، روح عمل نہیں کرسکتی مگر جذبات کی عبادت کرسکتی ہے۔

حدیث میں ہے کہ: جب منکر نکیر سوال و جواب کے لئے آتے ہیں اور دو تین سوال کرتے ہیں کہ مَنْ رَّبُّکَ؟ تیرا پروردگار کون ہے؟ وَمَا دِیْنُکَ؟ تیرا دین کیا تھا؟ وَمَنْ نَبِیُّکَ؟ تیرے نبی کون تھے؟ توحید رسالت اور شریعت، ان تینوں کا سوال ہوتا ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا جب ملائکہ علیہم السلام مؤمن سے کہیں گے کہ "مَنْ رَّبُّکَ"؟ تیرا پروردگار کون تھا؟ تو بموجب حدیث مؤمن کو جو اس وقت، وقت دکھلایا جائے گا۔ وہ ایسا ہوگا جیسے سورج غروب ہونے کو ہے اور دھوپ میں زردی چھا چکی ہے، دن ختم ہو چکا اور مغرب آنے والی ہے۔ "یُمَثَّلُ لَهُ الشَّمْسُ." قبر میں سورج کی صورت مثالی دکھلائی جائے گی۔ تو فرشتوں کے جواب میں یہ بندہ مؤمن کہے گا "دَعُوْنِیْ أُصَلِّیْ" "میاں پرے ہٹو وقت تنگ ہوگیا ہے۔ میری نماز قضا ہونے کو ہے مغرب آجائے گی۔ تو ایک فرشتہ دوسرے سے کہتا ہے کہ اس سے "رب" کے بارے میں کیا سوال کرتے ہو یہ تو رب کی عبادت کرنے کو ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ بہر حال ہماری ڈیوٹی ہے جو انجام دینی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ یہ جواب حق دے گا اس کا چہرہ اور عمل ہی بتلا رہا ہے۔ ①

میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے وہاں بدنی عبادت تو نہیں کرسکتے، مگر تخیل کی عبادت تو کریں گے جذبہ یہ ہوگا تبھی "دَعُوْنِیْ أُصَلِّیْ" "کہیں گے کہ میاں پرے ہٹو، نماز پڑھنے دو۔ اس پر فرشتے کہیں گے کہ اب نماز کا وقت نہیں یہ تو عالم برزخ ہے وہ جو نماز پڑھنے کی تکلیف دی گئی تھی، وہ دنیا میں دی گئی تھی۔ برزخ اور عالم آخرت میں یہ تکلیف نہیں دی گئی۔ اس وقت اسے پتہ چلے گا کہ یہ سورج کی صورت مثالی ہے۔ حقیقی دن نہیں ہے میں تو قبر کے اندر ہوں۔

مگر "دَعُوْنِیْ أُصَلِّیْ" "کون کہے گا؟ جس نے دنیا میں نماز پڑھنے کی عادت ڈالی ہو۔ اگر دنیا میں نماز سے بے پرواہ رہے گا تو اس کی زبان سے "دَعُوْنِیْ أُصَلِّیْ" "نہیں نکل سکے گا، کہ مغرب کا وقت آرہا ہے اور مجھے نماز پڑھنے دو۔ اس لئے کہ زندگی میں روزانہ اصلی مغرب کی نماز کا وقت آتا تھا اور اسے نماز کی پرواہ بھی نہیں ہوتی تھی۔ تو جو یہاں بے پرواہ تھا، وہاں بھی بے پرواہ رہے گا۔ جسے یہاں پرواہ تھی، وہاں جا کر بھی پرواہ دار بنے گا۔ حدیث

① المصنف لعبد الرزاق، ج:۳، ص:۵۸۷، روایت حسن ہے، دیکھئے ظلال الجنۃ ج:۲ ص:۱۲۶، رقم:۱۷۱ باب فی القبر.

میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ''تُحْشَرُوْنَ كَمَا تَمُوْتُوْنَ وَ تَمُوْتُوْنَ كَمَا تَحْيَوْنَ.'' ''تمہارا حشر اس حالت پر ہوگا جس حالت میں موت آئی اور موت اس حالت پر آئے گی جس حالت پر زندگی گزاری''۔ اگر زندگی ذکر وعبادت میں گزاری ہے تو موت کے وقت بھی ذکر وعبادت کا ہی دھیان ہوگا۔ اور جب قبر سے اٹھے گا جب بھی ذکر کا دھیان ہوگا۔ حدیث میں ہے کہ: اگر کوئی حاجی میدان عرفات میں یا منیٰ میں ''لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ'' کہتے ہوئے مرگیا۔ جب وہ میدانِ محشر میں قبر سے اٹھے گا تو اس کی زبان پر لبیک لبیک جاری ہوگا۔ ''لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ''①

وہ یہی سمجھے گا کہ میدان عرفات میں جارہا ہوں۔ آگے جاکے پتہ چلے گا کہ یہ تو میدان محشر ہے، میدان عرفات نہیں ہے۔ مگر زبان سے لبیک کیوں نکلا؟ اس لئے کہ لبیک کہتے ہوئے انتقال کر گیا تھا اور لبیک کہتے ہوئے انتقال کیوں کیا؟ اس لئے کہ زندگی بھر یہ جذبہ تھا کہ کسی طرح حج کروں۔ تو جس حالت پر آدمی زندگی گزارتا ہے۔ اس حالت پر موت آتی ہے، قبر سے اٹھتے ہوئے بھی وہی حالت ہوگی۔ معلوم ہوا ذکراللہ اور عبادتِ خداوندی وہ چیز ہے کہ دنیا میں بھی ساتھ، قبر میں بھی ساتھ اور میدان محشر میں بھی ساتھ۔ اور جنت میں بھی ساتھ رہے گی حدیث میں ہے کہ يُلْهَمُوْنَ التَّسْبِيْحَ اہل جنت کو تسبیح الہام کی جائے گی۔ بلا ارادہ سانس کیساتھ اللہ اللہ جاری ہوگا۔ ارادہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کو یہ تکلیف نہیں دی جائے گی کہ تم بیٹھ کے ذکر اللہ کرو، عبادت کرو، نمازیں پڑھو، وہ تو عیش کی جگہ ہے، ہر وقت راحت ہوگی مگر ان کے دلوں میں الہام کیا جائے گا ''پاس انفاس'' جیسے ہوتا ہے، جو صوفیائے کرام نے ذکر بتلایا ہے، ذکر اللہ کی وہ صورت ہوگی۔ ہر وقت سانس کے ساتھ اللہ اللہ جاری ہوگا، اصل غذا وہ ہوگی۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کی چیزیں بھی ہوں گی لیکن کھانے پینے کی محتاجگی نہیں ہوگی۔ تفریح طبع کے لئے کھائیں پئیں گے بھوک کی تکلیف نہیں ہوگی، کیونکہ جنت میں تکلیف کا کوئی نشان نہیں۔②

تو عبادتِ خداوندی دنیا سے چلی، قبر میں پہنچی، میدان محشر میں پہنچی اور جنت تک پہنچ گئی۔ یہ چیز ایسی ہے جو زندگی کا مقصد بن سکتی ہے۔ اگر زندگی اَبدی ہے تو عبادت بھی اَبدی ہے۔ کھانا پینا اَبدی نہیں، یہ تو قبر تک ختم ہوگیا۔ قبر میں کوئی کھانا پینا نہیں ہوگا اور اگر کچھ کھانا پینا ہوگا بھی تو وہ ذکر اللہ ہی ہوگا۔ جنت میں کھانا پینا ہوگا مگر محتاجگی نہیں ہوگی۔ اصل محتاجگی ذکر اللہ کی ہوگی اور وہ زبان پر جاری رہے گا۔

دنیوی زندگی کی روح...... زندگی کا مقصد بنانے کے اگر کوئی چیز لائق ہے تو وہ عباداتِ خداوندی ہے ذکر حق اور اطاعتِ خداوندی ہے۔ یہ چیز ہے جس سے انسان، انسان بنتا ہے۔ اکبر الٰہ آبادی ایک بڑے شاعر گزرے ہیں۔ جن کا ''لسان العصر'' لقب تھا۔ انہوں نے دو شعر کہے ہیں ۔

① الصحيح للبخاري، كتاب الحج، باب التلبية، ج: ٥، ص: ٣٢٥.

② الصحيح لمسلم، كتاب صفة نعيم الجنة واهلها، باب في صفات الجنة واهلها... ج: ١٣، ص: ٤٧٤.

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے ــ یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
اب رہی بحث رنج و راحت کی ــ وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

رنج بھی گزر جاتا ہے، راحت بھی گزر جاتی ہے۔ نہ یہ ابدی نہ وہ ابدی۔ تو اکبر نے کہا کہ مرنا جینا سب کے لئے ہے اور رنج و راحت وقتی چیز ہے۔ آتی ہے گزر جاتی ہے، لیکن ان اشعار میں مقصدِ زندگی نہیں آیا۔ یہ تو آ گیا کہ ان چیزوں کی طرف توجہ نہ کرو۔ سوال یہ ہے کہ پھر کاہے کی طرف توجہ کرو؟ مقصدِ زندگی پھر کیا ہے؟ تو میں نے تین اشعار بڑھا دیئے ہیں اور ان میں مقصد ظاہر کیا گیا ہے۔ اکبر کے تو یہ (مندرجہ بالا) دو شعر ہیں۔ میرے دو شعر اکبر ہی کے مطابق ہیں کہ جن کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہئے۔

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے ــ یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
اب رہی بحث رنج و راحت کی ــ وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

آگے میں کہتا ہوں۔

رہ گیا عز و جاہ کا جھگڑا ــ یہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے

یہ خیالی چیز ہے، یہ لائق توجہ نہیں۔ اور

قابلِ ذکر ہی نہیں خورد و نوش ــ یہ بہیمی کی خو سے لڑنا ہے

کھانا پینا یہ بہیمی کی علامت ہے۔ جانور بھی کھاتے ہیں، ہم بھی اسی کو کھا رہے ہیں۔ ایک مصیبت ہے جو گلے پڑی ہوئی ہے۔ تو یہ مقصد نہیں۔ آگے مقصد کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ۔

مقصدِ زندگی ہے اطاعتِ حق ــ نہ کہ فکرِ جہاں میں پڑنا ہے

اصل مقصد یہ ہے اطاعتِ خداوندی نصیب ہو جائے۔ قرآن کریم میں اس کو فرمایا گیا میں نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں۔ یہ نہیں فرمایا کہ: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَاْكُلُوْنَ﴾ (۱) میں نے اس لئے پیدا کیا کہ خوب کھائیں، خوب مزے اڑائیں۔ یا یوں فرمایا ہو کہ اِلَّا يُعَزَّوْنَ یہ عزتوں کا خوب خیال باندھیں بلکہ فرمایا اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ. فقط میری عبادت کریں۔ آگے فرمایا میں ان سے رزق نہیں مانگتا، یہ ہوں کہ وہ عبادت کریں۔ اور فرمایا ﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾ (۲) رزق دینے والے ہم ہیں۔ طاقتوں کے خزانے ہمارے ہاتھ میں ہیں۔

مطلب یہ کہ ایک کام ہم اپنے ذمے لیتے ہیں۔ ایک تم اپنے ذمے لو۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم ہماری عبادت کرو۔ اور ہمارا کام یہ ہے کہ ہم تمہیں رزق دیں۔ تم عبادت کرنا ترک کرو گے ہم روٹی دینا ترک کر دیں گے۔ ہم تمہیں محتاج و مفلس کر دیں گے گویا، مقصدِ زندگی محض اور محض اطاعتِ حق ہے۔

---

(۱) پارہ: ۲۷ سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶. (۲) پارہ: ۲۷ سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۸.

شبہ کا جواب...... یہاں ممکن ہے کوئی سوال کرے اور سوال وہی کر سکتا ہے، جو قرآن شریف پڑھا ہوا اور قرآن شریف کے کچھ مقاصد اس کے سامنے ہوں کہ صاحب! قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقصد جانوروں کا بھی ہے۔ وہ بھی عبادت کرتے ہیں۔ اس لئے کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ: ﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ ① کوئی چیز عالم میں ایسی نہیں جو خدا کی تسبیح نہ کرتی ہو۔ درخت اور اس کی شاخیں، آسمان وزمین، چاند وسورج سب اللہ کی تسبیح میں مشغول ہیں۔ زبان سب کی الگ الگ ہے۔ تسبیحیں سب کی الگ الگ ہیں۔ مگر ہیں سب تسبیح میں مشغول۔ اب اگر کوئی فرانسیسی زبان میں اللہ کی یاد کرنے لگے، ہم نہیں سمجھیں گے۔ کوئی فارسی زبان میں مناجات کرنے لگے۔ غیر فارسی دان نہیں سمجھ پائے گا۔ کوئی عرب، عربی زبان میں دعا کرنے لگے۔ ہم نہیں سمجھ سکیں گے۔ جب ہم اپنے بھائی بندوں کی زبان نہیں سمجھتے جو انسان اپنے بھائی بندوں کی زبان نہ سمجھے، وہ اگر جانوروں کی زبان نہ سمجھے تو تعجب کی کیا بات ہے؟ قرآن میں یہی تو فرمایا گیا کہ ہر چیز اللہ کی تسبیح کرتی ہے ﴿وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ ② تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں پاتے۔ ان کی زبان الگ ہے، تمہاری زبان الگ ہے۔ پرندہ بظاہر تو سیٹیاں بجا رہا ہوتا ہے۔ مگر حقیقت میں اللہ کی تسبیح کر رہا ہے۔ شیر دھاڑ رہا ہے مگر حقیقت میں اللہ کا نام لے رہا ہے۔ ہاتھی چنگھاڑتا ہے مگر حقیقت میں اللہ کا نام لیتا ہے۔ شیر کی زبان دھاڑنا اور چنگھاڑنا ہے مگر وہ بھی تسبیح۔ اور پرندوں کی زبان سیٹیاں بجانا ہے۔ تم سیٹیاں سمجھتے ہو حقیقت میں تسبیح وتہلیل ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ان کی زبان سے ہمیں واقف کر دے، تب ہمیں پتہ چلے گا کہ یہ تو وہی حمد وثناء کر رہے ہیں۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ آپ کبھی تار گھر میں ٹیلی گراف دینے کے لئے گئے ہوں گے۔ تو آپ نے تار لکھ کر آفیسر کو دے دیا، اس نے جو مشین پر ہاتھ رکھ کر ہینڈل کا جو کھٹکا ہوتا ہے اس کو حرکت دی تو وہ کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ شروع کی۔ آپ کہیں گے کہ یہ بڑا احمق آدمی ہے، میں نے اسے کہا تھا کہ بھائی تار دے دے اور یہ کھٹ کھٹ کر رہا ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ اس کھٹا کھٹ میں ہی سارے علوم اور معلومات دوسرے ملک پہنچ رہی ہیں۔ ظاہر میں کھٹا کھٹ معلوم ہوتی ہے اور حقیقت میں یہ اصطلاحات ہیں۔ ان کے ذریعے سے جو خبر یا پیغام دیا ہے، وہ دوسرے ملک پہنچ رہا ہے۔ دیکھنے میں کھٹا کھٹ کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اسی طرح سے پرندہ ظاہر میں تو سیٹی بجاتا ہے مگر حقیقت میں وہ تسبیح کرتا ہے اللہ نے اسے شعور دیا ہے وہ عبادت کرتا ہے، جس طرح سے ہم تار کی اس آواز کو محض آواز ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن ہم سمجھتے کہ اگر ہم اس فن کو جان لیں تو یہ کھٹا کھٹ نہیں، علوم ہیں۔ بالکل اسی طرح جانوروں کی بولی ہے اگر ہم کسی طرح سے سیکھ جائیں، تب ہمیں پتہ چلے کہ یہ حمد وثناء میں مصروف ہیں۔

① پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۴۴۔ ② پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۴۴۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ نے پرندوں کی بولیوں کا علم دیا تھا قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ﴾ ① سلیمان علیہ السلام فرماتے ہیں۔ اے لوگو! ہمیں جانوروں کی بولیوں کی تعلیم اللہ کی طرف سے دی گئی ہے۔ کوئی جانور بولتا تھا فرماتے تھے کہ اس کا یہ مطلب ہے حدیث میں جانوروں کی تسبیحات بیان کی گئی ہیں کہ تیتر یہ تسبیح پڑھتا ہے۔ پندرہ مثالیں بیان کی گئیں۔ تیتر بولتا ہے تو یہ کہتا ہے کہ" کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ۔" "جیسا کروگے ویسا بھروگے" جیسی کرتوت ہوگی ویسے ہی نتیجہ سامنے آئے گا۔ یہ اس کی تسبیح ہے۔ ②

حدیث میں ہے کہ بعض ملائکہ علیہم السلام کی یہ تسبیح ہے "سُبْحَانَ مَنْ زَیَّنَ الرِّجَالَ بِاللُّحٰی وَزَیَّنَ النِّسَآءَ بِالذَّوَآئِبِ" ③ پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو ڈاڑھیوں سے زینت دی اور عورتوں کو چوٹیوں اور مینڈھیوں سے زینت دی۔ عورتوں کے لئے چوٹی اور مینڈھی رکھنا حسن ہے اور مرد کے لئے ڈاڑھی رکھنا حسن ہے۔ ہر ایک کا حسن الگ الگ ہے۔ مردانہ حسن ڈاڑھی سے اور زنانہ حسن چوٹی اور مینڈھیوں سے ہے۔ غرض بعض ملائکہ علیہم السلام کی تسبیح یہ ہے۔ تو مختلف طریقوں سے پرندے، چرندے اور درندے بلکہ ہر مخلوق کسی نہ کسی طرح کی تسبیح میں مشغول ہے۔ تو کوئی قرآن کریم پڑھنے والا ممکن ہے یہ سوال کرے کہ آپ نے انسان کو اشرف المخلوقات کہہ کر اس کی زندگی کا مقصد عبادت اور ذکر اللہ بتایا ہے۔ وہ جانور، کنکریاں اور پتھر بھی کرتے ہیں، پھر انسان نے کیا کمال کیا جو ذکر اللہ اور عبادت کر لی؟ جیسے آپ نے یوں کہا تھا کہ گدھا، گائے اور جانور بھی کھانا کھاتے ہیں اگر انسان نے کھا لیا تو کیا بڑی بات ہے؟ قرآن کریم کی رو سے ہم کہیں گے ذکر و اطاعتِ خداوندی جانور بھی کرتے ہیں اگر انسان نے کر لی تو کون سا کمال کیا؟ یہ کون سا بڑا مقصد ہے؟ تو ممکن ہے کہ کسی کو یہ شبہ پیدا ہو؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ جانور بھی تسبیح و عبادت کرتے ہیں مگر وہ ارادی عبادت نہیں، وہ ارادہ سے عبادت نہیں کرتے یہ ان کی طبیعتوں کی فطرت کا تقاضا ہے، جیسے مشین چلتی ہے تو مشین ارادہ کر کے نہیں چلتی، ارادہ چلانے والے کے ہاتھ میں ہے۔ یہ سمجھ کر کہ یہ عبادت ہے اور اس کا ثمرہ نکلے گا۔ یہ عقل و شعور جانوروں کو نہیں دیا گیا۔ ارادی عبادت صرف انسان کرتا ہے، تو غیر اختیاری عبادت پر اجر و ثواب کچھ نہیں ملے گا۔ ارادہ اور اختیار سے کی ہوئی عبادت پر اجر و ثواب ملتا ہے اور انہیں افعال پر ترقی مدارج ہوتی ہے اور جو بلا ارادہ خود بخود ہو، اس پر نہ کوئی اجر و ثواب، نہ ہی ترقی مدارج کا وعدہ۔

حاصل یہ نکلا کہ جانور بھی عبادت کرتے ہیں مگر وہ غیر ارادی عبادت ہے، اس میں اختیار کا دخل نہیں۔ یہ ایک طبعی تقاضا ہے۔ جیسے ہم طبیعت کے تقاضے سے کھاتے پیتے ہیں، عقل و شعور سے نہیں کھاتے بھوک جو لگتی ہے تو

---

① پارہ ۱۹، سورۃ النمل، الآیۃ: ۱۶۔ ② تفسیر القرطبی، ج: ۱۳ ص: ۱۶۵۔ ③ یہ حدیث نہیں ہے، علامہ عجلونی اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رواہ الحاکم عن عائشۃ و ذکرہ فی تخریج احادیث مسند الفردوس للحافظ بن حجر فی اثناء حدیث بلفظ: ملائکۃ السماء یستغفرون لذوائب دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۱ ص: ۳۴۳۔

دلائل سے تھوڑا ہی لگتی ہے کہ آپ بیٹھ کر عقل سے سمجھیں کہ اس وقت مجھے بھوک لگنی چاہئے۔ اس میں یہ برکات اور یہ فوائد وغیرہ ہیں۔ لیکن بھوک جب لگے گی تو آپ لاکھ دلیل سے اسے روکنا چاہیں وہ تب بھی لگ کر رہے گی۔ جیسے انسان بے ارادہ کھاتا اور پیتا ہے اور اس پر اجر و ثواب نہیں ایسے ہی اگر کوئی بے ارادہ عبادت کرے اس پر بھی کوئی اجر و ثواب نہیں۔

انسان ارادہ، عقل و شعور سے اور اپنے معبود کو پہچان کر عبادت کرتا ہے اور اس کی یہ شان ہے، اس کے یہ کمالات ہیں اور یہ اس کی صفات ہیں، پھر حق عائد ہوتا ہے کہ اللہ کی عبادت کروں۔ مجھ پر واجب ہے کہ میں اپنے مالک کو یاد کروں۔ دلائل سے سوچ کر، سمجھ کر، ارادہ اور اختیار سے عبادت کرتا ہے۔ کبوتر، کتا، بلی اس شعور سے عبادت نہیں کرتے۔ سیٹیاں بجانا ان کی طبیعت کے تقاضے کی تسبیح ہے۔ اس واسطے یہ فرق ہو گیا۔ دوسرے لفظوں میں حاصل یہ نکلا کہ اتنی لمبی چوڑی زندگی کا مقصد ارادی عبادت ہے، جو جانوروں کو میسر نہیں۔

دوسرے شبہ کا جواب...... مگر ایک سوال پھر بھی شاید آپ کے ذہن میں پیدا ہو کہ اچھا صاحب! یہ ہم نے مان لیا کہ جانور ارادی عبادت نہیں کرتے، یا اختیاری عبادت صرف انسان کرتا ہے، مگر ملائکہ علیہم السلام تو ارادہ سے عبادت کرتے ہیں۔ وہ تو اپنے معبود کو پہچان کر شعور سے عبادت کرتے ہیں اگر انسان نے عبادت کر لی تو کیا کمال کیا؟ انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کام تو فرشتے بھی کر رہے ہیں۔ پھر سوال وہیں کا وہیں رہ گیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ ملائکہ علیہم السلام ارادہ سے عبادت کرتے ہیں، اختیار سے عبادت کرتے ہیں۔ لیکن ارادے کی کی ہوئی عبادت ہی ان کے نفس کا تقاضا ہے۔ اس لئے کہ ان میں گناہ کا مادہ نہیں، وہ برائی کر ہی نہیں سکتے، وہ جب کریں گے نیکی ہی کریں گے، جب کریں گے عبادت ہی کریں گے۔ تو وہ بھی ان کی طبیعت کا تقاضا ہوا فرق اتنا ہے کہ جانور طبیعت کے تقاضے سے بلا ارادہ عبادت کرتے ہیں۔ ملائکہ علیہم السلام طبیعت کے تقاضے سے ارادی عبادت کرتے ہیں۔ تو دونوں جگہ طبیعت کا تقاضا ہے، فرشتوں کی طبیعت میں گناہ کا مادہ نہیں اور شر کا مادہ نہیں کہ وہ مقابلہ کر کے عبادت کریں، بس وہ عبادت ہی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور عبادت کرتے ہیں۔

انسان اپنے نفس کا مقابلہ کر کے عبادت کرتا ہے، نفس چاہتا ہے کہ میں آرام سے پڑ کے سوؤں وہ کہتا نہیں لحاف اتار کے جا کر اپنے رب کی عبادت کر، سردیوں کے زمانے میں نفس کا تقاضا یہ ہے کہ گرم گرم لحاف میں پڑا رہے۔ مگر انسان اس گرمی کو چھوڑ کر لحاف کو اتار کر وضو کرتا ہے اور اسے ٹھنڈے گرم کی خبر نہیں، ہوا میں چل کر مسجد کی طرف آتا ہے، مسجد میں آنے کے بعد بھی اونگھ آ رہی ہے مگر پھر بھی وہ عبادت کرتا ہے۔ تو اس کی عبادت اپنے نفس کے مقابلے میں ہے۔ فرشتے نفس کا مقابلہ کر کے عبادت نہیں کرتے۔ فرشتوں کے نفوس تو پاک ہیں۔ ان کا تقاضا ہی یہ ہے کہ عبادت کرو۔ فرق ہو گیا۔ تو یہ عبادت زیادہ قابلِ قدر ہے جو اپنا مقابلہ کر کے کی جائے۔ اس لئے کہ طبعی تقاضوں کے مطابق کئے ہوئے کام زیادہ قابلِ توجہ نہیں ہوتے۔

اگر آپ یوں کہیں گے کہ میں بڑے اعلیٰ درجہ کا انسان ہوں اس لئے کہ میں روٹی کھایا کرتا ہوں۔ لوگ کہیں گے کہ بھائی یہ کونسا کمال ہے؟ یہ تمہاری طبیعت کا تقاضا ہے، تم اسے پورا کرو گے ہی کوئی ایسا کام بتاؤ کہ تم نے اپنے نفس کے خلاف کر کے کیا ہو؟ اور اگر کسی کی نسبت یہ معلوم ہو کہ فلاں صاحب ایک ہفتے تک کھاتے ہی نہیں۔ دنیا پیچھے دوڑ پڑے گی کہ صاحب کوئی ولی اللہ معلوم ہوتے ہیں۔ دیکھ رہے ہے کہ بھگی جارہی ہے کیوں۔؟ اس لئے کہ نفس کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ نفس کا تقاضا کھانا ہے اور وہ ایک ایک ہفتہ کھانا نہیں کھاتے تو کھانا کمال نہیں، نہ کھانا کمال ہے۔ اس لئے فرشتہ اگر عبادت کرتا ہے تو نفس کے خلاف نہیں۔ وہ ایسا ہے، جیسے ہم نے روٹی کھالی۔ اگر طبیعت کے خلاف کر کے عبادت ہوتی تو کمال تھا اور قابلِ قدر تھی۔ معلوم ہوا کہ انسان کی عبادت فرشتے کی عبادت سے زیادہ قابلِ قدر ہے۔ وہ طبیعت کے تقاضے پورا کرتا ہے۔ یہ طبیعت کا مقابلہ کر کے عبادت کرتا ہے۔ اپنے کو پہلے ختم کرتا ہے پھر عبادت کرتا ہے۔ یہ زیادہ قابلِ قدر ہے۔

گویا اس لمبی چوڑی زندگی کا مقصد یہ نکلا کہ عبادت ہو۔ ارادی ہو اور نفس کی مخالفت کے ساتھ ہو۔ یہ کام انسان ہی کر سکتا ہے اور کوئی نہیں کر سکتا اس واسطے فرمایا کہ ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (1) میں نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا مگر یہ کہ وہ میری عبادت کریں۔ ایسی عبادات جو ارادی ہو اور نفس کی مخالفت سے ہو۔ تو انسان کی عبادت ہی کو یہ خصوصی امتیاز حاصل ہے کہ وہ ملائکہ علیہم السلام اور دیگر مخلوقات سے بڑھی ہوئی ہے اور افضل ہے۔ بہر حال مقصدِ زندگی اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے، وہ صرف عبادت اور اطاعت خداوندی ہو سکتی ہے۔

طاعتِ خداوندی مقصدِ زندگی کیوں ہے؟...... اس کی بناء اور حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی جتنی بھی چیزیں ہیں، یہ سب آپ کے کام کی ہیں، چنانچہ سب آپ کے کام میں لگی ہوئی ہیں۔ زمین بھی آپ کے کام میں لگی ہوئی ہے۔ سورج بھی آپ کے کام میں لگا ہوا ہے۔ دریا بھی آپ کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ الغرض کائنات کا ہر ذرہ اس کا خادم ہے اور حضرتِ انسان مخدوم ہے۔

اس لئے کہ انسان کی زندگی کا دار و مدار ان چیزوں پر ہے، ان میں سے ایک بھی نہ رہے، تو انسان باقی نہ رہے گا۔ اگر سورج بالکل ہٹا دیا جائے، زندگی ختم ہو جائے گی۔ نہ سورج نکلے گا، نہ چاند ہوگا، نہ حرارت اور گرمی باقی رہے گی۔ انسان باقی نہیں رہ سکتا، زندگی کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اسی طرح اگر دنیا میں سے ہوا کو کھینچ لیا جائے، ایک لمحے کے لئے بھی آدمی زندہ نہیں رہ سکتا، سانس ہی نہیں چل سکتا۔ تو زندگی ختم ہوگئی۔ ''عَلٰی هٰذَا الْقِيَاس'' دنیا میں پانی نہ رہے اور ایک قطرہ بوند بھی کسی کو نہ ملے، تو بھی انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ غرض آگ، پانی، مٹی، ہوا، زمین سورج اور ستارے وغیرہ ذٰلک ان میں سے اگر ایک چیز بھی ختم کر دی جائے، انسانی زندگی ختم ہو جائے گی۔ معلوم ہوا کہ ہر چیز انسان کے کام کی ہے، انسانوں کے لئے ہی بنائی گئی ہے۔ لیکن انسان خود ان میں سے کسی

(1) پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶.

کے بھی کام کا نہیں ہے۔ اگر سارے انسان ختم ہو جائیں۔ سورج کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔ اگر ایک بھی انسان باقی نہ رہے۔ زمین اسی طرح قائم رہے گی۔ آسمان اسی طرح قائم رہے گا۔ تو آپ نے اندازہ کیا کہ ان میں سے ایک چیز بھی نہ رہے۔ انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور سارے انسان ختم ہو جائیں، ان چیزوں کا کچھ نہیں جاتا۔ معلوم ہوا کہ ساری چیزیں تو انسان کے کام کی ہیں۔ مگر انسان ان میں سے کسی کے کام کا نہیں ہے۔ آخر دنیا کے کروڑوں انسان ختم ہو گئے اور یہ سب کچھ اسی طرح موجود ہے۔

انسان صرف اللہ کے کام کا ہے..... انسان ان میں سے کسی کے کام کا بھی نہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ساری چیزیں انسان کے کام کی ہیں۔ آخر انسان کس کے کام کا ہے؟ جواب اس کا یہی ہے کہ جب انسان مخلوقات میں سے کسی کے کام کا نہیں ہے، خالق کے کام کا ہوگا۔ اور خالق کا کام یہ ہے کہ اس کے سامنے اس کی اطاعت کرے، اس کے سامنے نیاز مندی برتے، عبادت کرے اور جھکے۔ تو انسانی زندگی کا مقصدِ اصلی نکل آیا جو اطاعت اور عبادتِ خداوندی ہے۔ اسی لئے یہ سارا کارخانہ قائم کیا گیا۔ کھانے اور پینے کا نظام قائم کیا گیا۔ کیونکہ انسان اس وقت تک عبادت نہیں کر سکتا۔ اس لئے غذائیں، پانی اور ہوا کو پیدا کیا۔ اسی طرح جب تک چاند نہ ہو، عبادت نہیں کر سکتا، اللہ نے سورج چاند کو پیدا کر دیا۔ درخت، جانور پہاڑ، پیدا کر دیئے۔ یہ سب کچھ اس لئے پیدا کیا کہ انسان یہ سب کچھ استعمال کر کے تیار ہو جائے اور اپنے اللہ کی عبادت کرے۔ الغرض یہ سارے انتظامات انسان کے لئے ہوا انسان اپنے مالک کے لئے۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک شخص گھوڑا پالے۔ تو گھوڑے کے لئے اصطبل بنائے گا اور اصطبل کے لئے ایک سائیس رکھے گا، جو گھوڑے کی خدمت کرے گا۔ گھاس دانہ اس کے لئے مقرر کرے گا، اس کے لئے ملازم رکھے گا۔ یہ سارا گھوڑے کے لئے کیا جا رہا ہے۔

اور گھوڑا کس کے لئے؟ صرف مالک کی سواری کے لئے۔ اگر سواری کے وقت گھوڑا شرارت کرنے لگے اور سواری کا کام نہ دے، گھوڑا کس کام کا؟ وہ تو گولی مار دینے کے قابل ہے۔ مالک کہے میں نے سارے انتظامات اس کے لئے کئے اور اس کو اپنے لئے رکھا، اگر میرے ہی کام کا یہ نہیں، تو یہ رکھنے کے قابل کہاں؟ اس لئے جب گھوڑا ختم ہو جائے گا، مالک اصطبل کو، سائیس کو، ملازم وغیرہ کو از خود ختم کر دے گا۔ اس لئے کہ یہ سب چیزیں گھوڑے کے لئے تھیں اور گھوڑے کا مقصد تھا کہ مالک کو سواری کا کام دے۔ جب وہ مقصد پورا نہیں ہوگا، گھوڑا بھی ختم، اصطبل بھی، سائیس بھی ختم۔

ہم اور آپ اس اصطبل میں موجود ہیں۔ دنیا کو اللہ تعالیٰ نے ایک اصطبل بنایا، جس میں غذائیں رکھیں۔ اصطبل کی چھت بھی بنائی، پھر اس میں آگ ہوا وغیرہ سب کچھ رکھا۔ یہ سب کچھ آپ کے لئے اور آپ کو اس لئے کہ مالک کی عبادت کریں۔ اگر انسان عبادت نہیں کرے گا، تو وہ گولی مار دینے کے قابل ہے۔ اور اگر سارے ہی

مل کر عبادت چھوڑ دیں، تو سارے انسان ختم ہو جائیں گے، یہ اصطبل بھی ڈھا دیا جائے گا، اور اس میں جو سامان کھانے پینے کا ہے وہ بھی ختم کر دیا جائے گا، اور اسی کا نام قیامت ہے۔

فرمایا گیا کہ قیامت اشرارِ خلق پر قائم ہوگی۔ ان لوگوں پر جو بدترین خلائق ہوں گے، جنہیں اچھے برے کی تمیز نہیں ہوگی، برسرِ بازار برائیاں کرتے پھریں گے جیسے جانور اور بہائم ہوتے ہیں۔ اللہ کی کوئی قدر قلوب میں باقی نہیں رہے گی۔ جب اس طرح کے انسان بن جائیں گے تو انسان ختم کر دیے جائیں گے۔ آسمان بھی اٹھا دیا جائے گا زمین بھی ختم کر دی جائے گی۔ اس لئے کہ جب تخلیقِ انسانی سے مقصدِ خداوندی ہی پورا نہیں ہوتا، پھر یہ چیزیں بھی بیکار ہیں۔ ساری چیزیں انسان کے لئے ہیں۔ اگر وہ مالک کے کام کا ہے تو ساری چیزیں برقرار ہیں۔ اگر وہ اپنے مالک کے کام کا نہیں، یہ ساری چیزیں ختم کر دی جائیں گی۔

عقلی اعتبار سے عبادتِ خداوندی کی ضرورت...... آپ اللہ سے لو لگائیں تو یہ ساری کائنات آپ کی خدمت کرے گی، لیکن اگر آپ اپنے مالک کو چھوڑ کر اس کائنات سے لو لگائیں تو مالک کا کیا بگڑے گا، وہ یہ چاہے گا کہ یہ انسان گولی مار دینے کے قابل ہے۔

بالکل ایسی مثال ہے کہ ایک شخص کسی صاحبِ جمال عورت سے نکاح کرے۔ بڑی شائستہ، مہذب اور حسین وجمیل ہو۔ اس کے لئے ایک عمدہ بلڈنگ تیار کی، تاکہ یہ عورت آرام کر سکے۔ بلڈنگ میں کچھ فراش مقرر کئے تاکہ وہ اس کو جھاڑیں اور صاف کریں۔ باورچی مقرر کئے تاکہ دو وقت کھانا پکائیں، تو اس نے یہ خیال کیا کہ اس کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو، اس لئے ایک لمبا چوڑا تاج محل قائم کیا۔ بڑی لمبی چوڑی اور عالیشان بلڈنگ قائم کی۔ یہ سب کچھ کا ہے کے لئے؟ صرف بیوی کے لئے۔ اور بیوی کا ہے کے لئے؟ صرف خاوند کے لئے۔

اگر یہ بیوی خاوند کی بجائے کسی نوکر سے ملاقات شروع کر دے۔ یا اس محل میں باہر سے کوئی آدمی آنے لگے تو خاوند پر کیا گزرے گی؟ وہ کہے گا یہ بیوی طلاق دینے کے قابل ہے، بلکہ گولی مار دینے کے قابل ہے، اس نے تو میری آبرو ختم کر دی، تو وہ بیوی کو ختم کر دے گا۔ جب بیوی ختم ہو جائے گی، بلڈنگ کو کیا کرے گا؟ اسے بھی ختم کر دے گا اور جب بلڈنگ ہی نہ رہی، فراش کو رکھ کر کیا کرے گا؟ باورچی وغیرہ کس کام آئیں گے؟ یہ تو ساری چیزیں بیوی کے لئے تھیں۔ جب بیوی کو طلاق دے کے نکال دیا، ان چیزوں کی کیا ضرورت باقی رہی؟ یہ قصہ کب ہوگا؟ جب بیوی اپنے خاوند کی ہونے کی بجائے کسی دوسرے کی بننے لگے۔ فراشوں سے ہاتھ ملانے لگے، نوکروں سے آشنائی کرنے لگے، ایسے میں یہ بیوی نکال دینے ہی کے قابل ہوگی۔

ٹھیک اسی طرح سے سمجھ لیجئے کہ اللہ نے انسان کو بڑی مخلوق بنایا۔ اللہ کو انسان سے اس سے بھی زیادہ محبت ہے، جتنی کہ ایک خاوند کو بیوی (بلکہ ماں کو بچے) سے ہو سکتی ہے۔ اس کی ضرورت کے لئے حق تعالیٰ شانہ نے ایک بڑی بلڈنگ تیار کی اور آسمان کا خیمہ قائم کیا۔ اور زمین کا فرش بچھایا۔ ﴿جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ

فِرَاشًا ﴾① ”زمین کو ہم نے تمہارے لئے فرش بنایا“۔﴿وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا﴾ ② ”آسمان کو تمہارے لئے محفوظ چھت بنا دیا“۔ روشنی کی ضرورت تھی تو چاند سورج کے بلب لگا دیئے، تا کہ کائنات کے اندر روشنی ہو۔ کاروبار کے لئے تیز روشنی کی ضرورت تھی تو دن میں سورج نکال دیا۔ رات کو ہلکی روشنی کی ضرورت پڑتی ہے تو چاند ستارے نکال دیئے۔ ان میں روشنی بھی ہے مگر آنکھوں میں چمک نہیں پیدا کرتی۔ تو رات میں دھیمی اور دن میں تیز روشنی رکھی۔ دن کاروبار کے لئے اور رات آرام کے لئے ہے۔ فرمایا ﴿وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا﴾ ③ رات کو سکون کے لئے بنایا گیا، تاکہ آرام کیا جا سکے۔ ﴿وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا﴾ ④ دن کو کام کاج کے لئے بنایا۔ تاکہ کارخانے لگا کر کام کریں، تو اس میں تیز روشنی رکھی۔ رات کو دھیمی روشنی رکھی۔ پانی کی ضرورت تھی، سو ہر طرف دریا بہا دیئے۔ بارش سسٹم الگ قائم کیا تا کہ پانی ہر وقت ملتا رہے۔ مخلوق کو تکلیف نہ ہو۔ زمین کو فرش بنایا۔ یہ فرش بھی ہے اور گودام بھی ہے اس لئے کہ غذائیں اسی میں سے نکلتی چلی آ رہی ہیں۔ گندم، چاول اور بے شمار نعمتیں بھی۔ تو یہ فرش اور بچھونا بھی اور ساتھ ہی گودام بھی کہ اس میں سارے غلے رکھے ہوئے ہیں۔ ساری ترکاریاں رکھی ہوئی ہیں۔ بارش سسٹم بھی اسی میں ہے۔ دریا بھی اسی میں ہیں۔ پھر پانی آسمان میں نہیں ہے۔ زمین کے اندر ہے اور زمین کے بھی اوپر نہیں ہے تا کہ انسان کو تکلیف نہ ہو۔ سورج کی روشنی تھی۔ گویا وہ ایک لالٹین اور چراغ ہے جس سے انسانوں کو روشنی پہنچتی ہے۔ ایک گھڑی بھی جس سے صحیح اوقات معلوم ہوتے ہیں، جس روز سے اس کے مالک نے اس کو بنایا ہے۔ صحیح ٹائم دیتی چلی آ رہی ہے۔ آج تک بھی اس میں خرابی پیدا نہیں ہوئی اور ایک ہیٹر بھی جس سے گرمی پہنچ رہی ہے تو سورج ایک ہے مگر منافع اس کے بے شمار ہیں۔ اسی طرح زمین ایک ہے مگر اس کے منافع بے شمار ہیں۔

یہ سارا قصہ اس لئے تھا کہ انسان کو تکلیف نہ ہو، کھانے کو ملے، پینے کو ملے، ہوا ملے تا کہ اس کے کام کاج میں کوئی خلل نہ پڑے۔ مگر یہ ساری چیزیں انسان کے لئے ہیں۔ اور انسان اپنے رب کے لئے ہے، تا کہ اس کی طاعت و عبادت کرے۔ اس لئے کہ سب کچھ دینے والے وہ ہیں اور محسن وہ ہیں۔ اس احسانِ عظیم کا بھی تقاضہ ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔

عبادت و طاعت کا عام مفہوم ..... اور پھر عبادت و طاعت کے مفہوم کو اتنا عام رکھا کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق ہو سکتی ہے اور اسے ایک مخصوص انداز کے ساتھ متعین نہیں کیا بلکہ اس کو اتنا آسان کر دیا کہ مسلمانوں کی خدمت کرنا، دوستوں کی خدمت کرنا یہ بھی اللہ اللہ کرنا ہے۔ جو طاعت و عبادت میں داخل ہے۔

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۲۔ ② پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۳۲۔
③ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۹۶۔ ④ پارہ: ۳۰، سورۃ النبا، الآیۃ: ۱۱۔

میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ہم حج کو گئے تو اس سال وہاں ہیضہ بہت پھیلا، چونکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ سے بیعت تھے اور ان کے خلیفہ بھی تھے۔ فرماتے ہیں کہ اس حج کے موقع پر ہزاروں حجاج بے چارے اسی بیماری میں مبتلا تھے اور میرا یہ کام تھا کہ ایک کو دوا پلا رہا ہوں، تو ایک کے لئے کھانا لے کے آ رہا ہوں۔ بس خدمت میں لگا ہوا، نہ طواف کر سکتا تھا، نہ حرم میں حاضری ہو سکتی تھی۔ اتنا کام رہ گیا کہ کبھی کسی کو دوا پلا رہا ہوں تو کسی کو لوٹے میں پانی وغیرہ دے رہا ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔

غرض اسی پریشانی میں تھا۔ میں نے اپنے شیخ حضرت حاجی حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے اپنے حال کی شکایت کی کہ حضرت میرا آنا نہ آنا تو برابر ہو گیا۔ کہ میں نہ تو طواف کے قابل، نہ مدینہ منورہ جانے کے قابل میرے ہاتھ میں تو بس دوا کا پیالہ ہے، اور بیماروں کے پاس پڑا ہوں۔ فرماتے تھے کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح سے انگلی دبائی اور فرمایا۔ میاں یہ کیا بات کہی آپ نے؟ حج اور طواف بھی عبادت ہے، مگر اس سے بڑھ کر مسلمانوں کی خدمت کرنا ہے، یہ عبادت ہے، تو اجر و ثواب اس سے کہیں زیادہ ملے گا جتنا حج اور طواف میں ملتا۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است

آدمی اپنے دل کو قابو میں لائے کہ یہ سب سے بڑا حج ہے، تو فرمایا کہ حج کا فریضہ ادا کر لیا ہے۔ اب ان بیماروں کی خدمت کرو، ہزار طواف سے بڑھ کر اجر و ثواب ملے گا۔ جو طواف میں نہیں ملے گا۔ گویا بتلایا کہ عبادت فقط صدقہ اور نماز میں نہیں ہے۔ عبادت کی بہت سی شاخیں ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب جو دارالعلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس ہیں اور مولانا رفیع الدین صاحب جو سب سے پہلے مہتمم ہیں۔ نقشبندیہ خاندان کے بزرگ ہیں اور صاحب کشف و کرامت بھی ہیں، اول الذکر دونوں حضرات بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے، مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی آئے، مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تواضع کی اور عرض کیا کہ حضرت آپ بھی کھائیے۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت میرا تو روزہ ہے۔ نفلی روزہ تھا۔ غروب آفتاب میں کوئی دس منٹ باقی تھے، انہوں نے فرمایا کہ حضرت کھائیے۔ اللہ اس میں آپ کو زیادہ اجر دے گا۔ بس فوراً بیٹھ گئے اور کھانا شروع کر دیا۔ روزہ توڑ دیا، حضرت فرماتے تھے کہ مجھے اس تعمیل حکم میں جو اجر ملا ہے اگر میں ہزار روزے بھی رکھتا تو وہ اجر و ثواب نہ ملتا، جو اس وقت روزہ توڑنے میں ملا۔

تو عبادت فقط نماز روزہ میں نہیں ہے، عبادت کھانے، پینے میں بھی ہے، سونے، جاگنے، چلنے پھرنے میں بھی ہے۔ گویا اللہ فقط مسجد میں نہیں ملتا۔ گھر میں بھی ملتا ہے۔ دسترخوان پر بھی ملتا ہے۔ ہر جگہ آدمی اللہ کا جمال دیکھ سکتا ہے، جبکہ سچی نیت سے چلے اور طریق شریعت کے مطابق چلے۔ اتباع کا جذبہ لے کر چلے۔ تو ہر چیز اس کے لئے طاعت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اِسلام دُنیوی معاملات سے روکنے کے لئے نہیں آیا..... حق تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا کہ یہ ساری دنیا تمہارے لئے ہے اور تم اپنے مالک کے لئے ہو۔ مملوک کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے مالک کے سامنے نیاز مندی سے جھکے اور اطاعت کرے۔ جب آدمی اس میں مضبوط ہو جائے گا تو کوئی بھی دنیا کا کام کرے، اس میں خیر و برکت ہوگی۔

اسلام یہ نہیں کہتا کہ تم کاروبار نہ کرو۔ دنیوی معاملات ترک کر دو۔ اپنے تحفظ کی شکلیں اختیار نہ کرو۔ سب کچھ کرو مگر اللہ کو حاضر و ناظر جان کر کرو۔ عابد اور بندے بن کے کرو۔ یہ سمجھ کر کہ اسباب میں کچھ نہیں رکھا۔ اس کے حکم کی تعمیل میں ہم نے یہ اسباب اختیار کئے ہیں۔ تو دینِ اسلام صرف درست کرنے کے لئے آیا ہے۔ آپ کے کاموں میں روڑے اٹکانے کے لئے نہیں آیا قلب کا رخ اللہ کی طرف پھیر لو اور کام ساری دنیا کے کرو۔ وہ خیر بنتے چلے جائیں گے۔ مسلمان کی شان یہ ہے، کہ دس بیار، دست بکار۔ دل مالک میں لگا ہوا ہے اور ہاتھ پیر کاروبار میں لگے ہوئے ہیں۔ ایسے کاروبار میں بھی برکت ہے، یہ عبادت ہی شمار ہوگی۔

تو اسلام کاروبار اور تجارت و زراعت کو روکنے کے لئے نہیں آیا۔ سب چیزوں کی اجازت دی مگر یہ کہ میرے ساتھ تعلق قائم کر کے میرے حکم کے مطابق چلو۔ اس لئے اسلام آیا ہے۔ اگر اپنے نفس کے حکم کے مطابق چلو گے تو نفس تو ہر ایک کا آزاد اور باغی ہے۔ ظاہر ہے اس سے نہ دنیا بنے گی نہ آخرت۔ اگر یہ ساری چیزیں حکم خداوندی کے تحت کریں تو اس میں خیر و برکت ہوگی۔ دنیا بھی بنی اور آخرت بھی بنی۔

تو دین کا کام قلب کا رخ درست کرنا ہے جب وہ درست ہو جائے گا، سارا راستہ درست ہوتا چلا جائے گا اور اگر خدانخواستہ وہ غلط ہوگا، سارے کام غلط ہوں گے۔ مثلاً آپ سفر میں جائیں اور دو چار ہزار میل کا سفر کیا، لیکن رخ بدل گیا تو جتنا سفر کرتے جاؤ گے منزلِ مقصود سے دور ہٹتے چلے جاؤ گے۔ تو سفر کی تیاری میں تو آپ نے کمی نہیں کی۔ روپیہ بھی خرچ کیا۔ سامان بھی لیا، لیکن بجائے اِدھر کے اُدھر چل پڑے۔ جانا تھا آپ کو نیروبی اور راستہ فرانس کا اختیار کر لیا اور اپنے دل میں یہ سمجھ رہے ہیں۔ کہ نیروبی جا رہا ہوں، جتنا چلو گے نیروبی سے دور ہوتے جاؤ گے۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ راستہ بھی چلو، روپیہ بھی خرچ کرو۔ مگر منزل متعین کر لو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف جانا ہے۔ جنت کی طرف چلنا ہے۔ آخرت کی طرف چلنا ہے۔ رخ صحیح کر لو ساری دنیا دین بنتی چلی جائے گی۔ اور رخ اللہ تعالیٰ سے پھیر لو۔ ساری چیزیں وبال بنتی چلی جائیں گی۔ خیر و برکت تو اس میں کیا ہوگی؟ اسلام کا کام راستہ درست کرنا اور صراطِ مستقیم پر چلنا ہے اور یہی حاصلِ عبادت ہے جس کے لئے انسان پیدا کیا گیا ہے۔ تو فرمایا ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ ① ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا کہ وہ ہماری عبادت کریں اور عبادت کا مفہوم عام قرار دیا۔ اس لئے کھانا، پینا، سونا جاگنا بھی عبادت ہے۔ جب یہ منزلِ مقصود ہماری ذات کو ٹھہرا دیا جائے۔ بس مقصود یہ ہے کہ مسلمان کی منزل اللہ ہو۔ وہ ہر کام کرتا جائے، خدا کی طرف چلتا

---

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶.

جائے اس کا ہر کام باعثِ خیر و برکت ہوگا۔ اور فرمایا: ﴿مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ○ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾ ① ترجمہ: ہم یہ نہیں کہتے کہ تم ہمیں رزق پہنچاؤ، تم ہمیں روٹی کھلاؤ، ہم تو غنی ہیں۔ روزی کا ذمہ دار اللہ تعالیٰ ہے وہ دینے والا ہے۔ ہم روزی نہیں مانگتے۔ تمہاری نیازمندی چاہتے ہیں، روزی ہم دیں گے۔

اللہ اور بندہ میں معاہدہ..... تو ایک کام اللہ نے اپنے ذمہ لیا اور ایک کام بندوں کے ذمہ لگایا، اپنے ذمہ یہ کیا کہ ہم رزق دیں گے، عزت دیں گے۔ تمہارے ذمہ یہ کیا کہ تم عبادت کرو۔ نیازمندی برتو۔ اب تم اپنا کام چھوڑ دو گے، وہ بھی اپنا کام چھوڑ دیں گے۔ اس لئے جو عبادت ترک کر دے گا، تو روزی اور عزت، جو دیا جا رہا تھا، اس کو بھی بند کر دیا جائے گا۔ اگر اسی کام میں لگے رہے جو آپ کے سپرد کیا گیا، پھر وہ اپنا کام انجام دیں گے، گویا معاہدہ ہے۔ لیکن جب یہ عہد شکنی کرے گا، تو دوسرے کے ذمہ عہد پورا کرنا نہیں رہ جاتا۔ آج جو مسلمان پریشان ہیں کہ ہمارا غلبہ ختم ہو گیا، اقتدار ختم ہو گیا۔ حاسدین ہم پر چھا گئے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ تم نے اپنا کام چھوڑ دیا، انہوں نے اپنا کام چھوڑ دیا۔

اور انہوں نے اس لئے نہیں چھوڑا کہ ان کے خزانے میں کوئی کمی تھی۔ معاہدہ تھا کہ یہ کام تمہیں کرنا ہوگا اور یہ ہم کریں گے، جب یہ عہد شکنی کرے گا، تو دوسرے کے ذمہ عہد باقی نہیں رہے گا۔ یہ اللہ کا قانون ہے۔ آپ نے اطاعت کا عہد چھوڑ دیا، انہوں نے رزق دینے کا عہد چھوڑ دیا۔ رزق فقط روٹی کو نہیں کہتے۔ رزق، روٹی، عزت، اقتدار اور طمانیتِ قلب یہ سب کچھ اس میں آتا ہے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ ہم سب پریشان ہیں۔ روٹی ہمیں کھا رہی ہے اور ہم روٹی کو کھا رہے ہیں۔ یہ کیوں ہے؟ اس واسطے کہ وہ جو اطمینان قلب والی روزی تھی، وہ ملنا بند ہو گئی۔ وہ ہم سے چھین لی گئی۔ اس لئے چھین لی گئی کہ ہم نے عہد شکنی کی۔ تو یہ عہد یاد دلانے ہی کے لئے چند آیتیں پڑھی تھیں اور یہ وہی آیتیں ہیں جو اس عہد سے متعلق ہیں۔ یہیں سے آپ نے زندگی شروع کی ہے۔ یعنی عہد "اَلَسْتُ" سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ ② "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" میں تمہارا پالنے والا نہیں ہوں؟ تمہیں روزی اور عزت دینے والا نہیں ہوں؟ یہ ساری چیزیں رب میں داخل ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے سوال کیا اور سب نے کہا کہ ﴿قَالُوْا بَلٰى﴾ ③ "کیوں نہیں بے شک آپ ہی رب ہیں"۔ سب کچھ آپ ہی ہیں۔ تو فرمایا ﴿شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ﴾ ④ "فرمایا کہ تم بھی گواہ رہو۔ کہیں قیامت کے دن یوں کہہ دو کہ ہمیں تو یہ بات ہی نہیں بتلائی"۔ ہم کس کی عبادت کرتے؟ کس کو رب مانتے؟ اس سے ہم نے بتلا دیا اور سمجھا دیا۔

---

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۸۔ ② پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۲۔ ③ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۲۔ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۲۔ ④ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۳۔

﴿اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ﴾ ① ”یہ بھی مت کہنا کہ جو ہمارے پچھلے تھے وہ بہت بُرائیاں کر گئے۔ ان کی وجہ سے ہمیں پتہ نہیں تھا“۔ کسی کی برائی سے کوئی نہیں پکڑا جائے گا، خود جو برائی کرے گا۔ اس کی اس کو سزا ملے گی۔ تو یہ نہ کہنا کہ ”اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا“ ہمارے ماں باپ نے شرک اور بت پرستی کی تھی، ہم تو بعد میں تھے، ہمیں کیوں پکڑا جاتا ہے۔ جواب میں ہم جتلاتے ہیں کہ ماں باپ کی وجہ سے کوئی نہیں پکڑا جائے گا۔ جیسے ماں باپ سے عہد لیا تھا تمہارے سے بھی عہد لیا تھا، ایک ایک فرد سے عہد لیا تھا۔ انہوں نے اگر عہد شکنی کی تھی تو تم نے کیوں کی؟ قیامت کے دن یہ عذر نہیں چلے گا کہ پچھلوں کی برائی نے ہمیں اندھیرے میں رکھا۔ ہمیں تو کچھ پتہ نہیں تھا، ہم غفلت میں رہے۔

تو ہماری زندگی عہدِ الست سے چلی ہے۔ جہاں اقرارِ ربوبیت کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ میں خالق اور مالک ہوں۔ مجھے یاد رکھنا! اسی عہد کو یاد دلانے کے لئے انبیاء علیہم الصلوٰۃ السلام آئے۔ یہ روز کی تقریریں اور وعظ اسی عہد کو یاد دلانے کے لئے ہیں، کہ یہ عہد بھول نہ جانا۔ اس لئے جب بندہ اس عہد پر پکا رہے گا۔ اور اس کے مطابق چلے گا، تو ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی اپنے عہد کو پورا کریں۔

بس یہ چند باتیں آیت کے تحت میں مجھے گزارش کرنی تھیں۔ وقت زیادہ ہوگیا ہے۔ اور بقدرِ ضرورت آیات کی تشریح بھی ہوگئی ہے۔ اب دعا کیجئے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حسنِ اخلاق، عبادت، ریاضت اور توجہ الی اللہ کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں اپنی مرضیات پر چلائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۳۔

اسلام میں تصورِ آخرت

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّـــــا بَعْدُ !..... بزرگانِ محترم! دنیااورآخرت دو چیزیں ہیں۔آخرت کے بارے میں عام طور پر لوگوں نے یہ تصور باندھ رکھا ہے کہ آخرت تو آسمانوں کے اوپر ہے اور دنیا یہ ہے، یہ غلط ہے۔ بلکہ ہماری آخرت اسی دنیا میں چھپی ہوئی ہے۔ اسے نکالنا ہمارا کام ہے۔ یہی کھانے پینے کے اور سونے جاگنے کے افعال، انہی میں آخرت چھپی ہوئی ہے۔ان کے ذریعے سے اپنی آخرت نکالو۔ یہ نہیں کہ آخرت کوئی الگ عالم ہےاور دنیا ترک کر دو تب جاکے آخرت میں پہنچو گے۔ دنیا میں رہ کر اس میں سے آخرت نکالنا، یہ دانش مند کا کام ہے۔یہ جو آپ نماز روزہ کرتے ہیں بدن ہی سے تو انجام دیتے ہیں، بدن زمانے میں ہے یا مکان میں ہے، تو اس میں سارے دنیوی ہی افعال ہیں۔ اس سے جنت بن رہی ہے۔ جنت اس نماز سے ہی تو نکلی جو آپ نے بدن سے سرانجام دی۔ آخرت کوئی الگ تو نہیں تھی۔

یتیم کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور ہزاروں نیکیاں لکھی گئیں، وہ ہزاروں نیکیاں جنت ہی تو ہیں۔ آپ کی اس دنیا ہی میں آخرت چھپی ہوئی ہے۔ کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ افعال صحیح ہو کے آئیں، جنت یہیں سے بن جائے گی۔ افعال غلط ہو کے آئیں، تو جہنم یہیں سے بن جائے گی۔

حدیث میں فرمایا گیا اگر آدمی کھانا کھانے بیٹھے۔ کھانا ایک طبعی فعل ہے بھوک لگے گی تو آدمی خواہ مخواہ کھائے گا، لیکن اس نیت سے کھانے بیٹھے کہ قوت پیدا ہوگی تو عبادت کروں گا۔ اور "بِسْمِ اللّٰهِ" سے شروع کرے اور "اَلْحَمْدُلِلّٰهِ كَثِيْرًا" پر کھانا ختم کرے۔ فرماتے ہیں کہ اس کے پچھلے گناہ سب بخش دیئے جائیں گے۔ حالانکہ کھائی تو روٹی اور گناہ بخش دیئے گئے، گناہوں کا بخشا جانا یہی تو آخرت ہے اس لئے آخرت دنیا ہی میں ہوئی۔

حدیث میں ہے کہ دو بھائیوں نے مصافحہ کیا اور قلبی محبت سے کیا۔ دونوں کے منہ پر مسکراہٹ آگئی اور کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ فرماتے ہیں کہ ہاتھ جدا نہیں کرنے پائیں گے کہ پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ ایک

طبعی فعل انجام دیا مگر اس سے مغفرت ہوگئی بہر حال اس دنیا ہی سے ہماری آخرت نکلتی ہے۔

آخرت کے بارے میں اسلام اور دیگر مذاہب کا فرق ...... یہیں سے دوسرے مذاہب اور اسلام میں فرق پڑ جاتا ہے۔ دوسرے مذاہب یہ سمجھتے ہیں کہ آخرت دنیا سے بالکل الگ تھلگ کوئی چیز ہے۔ جب تک ترک دنیا نہیں کرو گے آخرت نہیں ملے گی۔ مثلاً ہندو مذہب ہے، اس میں سنیاس لیتے ہیں کہ گھر بھی ترک کیا بیوی بچے بھی ترک کئے اور جا کر کسی کونے میں بیٹھ جائے۔ اب سمجھتے ہیں کہ آخرت بن گئی۔

عیسائیوں کے ہاں ترکِ لذات ایک مستقل موضوع ہے، کہ گرجا میں آدمی داخل ہو جائے اور یہ عہد کرلے کہ میں نکاح نہیں کروں گا۔ کسی سے ملنے بھی نہیں جاؤں گا۔ بالکل ترکِ دنیا کر کے ایک کونے میں بیٹھ جائے۔ اب سمجھتے ہیں کہ آخرت ملی۔

اسلام نے ان سب چیزوں کو رد کر دیا کہ یہ رہبانیت ہے۔ اسلام نے بتایا کہ گوشے میں بیٹھ جانا پہاڑوں میں بیٹھ جانا، سمندر کے کناروں پر اپنے آپ کو گرا دینا، اس سے آخرت نہیں بنتی۔ دنیا میں رہ کر، لوگوں میں رہ کر، ان کی اڑی کڑی جھیل کر اصلاح کی کوشش کرے، اس سے آخرت بنے گی، اسی کھانے اور پینے سے آخرت بنے گی۔ یہ نہیں کہ تم کھانا پینا چھوڑ دو۔ قرآن حکیم نے حکم دیا ﴿كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا﴾ اللہ نے جو پاکیزہ چیزیں تمہارے لئے بنائی ہیں، انہیں استعمال کرو اور اعمالِ صالح اختیار کرو۔ جتنی نیت سچی ہوگی اسی میں سے آخرت بنے گی۔ یہ نہیں کہ کھانا پینا چھوڑ دو اور جنگل میں جا بیٹھو تب آخرت بنے گی۔

اسی طرح لباس ہے تو بعض مذاہب میں ترکِ لباس ہے۔ صرف لنگوٹا باندھو فرض لباس بھی ترک کیا۔ اسلام نے ناجائز قرار دیا کہ یہ رہبانیت ہے۔ گوشہ گیری ہے یہ اسلام میں نہیں ہے لباس پہنو، موٹا پہنو، اچھا پہنو، نیت اچھی رکھو۔ اسی سے آخرت نکلے گی۔ تو کھانا پینا، رہنا سہنا، مکان بنانا، اس سے اسلام نے نہیں روکا۔ مگر نیت صاف رکھنے کو کہا ہے۔ تھوڑی بہت زینت اور طبیعت کے موافق کرنے سے نہیں روکا۔ مگر نیت صاف رکھنے کو کہا اس سے یہی چیزیں آخرت بنیں گی۔ تو اور مذاہب میں تو یہ کہ ترکِ دنیا سے آخرت بنتی ہے۔ اسلام یہ ہے کہ دنیا میں رہ کر نیت صحیح کرنے سے آخرت بنتی ہے۔ انہی افعال میں سے آخرت بنے گی۔

اب مکان ہے۔ گیاہ میں ہم نے دیکھا کہ ان لوگوں کے ہاں خدا رسیدہ وہ ہے جس کا نہ گھر ہو نہ در ہو۔ صبح کے وقت ان کے ہاں ایک لشکر نکلتا ہے۔ وہ گھر گھر کھانا، مانگتے ہیں ان کے ہاں کھانا دانا نہیں پکتا، کسی نے بھیک دے دی، کھالیا۔ اسلام نے اسے ممنوع قرار دیا کہ یہ کام نہیں کہ اپنے نفس کو ذلیل کرے، بلکہ باوقار رہے۔ تو کھائے بھی، پیئے بھی، پہنے بھی، طیبات کو استعمال کرے اور نیت یہ رکھے کہ اپنی آخرت کے لئے کر رہا ہوں۔ حکم خداوندی ہے تعمیلِ حکم کر رہا ہوں۔ وہی چیز اجر کا ذریعہ بنے گی۔ اسلام نے یہ نہیں کہا کہ بھک منگے بن جاؤ۔ دنیا کماؤ، اس سے اپنی خدمت کرو اور کسبِ حلال کو فرض قرار دیا۔ تجارت کرو۔ یہ راستہ دکھلایا نہ یہ کہ سب چیزیں

چھوڑ کر پہاڑ کے گوشے میں جا کر بیٹھ جاؤ۔

بعض مذاہب میں یہ ہے کہ اعضاء کو مفلوج کر دو تو آخرت بن جاتی ہے۔ مثلاً ہاتھ اونچا کر دیا، وہ خشک ہو گیا اور وہ یہ سمجھے کہ اب آخرت بنی، اسلام نے کہا یہ لغویت ہے، اس سے آخرت کا کیا تعلق؟

یا بولنا چھوڑ دیا اس سے سمجھتے ہیں کہ آخرت بنی۔ اسلام نے کہا کہ یہ آخرت کیسی کہ ایک قوت کو ضائع ہی کر دیا۔ قوت سے کام لینے کا نام آخرت ہے نہ کہ قوت کو معطل چھوڑ دینے کا نام آخرت ہے۔

میرا ایک دفعہ ''گیاء'' میں جانا ہوا تو وہاں ایک بہت بڑا اور اونچا مندر ہے۔ اس میں بدھ کی تصویریں ہیں۔ اس کے بت رکھے ہوئے ہیں۔ وہاں ہم نے یہ دیکھا کہ بدھ کا ایک بہت بڑا بت ہے اور لوگ اس کے ارد گرد گھی کے چراغ جلا رہے ہیں۔ بہت سے پجاری چراغ جلا کر جا رہے ہیں۔ میں نے ایک پجاری سے پوچھا۔ اس گھی کو تم کیوں ضائع کر رہے ہو۔ کوئی آدمی کھاوے گا تو اس کے بدن میں قوت پیدا ہوگی اسے کیوں خواہ مخواہ ضائع کر رہے ہو۔ اب وہ سنتا تو ہے مگر بولتا نہیں۔ میں سمجھا کہ یہ بہرہ ہوگا میں نے ذرا زور سے کہا۔ وہ پھر بھی دیکھ رہا ہے جواب کوئی نہیں دیتا۔ میں نے اور زور سے کہا تو لوگوں نے مجھ سے کہا کیوں اپنا زور صرف کر رہے ہو۔ یہ جواب نہیں دے گا، ان کے ہاں چپ رہنا ایک عبادت ہے۔ یہ شخص چالیس برس سے نہیں بولا اور یہ پچاس برس سے نہیں بولا۔ تو زبان ایک قوت ہے اس کو ضائع کر دینے کا نام عبادت نہیں ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ اس قوت سے ہی تو آخرت کماؤ گے۔ قوت ضائع کر دی، آدمی ناقص رہ گیا تو آخرت بھی ناقص۔ زبان کو استعمال کرو، تلاوتِ کلام پاک میں، درود شریف پڑھنے میں اور عبادت میں لوگوں کی اصلاح میں نیک مشورے دینے میں اور سچی باتیں کہنے میں۔ اس میں قوت کو استعمال کرو۔ تو آخرت بنے گی۔ نہ یہ کہ قوت کو ختم کر دو اور بیکار بیٹھ جاؤ۔ اس سے تو بدلی بنے گی۔

ہاتھ ہے آپ اس کے ساتھ مصافحہ کریں گے، اجر ملے گا۔ آخرت بنے گی۔ قرآن کریم کو ہاتھ لگائیں گے، اجر ملے گا۔ بیت اللہ شریف کو چھوئیں گے، اجر ملے گا، ہاتھ ہوگا جبھی تو اجر ملے گا۔ اور اگر ہاتھ کو اٹھا کر خشک کر دیا، قوت بھی ختم اور اجر بھی ختم ہو گیا۔ تو جتنے اجر و ثواب کے راستے تھے وہ سارے بند ہو گئے۔

اس طرح پیر کو مفلوج کر دیا۔ پیر ہوگا تو مسجد کی طرف جائیں گے دوستوں کے گھر بھی جائیں گے عبادت گاہوں میں بھی جائیں گے مجلسِ وعظ میں بھی جائیں گے۔ اس سے اجر و ثواب کے ڈھیر ملیں گے اور جو پیر کو کلہاڑا مار کے ختم کر دیا تو نہ مجلس رہی نہ مسجد کی طرف جانا رہا، نہ حج رہا، وہ کیا خاک اجر ملا؟

تو تمام مذاہب نے یہ کہا ہے کہ دنیا ترک کرو، تب آخرت ملے گی۔ بدن کو کھو دو تو آخرت ملے گی۔ اسلام کہتا ہے کہ دنیا میں رہ کر آخرت پیدا کرو۔ ترکِ دنیا کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا کی نعمتوں کو چھوڑ دو۔ ہاں اس میں مبالغت کرو۔ غلو مت کرو۔ حد سے مت گزرو۔ اعتدال کے ساتھ استعمال کرو۔ اس سے اپنا بھی کام چلاؤ اپنے بھائیوں اور عزیزوں کی بھی خدمت کرو۔ تمہاری آخرت بنے گی۔ تو یہ نیت پر اور افعالِ اختیاری پر ہے کہ مرضی

خداوندی کے مطابق وہ افعال ہوں گے تو دنیا ہی آخرت بنے گی۔

افعالِ دنیوی کے بارے میں اسلام کا نظریہ...... اب دنیا کے بڑے افعال سونا، جاگنا، کھانا، پینا، رہنا، سہنا اور مکان بنانا۔ ان سب کو حق تعالیٰ نے نعمت شمار کیا ہے فرمایا ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾ ① اے پیغمبر! کون ہے جو اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو اپنے اوپر حرام کرے اس نے جو پاکیزہ غذائیں اور لباس دیے ہیں۔ کون ہے جو انہیں حرام کرے؟ ممانعت فرمادی کہ انہیں حرام مت قرار دو۔ البتہ حدود بتلا دیں کہ ریشم کا کپڑا ہے۔ مرد کے لئے ناجائز عورت کے لئے جائز۔ زیوارت میں سونا، چاندی عورت کے لئے جائز۔ مرد کے لئے ناجائز تو حدود بتلا دیں ان حدود میں رہ کر استعمال کئے جاؤ۔

مکان ہے اس کے بارے میں اللہ نے احسان جتلایا اور فرمایا کہ ﴿وَاللهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ بُيُوتِكُمْ سَكَنًا﴾ ② اللہ نے تمہارے گھروں میں تمہارے لئے سکون اور سکونت رکھی ہے۔ گھر بناؤ، استعمال کرو۔ اور پھر آگے کپڑوں کا بھی گھر ہوتا ہے۔ یعنی کپڑے کا خیمہ۔ اور چمڑوں کا گھر بھی ہوتا ہے۔ یعنی چمڑے کا خیمہ، پتھر اور اینٹ کا گھر ہوتا ہے۔ ساری قسمیں گنوا کے احسان جتلایا۔ احسان اسی پر جتلاتے ہیں جو نعمت ہوتی ہے۔ مصیبتوں پر تو احسان نہیں جتلایا جاتا۔ مکانوں کو اللہ نے نعمت قرار دیا۔ تو کون ہے جو اللہ کی نعمتوں کو رد کرے؟ حدود میں رہ کر انہیں استعمال کرو۔ مبالغہ اور غلو نہ کرو۔ ایک عام شریعت میں جو راحت کے سامان ہیں۔ انہیں آدمی اپنے لئے مہیا کرے تو کھانا ہو، لباس ہو۔ بلکہ ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ "إِنَّ اللهَ يُحِبُّ أَنْ يَرَى أَثَرَ نِعْمَتِهِ عَلَى عَبْدِهِ" ③ اللہ اپنے جس بندے کو نعمت دے، تو اسے یہ بھی پسند ہے کہ اس نعمت کا اثر بھی اس بندے پر دیکھے۔ تو ڈھنگ کا کھانا ہو، ڈھنگ کا پہننا ہو، ڈھنگ کا رہنا سہنا ہو یہ نہیں کہ پھٹے حال میں آدمی رہ رہا ہے۔ کوڑے کباڑ میں کھڑا ہوا ہے۔ نہ صفائی نہ ستھرائی مکان بنانے کا حکم دیا، صفائی ستھرائی کا حکم دیا۔

حدیث میں فرمایا گیا اپنے گھروں کے صحن چوک بھی صاف رکھو، دالان کو صاف رکھو۔ سڑک تک کو صاف رکھو۔ لباس کی صفائی کا حکم دیا۔ صفائی اور ستھرائی اسلام کا ایک مستقل موضوع ہے۔ یہ چیزیں چھڑائی نہیں گئیں حدود بتلا دی گئیں کہ ان سے آگے نہ گزرو۔ تو ہماری آخرت اسی دنیا ہی سے نکلتی ہے۔ اس بدن ہی سے تو آخرت پیدا ہوگی۔

اعمالِ ایمانی کی خوشبو...... حدیث میں ہے کہ جب موت کا وقت آتا ہے۔ تو ملائکہ علیہم السلام روح کھینچنے کے لئے آتے ہیں تو ہاتھ پیروں کو سونگھتے ہیں کہ اس میں ایمان کی خوشبو کتنی ہے۔ اعضاء کو سونگھتے ہیں۔ کیونکہ ایمانی افعال سرانجام دینے سے بدن میں خوشبو ہو جاتی ہے۔ یہاں ہمیں محسوس نہیں ہوتی۔ آخرت میں محسوس ہو جائے گی۔

---

① پارہ: ۸ سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۳۲۔ ② پارہ: ۱۴ سورۃ النحل، الآیۃ: ۸۰۔

③ السنن للترمذی، ابواب الادب عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، باب ماجاء ان اللہ یحب ان یری، ج: ۱۰، ص: ۲۰۔

حدیث میں ہے کہ ”خُلُوْفُ فَمِ الصَّآئِمِ اَطْيَبُ عِنْدَاللّٰهِ مِنْ رِيْحِ الْمِسْكِ“ ① روزے میں جب آدمی نہیں کھاتا تو منہ میں ایک قسم کی بو پیدا ہو جاتی ہے۔ تو فرماتے ہیں کہ اللہ کے نزدیک یہ منہ کی بو مشک سے بھی زیادہ خوشبودار ہے۔ یہاں تو یہ بدبو ہے، وہاں یہ خوشبو۔ وہ خوشبو درحقیقت روزے کی ہے اور روزے میں خوشبو ایمان سے ہے۔ ورنہ ایمان نہ ہو تو روزہ فاقہ ہے۔ وہ ایمان ہی کی خوشبو ہے ملائکہ علیہم السلام بدن میں سے اسی خوشبو کو سونگھتے ہیں کہ کتنی خوشبو آ رہی ہے۔ بعض مرتبہ ایسا ہوگا کہ آدمی کے ساتھ اعمال نہیں ہیں اور ملائکہ علیہم السلام نے بھی سمجھ لیا کہ یہ جہنم کے لائق ہے اور وہ ملائک آ گئے جو کفار کی روح قبض کرتے ہیں۔ ان کی شکلیں ہیبت ناک ہوں گی۔ وہ اپنے ہاتھوں کو اس کے بدن میں داخل کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ پنڈلی سے ایک عمل چپکا ہوا تھا۔ اس نے کسی موقع پر ”سُبْحَانَ اللّٰهِ“ کہا ہے۔ نیکی ہاتھ لگ جاتی ہے تو ملائکہ رحمت کہیں گے کہ تم ہٹو ہم اس کی روح قبض کرتے ہیں۔ تو وہ اعمال اسی بدن ہی میں سے سرزد ہوئے۔ پنڈلی میں سے عمل نکلے گا جگر میں سے نکلے گا ایسا ہوتا ہے کہ بعض دفعہ آدمی دل کی قوت سے عمل کرتا ہے، تو دل پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ کھڑے ہو کے کوئی عمل کرے تو گردوں کی طاقت سے آدمی کھڑا ہوتا ہے، اس عمل کا اثر گردوں پر ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ فلاں آدمی بڑی بے جگری سے لڑتا ہے، خوب اس نے جہاد کیا۔ اس عمل کا تعلق جگر سے ہوگا۔ تو ہر عضو سے خاص اعمال متعلق ہیں۔ اور ملائکہ وہ پہچانتے ہیں۔ تو انہیں اعضاء میں اعمال کی تلاش کریں گے اور وہ کہیں گے کہ اس کا عمل پنڈلی میں چھپا ہوا تھا۔ لہٰذا یہ صاحب نیکی ہے۔ ملائکہ عذاب اس کی روح قبض نہیں کر سکتے۔ ہم اس کی روح قبض کریں گے۔ تو اسی عمل اور بدن ہی سے آخرت بنی۔

دربارِ خداوندی کی پہلی پیشی ...... اور یہ بھی ہے کہ مرنے کے بعد مؤمن کی روح آسمانوں پر چڑھ جاتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام پہلے آسمان پر اس کا استقبال کرتے ہیں۔ اور ستر ہزار ملائکہ علیہم السلام کے ہجوم کے ساتھ استقبال ہوتا ہے۔ ملائکہ صف باندھے کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ قطار کے بیچ میں سے اعزاز و اکرام کے ساتھ گزرتی ہے۔ پھر آسمانِ دوم کے مقربین اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ پھر آسمانِ سوم کے مقربین اس کا استقبال کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ عرش پر پہنچ جاتا ہے۔ اور وہاں روح سجدہ کرتی ہے حق تعالیٰ ابتدائی خطاب ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ فرماتے ہیں، کیوں آیا؟ کیسے آیا؟ کیا لے کے آیا؟

ایک عالم ہیں ان کی وفات ہوئی۔ تو بعض عارفین پر ان کا حال منکشف ہوا۔ حق تعالیٰ کے سامنے ان کی پیشی ہوئی تو ڈانٹ کر فرمایا۔ کیوں آیا؟ کیا لے کر آیا؟ انہوں نے کہا میں ڈیڑھ سو قرآن شریف ختم کر کے لایا ہوں۔ فرمایا ایک بھی قبول نہیں۔ کہا اتنے روزے رکھے، فرمایا یہ بھی قبول نہیں۔ کہا اتنے تہجد پڑھے۔ فرمایا یہ بھی قبول نہیں۔ اب یہ حیران کہ کیا چیز پیش کروں اور ادھر سے مطالبہ کہ کیوں آیا؟ آخر میں انہوں نے کہا کہ میں آپ کی رحمت کا

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الصوم، باب فضل الصوم ج:٦ ص:٤٥٧.

سہارا لے کر آیا ہوں اور کچھ نہیں! فرمایا: اب بات ٹھکانے کی کہی۔ میری رحمت تیرے اوپر واجب ہوگئی۔ کسی وقت یہ نیت کی ہوگی وہ جا کر کام آگئی۔

وسعتِ مغفرتِ خداوندی..... تو آدمی اپنے قلب کے رخ کو صحیح رکھے۔ عملی کوتاہیاں ہر ایک سے ہوتی ہیں ہر ایک میں کچھ نہ کچھ گناہ، بڑا ہو یا چھوٹا، ضرور ہوتا ہے۔ سوائے انبیاء علیہم الصلوٰۃ السلام کے وہ تو معصوم ہیں۔ نبی کے بعد کوئی ایسا نہیں جس سے کوئی زلت یا خطانہ ہوتی ہو اس کو ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اِنْ تَغْفِرِ اللّٰهُمَّ تَغْفِرْ جَمًّا وَاَیُّ عَبْدٍلَکَ لَا اَلَمَّا'' ① یا اللہ جب آپ کو بخشنا ہی ہے تو سارے گناہ کیوں نہیں آپ بخش دیتے۔ کون بندہ ہے جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو، آپ کے سامنے سارے گنہگار ہی ہیں۔

اور حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی: فرمایا: ''رَبِّ مَغْفِرَتُکَ اَوْسَعُ مِنْ ذُنُوْبِیْ وَرَحْمَتُکَ اَرْجٰی عِنْدِیْ مِنْ عَمَلِیْ'' ② اے میرے پروردگار تیری مغفرت میرے گناہوں سے بہت وسیع ہے۔ کہاں تک گناہ کروں۔ ہزار برس بھی کروں گا تو محدود ہوں گے۔ اور تیری رحمت کی کوئی حد ہی نہیں۔ میرے گناہوں کی تیری رحمت کے سامنے کیا قدر و قیمت ہے۔ نیز میرے عمل محدود ہیں۔ بلکہ کوئی چیز نہیں مگر تیری رحمت ان سے بہت وسیع ہے۔

توبہ کا راستہ نہ ترک کیا جائے...... بہر حال کوئی بندہ بشر ایسا نہیں جس سے کوئی غلطی اور خطا نہ ہوئی ہو۔ انبیاء علیہم السلام اس سے بری ہیں۔ اسی واسطے فضل ہی پر مدار ہے۔ تو جب فرمادیں گے جبھی مغفرت ہوگی۔ نیت اپنی یہ ہونی چاہئے کہ آدمی حق تعالیٰ پر بھروسہ کرے جب خطاء ہو توبہ کرے۔ گناہ سرزد ہوا فوراً توبہ کرلے تاکہ کھاتہ صاف ہوتا رہے۔ اصل چیز نیت ہے کہ آدمی کا رخ صحیح ہونا چاہئے۔

ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے جو حدیثِ قدسی ہے کہ: اے بندے اگر تو میرے پاس اتنے گناہ لے کر آئے کہ زمین اور آسمان تیرے گناہوں میں چھپ جائیں تو میں اتنی اتنی (گناہوں سے کہیں بڑھ کر) مغفرت لے کر تجھ سے ملاقات کروں گا۔ بشرطیکہ میری عظمت تیرے دل کے اندر ہو۔ تو اصل چیز عظمتِ خداوندی ہے۔ آدمی وہ قائم رکھے جو وفادار ہوتا ہے وہ غلطی بھی کرتا ہے تو آقا کہتا ہے کہ اس کو معاف کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے اگر گناہ سرزد ہو، فوراً توبہ کرے۔ تاخیر ہرگز نہ کرے۔ کیونکہ اگر گناہ کیا اور دل پہ جم گیا، پھر گناہ کرتا رہا، پھر توجہ کی توفیق سلب ہو جاتی ہے۔ گناہ کے بعد معافی مانگ لے۔ اس سے قلب زنگ آلود نہیں ہوتا اور معصیت دھل جاتی ہے۔

---

① السنن للترمذی، ابواب التفسیر، باب من سورۃ النجم، ج: ۱۱، ص: ۹۰۔ حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح و ضعیف سنن الترمذی ج: ۷ ص: ۲۸۴ رقم: ۳۲۸۴۔

② شعب الایمان للبیہقی، ج: ۱۵ ص: ۱۵۸۔ امام بیہقیؒ اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ قال ابو عبداللہ: رواتہ مدنیون لایعرف واحد منہم بجرح۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ ایک آدمی نے بہت بڑا گناہ کیا۔ اور ندامت ہوئی تو کہا: ''یَارَبّ''! ابھی یہ نہیں کہا کہ میری مغفرت کر دیجئے، فقط ''یَارَبّ'' کہا۔ فوراً حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اَیَعْلَمُ اَنَّ لَهٗ رَبًّا یُؤَاخِذُهٗ'' اچھا یہ جان گیا کہ اس کا بھی کوئی رب ہے جو اس کی پکڑ کرے گا۔ فرمایا: اگر یہ جان گیا تو قبل اس کے کہ مغفرت مانگے۔ اس سے پہلے ہی مغفرت کر دیتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس کی مغفرت ہوگئی۔ آ کر پھر وہی گناہ کیا جو پہلے کیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اے لوگو! تم گناہ کرتے کرتے تھک جاؤ گے اللہ بخشتے بخشتے نہیں تھکیں گے۔ اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے۔ اس لئے آدمی سے جب غلطی ہو، فوراً توبہ کر لے، بس معاملہ صاف ہو گیا۔ ①

اور یہ ایسا ہی ہے جیسے راستے پر لگا ہوا آدمی ٹھوکر لگی، گر پڑا۔ اٹھا، کپڑے جھاڑ کر پھر چلنا شروع کر دیا۔ پھر گر پڑا پھر چلنا شروع کر دیا۔ بالآخر منزل تک پہنچ جائے گا اور جس نے گرتے ہی راستہ ہی بدل لیا۔ وہ نہیں پہنچے گا۔ تو راستہ نہ چھوڑا جائے۔ جس وقت گناہ سرزد ہو، توبہ کرے، ایک نہ ایک دن منزل پالے گا۔ اسی لئے ایک حدیث میں فرمایا گیا ''سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَرُوْحُوْا وَاغْدُوْا وَشَیْءٌ مِّنَ الدُّلْجَةِ'' ② راستے پر لگے رہو۔ اعتدال کے ساتھ چلتے رہو، منزل کھوٹی مت کرو کہ منزل چھوڑ کے کسی سبزہ زار کے اوپر بیٹھ گئے۔ کسی باغ میں بیٹھ گئے بلکہ راستے پر چلتے رہو۔ ایک نہ ایک دن پہنچ جاؤ گے۔

توبہ کی قوت...... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب آدم علیہ السلام اور شیطان کی دشمنی ٹھن گئی تو شیطان آدم علیہ السلام کا حاسد اور قریبی دشمن تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو تاجِ خلافت پہنا دیا گیا۔ جنتوں کے وعدے دیے گئے۔ تو شیطان کو فکر ہوئی، اس نے کہا یا اللہ! آدم بہر حال میرا دشمن ہو گیا، میں اس کا دشمن اس کے پاس عقل بھی ہے اور اسبابِ ہدایت بھی ہیں۔ یہ تو میرا ناطقہ بند کر دے گا۔ کچھ قوت مجھے بھی دے دیجئے گا کہ میں اس پر غالب رہوں۔

حق تعالیٰ نے فرمایا: ''ہم نے تجھے اکثریت کی قوت دی''۔ آدم علیہ السلام کا اگر ایک بیٹا ہوگا، تو تیرے دس بیٹے ہوں گے۔ اس کے سو ہوں گے، تیرے ایک ہزار ہوں گے۔ تو ہمیشہ اکثریت میں رہے گا۔ یہ ایک ارب ہوں گے تو، تو دس ارب ہوگا۔ مگر وہ بھی بڑا ہوشیار ہے۔ اس نے دیکھا کہ بعض دفعہ تو اقلیت بھی اکثریت پر غالب آ جاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اکثریت ہی کا غلبہ ہو۔ اس نے عرض کیا۔ یا اللہ! بے شک میں اکثریت میں ہو گیا۔ لیکن اگر طاقت ور اقلیت ہو، وہ تو اکثریت پر غالب آ جاتی ہے۔ اس لئے مجھے اور طاقت دیجئے۔ فرمایا: تجھے یہ طاقت دیتے ہیں کہ تو آدم کے بدن میں اس طرح سرایت کر سکے گا جیسے خون رگوں میں دوڑتا ہے۔ کہنے لگا: ''اب میں اسے پچھاڑ سکوں گا''۔ اس لئے اس کے اندر گھس کے قلب میں وسوسے ڈالوں گا، دماغ کو خراب کروں گا۔ اور جو چاہے

① الصحیح للبخاری، کتاب التوحید، باب قول الله تعالیٰ: یریدون ان یبدلوا کلام الله ج: ۲۳ ص: ۲۱.

② الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومة، ج: ۲۰، ص: ۹۹.

اندر جاکے کروں گا۔ اب مجھے طاقت مل گئی۔ اور وہ مطمئن ہو گیا۔

اب حضرت آدم علیہ السلام کو فکر پڑی کہ اس کمبخت کی یہ طاقت کہ میرے اندر گھس جائے، میرے اندر تو یہ طاقت نہیں کہ اس کے اندر گھس سکوں تو یہ غالب رہے گا اور سب کو جہنمی بنادے گا۔ مجھے بھی تو کوئی قوت دیجئے۔ (میں بھی اس کا مقابلہ کرسکوں؟) حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ”آدم کو بھی ہم ایک طاقت دیتے ہیں کہ شیطان کی ہزار برس کی کارروائیاں ایک دم میں سب ملیامیٹ ہو جائیں گی۔ اور وہ ایسے چت ہوگا کہ چاروں شانے لگ جائیں گے“۔ کفر تک کرلو تو یہ نصیب ہو، ایک منٹ میں سارا کفر ختم ہو جائے گا۔ جس نے سو برس کفر کرایا۔ تم نے ایک سچی توبہ کی۔ وہ سارا سو برس کا کفر ختم ہو جائے گا۔ اس کی ساری کارستانیاں ختم ہو جائیں گی۔ تو توبہ میں اتنی بڑی طاقت ہے کہ شیطان بھی اس سے عاجز ہے۔ اس لئے آدمی توبہ نہ چھوڑے۔ ذرا سی بات ہوئی فوراً توبہ کرے۔ بلکہ استغفار کو مستقل تسبیح کے طور پر پڑھے۔ کم از کم سو دفعہ روزانہ استغفار کرے۔ ”أَسْتَغْفِرُ اللهَ تَعَالٰى رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ“ ① سو دفعہ پڑھ لے۔ سو گناہ نہیں کرے گا مگر سو استغفار ہو جائیں گے۔ تو اس کے گناہ ختم ہوتے رہیں گے اور یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے، صرف دس منٹ کی بات ہے۔ صبح کی نماز کے بعد اگر سو دفعہ استغفار پڑھ لے۔ تو کوئی محنت نہیں مشقت نہیں۔ دن بھر میں آدمی سو گناہ نہیں کرتا، مگر توبائیں (توبہ کی جمع) سو ہو گئیں۔ انشاء اللہ سب گناہ ختم ہو جائیں گے۔

بہرحال قلب کا رخ صحیح رکھے اعتدال کے ساتھ چلتا رہے۔ جب گناہ ہو معافی مانگ لے۔ ایک نہ ایک روز منزل پر پہنچ جائے گا۔ اب میں ختم کرتا ہوں دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلائے۔ حسنِ اخلاق نصیب فرمادے اور خاتمہ بالخیر فرمادے۔ آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

① السنن الكبرى للبيهقي، ج:۵، ص:۲۸۲.

فضیلتِ یوم الجمعہ

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا إِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ﴾ ①

تمہید...... بزرگانِ محترم! میں اس وقت اپنی بعض مصروفیات کے وجہ سے آپ حضرات کا زیادہ وقت نہیں لے سکوں گا۔ اس کے علاوہ کچھ تعب تھکاوٹ وتکان بھی ہے۔ رات تقریباً دو اڑھائی گھنٹے بیان ہوا۔ اس وقت بھی ایک گھنٹہ کے قریب ایک نکاح کی مجلس میں بیان ہوا۔ اب کچھ بیان کرنے کی ہمت نہیں۔ لیکن چونکہ اعلان ہو چکا ہے، اس کا بھی احترام ضروری ہے۔ اسی واسطے تھوڑا سا وقت آپ حضرات کا لوں گا۔

سب سے پہلے سوال موضوع کا ہے کہ کس موضوع پر بیان کیا جائے اور میرے لئے یہ مستقل کام ہوتا ہے کہ کون سا موضوع منتخب کیا جائے۔ اس وقت سب سے بہتر موضوع وہی ہے جس کے لئے ہم اور آپ حاضر ہوئے ہیں اور وہ ہے نمازِ جمعہ، جو بہترین عبادت اور بہترین قربت بھی ہے۔

ایک حدیث...... اسی سلسلہ میں مجھے چند باتیں عرض کرنی ہیں اور وہ باتیں اپنی نہیں ہوں گی۔ بلکہ ایک حدیث شریف جو ذہن میں آ گئی اسی کو بیان کرنا ہے اور اس کا ترجمہ کرنا ہے۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام حاضر ہوئے، اس شان سے کہ ایک آئینہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ اس آئینہ کے وسط میں ایک سیاہ نقطہ تھا، جو بالکل ممتاز تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا "اے جبرئیل! یہ سیاہ نقطہ کیسا ہے؟ اور یہ آئینہ کیسا ہے؟"

میدانِ مزید...... فرمایا کہ یہ سیاہ نقطہ مزید ہے۔ جس کے معنی زیادتی کے آتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

① پارہ: ۲۸ سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۹.

فرمایا کہ مزید کیا ہے؟ عرض کیا یا رسول اللہ! یہ جنت میں ایک میدان ہے اور جنت کے بالائی حصہ میں ہے۔ یعنی اوپر نیچے سو جنتیں ہیں اور ہر جنت آسمانوں اور زمینوں سے بڑی ہے۔ سب سے اوپر کا حصہ جو عرش کے نیچے ہے۔ اس میں ایک میدان ہے جو بالکل سفید ہے اس کی گھاس بھی سفید، درخت سفید، غرض ہر چیز سفید اور شفاف ہے۔ اور عرض کیا کہ یہ اتنا بڑا میدان ہے کہ ہزار ہا برس مجھے گھومتے ہوئے ہو گئے ہیں۔ اب تک پوری طرح اس کی کنہ (اور حقیقت) کو نہیں پا سکا۔ ①

حدیث میں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کو اصل شکل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ دیکھا ہے۔ اس شان سے کہ زمین سے لے کر آسمان تک اور مشرق سے کر مغرب تک ساری فضا ان کے بدن میں گھری ہوئی تھی۔ چھ چھ بازو تھے۔ سورج سے زیادہ روشن تاج ان کے سر پر تھا۔ اندازہ کیجئے کہ وہ میدان کتنا بڑا ہوگا جس میں حضرت جبرئیل علیہ السلام ہزار ہا برس سے گھوم رہے ہیں لیکن ابھی تک پورا نہیں کر سکے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس میدان کی غرض و غایت کیا ہوگی؟ عرض کیا کہ دربار خداوندی منعقد ہونے کا موقع ہوگا۔ انبیاء علیہم السلام کے منبر اس میدان میں بچھائے جائیں گے۔ گول دائرے کی شکل میں نور کے منبر ہوں گے۔ ہر نبی علیہ السلام کے منبر کے پیچھے امت کی کرسیاں ہوں گی۔ اور وہ پورا میدان ان بیٹھنے والوں کی کرسیوں سے بھر جائے گا۔ دنیا میں جتنا جس کو تعلق نبی اور دین سے تھا، اتنا ہی وہ منبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہوگا۔ اور وہ کرسیاں اس شان سے ہوں گی کہ ایک کے دیکھنے میں دوسرا حائل نہیں ہوگا، جیسے آپ نے دیکھا ہوگا، بڑی بڑی مجالس میں کرسیاں اس ترتیب سے بچھاتے ہیں۔ اگلی صف ذرا نیچی تاکہ ہر شخص بے تکلف سامنے اسٹیج کو دیکھ سکے۔ اس انداز سے کرسیاں بچھائی جائیں گی۔ میدان کے کناروں پر کرسیاں نہیں ہوں گی۔ بلکہ کچھ غالیچے، کچھ فانوس ہوں گے۔ اس طرح سے میدان بھر جائے گا۔ اب گویا دربار بن گیا کہ چہار طرف انبیاء علیہم السلام کے منبر ہیں، ان کی پشت پر کرسیاں ہیں۔ بیچ میں حق تعالیٰ شانہ کی کرسی آئے گی جس کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔ ﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾ ②

حدیث شریف میں اس کرسی کی عظمت و بڑائی بیان فرمائی گئی کہ ساتوں آسمان اور زمین اس کے سامنے ایسے ہیں جیسے ایک میدان میں ایک چھلہ پڑا ہوا ہوتا ہے، اتنی عظیم کرسی ہے۔ آخر جس بادشاہ کی یہ کرسی ہے اس کی بڑائی اور عظمت کے مناسب اس کی شان ہے۔ حق تعالیٰ شانہ اس کرسی و تخت پر بیٹھتے نہیں۔ وہ جسم سے بری اور صورت سے منزہ ہیں۔ لیکن ان کی صفت "ملک" بادشاہ ہے۔ چنانچہ بادشاہت کے جتنے لوازم ہیں، وہ سب جمع کئے گئے تختِ سلطنت بھی ہے جس کا نام عرش عظیم ہے۔ عرش مثل قُبّہ کے ہے جو ساری کائنات پر چھایا ہوا ہے اور ڈھانپے ہوئے ہے۔ عرش کے اوپر رحمت کی تجلی مستوی ہے۔ فرمایا گیا ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾

① تفسیر القرطبی، ج: ۲۲ ص: ۳۶۸. ② پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۵۵.

تو عرش کے اوپر رحمت چھائی ہوئی ہے اور عرش کائنات پر چھایا ہوا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کائنات کے اوپر رحمت چھائی ہوئی ہے۔ یعنی اللہ نے اپنے بندوں کے ساتھ جو تعلق قائم کیا ہے، وہ رحمت کے ساتھ ہے، غضب کے ساتھ نہیں۔ غضب اگر سامنے آجائے تو مخلوق کا پتہ بھی نہ چلے۔ رحمت ہی نے سنبھال رکھا ہے۔ تو رحمت کی تجلی عرش پر مستوی ہے۔ اس رحمت سے احکام پھوٹتے ہیں۔ ہدایت و رہنمائی، کتب سماوی، قوانین خداوندی اور قضاء و قدر سب وہیں سے چھنتی ہیں۔ جیسے ملک کی تمام تجاویز و احکامات تختِ سلطنت سے جاری ہوتے ہیں۔ اسی طرح عرشِ عظیم سے تختِ سلطنت قائم کیا گیا۔ عرش کے نیچے عظیم سمندر ہے جس پر عرش قائم ہے۔ اس سمندر کے نیچے سو جنتیں ہیں۔ ہر جنت آسمانوں اور زمینوں سے بڑی ہے۔ سو جنتوں کے نیچے پھر آسمان تہہ بہ تہہ ہیں اور اس کے نیچے پھر ہفت زمین تہہ بہ تہہ ہیں۔ یہ کائنات کا ایک (عجیب) سلسلہ ہے کہ نیچے زمین، اوپر فضاء، اس کے اوپر آسمان، اس کے اوپر جنتیں، اس کے اوپر سمندر اور اس کے اوپر عرش عظیم۔ عرش پر پہنچ کر مخلوق کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ تو عرش اور جنتوں کے درمیان میں یہ میدان ہے۔ جس کی عظمت و بڑائی یہ ہے کہ اس میں دربار خداوندی منعقد ہوگا۔ بیچ میں کرسی حق بچھائی جائے گی۔ (1)

میدانِ مزید میں اہلِ جنت کی حاضری..... تمام اہلِ جنت اس دربار میں شرکت کے لئے اپنی اپنی سواریوں پر پہنچیں گے، ان کی سواریوں کی یہ شان آئی ہے کہ بعض تخت ہوا پر سوار ہوں گے، اڑتے ہوئے تخت ہوں گے۔ اور مختلف قسم کی سواریاں ہوں گی جن کے ذریعے اہل جنت پہنچیں گے اور ایسا وقت آئے گا کہ کل دربار منعقد ہوگا۔ تمام اہلِ جنت جمع ہوں گے۔ اور انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے منبروں پر ہوں گے۔ بیچ میں حق تعالیٰ کی کرسی ہوگی جب سارا دربار جم جائے گا تو اب بندے محسوس کریں گے کہ اب تجلّیاتِ حق کا ظہور ہو رہا ہے۔ گویا کرسی پر حق تعالیٰ کی تجلی مستوی ہے! حدیث میں ہے کہ وہ کرسی باوجود اس عظمت کے اس طرح چرچرائے گی، جیسے بوجھ سے دب کر کوئی چیز ٹوٹنے کے قریب ہوتی ہے۔ وہ ہیبت حق کا بوجھ ہوگا، کوئی جسمانی بوجھ نہیں ہوگا۔ (2)

حدیث میں فرمایا گیا کہ داؤد علیہ السلام کو آواز کا معجزہ دیا گیا تھا۔ اتنی پاکیزہ آواز تھی کہ جب وہ مناجات پڑھتے تو چرند و پرند ان کے ارد گرد جمع ہو جاتے اور محو ہو جاتے۔ انسان تو بجائے خود جانوروں پر بھی ایک غنودگی کی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو فرمایا جائے گا کہ ان تمام درباریوں کو اپنے مضمون سے مستفیض کریں۔ حضرت داؤد علیہ السلام اس اعجازی خوش آوازی سے مناجات و مضامین پڑھیں گے کہ اہل جنت پر کیف طاری ہو جائے گا، جس طرح شراب طہور کا وعدہ فرمایا گیا۔

ملائکہ علیہم السلام کو فرمایا جائے گا کہ تقسیم کرو، یہ شرابِ طہور دنیا کی شراب جیسی نہیں ہوگی۔ دنیا کی شراب میں

(1) تفسیر ابن کثیر ج:1 ص:326.

(2) تفسیر الطبری ص:368.

تخی ہوتی ہے، اس میں شیرینی ہوگی۔ دنیا کی شراب سے عقلیں جاتی رہتی ہیں۔ اس سے عقلوں میں تیزی اور معرفت وبصیرت پیدا ہوگی۔ وہ سکر اس سکر کے مشابہ ہوگا جو حضرات صوفیاء پر کثرت ذکر سے معرفت کا ایک نشہ سا طاری ہوتا ہے۔ اور ایک استغراق ہوتا ہے اس میں ان پر احوال وعلوم اور مواجید منکشف ہوتے ہیں۔ گویا دنیا میں جو معرفت کا سکر دیا گیا تھا، جنت میں ''شراب طہور'' اس کی صورتِ مثالی ہوگی۔ اسی طرح سے عقلوں پر کیف طاری ہوگا۔ روحوں میں بھی کیف بڑھے گا۔ معرفتِ خداوندی اور بصیرت بڑھتی جائے گی۔

میدانِ مزید میں اہلِ علم کی احتیاج...... اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ''سَلُوْنِیْ مَاشِئْتُمْ'' ① جو جس کا دل چاہے مانگے، طلب کرے۔ سب کو خطاب عام فرمایا جائے گا۔ تو سب مل کر عرض کریں گے کہ کونسی نعمت ہے جو آپ نے عطاء نہیں فرمادی۔ ہمیں ساری نعمتیں مل چکی ہیں۔ بس ہماری درخواست یہ ہے کہ اپنی رضا ہمیں عطاء فرمادیجئے۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے یہ نعمت مل چکی، اگر میں راضی نہ ہوتا تو تمہیں اس مقام پر گھسنے نہ دیتا۔ میں راضی ہوں اور ایسا راضی ہوں کہ ابدالآباد تک کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔ یہ مقام تمہیں مل چکا۔ کچھ اور مانگو۔ حیران ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں گے کہ کیا چیز مانگیں؟ کون سی نعمت ہے جو ہمیں نہیں مل گئی۔ اس وقت سب مل کر علماء کے طرف رجوع کریں گے۔ ان سے استفتاء کریں گے کہ کیا چیز رہ گئی ہے جو ہم مانگیں؟ ہمارے علم کے اعتبار سے تو ہر نعمت مل چکی ہے۔ گویا علم اور اہل علم کی احتیاج وہاں بھی باقی رہے گی۔ لوگ دنیا میں علماء سے مستغنی ہونا چاہتے ہیں۔ حالانکہ حاجت مندی وہاں بھی قائم رہے گی۔ وہ کسی کی ذات کی احتیاج نہیں ہوگی۔ وہ علم کی احتیاج ہوگی۔ اور ابدالآباد تک آدمی علم کا محتاج ہے۔ اس لئے کہ علم اللہ کی صفت ہے۔ جیسے ذات لامحدود ہے، اس کی صفات بھی لامحدود ہیں۔ انسان کتنے ہی بڑے مقامات طے کرلے، پھر بھی لامتناہی مقامات رہتے ہیں جن کی طلب رہے گی۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قطعہ ہے جو وہ پڑھا کرتے تھے (جس کا ترجمہ یہ ہے) کہ جوں جوں مجھے زمانہ ادب سکھاتا ہے۔ مجھ پر میری عقل کا نقصان وارد ہوتا ہے، جو ادب کا مقام طے کیا تو سمجھ میں آیا کہ اب تک میری عقل نے یہ نہیں پایا تھا۔ اس مقام تک میری عقل ناقص ہے۔ پھر اگلا مقام طے ہوا۔ معلوم ہوا کہ یہ بھی اب تک میری عقل نہیں پاسکی تھی۔ اس طرح جوں جوں مقام ادب آتے رہے میری عقل کا نقصان مجھ پر واضح ہوتا رہا اور جیسے جیسے مراتبِ علم بڑھتے رہے۔ میری جہالت مجھ پر واضح ہوتی رہی۔ جب کسی علم کے مقام پر پہنچا، معلوم ہوا کہ اب تک میں اس سے جاہل تھا۔ مراتبِ علم کھل رہے ہیں تو میرے نفس کی جہالت کے مقامات بھی میرے نفس پر کھل رہے ہیں۔

لامحدود تک انسان جاہل اور محدود تک عالم ہوتا ہے، جو ہمیں معلومات ہیں وہ محدود ہیں۔ اور جو غیر معلوم چیزیں ہیں، وہ لامحدود ہیں۔ اس لئے کہ علم اللہ کی صفت ہے۔ علم، انسان جتنا بھی بڑھتا جائے، چاہے وہ علم کے کروڑوں مقامات ہوں، پھر بھی ان گنت مقامات باقی رہیں گے، کیونکہ لامحدود کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس لئے

① تفسیر القرطبی ج: ۲۳ ص: ۱۹۔

میں نے عرض کیا کہ علم کی جتنا تجلی دنیا میں ہی نہیں ، جنت میں بھی باقی رہے گی۔ کیونکہ صفت خداوندی وہاں پہنچ کر محدود نہیں بن جائے گی۔ علم اور معرفت کے مقامات وہاں بھی لامحدود رہیں گے۔ تو لوگ علماء کی طرف رجوع کریں گے کہ ساری نعمتیں مل گئیں کوئی چیز باقی ہے جو ہم مانگیں؟ علماء مل کر ایک مشورہ دیں گے کہ ایک چیز رہ گئی ہے جو طلب کرو، وہ نہیں ملی اور وہ یہ کہ حق تعالیٰ اپنا جمال مبارک دکھا دے۔ دیدارِ خداوندی ابھی تک باقی ہے۔ یہ نعمت ابھی تک نہیں ملی۔ قرآن مجید میں وعدہ فرمایا گیا۔ ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ ① بہت سے چہرے تر وتازہ اور شاداب ہوں گے، جو اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے۔ جیسے کفار کے بارے میں دھمکی دی گئی ﴿كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ﴾ ② یہ (سیاہ چہرے والے) وہ لوگ ہیں کہ ان کے اور پروردگار کے درمیان حجابات حائل ہوں گے۔ یہ زیارت نہیں کرسکیں گے، انکے لئے ابدی محرومی ہوگی۔

تو دیدارِ خداوندی کا وعدہ دیا گیا۔ اس وعدے کا ظہور وہاں ہوگا۔ علماء مشورہ دیں گے کہ ایک نعمت رہ گئی ہے، وہ طلب کریں۔ ”وہ دیدارِ خداوندی“۔ تو سب مل کر یک زبان ہو کر عرض کریں گے کہ ہمیں یہ نعمت عطاء فرما دیجئے، اپنا جمال مبارک دکھلا دیجئے۔ اسی کی تمنا میں ہم نے عبادتیں کیں۔ عمریں گزار دیں۔ مشاہدہ حق اصل مقصود تھا۔ اب اس مقام پر مشاہدہ نہ ہوا تو اور کون سا مقام ہوگا جہاں مشاہدہ حق ہوگا۔ درخواست قبول کر لی جائے گی۔

حدیث میں ہے کہ حجابات اٹھنے شروع ہو جائیں گے۔ صرف ایک حجاب کبریائی اور عظمت کا باقی رہے گا۔ باقی سب حجاب اٹھ جائیں گے اور بندے اپنے خدا کو دیکھیں گے۔ اس شان سے کہ سمت ہے، نہ جہت ہے، نہ رنگ ہے اور پھر مشاہدہ ہو رہا ہے اور دیکھ رہے ہیں۔ یہ اس مزید کا موضوع ہے۔ جس کا نام ”میدانِ مزید“۔ گویا درباری مقام ہے۔ یہ ایک حدیث ہے جس کا میں نے ترجمہ اور تفسیر آپ کے سامنے عرض کی۔ ③

دنیا میں ”میدانِ مزید“ کی مثال...... یہ جنت میں میدانِ مزید ہے۔ اور ہفتے میں ایک بار اجتماع ہوگا۔ جب دربار ختم ہوگا تو اللہ تعالیٰ اہل جنت کو فرمائیں گے ”جاؤ! اپنے اپنے مقامات پر“۔ اہل جنت واپس ہوں گے۔ جنت میں اپنے اپنے گھروں میں پہنچ جائیں گے۔

دنیا میں اس دربار کی مثال جمعہ کو رکھا گیا ہے۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ یہ دربارِ خداوندی ہے، جو دنیا میں منعقد ہوتا ہے۔ خطیب اور امام وہ نائب حق ہوتا ہے، جیسے کہ تجلیات ربانی کرسی پر ہوتی تھیں۔ یہاں خطیب منبر پر بیٹھتا ہے گویا وہ نمائندہ حق ہے اور خطابت کی تجلی اس میں ظہور کر رہی ہے۔ اس لئے کہ اصل خطیب حق تعالیٰ شانہٗ ہیں۔ انکے بعد انبیاء علیہم السلام ہیں۔ اس لئے حدیث میں آپ فرماتے ہیں ”اَنَا قَائِدُهُمْ وَاَنَا خَطِيْبُهُمْ“ ④ قیامت کے دن میں ہی ساری امتوں کا قائد اور میں ہی خطیب ہوں گا۔ میں ہی ان کے سامنے خطبہ دوں گا۔ تو

① پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۲۲-۲۳. ② پارہ: ۳۰، سورۃ المطففین، الآیۃ: ۱۵.

③ تفسیر الطبری، ص: ۲۶۸. ④ سنن الدارمی، المقدمۃ، باب ما اعطی النبی من الفضل ج: ۱ ص ۵۷

انبیاء علیہم السلام اس تجلی کے بارے میں جو خطبات کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے، نمائندگانِ حق ہیں۔ اصل خطیب حق تعالیٰ شانہٗ ہیں۔ اس دنیا میں ان کا نمائندہ امام اور خطیب ہوتا ہے۔

خطبہ جمعہ کے آداب، عام خطبات سے زیادہ ہیں...... یہی وجہ ہے کہ عام مواعظ اور خطبوں کے جو آداب ہیں۔ اس خطبے کے آداب ان سے ممتاز ہیں۔ فرمایا گیا: ''اِذَا خَرَجَ الْاِمَامُ فَلَا صَلٰوۃَ وَلَا کَلَامَ'' ① خطبہ کے لئے جب امام اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہو، تو اب نہ سلام وکلام جائز ہے نہ نوافل پڑھنی جائز ہیں۔ صرف یہ کام ہے کہ امام کو خطبہ کی حالت میں دیکھو فرمایا گیا جو کنکریوں سے کھیلنے لگا، اس نے لغو حرکت کی۔ مکروہ کا ارتکاب کیا۔ عام وعظوں میں اگر کوئی کنکری اٹھالے، کوئی کراہت نہیں۔ لیکن خطبہ جمعہ میں اگر کنکریوں سے، یا چٹائی کے تیلوں سے کھیلنے لگے، اس پر نکیر کی گئی ہے۔ خطبہ شروع ہونے کے بعد نماز بھی جائز نہیں۔ تلاوتِ قرآن مجید بھی جائز نہیں درود شریف جیسی طاعت بھی جائز نہیں۔ خطبہ شروع ہونے کے بعد سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اس وقت خطیب کو دیکھا جائے۔ اس کے خطبہ پر کان لگائے جائیں، جو زیادہ سے زیادہ اس کو دیکھنے کی عادت ڈالے گا، اسے میدانِ حشر میں زیادہ سے زیادہ حق تعالیٰ کا دیدار میسر ہوگا، جہاں تجلیاتِ حق سامنے ہوں گی۔ ②

اس لئے فرمایا گیا کہ جمعہ میں جو اذان سے پہلے اول وقت آگیا۔ صف اولیٰ میں اسے جگہ ملی۔ وہ ایسا ہے۔ جیسے ایک اونٹ قربانی کا ذبح کر دیا۔ اس کے بعد اس سے کم درجہ ہے کہ گائے ذبح کی پھر اسے کم درجہ ہے کہ بکرا ذبح کیا۔ اس کے بعد جو آیا وہ ایسا ہے کہ اس نے مرغی ذبح کی۔ جب امام خطبہ کے لئے کھڑا ہوگیا، تو ملائکہ علیہم السلام اپنے صحیفے لپیٹ کر خطبہ سننے کے لئے بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر درجات عالی کا کوئی مقام نہیں رہتا کہ اس میں نام لکھا جائے۔ ایسے میں جو آئے گا، بس اس کا فرض ادا ہو جائے گا۔ اور جو یہاں صف اولیٰ میں ہوگا وہاں بھی انبیاء علیہم السلام کے پیچھے صف اُولیٰ میں جگہ پائے گا، جو یہاں جتنا پیچھے ہو جائے گا، وہاں بھی اتنا ہی پیچھے ہوگا۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اگر لگاتار تین جمعے چھوڑ دیے، بلا کسی شرعی یا طبعی عذر کے، تو ظن غالب یہ ہے کہ پھر اسے عمر بھر جمعہ پڑھنے کی توفیق نہیں ہوگی۔ جب تک یہی توبہ نہ کرے اور رجوع نہ کرے۔ تو جمعہ کی نماز بھی بے شک فرض ہے مگر عام فرائض سے اس میں کچھ زیادہ خصوصیت ہے۔ اور وہ خطبہ عام خطبوں سے بڑھ کر ایک نئی شان رکھتا ہے، جو امتیازی شان ہے۔

علماء لکھتے ہیں کہ ظہر کے چار فرض ہیں۔ جمعہ کے دو ہوتے ہیں دو فرضوں کے قائم مقام یہ دو خطبے ہوتے ہیں جو امام کھڑے ہو کر دیتا ہے۔ اسی لئے ان خطبوں کے آداب عام خطبات سے زائد ہیں کہ امام کو دیکھو، تلاوت

---

① تفسیر حقی، ج:۳، ص:۳۶۳۔ امام زیلعیؒ فرماتے ہیں: اس کو حضورﷺ کی طرف منسوب کرنا کھلا وہم ہے یہ صرف امام زہری کا مقولہ ہے۔ دیکھئے: الثمر المستطاب، باب صلاۃ الجمعۃ ۱۲۵۔ نیز دیکھئے: نصب الرایۃ فی تخریج احادیث الہدایۃ، باب صلاۃ الجمعۃ ج:۳ ص:۳۶۳۔ ② تفسیر ابن کثیر، ج:۱ ص:۱۲۶۔

مت کرو، عبادت بھی نہ کرو۔ بڑی عبادت یہ ہے کہ خطبہ سنو اور امام کو دیکھو۔ گویا یہ دو خطبے بمنزلہ نماز کے ہیں، تو چار رکعتیں ہو جاتی ہیں، اس شان سے کہ دو رکعتیں جمعہ کی اور دو رکعات ان خطبوں کے قائم مقام۔ حق تعالیٰ شانہ نے اس جمعہ کو دنیا میں میدان مزید کا نمونہ اتارا ہے۔ اسی لئے شریعت کی اصطلاح میں جمعہ کا نام "یَوْمُ الْمَزِيْدِ" ہے۔ اس لئے "یَوْمُ الْمَزِيْدِ" کہا گیا کہ یہ جنت کا میدان اس دنیا میں ہے۔ جنت میں جا کر میدان مزید وہاں کی شان کے مطابق ہوگا۔ تو ساری دنیا کے جمعے اور جامع مسجدیں مل کر میدان مزید کا دنیا میں ایک نقشہ ہیں۔ ان کے مجموعوں کو اٹھا کر آخرت میں لے جائیں گے اور یہ خطبے اوپر جنتوں میں پہنچائے جائیں گے۔ تو وہاں کے دربار خداوندی کا یہاں ایک نمونہ ہے۔ اسی واسطے جمعہ کو "سَيِّدُ الْأَيَّامِ" کہا گیا ہے کہ تمام دنوں کا سردار ہے۔ ①

حق تعالیٰ کا انتخاب..... حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ﴾ ② تیرا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، اور اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے جس چیز کو چاہتا ہے اپنے لئے چھانٹ لیتا ہے۔ سات آسمان بنائے، ساتویں کو پسند کیا، منتخب کر لیا، وہ مقبول زمین ہے جنتوں کی بنیاد ہے ساتویں آسمان پر جنتوں کا علاقہ ہے جو مقام کریم ہے۔

صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ③ ساتویں آسمان پر ہے، جو جبرئیل علیہ السلام کا مقام ہے اور قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے ﴿عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ○ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوٰى﴾ ④ "سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى" کے پاس ہی جنت الماویٰ ہے۔ "سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى" ساتویں آسمان پر ہے۔ سدرہ کے پاس مقام جنت ہے تو جنتیوں کا علاقہ ساتویں آسمان سے شروع ہوتا ہے۔ سرکاری مہمان خانہ اسی میں بنا دیا گیا ہے۔ سات زمینیں پیدا کیں، تو اوپر کی زمین منتخب کی کہ وہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء علیہم السلام کا مقام ہے، اور ساتویں زمین کی تہہ میں جہنم ہے، جیسے جنت سات آسمانوں سے بالاتر ہے، جہنم سات زمینوں سے نیچے ہے۔

قیامت کے دن صور پھونکا جائے گا۔ آسمان توڑ دیے جائیں گے تو جنتیں نمایاں ہو جائیں گی۔ زمینیں ختم کر دی جائیں گی تو جہنم نیچے سے نمایاں ہو جائے گی ﴿وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ○ وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ﴾ ⑤ جہنم دھونکا دیا جائے گا اور جنتیں سامنے کر دی جائیں گی، زمینوں اور آسمانوں کے بیچ میں جو پردے حائل ہیں یہ سب توڑ پھوڑ کر برابر کر دیے جائیں گے، تو زمینوں میں اوپر کی زمین کو اپنے لئے پسند کیا اور آسمانوں میں اوپر کے آسمان کو پسند کیا۔ پیدا کئے سات اور منتخب کر لیا ایک جنتیں سات پیدا کیں اور اپنے لئے جنت الفردوس کو پسند کیا، جو

---

① السنن لابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلوۃ والسنۃ فیہا، باب فی فضل الجمعۃ، ج:۳ ص:۳۸۵۔ ② پارہ:۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ:۶۸۔ ③ الحدیث اخرجہ مسلم فی صحیحہ ولفظہ: وھی فی السماء السادس والیھا ینتھی مایعرج بہ من الارض... کتاب الایمان، باب فی ذکر سدرۃ المنتھی ج:۱ ص:۲۰۵۔ ④ پارہ:۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ:۱۴، ۱۵۔

⑤ پارہ:۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ:۱۲-۱۳۔

انبیاء علیہم السلام کا مقام ہے اور سب سے اوپر جنت ہے۔ پہاڑ اللہ نے ہزاروں بنائے طور سیناء کو پسند کرلیا کہ اسے اپنی تجلی گاہ بنایا۔ دنیا میں اس کے شہر ہزاروں لاکھوں ہیں مگر "بلد الامین" کو پسند کرلیا جس میں حرم واقع ہے یعنی "مکۃ المکرمۃ" زمین کے ٹکڑے کروڑوں بنائے۔ سب سے زیادہ پسندیدہ ٹکڑا وہ ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما ہیں۔

ہمارے علماء لکھتے ہیں کہ وہ ٹکڑا عرش سے بھی افضل ہے اور وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ عرش کو حق تعالیٰ سے نسبت ہے، مگر حق تعالیٰ اس پر بیٹھے ہوئے نہیں ہیں، وہ تو جسم سے پاک ہیں۔ اور وہ ٹکڑا جو قبر مبارک ہے اس کو بدن مبارک لگا ہوا ہے اور جس حصہ زمین کو بدنِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم چھوجائے وہ یقیناً عرش سے افضل ہوگا۔ کیونکہ حق تعالیٰ شانہٗ عرش کو چھوئے ہوئے نہیں ہیں کیونکہ وہ جسم سے بری و بالا ہیں۔ صرف ایک نسبت ہے اور یہاں نسبت نہیں بلکہ اتصال وطاپ ہے تو زمین کے ٹکڑے ہزاروں بنائے یہ زمین منتخب کرلی اور یہ ٹکڑا منتخب کرلیا۔

راتیں سات بنائیں اور "لَيْلَةُ الْقَدْرِ" کو پسند کرلیا اور فرمایا کہ ﴿لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ﴾ ① لیلۃ القدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔ گویا ہزار مہینے جو شخص رات دن عبادت کرے، اس محنت سے جس مقام پر پہنچے گا، اگر لیلۃ القدر کو زندہ کیا، تو اس مقام پر ایک رات میں پہنچ سکے گا۔ تو لیلۃ القدر کو اپنے لئے پسند کرلیا۔ اسی طرح سے سات دن بنائے ان میں اپنے لئے یوم الجمعہ کو پسند کرلیا کہ ہمارے دربار کا دن ہے۔

جنت کا موسم...... جنت میں بھی اسی دن دربار ہوگا، حالانکہ جنت میں رات اور دن نہیں۔ وہاں تو یکساں ایک وقت رہے گا۔ وہاں سورج کی گردش نہیں ہے کہ رات اور دن بنیں۔ رات اور دن کا بننا۔ کبھی دھوپ اور کبھی چھاؤں، کبھی رات اور کبھی دن، یہ گردشِ آفتاب کے آثار ہیں۔

حدیث میں ہے جنت میں عرش کا چاندنا ہوگا۔ عرش کی نورانیت یکساں پھیلی ہوئی ہوگی۔ اس نورانیت کی تمثیل اور تشریح دی گئی ہے کہ گرمی کے زمانہ میں صبح صادق کے بعد سورج نکلنے سے پہلے جب ٹھنڈی روشنی اور دودھ سا چاندنا ہوتا ہے، جنت میں روشنی کی یہ نوعیت نہ ہوگی کہ آدمی دھوپ میں نہ بیٹھ سکے۔ روشنی بھی ہے، ٹھنڈی بھی ہے، بردوسلام بھی ہے مگر تیزی نہیں ہے، وہ خوشگوار ہے، نگاہوں کو بھانے والی اور یکساں رہے گی، وہاں نہ رات ہے نہ دن ہے، نہ سونا ہے، بلکہ جاگنا ہی جاگنا ہے۔ اس لئے کہ سوجانا تھکن اور غفلت کی علامت ہے۔ وہاں تعب و تکان نہیں کہ آدمی پڑ کے سوجائے۔ وہاں تو رات دن کا عیش ہے اور رات دن کی بادشاہت ہے اس لئے نہ رات ہے نہ دن تعب [illegible] تو رات رکھی جاتی کہ آرام سے سوجاتے۔ جب تکان نہیں تو رات کی ضرورت نہیں۔ اس لئے یکساں دن رہے گا۔

سَيِّدُ الْأَيَّام...... مگر یہ جو فرمایا گیا کہ ہفتے میں ایک مرتبہ دربار خداوندی منعقد ہوگا۔ یعنی جتنی تمہارے یہاں

① پارہ: ۳۰سورۃ القدر، الآیۃ: ۳.

ایک ہفتہ کی مسافت و مدت ہوتی ہے اتنی مدت کا حساب لگا لو ساتے اتنے وقفے کے بعد دربار خداوندی منعقد ہوگا۔ وہ ہفتے میں ایک بار سمجھ لیجئے اس لمحے کا نام مزید رکھا گیا ہے۔ دنیا میں ساتویں دن کا نام "یَوْمُ الْمَزِیْد" رکھ دیا، جو دنیا میں جنت کا نمونہ ہے۔ اس لئے اس کو "سَیِّدُ الْاَیَّام" فرمایا گیا کہ یہ سب سے پاکیزہ، سب سے بڑا اور بہترین دن ہے۔ جتنے بھی عظیم و اعظم امور ہیں وہ اسی دن میں ظاہر ہوئے فرمایا گیا: "فِیْہِ جُمِعَ طِیْنُ اٰدَمَ"

"جُمُعَۃ" اس کا مادہ (ج، م، ع) ہے۔ جامعیت کی شان جمعہ میں موجود ہے۔ منتشر چیزوں کو ایک جگہ جمع کردینا، بکھری ہوئی چیزوں کو ملا دینا یہ جمعہ کا مادہ ہے، جتنی بھی بڑی بڑی چیزیں منتشر تھیں، وہ اس دن میں جمع کی گئیں، آدم علیہ السلام کی مٹی جو پوری زمین سے لی گئی، وہ جمعہ کے دن ہی جمع کی گئی، اور ان کا پتلا بنایا گیا۔

حدیث میں ہے کہ آدم علیہ السلام جس دن جنت میں داخل کئے گئے، وہ جمعہ کا دن تھا۔ جنت سے زمین پر لائے گئے، وہ بھی جمعہ کا دن تھا، صحف آدم علیہ السلام آسمانوں سے اتارے گئے، وہ دن بھی جمعہ کا تھا۔ جیسے قرآن کریم میں تفسیر بتلائی گئی اور حدیث میں زیادہ شرح ہے کہ چھ دن میں اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات کو تیار کیا اور اس کے چھ دن تمہارے چھ ہزار سال کے برابر ہیں۔ ﴿وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ ①

تو چھ ہزار سال میں کائنات تیار ہوئی۔ گویا اتوار سے بنی شروع ہوئی اور جمعہ پر ختم ہوئی۔ اس میں زمین بچھائی گئی، پھر آسمان بنائے گئے، پھر زمین میں قوتیں رکھی گئیں، پھر جمادات و نباتات پیدا کئے گئے، پھر آسمانوں میں ستارے پیدا کئے گئے، اس کی تفصیلات آئی ہیں۔ جب ساری کائنات بن کر تیار ہوگئی، تو جمعہ کی آخری ساعت میں آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا، یہ زمین کا فرش بچھایا گیا، آسمان کا خیمہ تانا گیا، چاند ستاروں کے انڈے لٹکائے گئے، دریا جاری کئے گئے، غذائیں جمع کی گئیں۔ یہ کس کے لئے تھیں؟ "وَاِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَاَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَۃِ" ②

ساری دنیا انسان کے لئے بنائی گئی، انسان معبود کے لئے بنایا گیا۔ آپ جب کسی کو مہمان بلاتے ہیں تو پہلے آپ کوٹھی منتخب کرتے ہیں، وہاں مہمانداری کا سامان کرتے ہیں، کھانے کا، پینے کا، رہائش کا، جب سب کچھ مہیا ہوتا ہے تب کہتے ہیں کہ تشریف لایئے، تو مہمان آتا ہے۔ ساری چیزیں اس کے استعمال میں آتی ہیں۔ تو آدم علیہ السلام ساری دنیا کے مہمان ہیں، ان کو لانے سے پہلے ساری دنیا مکمل کردی گئی۔ زمین کو فرش بنا دیا گیا، آسمان کو چھت بنا دیا گیا، سورج اور چاند کے چراغ لٹکائے گئے تاکہ روشنی ہو اور پھر عجیب طریقے سے زمین کو گودام بنادیا، اس میں سے غذائیں نکل رہی ہیں، زمین کو واٹر ورکس بنادیا، جس میں سے پانی نکل رہا ہے۔ ایک صندوق

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۴۷. ② شعب الایمان للبیہقی، التاسع والثلاثون من شعب الایمان، فصل فیما یقول العاطس فی جواب التشمیت ج: ۲۲ ص: ۱۰، محقق فرماتے ہیں یہ روایت منقطع ہے۔ دیکھئے تخریج احادیث الاحیاء ج: ۷ ص: ۲۶۳۰.

بنادیا، جس میں سے لباس بھی نکلتے چلے آ رہے ہیں۔ تو زمین ساری ضروریات کا ذخیرہ ہے حتیٰ کہ زندگی کا بھی اور موت کا بھی۔ اس سے آدمی پیدا ہوتا ہے اس میں کھپ جاتا ہے۔ ﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى﴾ ①

''جمعہ'' میں شانِ جامعیت..... تو زمین ہماری قرارگاہ بھی ہے، ہماری موت گاہ بھی ہے، ہماری دنیا بھی ہے ہمارا برزخ بھی ہے۔ ساری چیزیں جمع کر دی گئیں۔ اس کے بعد آخر میں آدم علیہ السلام لائے گئے تو جمعہ کا دن تھا۔ آخری ساعت تھی جس میں آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے۔ اس واسطے فرمایا گیا کہ جمعہ کے دن میں ایک ساعت ہے وہ اگر کسی پر گزر جائے تو اس میں جو دعا مانگتا ہے یقیناً قبول ہوتی ہے۔ علماء لکھتے ہیں کہ یہی وہ ساعت ہے جس میں آدم علیہ السلام کی پیدائش عمل میں آئی تو جتنے بڑے بڑے امور ہیں، سب اسی دن واقع ہوئے ہیں۔

آدم علیہ السلام کی پیدائش، آدم علیہ السلام کی مٹی کا جمع کرنا، آدم علیہ السلام کو دنیا میں اتارنا۔ تو اس دن کو آدمی سے کوئی خاص مناسبت ہے اور ایام بھی انسانوں کے لئے ہیں۔ مگر جمعہ کے دن ولادت، موت وحیات و جمعیت اور جنت سے نزول ہوا۔ دنیا میں آئے تو صورۃً نزول ہوا، حقیقۃً عروج ہوا۔ اس لئے کہ دنیا میں نہ آتے تو خلافت نہ پاتے، ظاہر میں تو نیچے اتارے گئے اور حقیقت میں اس عمل گاہ کے ذریعے سے جب انسان نے عمل کرنے شروع کئے تو بڑے بڑے مراتب اور درجات بلند ہوئے۔ تو معنوی طور پر انسان بلند ہوا۔ ظاہری طور پر اسے نیچے اتارا گیا۔ تو وہاں کھلا ہوا حسی ورود تھا، یہاں حسی نزول اور معنوی خلافت کا تاج رکھا گیا۔ انبیاء علیہم السلام پیدا ہوئے علمائے ربانی پیدا ہوئے۔ ہر ایک کے جوہر ظاہر ہوئے تو دنیا مظہر کمالات ہے۔ دنیا نہ ہوتی تو کمالات کا ظہور نہ ہوتا۔ اگر یہ ساری اولاد جنت میں پیدا ہوتی تو بادشاہوں کی طرح بسر کرتی۔ رات دن کھانے پینے اور عیش اڑانے میں لگے رہتے۔ لیکن دنیا میں لا کر مصائب میں مبتلا کیا گیا۔ تاکہ ان مصائب کے توڑ اور دفعیہ کے لئے انسان کے اندر جوہر نمایاں ہوں۔ مصیبت رکھی گئی تاکہ دفاع کی طاقتیں کام میں آئیں۔ اقوام کو اقوام کے مقابلہ پر ڈالا گیا، تاکہ شجاعتوں کا ظہور ہو، صبر وتحمل کا ظہور ہو۔ جنت میں نہ جنگ ہوتی نہ لڑائی ہوتی، نہ دفعیہ کی تدبیریں سوجھتیں، نہ صبر وتحمل کام آتا۔ انسان کے بہت سے جوہر چھپے ہوئے رہ جاتے۔ دنیا کو ان کے لئے ظہور گاہ بنایا گیا۔ تو آدم علیہ السلام ظاہراً تو جنت سے نیچے اتارے گئے جو نزول ہوا، حقیقت میں عروج ہوا کہ جب تک دنیا میں نہ آئیں کمالات کا ظہور نہیں ہو سکتا۔ قیامت بھی قائم ہوگی تو جمعہ کے دن ہوگی۔ جس میں اولین وآخرین جمع کئے جائیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جمعہ کے دن میں جامعیت کا مادہ موجود ہے۔ آدم علیہ السلام کی بکھری ہوئی مٹی یوم جمعہ میں جمع کی گئی۔ جو کمالات چھپے ہوئے تھے، وہ جمع ہو کر جمعہ کے دن نمایاں ہوئے۔ قیامت ہوگی تو کروڑوں اربوں انسان زمینوں میں چھپے پڑے ہوئے ہوں گے۔ لیکن اپنی اپنی قبروں سے اٹھ کر میدان حشر میں

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۵۵۔

جمع ہوں گے، جمعہ کا دن انہیں جمع کر دے گا۔ غرض اس میں جامعیت کی شان ہے۔

تو دنیا میں جمعہ لایا گیا تا کہ انسان جیسے اس کی تکوینی طور پر چیزیں جمع ہوئی ہیں، اپنے ارادے سے جمعیت کی شان اپنے اندر پیدا کرے۔ یعنی جمع ہونا سیکھیں قلوب کی یکسانی سیکھیں، قلوب کا میل ملاپ اور اتحاد سیکھیں۔ اختلاف سے بچیں گروہ بندیوں سے بچیں اس کے لئے جمعہ کو نمونہ بنا دیا گیا۔ کہ شکلیں مختلف، عقلیں مختلف، رنگ مختلف، مگر سب آ کر جمعہ کے اندر جمع ہوتے ہیں۔ دیہات کے قصبوں کے لوگ اور محلوں کے بھی ایک جگہ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں جمع ہوتے ہیں۔ باوجود اختلاف مزاج کے پھر ان میں وحدت پیدا ہوتی ہے۔ یہ جمعہ ہی کی برکت ہے۔ جب ہفتہ میں ایک دن جمع ہونا سیکھ لیا تو بقیہ ایام میں بھی ان کے لئے جمع ہونا آسان ہو جاتا ہے۔ ان میں اجتماع کی خو پیدا ہو جاتی ہے۔

ہر انسان اس وقت جہنم میں ہے، اس سے نکلنے کی تدبیر...... جمعہ کا دن اجتماعیت کی دعوت دیتا ہے کہ باہمی میل ملاپ اور محبت پیدا ہو، باہمی یگانگت پیدا ہو۔ تمہارے اندر اتحاد باہمی ہو۔ مگر اس کے ذریعہ کیا ہے؟ ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ ① امام خطبہ دیتا ہے، وہ قرآن پڑھتا ہے۔ نماز میں بھی قرآن پڑھا جاتا ہے، وہ اللہ کی رسی ہے جس کو پکڑنے کے بعد آدمی اوپر پہنچے گا۔

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قرآن اللہ کی رسی ہے۔ جو آسمان سے لے کر زمین تک لٹکا دی گئی، جس نے مجھ تک آنا ہو، اس رسی کو مضبوط تھام لے، جب ہم رسی کھینچیں گے، جو اس میں لٹک جائے گا وہ لٹک کر ہم تک پہنچ جائے گا۔ شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ یہ آسمان سے نیچے کی جگہ سارا علاقہ جس میں ساتوں زمینیں شامل ہیں۔ یہ سب جہنم کا علاقہ ہے۔ قیامت کے دن اسی میں جہنم تپے گی۔ اسی میں آگ، اسی میں سانپ اور بچھو اور اسی میں وہ سارے عذابات ہوں گے۔ تو ہم اور آپ گویا اس وقت جہنم میں موجود ہیں۔ قرآن کی رسی تانگ دی گئی جسے اس جہنم سے نکل بھاگنا ہو، وہ اس رسی کو مضبوطی سے پکڑ لے، جو نہیں پکڑے گا، اسے جہنم میں بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود بخود جہنم کے اندر موجود ہے۔ اس سے نکلنے کے لئے صرف ایک ہی ذریعہ ہے، اور وہ اللہ کی رسی ہے۔ وہ رسی ٹوٹ نہیں سکتی۔ البتہ اگر کوئی مضبوط نہ پکڑے تو چھوٹ سکتی ہے۔ تو پوری قوت کے ساتھ اس کو مضبوط تھام لیا جائے۔ اس روز بھی قرآن پورے شہر کے آگے پڑھا جاتا ہے۔ تا کہ لوگ پیغام خداوندی سن کر اس سے وابستہ ہوں اور اپنے اندر اجتماعی شان پیدا کریں۔

جُمعہ یوم امتحان...... جمعہ کا دن گویا عبرت و موعظت بھی ہے اور ایک امتحان بھی ہے۔ یہ امت مرحوم جمعہ کی وجہ سے امتحان میں کامیاب ہوئی، امتحان میں کامیابی کی فضیلت اس کو حاصل ہوئی۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ نے اقوام کا امتحان لیا۔ یہود سے کہا کہ تم عبادت کے لئے ایک دن منتخب کرو، جو ہمارے علم

---

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۰۳۔

میں متعین ہے۔ انہوں نے "یَوْمُ السَّبْتِ" مقرر کیا۔ شنبہ کا دن کہ ہفتہ کے دن بجز طاعت وعبادت کوئی کام مت کرو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہود سے فرمایا: اے یہود! "یَوْمُ السَّبْتِ" کا احترام کرو۔ جب دعوے کرتے ہو کہ وہ مقدس دن ہے تو اس کی تقدیس کرو۔

نصاریٰ سے کہا گیا کہ تم بھی ایک دن طے کرو، جو ہمارے علم میں طے شدہ ہے۔ دیکھتے ہیں تم پہنچتے ہو یا نہیں؟۔ نصاریٰ نے اتوار کا دن عبادت کے لئے تجویز کیا۔ اسی میں ان کے لئے عبادت فرض کردی گئی۔

مسلمانوں سے کہا گیا تم بھی ایک دن منتخب کرلو۔ تو ہمارے پیغمبر (فِدَاهُ رُوْحِیْ وَاَبِیْ وَاُمِّیْ) صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کا دن منتخب فرمایا۔ فرمایا یہی ہمارے علم میں طے شدہ تھا۔ تو اس وقت کو وحیِ خداوندی سے مناسبت دی گئی۔ اب پوری امت اپنے پیغمبر کے قائم مقام ہے، جو اللہ کے علم میں طے تھا، وہی طے پا گیا۔

حق فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ گھومتا ہے..... جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت بیان کی گئی کہ پچھلی امتوں میں کچھ محدث ہوتے تھے۔ جن سے حق تعالیٰ کلام فرماتا۔ میری امت میں وہ حضرت عمر ہیں۔ فرمایا گیا کہ جدھر عمر رضی اللہ عنہ گھومتے ہیں حق بھی ادھر ہی کو گھوم جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ جدھر حق گھومتا ہے عمر رضی اللہ عنہ گھومتے ہیں۔ گویا اس درجہ فاروقِ اعظم سراپا صدق اور حق بن چکے ہیں کہ جدھر وہ گھومتے ہیں حق بھی ادھر گھوم جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بارہ، تیرہ [illegible] میں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے تھی، وہی آسمان سے وحی اتری۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَوْ كَانَ بَعْدِیْ نَبِیٌّ لَكَانَ عُمَرُ" (1)

اگر نبوت ختم نہ ہوگئی ہوتی اور میرے بعد کوئی نبی آتا، تو وہ عمر رضی اللہ عنہ ہوتے۔ لیکن چونکہ دنیا میں نبوت باقی نہیں، اسی واسطے کوئی نبی نہیں ہوگا۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں صلاحیت ہے کہ اگر دنیا میں نبی آنے والا ہوتا تو وہ نبی بنائے جاتے۔ یعنی ان کے ذوق کو ذوقِ نبوت سے مناسبت تھی، وحی سے مناسبت تھی۔ رائے وہ قائم کرتے تھے جس پر وحی آنے والی ہوتی تھی۔ وحی ان کے معاون بن کر اترتی تھی۔ مخالف بن کر نہیں اترتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فضائل میں سے یہ عظیم فضیلت ہے کہ ان کے ذوق کو وحیِ خداوندی سے کامل مناسبت تھی۔

مجموعہ امت میں ذوقِ نبوت..... مجموعی طور پر یہ امت مل کر اپنے پیغمبر کی قائم مقام ہے۔ تو مجموعہ امت میں بھی نبوت کا ایک خاص ذوق ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی قائم مقام ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شریعت اصلیہ لے کر آئے امت نے اجتہاد سے وہ مسائل قرآن وحدیث سے نکالے، اور لا (LAW) اور قانون کی شکل میں پیش کیے۔ پہلے وہ مسائل نہیں تھے اس امت کے مجتہدین کے علم میں آئے تو انہوں نے قرآن سے نکال کر پوری شریعت کو گلدستہ بنا کر پیش کردیا۔ اگر پیغمبر پر وحی اتری تھی تو اس امت کے مجتہدین پر الہامِ ربانی منکشف ہوا۔ وہ اصلی شریعت لے کر آئے۔ انہوں نے اس شریعت میں سے شریعت وضع کی، گویا پیغمبر کے قائم مقام

---

(1) السنن للترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ج: ۱۲، ص: ۱۳۶۔

ہو گئے، کہ جیسے پیغمبر شرائع لائے تھے، اس امت کے مجتہدین بھی شرائع لے کر آئے اور شریعتیں پیش کیں، مگر وہ شریعتیں اصل شریعت میں سے نقل تھی۔ اس لئے علماء لکھتے ہیں کہ ''اَلْقِیَاسُ مُظْهِرٌ لَا مُثْبِتٌ''۔

مجتہد جو قیاس کر کے اجتہاد کرتا ہے تو قیاس کسی مسئلہ کو ثابت نہیں کرتا بلکہ ظاہر کر دیتا ہے۔ مسئلہ شریعت میں پہلے ہی ثابت شدہ ہے۔ مجتہد کا اجتہاد اسے شریعت کے اندر سے نکال کر لاتا ہے۔ ہم میں اور آپ میں وہ فہم نہیں کہ ہم نکال لیں، مجتہدین کو وہ فہم دیا گیا کہ وہ نکال کر پیش کر دیتے ہیں۔

بالکل ایسی ہی مثال ہے جیسے کنواں ہے اس میں پانی بھرا ہوا ہے۔ ڈول رسی جس کے ہاتھ میں ہے پانی وہی نکالے گا۔ گویا مجتہد کا اجتہاد بمنزلہ ڈول رسی کے ہے کہ وہ قوت سے کھینچتا ہے اور پانی کو نالیوں میں، نہروں میں اور جنگلوں میں بہا دیتا ہے جس سے کھیت سیراب ہوتے ہیں۔

اُمتِ محمدیہ کی مثال...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری لائی ہوئی شریعت کی مثال ایسی ہے۔ جیسے آسمان سے شدید قسم کی بارش اتری اور موسلادھار پانی زمین پر برسنا شروع ہوا۔ پانی آ کر پڑا تو زمین کے تین حصے ہو گئے۔ ایک ٹکڑا نہایت پاکیزہ نہایت عمدہ تھا اس نے پانی کو جذب کیا۔ اور جذب کر کے طرح طرح کے پھل اور پھول چمن اور رنگ رنگ کے باغ لگائے اور دنیا کو بہار بنادیا۔ ایک ٹکڑا ایسا تھا کہ کچھ اگا تو نہیں سکا، مگر اس نے بارش کے پانی کو جمع کر لیا۔ بڑے تالاب بھر دیئے کہ لوگ اس سے پانی لے جاتے ہیں، سیراب بھی ہوتے ہیں، تو وہ زمین اگر پھل پھول نہ نکال سکی، تو اس نے پانی جمع کر لیا۔

اب تیسرا ٹکڑا ایسا تھا کہ وہ چٹیل میدان تھا۔ نہ پانی کو جذب کر سکا نہ جمع کر سکا۔ پانی آیا اور بہہ کر ادھر ادھر نکل گیا اور وہ خالی رہ گیا۔ فرمایا اس طرح سے وحی کا پانی اترا، تو قلوب کی دنیا تین حصوں میں منقسم ہو گئی۔ ایک وہ قلوب جنہوں نے وحی الٰہی اور علمِ ربانی کے پانی کو جذب کیا، یہ طبقہ فقہاء اور علماء ربانی کا تھا۔ دوسرے وہ قلوب جنہوں نے جذب تو نہ کیا مگر پانی جمع کر لیا، یہ طبقہ حفاظ اور محدثین کا تھا۔ تیسرے وہ قلوب جن پر کوئی اثر نہیں ہوا اور یہ طبقہ کفار کا ہے۔

علمائے امتِ محمدیہ کی خدمات...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اصل شریعت لے کر آئے اور اس امت کے مجددین و مجتہدین نے اس شریعت میں سے مسائل استنباط کر کے نکالے۔ ان پر وحی تو نہیں آتی تھی۔ مگر ان کے قلوب پر الہام ہوتا تھا۔ انبیاء علیہ السلام کے ہاتھوں پر معجزات ظاہر ہوئے، ان کے ہاتھوں پر کرامتیں ظاہر ہوئیں۔

اس مضمون کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا۔ گو حدیث ضعیف ہے مگر علماء اس حدیث سے جگہ جگہ استدلال کرتے رہتے ہیں کہ میری امت کے علماء ایسے ہوں گے جیسے بنی اسرائیل کے پیغمبر۔ ① یعنی پیغمبر تو نہیں ہوں گے، مگر کام وہ کریں گے جو پیغمبروں نے کیا۔ ان کے کام کی نوعیت وہ ہوگی جو انبیاء علیہ السلام

① اس کی کوئی اصل نہیں۔ یہ حدیث نہیں ہے۔ دیکھئے المقاصد الحسنۃ ص: ۲۰۲۔

کے کام کی تھی، جیسے ایک نبی جس خطے میں آتا ہے تو اس خطے کو ایمان سے رنگ دیتا ہے اور لوگ مؤمن بنتے چلے جاتے ہیں۔ عالم و عارف بنتے چلے جاتے ہیں۔ اس امت کے علماء ربانی اور مجتہدین وہ ہیں کہ ایک عالم ربانی جہاں بیٹھ گیا، ہزاروں کے ایمان کو سنبھال گیا۔ ہزاروں کو ایمان سے رنگ دیا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں پورا ہندوستان تو کیا، پاکستان (بنگلہ دیش) افغانستان اور پورا ترکستان حنفی۔ ایک عالم ربانی، ایک مجتہد اٹھا، کروڑوں کے ایمان کو درست کیا۔ کروڑوں کو جنت تک پہنچا دیا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ مکہ میں پیدا ہوئے، ابتدائی عمر مکہ میں گذاری آخیر عمر مصر میں اور وہیں وفات پائی تو حجاز تقریباً سب کا سب شافعی ہے۔ ایک عالم ربانی اترا، اس نے ملکوں کو ایمان سے رنگ دیا اور لاکھوں متبع شریعت پیدا کئے۔ جتنے حنابلہ ہیں وہ کثرت سے ادھر ہیں، مغربی ممالک میں زیادہ مالکیہ ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ظہور ادھر ہوا اور علماء پیدا ہوئے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ عبداللہ بن مبارک، امام نووی، امام اسحٰق رحمہم اللہ علیہم یہ سب وہ ہیں جو صاحب مذہب تھے، اب یہ الگ چیز ہے کہ یہ مذاہب ختم ہو گئے۔ ان چار مذاہب کو قبول عام ہو گیا۔ یہ کوئی ارادی اور اختیاری چیز نہیں ہے۔ یہ منجانب اللہ ہے جیسے صوفیاء کرام کے سلاسل تو بہت سے ہیں لیکن قبولِ عام زیادہ تر چار سلسلوں کو ہوا۔ سلسلہ چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ نقشبندیہ تو یہ قبولیت منجانب اللہ ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اس امت میں ہزاروں آفتاب و ماہتاب پیدا ہوئے جن کی روشنی سے دنیا مستفید ہوئی جہاں ایک بیٹھ گیا، کروڑوں کے ایمان درست ہو گئے۔

آفتابِ عالم تاب صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد آمد...... حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے علماء، انبیاء بنی اسرائیل کی مثل ہوں گے، یعنی پہلی امت میں جو کام نبی علیہ السلام سے چلتا تھا۔ اس امت میں ختم نبوت کے طفیل وہ کام مجددین اور علماء سے چلے گا۔ گویا ایک ہی نبوت اتنی قوی ہو گی کہ اور نبوتوں کی قوت باقی نہیں رہے گی۔ جیسے مثلاً رات ہو جائے، تو آسمانوں پر ہزاروں ستارے طلوع کرتے ہیں۔ اربوں کھربوں ستارے۔ جدھر دیکھو ستارے۔ کروڑوں ستارے روشنی دار جمع ہیں مگر رات کا دن نہیں بنتا۔ ہے رات کی رات، یعنی تاریکی کلیتہً زائل نہیں ہوتی، ٹیوب لائٹوں کی ضرورت ہے۔ یہ نہیں کہ رات سے دن ہو جائے۔ لیکن جونہی آفتاب عالم تاب صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد آمد ہوتی ہے ابھی پو پھٹی ہے۔

آفتاب نے طلوع نہیں کیا۔ صبح صادق نے خبر دی کہ آفتاب عالم تاب صلی اللہ علیہ وسلم جو روشنی کا بادشاہ ہے آ رہا ہے۔ آمد کی خبر تھی کہ ستارے بھی غائب، رات بھی غائب اور دن نمودار ہونا شروع ہو گیا اور جب سورج آتا ہے۔ تو سارے ستارے ماند پڑ جاتے ہیں یہ نہیں کہ ستاروں کا نور چھن گیا بلکہ اتنا ماند پڑ گیا کہ مدھم ہو جاتا ہے کیونکہ سورج کے نور میں کوئی امتیازی طور دکھائی نہیں دیتا اگر آفتاب یوں کہے کہ میرے بعد کوئی ستارہ نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ میں خاتم الانوار ہوں۔ نور کا خزانہ ہوں۔ میرے آنے کے بعد اب کسی ستارے کی حاجت باقی نہیں۔ سارا دن گزر جائے گا، میری روشنی کام دیتی رہے گی۔ میدانوں میں میری دھوپ پڑے گی۔ اس سے کام

لے اگر کوئی میدان میں نہ آسکے، تو گھر کے دروازے کھول دے۔ اس میں بھی چاندنی پہنچ جائے گی اور اگر کوئی تہہ خانے میں بیٹھا ہوا ہے تو کم از کم کچھ دمک چمک ہی پیدا ہو جائے گی۔ اس سے بھی کام کرسکتا ہے۔ تاریک سے تاریک کوٹھری میں میری روشنی پہنچے گی۔ دن میں چراغ جلانے کی ضرورت نہیں۔ سوائے اس کے کہ کوئی آنکھوں کا نین سکھ ہی بن جائے۔ دن میں بھی بجلیاں جلائے اس کا تو کوئی علاج نہیں، ورنہ سورج نے ہر روشنی سے مستغنی کر دیا ہے۔

اسی طرح انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام آسمانِ نبوت کے ستارے ہیں۔ یکے بعد دیگرے انبیاء علیہم السلام طلوع ہوئے۔ ایک ایک وقت میں ہزاروں نبی تھے۔ بنی اسرائیل میں چار چار ہزار نبی ایک وقت میں آئے۔ تو آسمانِ نبوت پر آدم علیہ السلام کا ستارہ طلوع ہوا۔ نوح علیہ السلام کا ستارہ طلوع ہوا۔ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام آئے۔ موسیٰ وعیسیٰ (علی نبینا وعلیہم والسلام) آئے مگر رہی رات، دن نہیں نکلا۔ جونہی آفتابِ نبوت کی بشارت دی گئی۔ پو پھٹی اور صبح صادق ہوئی، یعنی عیسیٰ علیہ السلام نے پانچ سو برس پہلے آ کر کہا۔ ﴿مُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ﴾ ① میں ایک ایسے رسول کی خوشخبری دینے والا ہوں جو میرے بعد آئیں گے۔ ان کا نام نامی احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوگا۔

صبح صادق کا نمایاں ہونا تھا کہ قلوب میں جگمگاہٹ شروع ہوگئی۔ اسی جاہلیت کے دور میں دل توحید و رسالت کی طرف مائل ہونا شروع ہوئے۔ جہالتیں رفع ہونا شروع ہوئیں۔ اور جب فاران کی چوٹیوں سے آفتاب طلوع ہوگیا تو جس دل میں ذرا سی بھی استعداد تھی، اس میں نور داخل ہوا اور روشنی آنی شروع ہوئی۔ قیامت تک یہ دن لمبا دن ہے، جو ہزاروں برس کا ہوگا۔ جیسے کہ بارہ گھنٹے کا دن ہوتا ہے تو صبح صادق تو گھنٹے سوا گھنٹے کی ہوتی ہے۔ جتنا بڑا دن اتنی بڑی صبح صادق۔ یہ دن چونکہ ہزاروں برس کا تھا، تو اس کی صبح بھی پانچ سو برس کی ہوئی۔ عیسیٰ علیہ السلام کے دور سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک تک۔ اس کے بعد قیامت تک دن ہوگا۔ کل صبح قیامت کا دن ہوگا۔ تو قیامت کی صبح تک اب آفتابِ عالم تاب کی روشنی کافی ہے، کسی اور ستارے کی ضرورت نہیں۔ یہی ایک ستارہ (آفتاب) پورے عالم کو نور پہنچائے گا اور پہنچا رہا ہے۔

مختلف صورتوں میں ایک ہی نور..... اس کی روشنیوں کے ظہور مختلف ہیں۔ مجددین میں اس کی روشنی کا ظہور ہے۔ علماء ربانی میں اس کی روشنی کا ظہور ہے۔ صوفیائے کرام میں اسی کی روشنی کا ظہور ہے۔ کسی نے عالم باطن کھولا، کسی نے عالم ظاہر کھولا۔ کسی نے مسائل شرعیہ پیش کیے۔ کسی نے مسائل باطنیہ پیش کیے۔ کسی نے نفس کی الجھنیں دور کیں۔ کسی نے مکائد نفس پر روشنی ڈالی۔ کسی نے فضائل اخلاق پیش کیے اور رذائل اخلاق کو دھکا دیا۔ ایک ہی نور ہے جو مختلف صورتوں سے کام کر رہا ہے اور یہ پوری امت اپنے پیغمبر کی قائم مقام ہے۔

---

① پارہ ۲۸، سورۃ الصف، الآیۃ: ۶۔

امتِ محمدیہ سے حق کبھی منقطع نہیں ہوگا..... فرمادیا گیا: "لَاتَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلٰلَةِ." ① میری پوری امت مل کر کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگی۔ حق کبھی منقطع نہیں ہوگا۔ فرقے، گروہ بندیاں ہوں گی۔ مگر ایک فرقہ ناجیہ ضرور ملے گا، وہ وہی کرے گا جو میں کر رہا ہوں، وہی کہتا رہے گا جو میں کہہ رہا ہوں، وہی باتیں پیش کرے گا جو میں کر رہا ہوں فرمایا: اس امت میں ہر صدی پر ایک نہ ایک مجدد آتا رہے گا۔ جماعت کی شکل میں ہو یا فردی شکل میں مختلف خطوں میں مختلف مجددین ہوں گے جو دین کو نکھارتے رہیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ امت کیسے ضائع ہوسکتی ہے جس کے اول میں تو میں ہوں اور آخر میں مسیح علیہ السلام آسمان سے نزول کریں گے اور بیچ میں حضرت مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہوں گے۔ ② وہ امت کیسے ضائع ہوگی؟ جس میں اتنے بڑے بڑے مجدد پیدا ہوں گے۔ تو صدی پر وعدہ کیا، مجموعہ امت پر (عدم گمراہی کا) وعدہ کیا۔

پھر صدی کے اندر ہر دن کے لئے بھی وعدہ ہے، فرمایا اس امت میں ہمیشہ سلف سے خلف علم حاصل کرتے رہیں گے، جو اخلاف رشید ہوں گے۔ وہ اسلاف سے علوم لیتے رہیں گے۔ اور اس علم کے ذریعے غلو کرنے والوں کی تحریفات کا پردہ چاک کریں گے۔ ان کے غلو کو کھول کر رکھ دیں گے۔ اور کم عقلوں اور جاہلوں کی تاویلات کا پردہ چاک کر کے قرآن و حدیث کا اصل روپ پیش کر دیں گے۔ جس سے روز بروز دین نکھرتا رہے گا۔ تو مجموعی طور پر امت حق پر مجتمع ہے۔ ہر صدی پر مجدد آئیں گے صدی کے اندر علماء پیدا ہوں گے، امت ضائع نہیں ہوگی۔ تو پوری امت مجموعی طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم مقام ہے اور جتنے کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں وہ اس امت میں بٹے ہوئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوتِ آیات کی، تو حفاظ کا طبقہ کھڑا ہوگیا، جو تلاوت کر رہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیمات کتاب کیں، تو علماء اور فقہاء کا طبقہ کھڑا ہوگیا۔ جس نے کتاب کی تعلیم شروع کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم حکمت دی، اسوۂ حسنہ پیش کیا، تو صوفیاء کا طبقہ کھڑا ہوگیا، جس نے وہی کردار اور کریکٹر بنا کر دکھلا دیا اور لوگوں کو اس پر چلایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تزکیہ نفس کیا۔ تو صوفیاء نے قرآن و حدیث کی روشنی میں ریاضت و مجاہدے کے اصول مرتب کئے اور امت کی تربیت کی۔ ③

جو فرائض پیغمبر کے تھے، وہ "بجنسہٖ" آج بھی باقی ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ علماء میں بہت سی خطائیں ہوں، بہت غلطیاں بھی ہوں، بہر حال وہ معصوم تو نہیں، لیکن حق منقطع ہو جائے، یہ نہیں ہوسکتا۔ لوگوں کا کام یہ ہے کہ ان کے بیان کردہ مسائل پر چلیں ان کے ذاتی کردار سے قطع نظر کریں اگر کوئی برائی ہے تو ذات کے لئے چھوڑ دیں۔

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کا زریں مقولہ..... حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا میں

① السنن لابن ماجه، كتاب الفتن، ج: ۱، ص: ۲۲۳
② جامع الاصول من احاديث الرسول، فصل المؤمنين والمسلمين ج: ۹، ص: ۱۲۷۲.
③ الابانة الكبرىٰ لابن بطة، ج: ۱، ص: ۳۷.

سوائے انبیاء علیہم السلام کے کوئی آدمی ایسا نہیں جس میں صرف خیر ہی خیر ہو اور کوئی ایسا نہیں جس میں شر ہی شر ہو۔ خیر بھی ہے شر بھی ہے بھلائی بھی ہے برائی بھی ہے۔ نیکی بھی ہے بدی بھی ہے۔ دانشمند وہ ہے کہ اس کی ہر ایک نیکی سے فائدہ اٹھائے اور اس کی بدی اس کے لئے چھوڑ دے۔ کہ تو جانے اور تیرا خدا جانے۔ تو پوری امت فرشتہ دکھائی دے گی۔ یوں معلوم ہوگا کہ سب خیر ہی خیر ہے۔ آج ہم ہر شخص کے شر کو لیتے ہیں اور خیر کو دھکا دے دیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ساری امت میں شر پھیلی ہوئی ہے، وہ ساری خیر ماند پڑ گئی۔ تو دانشمندی کا طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص کی خیر سے فائدہ اٹھاؤ۔ اگر اس میں شر ہے وہ خدا کے حوالہ کرو۔ تم سے اس کے شر کا سوال نہیں ہوگا، اسی سے سوال ہوگا وہ نمٹے گا۔ تم اس کی خیر کو اپناؤ۔ (ہو سکے تو اس کے لئے دعا ہی کردو)۔ یہ تو انبیاء علیہم السلام کی صفات ہیں کہ ان کا چلنا پھرنا کہنا سننا سب حجت ہے۔ ہر گناہ، ہر برائی سے معصوم ہیں، انبیاء علیہم السلام کے بعد اور کوئی معصوم نہیں، اولیاء اللہ محفوظ ہوتے ہیں۔ لیکن باوجود محفوظیت کے امکان ہوتا ہے کہ غلطی سرزد ہو جائے اور ہوتی رہتی ہے۔ تو آپ کا یہ کام نہیں ہے کہ آپ ان کی کمزوریوں پر نظر کریں۔ آپ کا کام یہ ہے کہ جو علم ان کے اندر سے نکل رہا ہے، وراثت کے طور پر اس کو اختیار کریں اور ان کی برائی کو ان پر چھوڑ دیں، یا اگر خیر خواہی کا جذبہ ہو تو آپ تنہائی میں ادب سے کہیں کہ یہ غلطی ہے آپ اسے چھوڑ دیں۔ وہ آپ کے ممنون ہوں گے۔

حسنِ ظن اختیار کرنے کی ضرورت...... لیکن ہر شخص کی برائیوں کو اچھالنا، اس سے پوری قوم کو رسوا کر دینا ہے۔ فرمایا گیا: "ظُنُّوا بِالْمُؤْمِنِيْنَ خَيْرًا" "مومنوں کے ساتھ حسن ظن اختیار کرو۔ حسن ظن کے لئے کسی دلیل کی حاجت نہیں۔ بدظنی کے لئے جب تک کوئی دلیل نہیں ہوگی، بدظنی کی اجازت نہیں۔ یہ فرض ہے کہ ہر شخص حسن ظن رکھے۔ جب ایسے دلائل ہی مہیا ہو جائیں کہ برائی پیدا ہو گئی تو بے شک بدظنی قائم کرے۔

اب اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ آپ اسے اچھالتے پھریں نصیحت کریں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے اور فرمایا" اے اللہ! میں مکار دوست سے پناہ مانگتا ہوں کہ اس کی آنکھیں دیکھتی رہیں۔ میری ہر نقل و حرکت کی رقیب بنی رہیں، اگر بدی سامنے آئے اسے اچھال دیا، نیکی سامنے آئی اسے دفن کر دیا۔ ایسے مکار دوستوں سے میں پناہ مانگتا ہوں"۔ ہمیں اور آپ کو ایسا دوست نہیں بننا چاہئے۔ بلکہ کسی کی نیکی سامنے آئے تو اسے اچھال دو۔ بدی سامنے آئے تو دفن کر دو۔ پیار و محبت سے سمجھا دو، نصیحت کرو۔ نہیں مانتا تو خدا کے حوالے کرو۔ وہ جانے اس کا خدا جانے۔ پھر بھی اس میں کوئی نیکی ہے، علم کی بات ہے تو اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

ہر جگہ سے آدمی حصولِ خیر کرتا رہے...... مولانا حبیب الرحمٰن، حضرت مولانا احمد علی صاحب سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ بڑے صاحبزادے مولانا خلیل الرحمٰن تھے جو جمعیۃ علماء ہند کے ناظم رہے تھے۔ وہ بڑے بلا کے ذہین تھے۔ ان کی ذکاوت ضرب المثل ہو گئی تھی۔ ان کی ذکاوت و ذہانت عجائبات تھی۔ شروع عمر جوانی میں کوئی برائی ایسی نہیں جو ان سے سرزد نہ ہوئی ہو۔ یعنی جوا تک کھیلا، غصب کیا۔ دوسرے کا

مال و دولت جھپٹ لیا۔ یہ واقعہ ہے کہ علمی استعداد اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ دیوبند تشریف لاتے تو طلباء منے ہوئے تھے۔ ان کے علم کی وجہ سے ان پر قربان تھے۔ اسٹیشن سے شہر کی طرف آ رہے ہیں۔ طلباء کے ہاتھوں میں ہدایہ ہے، ہدایہ کا سبق ہو رہا ہے۔ اور طلباء پیچھے پیچھے ہیں۔ دیوبند میں پہنچے بازار میں بنیا رہتا تھا۔ ملا اس کا نام تھا۔ بہت جواری تھا۔ اس کے مکان کے نیچے بنیے کو آواز دی۔ وہ سامنے آیا تو کہا کہ ''تو پٹ لے گا جوتا، یا چت لے گا'' اس نے کہا پٹ۔ بس جوتا پھینکا وہ چت گرا دس ہزار کی شرط ٹھہری دس ہزار لے کر آگے روانہ ہوئے بنیا ہار گیا۔ اور ساتھ ساتھ سبق بھی ہو رہا ہے۔

ایک دفعہ ایک بنیے سے قرض لیا۔ بیس ہزار روپے کی دستاویز لکھ دی۔ دستخط کر دیئے۔ میعاد طے ہوئی کہ برس دن بعد ادا کریں گے۔ برس دن بعد، بنیے نے مانگا کہ میرا روپیہ کہا کیسا روپیہ؟ کہا کہ حضرت وہ جو آپ سے یہ تھا۔ فرمایا مکار! ہم نے کب لیا تھا۔ اس نے کہا صاحب دستاویز لکھی ہے۔ کہا غلط ہے۔ کوئی دستاویز نہیں، بھاگ جا یہاں سے۔ اس نے جا کر عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا۔ دستاویز اس کے پاس تھی۔ مولانا کے اس پر دستخط تھے۔ کہا کہ انہوں نے بیس ہزار روپیہ مجھ سے لیا اور دستاویز جج کی میز پر رکھ دی۔ مولانا نے کہا کہ حضور میں بھی دستاویز دیکھ سکتا ہوں۔ انہوں نے کہا دیکھو تمہارے لئے تو حجت ہے۔ تو اس نے اس طرح سے وہ کاغذ پکڑایا کہ اوپر کا سرا تو جج کے ہاتھ میں نیچے جہاں ان کے دستخط تھے، دوسرا ان کے ہاتھ میں تھا۔ خدا جانے انگوٹھے میں کوئی مسالہ لگا کر گئے تھے، کیا صورت تھی۔ اس طرح سے اس کو پکڑ کر مسلا ہے۔ کہ جب کاغذ میز پر رکھا، وہ دستخط غائب تھے، سادہ کاغذ تھا۔ مولانا نے کہا کیا یہ دستاویز آپ کو بنیے نے دی ہے۔ اس نے کہا ہاں۔ فرمایا کہ جعلی معلوم ہوتی ہے۔ اس پر تو دستخط نہیں، گمنام ہے۔

دیکھا تو اس پر کسی کے دستخط نہیں تھے۔ جج نے غصے کے لہجے میں بنیے سے کہا، گمنام دستاویز لے کر یہاں آئے ہو؟ اس نے کہا حضور! دستخط تھے، میں حلف کرتا ہوں۔ اس نے کہا تھے تو کہاں گئے؟ کوئی جن کھا گیا۔ کوئی اسے لے گیا۔ کہاں گئے دستخط؟ بنیے نے سر پیٹ لیا۔ آخر مولانا کی ڈگری ہوئی۔ بیس ہزار روپے کا اور دعویٰ کر دیا کہ میری حیثیت کی ہتک ہوئی ہے بیس ہزار اور وصول کر لئے یہ کیفیت تھی۔

سنار کو گھر بلایا کہ زیورات کی ضرورت ہے۔ شادی ہونے والی ہے۔ دس پندرہ ہزار کے زیورات لینے ہیں۔ فرمایا کہ اتنی مہلت ہے، اجازت ہے کہ میں گھر کی عورتوں کو دکھلا آؤں۔ اس نے کہا ضرور دکھلا دیجئے۔ کوئی بے اعتباری تھوڑا ہی ہے۔ بس وہاں سے جا کر آدھ گھنٹہ میں جو کام کیا کہ سارے نگ اکھاڑ کر چھوٹے چھوٹے پرچوں پر دستخط کر کے نیچے رکھ دیئے اور نگوں کو اس طرح جڑ دیا جس طرح تھے اور سنار کو واپس کر دیئے۔ وہ لیکر چلا گیا۔

مولانا نے جا کر عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا کہ سنار میرے گھر سے پندرہ ہزار روپے کے زیورات چرا کر لے گیا ہے اور پتہ نہیں ہے کہ کہاں ہیں۔ تو فوراً سمن جاری ہوا۔ اس کی طلبی ہوئی۔ عدالت میں حاضر ہوا۔ مولانا کا

دعویٰ تھا کہ پندرہ ہزار کے زیور لے گیا ہے۔اس نے کہا صاحب! میں کسی کے زیور نہیں لایا۔دکھانے کے لئے لے گیا تھا۔مولانا نے کہا یہ جھوٹا ہے۔ چرا کر لے گیا ہے۔بات بنا رہا ہے کہ میں دکھانے کو لے گیا تھا۔ورنہ مجھے کیا ضرورت تھی۔میں خود دکان پر جا کر دیکھ آتا۔

جھڑپ شروع ہوئی تو جج نے کہا''کوئی ثبوت''؟مولانا نے کہا کہ ثبوت یہ ہے کہ اس کے سارے زیور عدالت میں طلب کر لئے جائیں میں اپنے زیور پہچان لوں گا۔چنانچہ سارے زیور عدالت میں حاضر کئے گئے۔ مولانا نے جتنے ان کی نگاہ میں آچکے تھے،سب الگ کر دیئے۔اور کہا کہ''یہ ہیں وہ سب زیور''۔سنار نے شور مچایا کہ صاحب ان کے کہاں سے آئے؟یہ میری دکان کے زیور ہیں،ان کے نہیں۔

جج نے کہا''ثبوت''؟انہوں نے کہا کسی زیور کا نگ اکھاڑ کر دیکھ لیجئے ہر نگ کے نیچے میرے نام کے دستخط موجود ہیں۔اب جس نگ کو اٹھاتے نیچے مولانا کے دستخط تھے۔پندرہ ہزار کے زیوروں پر دستخط موجود تھے۔آخر وہ زیور مولانا کو مل گئے اور گھر لے کر چلے آئے۔یہ حالت تھی اور ساتھ ہی علمی استعداد کا یہ حال کہ سڑک پر بھی جا رہے ہیں تو طلباء پیچھے۔مگر خیر آخر میں اللہ تعالیٰ نے توبہ نصیب فرمائی۔اور اس درجہ پر پہنچے کہ پوری پوری راتیں نوافل وتلاوت قرآن مجید اور درود شریف میں گزرتی ہیں۔یہ ان کا عام معمول تھا کہ جمعہ کی پوری رات درود شریف پڑھ کر گزارتے۔سوتے نہیں تھے۔جیسے حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ہم نے علم دنیا کی طلب کے لئے حاصل کیا تھا۔مگر علم نے کہا میں غیر کی طرف نہیں جاؤں گا۔تو ہمیں بھی اللہ سے ملا دیا۔انہوں نے علم سیکھا تو بالآخر اس علم نے اپنی طرف کھینچا۔یہ چیزیں ختم ہوئیں۔اخیر عمر ان کی نہایت مقدسانہ اور نہایت پاکیزہ زندگی بن گئی۔مگر میں نے اس پر یہ عرض کیا کہ باوجود ان خرافات کے،ان کی برائیوں کے چونکہ علم تھا،تو طلباء ان کے جوے کے درپے نہیں تھے۔انکے علم کے درپے تھے کہ یہ ہمیں مل جائے۔ان کا جوا ان کے ساتھ ہے،اللہ جانے اور وہ جانیں۔

پوری امت میں خیر کیسے نمایاں ہوسکتی ہے......اگر پوری امت میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ ہر شخص کی خیر سے فائدہ اٹھاؤ اور اس کی شر کو اس کے لئے چھوڑ دو۔تو ساری امت نیک نظر آئے گی اور اگر پوری امت کے ایک ایک فرد کی برائیاں اچھالیں گے۔اور نیکیاں دفن کر دیں گے تو معلوم ہوگا کہ ساری امت برائیوں سے بھری ہوئی ہے۔اس امت میں کوئی نیک آدمی نہیں۔

اس جذبے سے ہم پوری امت کو برا کر کے دکھلا رہے ہیں۔نہ اجتماعیت باقی ہے،نہ اتحاد وحدت اور نہ قلوب کی یگانگت۔اس لئے ہر شخص کی نظر برائی پر ہے۔اپنی جانب سے ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ میں سب سے اونچا اور دوسرا حقیر اور دوسرا یہ سمجھتا ہے کہ میں سب سے اونچا اور وہ حقیر۔سات فقیر ایک کمبل میں سو سکتے ہیں مگر دو بادشاہ ایک ملک میں جمع نہیں ہوسکتے۔اس لئے کہ فقیر میں تو اضع ہے اور بادشاہ میں کبر۔تو کبر دوسرے کے ساتھ جمع نہیں

ہونے دیتا۔ ہر شخص نے کبر و نخوت کو پیشہ بنا لیا۔ اس لئے فسادات اور جھگڑے بھی ہیں۔

تواضع پیدا ہو جائے تو جھگڑے ختم ہو جائیں۔ جب آپ دوسرے سے یوں کہیں گے کہ آپ بڑے ہیں۔ میں آپ کا خورد ہوں۔ وہ کہے گا کہ آپ بڑے ہیں، میں آپ کا خورد ہوں۔ لڑائی کیسے ہوگی؟ لڑائی اس سے ہوگی کہ آپ کہیں میں عزت والا ہوں تم ذلیل ہو۔ اس نے کہا میں عزت والا ہوں تم ذلیل ہو۔ بس لاٹھی چل پڑے گی۔ جب ہر شخص یہ کہے کہ حیثیت تو آپ کی ہے، میں تو آپ کا خادم ہوں۔ تو پاؤں میں پڑے سانپ کو بھی کوئی نہیں مارتا۔ بہرحال امت میں آپ جہاں دیکھیں کہ جھگڑا چلتا ہے، تو سمجھ لیں کہ کوئی متکبر آ گیا، کوئی صاحب نخوت موجود ہے، جسے اقتدار کی ہوس ہے۔ جاہ پسندی اس کے اندر گھر کئے ہوئے ہیں، وہیں جھگڑا شروع ہوتا ہے۔

دو چیزیں ہیں جو امت کو تباہ کرنے والی ہیں۔ ایک حبِ جاہ اور ایک حبِ مال۔ جاہ اللہ کی دین ہے اسے استعمال کیا جائے۔ اس پر فخر نہ کیا جائے۔ مال اللہ کا انعام ہے۔ اس کے بتائے ہوئے مصارف میں اس کو استعمال کیا جائے۔ نہ کہ مال کو کوئی خدا بنانے کی چیز ہے کہ آدمی سربسجود ہو کر جھک جائے۔ یہ تو استعمال کی چیزیں ہیں۔ بندہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے تو اس کو جاہ دی ہے محنت کرتا ہے تو اسے دھن دیا جاتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں خدا کی ہیں۔ خدا ہی کے لئے استعمال میں آتی ہیں۔ اس واسطے کہ اگر ان چیزوں کو ہم مخلوق کے لئے استعمال کریں۔ اپنی نخوتوں کا سامان نہ بنائیں تو پوری امت میں خیر نمایاں ہوگی۔

بحیثیت مجموعی امت بھی معصوم ہے...... تو میں اس پر عرض کر رہا ہوں کہ پوری امت اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم مقام ہے۔ جیسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم معصوم تھے، بحیثیت مجموعی امت بھی معصوم ہے۔ اس میں طبقات برے ہوں گے، افراد بھی برے ہوں گے۔ لیکن مجموعی حیثیت سے امت معصوم ہے یعنی دین ضائع نہیں ہو سکتا، کہ دین ختم ہو جائے اور گمراہی عام ہو جائے۔ ہدایت بالکل باقی نہ رہے۔ اصل ہدایت باقی رہے گی۔ تو مجموعی حیثیت سے گویا عصمت کے مقام پر ہے کہ امت ضائع ہو کر کسی دوسری امت کا وجود ہو جائے، یہ نہیں ہوگا۔ جیسے پچھلی امتیں ختم ہوتی تھیں۔ نئی امت کی بنیاد پڑتی تھی۔ تو وہ یہ ہوتا تھا کہ ایک نبوت ختم ہوتی دوسری نبوت کی بنیاد پڑتی۔ اب نبوت ایک ہے جو قیامت تک رہے گی۔ تو امت بھی ایک ہے کہ قیامت تک رہے گی۔ اس لئے اس میں حق بھی رہے گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ حق منقطع ہو جائے اور گمراہی پھیل جائے۔

ہمہ وقت اللہ کا دھیان رہے...... تو ساری ہدایتوں کا اجتماع جمعہ کے طفیل ہوا۔ جمعہ ہی آدم علیہ السلام کو نیچے لانے کا ذریعہ بنا۔ وہ نیچے آئے تو اولاد پیدا ہوئی اور پیغمبریاں بھی ظاہر ہوئیں۔ نبوتیں بھی نمایاں ہوئیں علم و کمال نمایاں ہوئے۔ پاکیزہ اخلاق بھی نمایاں ہوئے اور اب تک یہ سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ تو جمعہ کا دن تمام کمالات کا جامع اور سبب ہے۔ اس سے ہم فائدہ اٹھائیں کہ جس طرح ہم یہاں جمع ہوئے، کاش باہر جا کر بھی ہم بھائی بھائی بنے ہوئے ہوں۔ اسی طرح ہمارے قلوب میں یکسانی ہو۔ مسجد اور باہر کا فرق کیا؟ یہ کہ جب آپ باہر جائیں گے تو دنیا

سامنے ہوگی۔ جب جمعہ کے لئے مسجد کے اندر آئے تو اللہ میاں سامنے ہیں۔ معلوم ہوا خدا سامنے ہو تو وحدت پیدا ہوتی ہے۔ دنیا سامنے ہو تو انتشار پیدا ہوتا ہے۔ اسلام نے یہ نہیں کہا کہ دنیا کو چھوڑ دو۔ کسبِ حلال تمہارے اوپر فرض ہے۔ اسلام میں یہ ہے کہ دنیا پر قابو پا کر اس کی محبت ترک کر دو۔ دنیا کو استعمال کے لئے رکھو۔ اور تمہاری شان ہو کہ۔

دل بیار و دست بکار

ہاتھ پیر کام میں لگے ہیں اور دل اپنے مالک میں لگا ہوا ہے۔ گویا اپنے پروردگار سے باتیں کر رہا ہے۔ غرض ترکِ دنیا اسلام میں اس معنی پر نہیں ہے کہ شہروں کو چھوڑ دو۔ آبادیوں کو چھوڑ دو۔ لذات کو ترک کر دو۔ حکم دیا گیا۔ ﴿کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا﴾ ① پاک غذائیں کھاؤ اور عملِ صالح اختیار کرو۔ فرمایا گیا ﴿فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾ ② نکاح بھی کر سکتے ہو، ضرورت پڑے تو چار بھی کر سکتے ہو۔ بشرطیکہ ضرورت پڑے اور دل اجازت دے۔ اور دل میں عادل ہو تب، ویسے نہیں۔ مکان بنانے کے بارے میں قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے احسان جتلایا ہے۔ ﴿وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ بُیُوْتِکُمْ سَکَنًا﴾ ③ اللہ نے تمہارے لئے سکون کی جگہ رکھی۔ سکونت کی جگہ۔ کپڑوں کے گھر دیئے چمڑوں کے گھر دیئے اگر گھروں میں بسانا منظور نہ ہوتا، جنگلوں میں بسانا منظور نہ ہوتا تو احسان کیوں جتلایا جاتا۔ تو کھانے کی اجازت، پینے کی اجازت۔ اور فرمایا: ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِہٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾ ④ کہہ دے اے پیغمبر! کون ہے جو اللہ کی دی ہوئی نعمت و زینت کو اپنے لئے حرام کرے۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ حلال طریقے پر لذات کو استعمال کرو اور شکرِ خداوندی بجالاؤ اور عملِ صالح اختیار کرو۔

اسلام میں ترکِ دنیا کا مفہوم...... اسلام میں ترکِ دنیا کا یہ مفہوم نہیں کہ آدمی شہروں کو چھوڑ کر ساری لذات سے منہ موڑ کر جنگلوں میں پہاڑوں میں جا بیٹھے۔ بلکہ یہ معنی ہیں کہ مال کمائے، شہر بسائے آباد کرے۔ سب میں رہے پھر بھی اللہ سے متعلق رہے۔ معبود ایک ہے، یہ چیزیں پرستش کے لائق نہ بنائے۔ تو روپے پیسے کو معبود مت بناؤ۔ اللہ نے یہ دولت خادم بنا کر دی ہے، مخدوم بنا کر نہیں دی کہ آدمی اس کی پرستش میں لگ جائے۔ جاہ و عزت آدمی کو اللہ نے اس لئے دی ہے کہ اس کے ذریعے باطل کو دفع کیا جائے۔ اس اقتدار سے مدافعت میں کام لیا جائے۔ اس لئے نہیں دی گئی کہ آدمی غرور کی شکل میں بولے۔ بڑا بول بولے، متکبر بنے اور عقل کے لئے مال دیا گیا ہے مال کے لئے وہ چیزیں جمع کرو جو نافع ہوں اور جاہ کے ذریعے ان چیزوں کو دفع کرو جو نفس کے لئے

---

① پارہ: ۱۸، سورۃ المؤمنون، الآیۃ: ۵۱. ② پارہ: ۴، سورۃ النساء، الآیۃ: ۳.

③ پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۸۰. ④ پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۳۲.

مضطر ہوں۔ مقاصد کو چھوڑ کر آلات و وسائل میں پڑ جاؤ، یہ دانش مندی کے خلاف ہے۔

جمعہ کی تعلیم...... بہرحال جمعہ ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ ایک جگہ جمع ہوں اور جمع ہونے کی صورت یہ ہے کہ منہ اللہ کی طرف ہو۔ قبلہ کا استقبال کرو۔ جب ایک رخ ہوگا، مجتمع ہو جاؤ گے۔ جب آمنے سامنے ہوں گے تب ٹکر پیدا ہوگی۔ جب سب کا رخ ایک طرف ہوگا۔ ٹکراؤ کی کوئی وجہ نہیں۔

آپ میں سے جو حضرات حج کے لئے گئے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ طواف کرنے کی جگہ میں کئی لاکھ آدمی طواف کرتے ہیں۔ بیت اللہ شریف میں ایک ہی مقام پر لاکھوں آدمی جمع ہیں۔ مرد و عورت کا ایک ہجوم ہے۔ کندھے سے کندھا چھلتا ہے، لڑائی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ سب ایک ہی رخ میں گھومتے ہیں۔ اگر کچھ ادھر کو چلتے، کچھ ادھر کو تو مڈبھیڑ ہوتی، اچھا خاصا تصادم ہوتا، کیونکہ رخ ایک ہے۔ اس لئے لاکھوں جمع ہیں، ان میں کوئی ٹکر نہیں۔

جب آپ جامع مسجد میں آئیں گے تو سب کا رخ ایک ہی طرف ہوگا، تو یگانگت پیدا ہوگی۔ آپس میں کوئی ٹکراؤ نہیں جب باہر جائیں گے تو کسی کا منہ دکان کی طرف، کسی کا منہ دفتر کی طرف، ہر کوئی دوسرے کے سامنے۔ اس میں تصادم ٹکراؤ اور جھگڑے شروع ہو گئے۔ جیسے یہاں ظاہری طور پر ہے اگر باطنی طور پر خدا کی طرف منہ کر لیا جائے وہاں بھی وہی شکل پیدا ہو جائے گی۔ تو جمعہ کا رخ بتلاتا ہے کہ جیسے تم ظاہر میں جمع ہو گئے ہو، باطن میں بھی ہم نے تمہیں جمع کیا ہے۔ اس لئے جب تم باہر جاؤ تو باطن کا رخ ایک طرف رکھو۔ اللہ سے لو لگائے رکھو۔ تم میں تفریق پیدا نہیں ہوگی۔ بہرحال جمعہ یوم امتحان بھی ہے کہ یہ امت کامیاب ہوئی۔ جمعہ یوم جامعیت بھی ہے جس نے تمام بکھری ہوئی چیزیں جمع کیں۔ جمعہ یوم فضیلت بھی ہے جس میں انسانوں کو فضیلت ملی۔ جمعہ یوم مزید بھی ہے، جس میں دربار خداوندی میں حاضری کی عادت پڑی۔ اس لئے جمعہ کو انتہائی ذوق و شوق سے ادا کرنے کی ضرورت ہے اور اذان جمعہ سے پہلے آ کر مسجد میں صف اول ہی میں بیٹھنے کی ضرورت ہے۔ تا کہ وہ فضائل و برکات حاصل ہوں۔ اس مختصر سے وقت میں یہی موضوع جمعہ کا سامنے تھا۔ اسی کے متعلق میں نے چند باتیں عرض کیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرماوے۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ، اَللّٰهُمَّ وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصّٰلِحِيْنَ غَيْرَ خَزَايَا وَلَا مَفْتُوْنِيْنَ ، وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَآ اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ. آمین۔

سنتِ حضرت خلیل علیہ السلام

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ ! "قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَا عَمِلَ ابْنُ اٰدَمَ مِنْ عَمَلٍ يَوْمَ النَّحْرِ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ اِهْرَاقِ الدَّمِ، وَاِنَّهٗ لَيَأْتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِقُرُوْنِهَا وَاَشْعَارِهَا وَاَظْلَافِهَا، وَاِنَّ الدَّمَ لَيَقَعُ مِنَ اللّٰهِ بِمَكَانٍ قَبْلَ اَنْ يَّقَعَ بِالْاَرْضِ، فَطِيْبُوْا بِهَا نَفْسًا. اَوْكَمَا قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ "①

" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: کہ بقرہ عید کے دن انسان کے تمام نیک اعمال میں سے سب سے زیادہ پسندیدہ اور محبوب عمل قربانی ہے یہ قیامت کے دن اپنے سینگ، بال اور کھر کے ساتھ (صحیح سالم) آئے گی اور یقیناً (قربانی کا) خون زمین پر گرنے سے پہلے حق تعالیٰ کے یہاں مقبولیت کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ سو قربانی خوشدلی سے کیا کرو"۔

تمہید..... بزرگانِ محترم! یہ حدیث جو اس وقت آپ کے سامنے تلاوت کی (اور جس کا ترجمہ بھی آپ کو معلوم ہو چکا ہے) احکام قربانی پر مشتمل ہے۔ جو اس وقت تقریر و جلسہ کا موضوع ہے، تقریر تو مختصر ہوگی۔ اس لئے کہ اول تو یہ مسئلہ جزئی ہے اور جزئیات میں تفصیل نہیں ہوتی۔ کیونکہ بسط و تفصیل تو اصول میں ہوا کرتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ ایک عام مسئلہ ہے اور اس سے کوئی مسلمان بھی ایسا نہیں جو واقف نہ ہو۔ قربانی کا عمل کوئی سال کا عمل نہیں بلکہ صدیوں سے یہ عمل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس لئے بھی اس میں تفصیل کی ضرورت نہیں تو نہ نفسِ مسئلہ میں تفصیل کی گنجائش اور اس کے عام ہونے کی بناء پر نہ تفصیل کی ضرورت ہے۔

اُصولِ ثلاثہ تکوینیہ.....اُصولِ اوّل: مسئلہ کی شرح سے پہلے ایک اصول سمجھ لیجئے اور یہ اصول جس طرح تکوینی ہے اس طرح تشریعی بھی ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا ذرہ ذرہ دو چیزوں سے ملا کر بنایا ہے۔ ایک روح ایک جسم یعنی ہر چیز کی صورت ہے، ایک اس کی حقیقت ایک اس کی ہیئت اور ایک ماہیت یا یوں کہئے کہ ایک اس کا ظاہری حصہ

① السنن للترمذی، ابواب الاضحیۃ، باب ماجاء فی فضل الاضحیۃ، ج: ۵، ص: ۲۴۳۔

ہے اور ایک باطنی۔ غرض تمام انسان، کل حیوانات، نباتات، جمادات کی جہاں ایک صورت ہے وہاں اس کی ایک حقیقت بھی ہے، ایک اس کا بدن اور ایک اس کی روح ہے۔ اور ہر بدن میں خدا تعالیٰ نے اس کے مناسب روح ڈالی ہے۔ جب حق تعالیٰ کی توجہ کائنات کی طاقتوں اور بدن بنانے کی طرف متوجہ ہوئی تو یہی اصول مدِنظر تھا۔

سب سے پہلے انسان ہی کو لیجئے کہ اوّل انسان کا بدن تیار کیا جاتا ہے جس کی ابتداء نطفہ یعنی ایک گندے قطرہ سے ہوئی۔ جس کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح ہے: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۚ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۚ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾ ① ”یعنی ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ (یعنی گندے قطرے) سے بنایا۔ پھر ہم نے اس بوٹی کو ہڈیاں بنادیا۔ پھر ہم نے ان ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا۔ پھر ہم نے اس کو ایک دوسری مخلوق بنادیا۔ سو کیسی شان ہے اللہ کی جو تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے“۔

تو روح ڈالنے سے پہلے ڈھانچہ تیار کیا جاتا ہے، جس کی تیاری میں زمین کی قوتیں بھی متوجہ ہوتی ہیں۔ آسمان کی بھی۔ آفتاب کی طاقتیں بھی متوجہ ہوتی ہیں اور ہواؤں کی بھی۔ غرض جب کائنات کی ساری قوتیں مل کر ڈھانچہ تیار کر لیتی ہیں تو پھر اس میں روح ڈال دی جاتی ہے۔ یہی صورت سارے جمادات اور نباتات اور حیوانات کی ہے۔

دوسرا اُصول...... جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ اس کائنات کی کوئی چیز باقی نہیں رہ سکتی جب تک بدن اور روح ملے ہوئے نہ ہوں، گویا بدن کی بقا روح پر موقوف ہے اور روح کی بقا بدن پر۔ اگر آپ نے بدن کو پھوڑ کر خستہ وخراب کر دیا یا وہ خود ہی قدرتی طور پر خراب ہو گیا اور اس میں سکت باقی نہ رہی تو پھر اس میں روح نہیں ٹھہرتی، بلکہ پرواز کر جاتی ہے۔ اس لئے کہ بدن ہی روح کو سنبھالے رکھتا ہے۔

غرض انسان میں جب تک روح ہے تو انسان ہے ورنہ لاشہ ہے جو بے کار ہے۔ پھر جس طرح مجموعہ بدن کے لئے مجموعہ روح ہے اس طرح بدن کے ہر جزء کے لئے ایک ایک روح ہے جو اسی کے ساتھ رہ سکتی ہے اگر اس جزء کو ختم کر دیا جائے تو یہ روح بھی نہ رہے گی۔ یہ نہ ہوگا کہ اگر ایک جزء کو ختم کر دیں تو اس کی روح کسی دوسرے جزء میں پہنچ جائے۔ مثلاً آنکھ پھوڑ دی جائے تو یہ نہیں ہوتا کہ دیکھنے کی قوت ناک میں آجائے بلکہ یہ قوت ہی باقی نہیں رہتی۔ اسی طرح ناک ہے اس میں سونگھنے کی قوت ہے وغیرہ۔

حاصل یہ کہ خداوند تعالیٰ نے جس قدر قویٰ پیدا کئے ہیں ان میں روح اور قوت بھی ساتھ ساتھ پیدا کر دی ہے اور یہ دونوں مل کر کائنات کا حصہ بنتے ہیں۔ اگر دونوں کو الگ کر دیا جائے۔ تو اسی حقیقت کو ”موت“ کہتے ہیں اور اس علیحدگی سے کائنات کی تمام اشیاء ختم ہو جاتی ہیں۔ ایک دوسرا اصول اور سمجھ لیجئے جو اسی سے متعلق ہے کہ

① پارہ: ۱۸، سورۃ المومنون، الآیۃ: ۱۲، ۱۳، ۱۴۔

بدن کے اندر جو قوتیں چھپی ہوئی ہیں ان کی پہچان ان ابدان ہی کے ذریعے سے کی جاتی ہے۔ مثلاً قوتِ بینائی کی شناخت آنکھ سے کی جاتی ہے اور قوتِ سامعت کی کان سے غرض یہ صورتیں ان قوتوں کے تعارف کا ایک ذریعہ ہیں اگر یہ صورتیں نہ ہوں تو یہ تعارف ختم ہو جائے۔ اس اصول کا حاصل یہ ہوا کہ "بدن روح کی پہچان کا ذریعہ ہے"۔

تیسرا اُصول...... اب تیسرا اصول اور سمجھ لیجئے کہ اگر آپ روح تک کوئی اثر پہچانا چاہیں تو وہ بدن ہی کے ذریعے پہنچا سکتے ہیں۔ اس عالم میں براہِ راست روح کو متاثر کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ مثلاً آپ روح پر گرمی کا عمل کرنا چاہیں تو بدن کو آگ کے سامنے لے جائیں گے جب پہلے بدن گرم ہو جائے گا، اس کے بعد روح کو گرمی پہنچے گی اور اگر ٹھنڈک پہچانا چاہیں تو آپ بدن پر پانی ڈالیں گے، یا اس پر برف ملیں گے یا وضو کریں گے وغیرہ۔ غرض ہر تاثیر کے لئے بدن ذریعہ ہے۔ بغیر بدن کے روح پر اثرات نہیں پہنچ سکتے۔

اُصولِ ثلاثہ تشریعیہ...... تو اب تین اصول معلوم ہوئے کہ بدن سے تین کام لئے جاتے ہیں۔ روح کے قرار اور قیام کا۔ دوسرے روح کے تعارف اور پہچان کا۔ اور تیسرے تاثیر کا۔ اور یہ تینوں باتیں اس قدر ظاہر ہیں کہ ان پر کسی دلیل کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔

اور یہ تینوں اصول جس طرح تکوینی ہیں، اسی طرح تشریعی بھی ہیں۔ یعنی اعمالِ شرعیہ میں بھی ایک صورت ہے اور ایک روح۔ اور بغیر صورت کے روح کا باقی رہنا ناممکن ہے اس طرح اگر روح تک کوئی اثر پہچانا چاہیں تو وہ صورت ہی کے ذریعہ پہنچ سکتا ہے اس کی مثالوں سے شریعت بھری پڑی ہے۔ مثال کے طور پر وضو ہی کو لیجئے کہ اس کی ایک صورت ہے اور ایک روح۔ اس کی صورت تو وہ خاص ہیئت اور افعال ہیں جو انسان وضو کرنے کے وقت اختیار کرتا ہے یعنی ایک خاص طرح بیٹھ کر اعضاء کا دھونا وغیرہ۔ اور یہی ہیئت اس کے تعارف کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ آپ وضو کر رہے ہوں تو ہر شخص آپ کو دیکھ کر پہچان لے گا کہ آپ وضو کر رہے ہیں۔ کھانا نہیں کھا رہے کیونکہ کھانا کھانے والے کی ہیئت اور ہے۔ یہ تو اس کی صورت ہے اور ایک اس کی روح ہے۔ یعنی طہارت حاصل کرنا تاکہ انسان دربارِ الٰہی میں حاضری کے قابل ہو سکے۔ اور ایک اس کی تاثیر ہے یعنی وہ خاص قسم کا انشراح جو انسان کے قلب میں وضو کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ تو یہ طہارت اور انشراح بغیر وضو کی صورت اختیار کئے کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح غسل کی بھی ایک صورت ہے یعنی تمام جسم کو دھونا اور ایک اس کی روح ہے۔ یعنی طہارت اور صفائی۔ اور اس کی تاثیر فرح و انبساط ہے۔ اب اگر کوئی شخص تمام عمر غسل نہ کرے تو اس کو فرح و انبساط کی وہ خاص کیفیت کبھی بھی نصیب نہ ہوگی الغرض ہر چیز کی روح حاصل کرنے کے لئے اس کی صورت کا اختیار کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح آپ نماز کو لیجئے کہ اس کی صورت نیت باندھ کر کھڑا ہونا اور رکوع و سجود وغیرہ ادا کرنا ہے اور اس کی روح خدا تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنا ہے اور اپنی عبدیت و بندگی کا اظہار کرنا ہے، اگر آپ نماز کی ہیئت اختیار نہ کریں تو بندگی کی یہ خاص صورت کبھی بھی حاصل نہ ہوگی اسی طرح زکوٰۃ اور روزہ وغیرہ عبادات ہیں کہ ہر ایک کی

ایک روح اور ایک صورت ہے۔

محبوباتِ نفس کی قربانی.....تو یہ جو ''قربانی'' ہے۔اس کی بھی ایک صورت ہے اور ایک روح ،صورت تو جانور کا ذبح کرنا ہے اور اس کی حقیقت ایثارِ نفس کا جذبہ پیدا کرنا ہے اور تقرب الی اللہ ہے۔تو ظاہر ہے کہ یہ روح بغیر جانور ذبح کئے کیسے حاصل ہو سکتی ہے کیونکہ یہ بات پہلے معلوم ہو چکی ہے کہ ہر صورت میں اس کے مطابق روح ڈالی جاتی ہے نماز میں نماز کی روح۔زکوٰۃ میں زکوٰۃ کی روح اور قربانی میں قربانی کی روح ڈالی جاتی ہے غرض اللہ تعالیٰ نے اس کی جو صورت مقرر کر دی ہے وہی اختیار کرنا پڑے گی تب وہ روح اس میں ڈالی جائے گی اگر وہ کسی چیز کی قربانی طلب کریں تو قربانی دینی ہو گی۔﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ ① ''یعنی تم خیرِ کامل کبھی حاصل نہ کر سکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو گے''۔

اور مال محبوب چیز ہے۔مال میں سے بھی جانور زیادہ عزیز ہوتا ہے۔کیونکہ جاندار ہونے کی وجہ سے اس سے زیادہ محبت ہوتی ہے اس لئے کہ اگر کوئی بے جان چیز ضائع ہو جائے تو آدمی دوسری گھڑ کر بنا سکتا ہے بخلاف جاندار کے اگر فنا ہو گیا تو دوسرا نہیں ملتا۔اور یہ مال تو ایسی چیز ہے کہ فنا ہو کر ہی نفع پہنچاتا ہے اگر کسی کے پاس ایک کروڑ روپیہ رکھا ہوا ہو تو وہ بے کار ہے،اس سے کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اس کو خرچ نہ کرے تو جب دنیوی منافع اس کو خرچ کئے بغیر نہیں مل سکتے تو ''رضاءِ حق'' جو اعلیٰ ترین نفع ہے وہ محبوبات قربان کئے بغیر کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ اور محبوبات کیا ہیں؟ جان،مال،اولاد،عزت آبرو وغیرہ۔

چنانچہ ارشاد ہے﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ ② ''یعنی بیشک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی جانوں اور مال کو جنت کے بدلے میں خرید لیا''۔

غرض آپ کو ان میں سے ہر چیز نثار کرنی ہو گی۔تب کہیں بندگی کا اظہار ہو گا۔درحقیقت جنت تو ایمان کے بدلے میں ملے گی اور اعمال تو ایمان کی شناخت کا ذریعہ ہیں۔جیسے اگر سونا خریدا جائے تو اس کو کسوٹی پر گھسا کر دیکھا جاتا ہے اگر کھرا ہے تو اس کی قیمت ادا کرتے ہیں،ورنہ نہیں تو اس جگہ قیمت سونے کی ہوتی ہے،لکیروں کی نہیں جو کسوٹی پر پڑ جاتی ہیں۔بس اسی طرح آخرت کے بازار میں جنت کے عوض ایمان کی قیمت ادا کرنا ہو گی اور یہ ہمارے اعمال ان لکیروں کی طرح ہمارے ایمان کی پختگی کی علامت ہیں۔اس لئے جنت حاصل کرنے کے لئے ہمیں ''محبوباتِ نفس'' کو قربان کرنا لازمی ہے۔اگر مال خرچ کرنے کا حکم ہو تو مال خرچ کرو۔جان دینے کا حکم ہو تو جان نثار کرو۔عزت کی ضرورت ہو تو وہ بھی قربان کرو۔یہی عشق کی پختگی کی علامت ہے۔

ایک صحابی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سوچ کر کہو کیا کہتے ہو؟۔انہوں نے پھر یہی عرض کیا اور آپ

---

① پارہ:۴،سورۃ آل عمران،الآیۃ:۹۲. ② پارہ:۱۱،سورۃ التوبۃ،الآیۃ:۱۱۱.

صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی فرمایا، کہ سوچ کر کہو کیا کہتے ہو؟ انہوں نے تیسری بار بھی یہی عرض کیا کہ مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مصیبتیں جھیلنے کو فقر فاقہ کی زندگی بسر کرنے کو اور آفتیں جھیلنے کو تیار ہو جاؤ اور ظاہر بات ہے کہ عاشق اپنی محبت کا ثبوت اس وقت تک نہیں دے سکتا جب تک مصیبتیں نہ جھیلے اسی لئے ارشاد ہے۔ ﴿الٓمّٓ ۝ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِیْنَ﴾ ① ''یعنی کیا لوگوں کا خیال ہے کہ محض ''اٰمَنَّا'' کہنے سے ان کا چھٹکارا ہو جائے گا اور ان کی آزمائش نہ ہوگی۔ حالانکہ ہم نے آزمایا ان سے پہلے لوگوں کو بھی ضرور بہ ضرور معلوم کرے گا اللہ تعالیٰ سچے لوگوں کو اور ضرور معلوم کرے گا جھوٹوں کو''۔

روحِ قربانی اور شبہ کا جواب ...... غرض اصل بیان یہ تھا کہ جس طرح اعمال کی روح ضروری ہے اسی طرح ان کی صورت بھی مطلوب ہے اس لئے کہ دنیا میں صورت اصل ہے اور روح اس کے تابع اور آخرت میں معاملہ برعکس ہوگا، روح اصل ہوگی اور صورت تابع۔ تو اب یہ بات واضح ہوگئی کہ دنیا میں جس طرح ہر چیز کی روح کی بقا کے لئے صورت کی ضرورت ہے اسی طرح اعمال شرعیہ کی روح کی بقا کے لئے ان کے جسم وصورت کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی شخص کہے کہ اعمال میں تو اصل روح ہے اس لئے روح کو لے لو اور صورت کو چھوڑ دو تو اس کو چاہئے کہ یہ عمل پہلے اپنے اوپر جاری کرے کہ اپنے بدن کو ختم کر دے اور خودکشی کرے کہ بس میں تو روح کو باقی رکھوں گا لیکن اگر خود بغیر صورت کے نہیں رہ سکتے تو پھر اعمال شرعیہ میں یہ عمل جراحی کیوں کیا جاتا ہے؟

جیسے کہ شروع میں معلوم ہو چکا کہ کائنات میں جس طرح مجموعہ بدن کے لئے مجموعہ روح ہے اسی طرح ہر ہر چیز کی علیحدہ علیحدہ روح بھی ہے۔ جیسے آنکھ میں بینائی کی قوت ایک روح ہے وغیرہ۔ اسی طرح سارے اعمال کا تام ''تقویٰ'' ہے۔ چنانچہ قربانی کے متعلق ارشاد ہے۔ ﴿لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ﴾ ② ''یعنی اللہ تعالیٰ کو قربانی کا گوشت نہیں پہنچتا لیکن تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے''۔

تو قربانی کی روح بھی تقویٰ ہے سو اگر کوئی یہ کہے کہ جب قربانی سے تقویٰ مقصود ہے تو قربانی کرنے کی کیا ضرورت ہے بلکہ تقویٰ اختیار کر لو کافی ہو جائے گا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پھر سارے اسلام کو چھوڑ کر بس تقویٰ اختیار کر لو کیونکہ روزہ کے متعلق ارشاد ہے۔ ﴿كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ ③ ''تم پر روزوں کا حکم ہوا جیسے تم سے پہلے لوگوں پر حکم ہوا تھا۔ شاید کہ تم پرہیزگار ہو جاؤ''۔ تو روزہ کا حاصل بھی تقویٰ ہے۔ نماز کے متعلق ارشاد باری ہے کہ ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ ④ ''نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے''۔ جس کا حاصل تقویٰ ہے۔ لہٰذا نماز اور روزہ

---

① پارہ: ۲۰، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۱-۳۔ ② پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۳۷۔

③ پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۳۔ ④ پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵۔

بھی چھوڑ دیجئے۔ پھر ارشاد ہے کہ ﴿لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ ۚ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ ۚ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا ۚ وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ ۗ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ ① ”مشرق اور مغرب کی طرف منہ کر لینا نیکی نہیں ہاں نیکی یہ ہے کہ جو اللہ اور قیامت کے دن اور ملائکہ اور کتابوں اور نبیوں پر ایمان لائے۔ اور اس کی محبت پر مال دے اور رشتہ داروں کو، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوالیوں کو اور گردنیں چھڑانے میں اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے، اور جو لوگ اپنے عہد پورے کریں۔ یہی لوگ سچے ہیں، اور یہی متقی ہیں“۔

لیجئے سارے اسلام کا حاصل تقویٰ نکلا اس لئے سب کچھ چھوڑ کر بس تقویٰ اختیار کر لیجئے۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے اس لئے کہ ہر ہر چیز کی روح علیحدہ ہے اسی طرح ہر عبادت کا تقویٰ جداگانہ ہے تو جو تقویٰ گوشت پوست کے ذریعہ پہنچتا ہے اور حاصل ہوتا ہے وہ کسی دوسری عبادت، صدقہ وغیرہ سے کیسے حاصل ہو سکتا ہے مثلاً زید کی روح کو گدھے کے قالب میں اگر منتقل کر دیا جائے تب بھی وہ زید نہ بنے گا بلکہ گدھا ہی رہے گا اسی طرح صدقہ، صدقہ ہی رہے گا قربانی کا قائم مقام اسے کیسے کہا جا سکتا ہے تو دنیا میں چونکہ بغیر صورت چارہ نہیں اس لئے قربانی کرنی ہی پڑے گی ہاں آخرت میں پہنچ کر آپ قربانی نہ کریں کیونکہ وہاں صورت ضروری نہیں لیکن اگر آپ نے دنیا میں اعمال کی صورت کو ترک کر دیا تو یقین رکھیئے کہ آپ نے اس کی روح کو بھی فنا کر دیا۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: کہ ”اَلْإِيْمَانُ سِرٌّ وَالْإِسْلَامُ عَلَانِيَةٌ“ ② ”ایمان پوشیدہ چیز ہے اور اسلام ظاہر“۔

اور چونکہ قربانی کا قائم مقام صدقہ یا کوئی عبادت نہیں ہو سکتی۔ لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ”مَا عَمِلَ ابْنُ آدَمَ مِنْ عَمَلٍ يَوْمَ النَّحْرِ أَحَبُّ إِلَى اللَّهِ مِنْ إِهْرَاقِ الدَّمِ“ ”بقرہ عید کے روز سب سے زیادہ محبوب عمل قربانی ہی ہے۔“ تو اس روز سوائے اس عمل کے دوسرا عمل کیسے اس کا قائم مقام ہو سکتا ہے اور حدیث شریف میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا ”يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا هٰذِهِ الْأَضَاحِيُّ“ ”یارسول اللہ! یہ قربانیاں کیا ہیں؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”سُنَّةُ أَبِيْكُمْ إِبْرَاهِيْمَ“ ”تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے“۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے استفسار کیا کہ ”فَمَا لَنَا فِيْهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ“ ”یارسول اللہ اس میں ہمارا کیا نفع ہے؟“

---

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۷۷۔ ② قال ابن تیمیۃ فی شرح عقیدۃ الواسطیۃ: نعنی بالاسلام الاعمال الظاھرۃ، وبالایمان الاعتقادات الباطنۃ، کما جاء فی المسند من حدیث انس رضی اللہ تعالٰی عنہ ...... ان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال: "الایمان فی القلب والاسلام علانیۃ." شرح عقیدۃ الواسطیۃ، ج: ۱۳، ص: ۱۴۰۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: "بِكُلِّ شَعْرَةٍ حَسَنَةٌ" "قربانی کے ہر بال پر ایک نیکی ہے گی"۔ ① تو یہ اجر وثواب صدقہ وغیرہ پر کیسے مرتب ہوسکتا ہے؟ کیونکہ صدقہ میں بال کہاں ہیں تو بات دراصل وہی ہے کہ ہر صورت میں اس کے مطابق روح ڈالی جاتی ہے۔

قربانی کی حقیقت ...... اصل میں قربانی کی حقیقت تو یہ تھی کہ عاشق خود اپنی جان کو اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کرتا مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت دیکھئے ان کو یہ گوارہ نہ ہوا اس لئے حکم دیا تم جانور ذبح کر دو ہم یہی سمجھیں گے کہ تم نے خود اپنے آپ کو قربان کر دیا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خواب کے ذریعہ بشارت دی گئی کہ آپ اپنے اکلوتے بیٹے اسماعیل (علیہ السلام) کی قربانی پیش کریں اب دیکھئے کہ یہ حکم اول تو اولاد کے بارہ میں دیا گیا اور اولاد بھی کیسی، فرزند اور فرزند بھی نا خلف نہیں بلکہ نبی معصوم۔ ایسے بچے کو قربان کرنا بڑا مشکل کام ہے حقیقت میں انسان کو اپنی قربانی پیش کرنا آسان ہے، مگر حکم خداوندی کے سامنے سر جھکا دیا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو لے کر منیٰ کے منحر میں تشریف لائے اور فرمایا: بیٹا۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ میں تجھ کو ذبح کروں۔ تو حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فوراً فرمایا ﴿اِفْعَلْ مَا تُؤْمَرُ﴾ ② جو آپ کو حکم ہوا ہے ضرور کیجئے۔

اگر میری جان کی ان کو ضرورت ہے تو ایک جان کیا؟ اگر ہزار جانیں بھی ہوں تو نثار ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رسیوں سے ان کے ہاتھ پاؤں باندھے چھری تیز کی۔ اب بیٹا خوش ہے کہ میں خدا کی راہ میں قربان ہو رہا ہوں ادھر باپ خوش ہے کہ میں اپنے بیٹے کی قربانی پیش کر رہا ہوں چنانچہ حکم خداوندی کی تعمیل میں اپنے بیٹے کی گردن میں چھری چلائی تو چھری کند ہوگئی اور اس وقت حکم ہوا۔ ﴿قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ﴾ ③ "بے شک آپ نے اپنا خواب سچ کر دکھایا ہم نیکوکاروں کو اسی طرح جزا دیا کرتے ہیں"۔ اب ہم اس کے عوض جنت سے ایک مینڈھا بھیجتے ہیں اور تمہارے بیٹے کی جان کے عوض ایک دوسری جان کی قربانی مقرر کرتے ہیں چنانچہ اسی دن سے گائے، مینڈھا یا بکری وغیرہ قربانی کے لئے فدیہ مقرر ہو گیا۔

قربانی اور صدقہ میں فرق ...... اس واقعہ سے یہ معلوم ہوا کہ ذبح کا اصل مقصد جان کو پیش کرنا ہے چنانچہ انسان میں جان سپاری اور جان نثاری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور یہی اس کی روح ہے، تو یہ روح صدقہ سے کیسے حاصل ہوگی کیونکہ قربانی کی روح تو جان دینا ہے اور صدقہ کی روح مال ہے۔ پھر اس عبادت کا صدقہ سے مختلف ہونا اس طرح بھی معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ کا کوئی دن مقرر نہیں مگر اس کے لئے ایک خاص دن مقرر کیا گیا ہے اور اس کا نام بھی "يَوْمُ النَّحْرِ" اور "عِيْدُ الْاَضْحٰى" یعنی قربانی کا دن رکھا گیا۔

---

① السنن لابن ماجه، كتاب الاضاحي، باب ثواب الاضحية، ج: ٩ ص: ٢٨١.

② پارہ: ٢٣ سورۃ الصافات، الآية: ١٠٢.

③ پارہ: ٢٣ سورۃ الصافات، الآية: ١٠٥.

جہاں تک قربانی کے مسئلہ کا تعلق ہے تو یہ سلفاً خلفاً ایسی ہی ہوتی چلی آئی ہیں حضرات انبیاء علیہم السلام کا بھی اور امت کا اس پر اجماع ہے انبیاء بنی اسرائیل میں سب کے یہاں قربانی تھی۔ ائمہ کرام کا اس پر اجماع ہے یہ اور بات ہے کہ امام شافعی امام احمد بن حنبل، اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہم کے یہاں قربانی سنت ہے اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واجب ہے۔ یہ اس کے حکم میں اختلاف ہے اور ائمہ کے دقائق ہیں مگر قربانی کی مشروعیت میں سب متفق ہیں۔ اور اگر یہ کوئی غیر شرعی عمل ہوتا تو احادیث میں اس کی صفات وغیرہ کیوں بیان کی جاتیں؟

چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ ہم کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی "أَنْ نَسْتَشْرِفَ الْعَيْنَ وَالْأُذُنَ وَأَنْ لَا نُضَحِّيَ بِمُقَابَلَةٍ وَلَا مُدَابَرَةٍ وَلَا شَرْقَاءَ وَلَا خَرْقَاءَ" ① "ہم قربانی کی آنکھ اور کان کو خوب دیکھ بھال کر لیا کریں ہم ایسے جانور کی قربانی نہ کریں جس کا کان آگے سے کٹا ہوا ہو اور نہ جس کا کان پیچھے سے کٹا ہوا ہو اور نہ جس کا کان چرا ہوا ہو، اور نہ جس کے کانوں میں سوراخ ہو"۔

اس کے علاوہ بھی بعض اوصاف مذکور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کے احکام صدقہ سے بالکل جدا ہیں اس لئے اس میں صدقہ کے احکام سے پرہیز کرنا ضروری ہے پھر ساری امت آج تک بلا اختلاف اس عمل کو کرتی چلی آ رہی ہے، اور تعامل امت سب سے بڑی دلیل ہے۔

منکرینِ قربانی پر طریقِ رد..... قربانی کے متعلق تو اب بیان ہو چکا، لیکن اگر کہا جاوے کہ آپ تو حدیث سے استدلال کر رہے ہیں حالانکہ ہم حدیث کو حجت ہی نہیں مانتے تو ایسے لوگوں سے پھر قربانی کے مسئلہ میں جھگڑا نہیں بلکہ پھر تو حدیث کے حجت ہونے پر گفتگو ہے یہ ایک اصولی اختلاف ہے ایسے لوگوں سے یہ سوال کیا جاوے گا کہ آپ قرآن مجید کو جو کلام اللہ تسلیم کرتے ہیں تو اس کا کلام اللہ ہونا کیسے معلوم ہوا؟

اگر یہ جواب ہے کہ خود قرآن سے معلوم ہوا تو یہ "مکابرہ" ہے یعنی جو دعویٰ ہے وہی دلیل اور یہ صریح غلطی ہے ورنہ پھر یہ تسلیم کر لیجئے کہ حدیث کا کلام رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونا حدیث سے ثابت ہے۔ در حقیقت جو شخص احادیث کا انکار کر رہا ہے وہ قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے کا بھی منکر ہے کیونکہ قرآن بغیر حدیث کے حجت نہیں بن سکتا جس طرح کوئی شخص بغیر رسول کے خدا تک نہیں پہنچ سکتا اسی طرح کلام اللہ تک بغیر کلام رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے رسائی ممکن نہیں کیونکہ لغت کے زور سے اگر کلام اللہ کو حل کیا گیا تو اللہ تعالیٰ کی مراد نہ ہوگی بلکہ اس شخص کی اپنی مراد ہوگی۔ جب تک پیغمبر یا پیغمبر کے نائبین کسی آیت کی مراد کو بیان نہ کریں وہ شریعت نہیں بن سکتی۔ کیونکہ کلام کی بعض خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جو کاغذ پر نہیں آ سکتیں بلکہ لب ولہجہ بدلنے سے معنی بدل جاتے ہیں چنانچہ کبھی اس کو استفسارِ حال کے واسطے استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی تعجب کے لئے کبھی تعظیم شان کے لئے اور کبھی تحقیر کے لئے اب اگر یہ جملہ کاغذ پر لکھ کر کسی کو بھیج دیں تو کیا وہ شخص اس کو پڑھ کر متکلم کی مراد کو سمجھ سکے گا؟ ہرگز نہیں بلکہ

① السنن للترمذی، کتاب الاضاحی، باب مایکرہ من الاضاحی، ج:۵ ص:۳۵۴۔

جو کچھ وہ سمجھے گا وہ اس کی اپنی مراد ہوگی چنانچہ اگر یہ شخص اس وقت تعجب کی حالت میں ہوگا تو اس کو تعجب کے لئے سمجھے گا اور اگر استفسارِ حال کا اس پر غلبہ ہوگا تو اسی کے لئے سمجھے گا۔ تو یہ کیفیات کاغذ پر نہیں آ سکتیں۔

گر مصوّر صورت آں دلستاں خواہد کشید لیک حیرانم کہ نازش را چساں خواہد کشید

یعنی مصور تو صرف محبوب کی صورت بنا سکتا ہے۔ اس کے ناز وانداز کو کیسے اس میں ڈھال سکتا ہے؟

طریق ردنمبر ۲...... اس کے علاوہ ایک چیز "عُرف" ہے یعنی کلام میں کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ اہلِ عُرف کے پاس رہ کر ہی سمجھ میں آ سکتی ہیں چنانچہ دیوبند میں ایک صاحب تھے جو کلکٹر کے یہاں منشی تھے کلکٹر اگرچہ انگریز تھا مگر اس کو خیال تھا کہ میں اُردو بہت اچھی جانتا ہوں، چنانچہ اکثر وہ میر منشی صاحب سے بھی کہا کرتا تھا کہ ویل میر منشی! "ہم تم سے زیادہ اردو جانتے ہیں"۔ اور یہ بے چارے منشی اس کا جملہ سن کر خون کے سے گھونٹ پی کر رہ جاتے کیونکہ ملازمت کا سوال تھا۔ آخر ایک روز اس نے کسی بات پر میز پر ہاتھ مار کر کہا "ول منشی، ہم تم سے زیادہ اردو جانتے ہیں"۔ اس مرتبہ ان کو بھی جوش آ گیا انہوں نے سوچ لیا کہ ملازمت رہے یا نہ رہے مگر کم از کم ایک مرتبہ اسکو جواب تو دے دوں۔ چنانچہ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے میز پر مکہ مار کر کہا کہ "صاحب بہادر اردو کی ابجد بھی نہیں جانتے"۔ یہ سن کر وہ انگریز بڑا حیران ہوا اور کہا کہ ہمارا امتحان لو انہوں نے کہا اگر میں امتحان لوں تو صاحب بہادر بغلیں جھانکنے لگیں۔ اب تو صاحب بہادر واقعی بغلیں جھانکنے لگے کہ اس کا مطلب کیا ہوا بہت غور کیا مگر خاک سمجھ میں نہ آیا آخر کہا کہ تین دن کی مہلت دو۔ انہوں نے کہا کہ سات دن کی مہلت ہے غرض اس نے جملے کو لغت میں تلاش کیا مگر لغت میں تو بغل مل گیا اور جھانکنا مل گیا مگر یہ جملہ کہاں ملتا۔ آخر کار اس نے سات دن کے بعد کہا کہ مطلب یہی ہے کہ بغل اُٹھا کر دیکھ لیا اور ادھر کی بغل کو اسی طرح دیکھ لیا۔ میر منشی یہ سن کر ہنس پڑے تب اس نے پوچھا کہ پھر اس کا کیا مطلب ہے؟ میر منشی نے کہا کہ اس شرط پر بتلاؤں گا کہ پھر کبھی اردو دانی کا دعویٰ نہ کرو۔ چنانچہ اس نے اقرار کیا اور انہوں نے اس کا مطلب بتایا کہ دراصل یہ جملہ تحیر سے کنایہ ہے یعنی اگر صاحب بہادر کا امتحان لیا جائے تو وہ حیرت میں پڑ جائیں اور اس قسم کی غلطیاں ہونے کے متعدد واقعات ہیں غرض کلام کی بعض خصوصیات ایسی ہیں جو "عرف" سے متعلق ہیں۔ غیر اہلِ عرف ان کو سمجھ ہی نہیں سکتے ہیں۔

جب ہماری زبان اور کلام میں محاورات ہیں تو قرآن مجید میں بھی ایسی چیزیں ہیں کہ ان کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نصیب تھی تو اب جو لوگ قرآن مجید کو سمجھنا چاہیں ان کو چاہئے کہ اہلِ عرف کی طرف رجوع کریں یعنی جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف اور جو معنی وہ بتائیں ان کو صحیح سمجھیں اس لئے قرآن مجید میں ارشاد ہے ﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ ① "اللہ

① پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲۔

تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ان پڑھ لوگوں میں ایک رسول بھیجا جو انہی میں سے ہے ان کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کے قلوب کو صاف کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں تعلیم کرتا ہے حالانکہ وہ لوگ اس سے قبل صریح گمراہ تھے''۔

اب دیکھئے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر علیہ السلام کے تین فرائض بیان فرمائے یعنی تلاوت، تزکیہ و تعلیم اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر کا کام صرف آیتیں پڑھ کر سنا دینا ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کے قلوب کو پاک کریں تا کہ وہ قرآن کے معانی سمجھنے اور اس کو محفوظ رکھنے کے قابل ہو سکیں یہی وجہ ہے کہ آیت میں ''تزکیہ'' کو تعلیم پر مقدم کیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ اسے حاصل کئے بغیر انسان کو قرآن مجید کے معانی سمجھنے کی استعداد حاصل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے قلوب کا ایسا تزکیہ کیا کہ وہ حضرات پھر قرآن کے معانی کو اسی طریقے سے سمجھنے لگے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمائی۔ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے تابعین کے قلوب کی تزکیہ کیا اور انہوں نے تبع تابعین کا۔ غرض اسی طرح سلسلہ وار آج تک یہ معانی و مطالب محفوظ ہیں۔ اس لئے ہمیں ادنیٰ سے ادنیٰ نکتہ بھی بغیر استاذ کے سمجھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ قرآن مجید ہمارے پاس امانت ہے جس طرح ہم لفظوں کے امین ہیں اسی طرح ہم معانی کے بھی امین ہیں۔ اور ہم کیا؟ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی الفاظ و معانی دونوں کے امین تھے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوتی تو آپ شروع شروع میں آیات کو رٹنے کی کوشش فرماتے تا کہ بھول نہ جائیں اس لئے وحی نازل ہوئی ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ﴾ ① ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پڑھنے کی خاطر وحی کے دوران زبان بھی نہ ہلایئے''۔ اور زبان کیوں نہ ہلایئے اس لئے کہ ﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ﴾ ② ''ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع کرنا اور آپ سے پڑھوانا''۔

پھر آپ کو کیا کرنا چاہئے؟ ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ ③ ترجمہ: جب وحی نازل ہو رہی ہو اس وقت سنتے رہئے پھر ہم ہی اس کا مطلب بیان کریں گے۔'' اس آیت میں حق تعالیٰ صاف صاف فرما رہے ہیں کہ اس کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے۔ اگر اس کے مطلب و معانی خود سمجھ میں آ سکتے تو یہ کیوں فرمایا جاتا اور جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سمجھ میں نہیں آ سکتے تھے تو کسی اور کا کیا منہ ہے؟

یہی وجہ کہ بعض اوقات صحابہ رضی اللہ عنہم کسی آیت کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر غور فرماتے رہتے۔ پھر کبھی تو من جانب اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں اس کا مطلب ڈال دیا جاتا ورنہ آپ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے استفسار فرماتے اگر ان کو معلوم ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کر دیتے ورنہ وہ فرماتے کہ میں حق تعالیٰ سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ تو قرآن مجید کے معانی اس طرح

---

① پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۶۔ ② پارہ: ۲۹ سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۷۔ ③ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۸۔

آپ کو من جانب اللہ بتائے گئے اور جب صحابہ رضی اللہ عنہم اور خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معنی کے متعلق استفسار کی ضرورت پڑتی تھی حالانکہ آپ اہل زبان تھے نور نبوت سے منور بھی تھے پھر کسی اور کو کیا حق ہے کہ وہ بغیر حدیث کے قرآن فہمی کا دعویٰ کرے؟ غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید کے موجد یا مخترع نہ تھے بلکہ الفاظ و معانی میں امین تھے جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ رضی اللہ عنہم کو تعلیم فرما دیتے اس طرح آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے قلوب کو مانجھا اور تزکیہ فرمایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم بھی مسائل پر اسی طرح غور فرمایا کرتے تھے۔ پھر انہوں نے تابعین کے دلوں کو اسی طرح مانجھا اور انہوں نے اپنے شاگردوں کو اسی طرح تزکیہ باطن سے آراستہ کیا اور یہ سلسلہ آج تک اسی طرح جاری ہے۔ ہم کو قرآن مجید کے جو مطالب پہنچے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگردوں سے پہنچے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے زمانے میں ہر شخص قرآن مجید کا مفسر نہ بن سکتا تھا۔ جب تک کسی ایسے ہی استاذ کا شاگرد نہ ہوا اور جو شخص قرآن مجید یا حدیث کی تفسیر وغیرہ بیان کرتا اس سے سند پوچھی جاتی تھی اگر وہ شخص مستند ہوا، اس کی بات قابل قبول سمجھی جاتی تھی ورنہ رد کر دی جاتی تھی۔ مگر آج کل چونکہ ناواقفیت کا زمانہ ہے اور خدا کا خوف لوگوں کے دلوں میں کم ہے اس لئے ہر وہ شخص جو ذرا عربی جانتا ہو وہ مفسر قرآن بننے کا مدعی ہے اور لوگ بغیر کسی تحقیق کے اس کی پیروی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید کے مطالب صرف انہی لوگوں سے حاصل کرنے چاہئیں جو خود صحیح سمجھتے ہوں۔ یعنی بزرگوں کے صحبت یافتہ اور عالم کے شاگرد ہوں تاکہ ان کے اندر بھی تزکیہ نفس کا وہ وصف موجود ہو جس کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا۔

حقیقت میں صحابہ رضی اللہ عنہم جو ساری امت سے افضل ہیں وہ اسی صحبت کی برکت سے ہیں کہ ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسی شخصیت کی صحبت نصیب ہوئی، جس سے ان کے دل صاف ہو گئے کہ اس میں صرف حق بات ہی سما سکتی تھی۔ پھر انہوں نے اپنے شاگردوں کو اس نہج پر ڈالا، اور ان کے قلوب کی صفائی و تزکیہ کیا۔

"أُولٰئِکَ أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ وَأَصْحَابُ أَبِي بَكْرٍ وَأَصْحَابُ عُمَرَ"

غرض یہ حضرات تھے کہ ان پر حق کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ حاصل یہ کہ کتاب اللہ تک ہم رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر نہیں پہنچ سکتے اور ہم کو کتاب اللہ کے اندر غور و فکر کرنے کی بھی جبھی اجازت ہے کہ پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کا مطلب بیان فرما دیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَأَنْزَلْنَآ إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾ ① "اور ہم نے نازل کیا آپ کی طرف قرآن مجید کو تاکہ آپ بیان فرما دیں لوگوں کے لئے جو ان کی طرف نازل ہوا تاکہ وہ فکر کریں"۔

دیکھئے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ﴿لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ﴾ ② فرمایا کہ پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۴۴۔ ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۴۴۔

کا مطلب بیان کریں اس کے بعد "یَتَفَکَّرُوْنَ" ہے۔ یعنی اس کے بعد لوگوں کو غور وفکر کی اجازت ہے۔ تا کہ لوگ غور وفکر کرنے میں شریعت کی حدود سے نہ نکل جائیں۔

درحقیقت اگر ہر شخص اپنی اپنی عقل اور فہم کے مطابق غور کرنا شروع کر دے تو قرآن مجید تو ایک کھیل تماشہ بن جائے۔ اس لئے ضروری تھا کہ اس کے لئے بھی حدود وقیود مقرر کی جائیں۔ چنانچہ کر دی گئیں۔ اب کسی کو بغیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے "بیان" کے قرآن مجید کی تفسیر کی اجازت نہیں۔ اور چونکہ کلام اللہ کا مطلب سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں۔ اس لئے ہمیشہ اللہ تعالیٰ نے ہر کتاب کے ساتھ ایک نبی ضرور بھیجا۔ چنانچہ اگر توریت آئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی تشریف لائے۔ صحف آدم علیہ السلام کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام بھی تشریف لائے اور انجیل کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور زبور کے ساتھ حضرت داؤد علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور سب سے آخر میں قرآن مجید کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا گیا۔ ورنہ اگر صرف عربی دانی اور لغت کے زور سے کلام الٰہی کو حاصل کیا جا سکتا تو حضرات انبیاء علیہم السلام کی تشریف آوری کی کیا ضرورت تھی؟ بلکہ یہ ہوا کرتا کہ ایک کتاب کسی فرشتہ کے ذریعہ سے بیت اللہ کی چھت پر رکھوا دی جایا کرتی اور اعلان کر دیا جاتا کہ لوگو! یہ خدا کی کتاب ہے اس پر عمل کرو۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ کیونکہ کتاب کے ساتھ اس کو سمجھانے اور پڑھانے کی بھی ضرورت تھی۔ ورنہ ہر شخص قرآن مجید سے اپنے نفس کے مطابق مطلب گھڑ کر استدلال کر لیا کرتا۔

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو خوارج سے مناظرہ کرنے کو بھیجا تو ان کو ہدایت فرمائی کہ ان کے سامنے قرآن سے استدلال مت کرنا بلکہ احادیث سے استدلال کرنا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو تعجب ہوا اور سوال فرمایا کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ حالانکہ قرآن مجید کو میں خاص طور پر سمجھتا ہوں۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے حق میں دعا فرمائی "اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْقُرْاٰنَ." ① یا اللہ! ابن عباس کو قرآن کا فہم عطا فرما۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بے شک تم قرآن کو صحیح سمجھتے ہو مگر "اَلْقُرْاٰنُ ذُوْ وُجُوْهٍ" (یعنی قرآن مجید کے الفاظ سے متعدد مطالب نکل سکتے ہیں) اس لئے تم صحیح مطلب بیان کرو گے اور لوگ اس کا غلط مطلب بیان کر دیں گے۔ اور الفاظ سے کسی ایک کی بات متعین نہ ہوگی۔ اس لئے تم حدیث سے استدلال پیش کرنا۔ کیونکہ حدیث نے قرآن کے معانی متعین کر دیئے ہیں، جس میں کسی تاویل اور کید نفس کی گنجائش نہیں رہی۔ ②

یہی وجہ ہے کہ زمانہ سابق میں بھی جب کوئی فرقہ ایسا ہوا کہ اس نے دین میں تحریف کا ارادہ کیا تو اس نے سب سے پہلے حدیث کا انکار کیا۔ کیونکہ حدیث ہوتے ہوئے کسی قسم کی تحریف کا احتمال ہی نہیں رہتا۔ اس لئے اس نے پہلے اس کانٹے کو راہ سے ہٹایا مگر ساری دنیا جانتی ہے کہ آج وہ لوگ ختم ہو گئے اور ان کے ساتھ ان کی تحریفات

① الصحيح للبخاري، كتاب المناقب، باب ذكر ابن عباس، رقم: ۳۴۷۳. ② الدر المنثور، ج: ۱، ص: ۱۰.

بھی ختم ہو گئیں۔ اور حدیث پر عمل کرنے والے اب بھی باقی ہیں اور قیامت تک باقی رہیں گے۔ الغرض حدیث کے بغیر قرآن نہیں سمجھ میں آ سکتا۔ اور عجیب بات ہے کہ علماء صلحاء کا قول حجت ہو مگر نبی کا کلام حجت نہ ہو۔

تقریر کا اصل موضوع تو قربانی کا مسئلہ تھا جس میں تفصیل نہ تھی مگر درمیان میں چونکہ کچھ اصول کی بحث آ گئی اس لئے بات ذرا طویل ہو گئی اگر چہ اس اصول بحث کو بہت مختصر بیان کیا گیا۔ تاہم بحمد اللہ ضروری باتیں آ گئیں اور یہ معلوم ہو گیا کہ حدیث پر بھی ایمان ضروری ہے۔ اب اصل مسئلہ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

متعلقات قربانی کی وضاحت...... اس جگہ یہ اشکال کہ قربانی کرنے سے جانور ختم ہو جائیں گے، سو اول تو یہ خیال ہی غلط ہے کیونکہ روزانہ جو لاکھوں جانور بطور ذبیحہ کے کاٹے جاتے ہیں، عید کے دن وہ ذبح نہیں ہوتے اس طرح کچھ معمولی سا فرق پڑتا ہے جو کسی طرح بھی قابل اعتنا نہیں۔ پھر اس روز بعض ایسے لوگوں کو بھی گوشت پہنچ جاتا ہے جو سال میں ایک آدھ دفعہ ہی کھا سکتے ہیں۔ پھر ان کی ساری کھالیں غرباء و مساکین میں تقسیم ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ جو روپیہ قربانی میں خرچ ہوتا ہے، اس کو مہاجرین وغیرہ کی امداد میں صرف کیا جائے۔ تو بے شک مہاجرین کی امداد ضروری ہے مگر ہر کام کے لئے اسلام کے گلے پر چھری کیوں چلتی ہے۔ کچھ اپنی خواہشات نفس پر بھی تو چھری چلائیے اور غیر شرعی اخراجات کو بند کر کے مہاجرین کی امداد کیجئے۔ مثلاً سینما ہے شراب ہے، اور دوسرے فضول اخراجات ہیں۔

حاصل یہ کہ اب یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ جس طرح کائنات کی ہر چیز میں ایک صورت ہے اور ایک روح ہے اسی طرح اعمال شرعیہ میں بھی ایک روح ہے۔ اور جیسے وہاں صورت کی ایک خاص روح ہے جو دوسری صورت میں نہیں آ سکتی۔ اسی طرح یہاں بھی ایک روح ہے جو دوسرے میں نہیں آ سکتی۔

سو اب سمجھئے کہ سارے اعمال شرعیہ کا مقصود تقویٰ ہے۔ مثلاً نماز سے عاجزی وانکساری کی صورت میں تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔ روزے میں تزکیہ نفس کی صورت میں جہاد میں شجاعت کی صورت میں، صدقہ میں انفاق مال کی صورت میں، اور قربانی سے جان نثاری کی صورت میں تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔ اب اگر آپ نے قربانی کی بجائے نماز پڑھ لی، تو نماز سے عاجزی اور بندگی کا تقویٰ تو ملا مگر قربانی (کی صورت میں حاصل ہونے والا تقویٰ) نہ ملا پس اگر کوئی شخص قربانی نہ کرے اور صدقہ دے دے تو قیامت کے دن اس کو ثواب مل جائے گا مگر قربانی کا مطالبہ باقی رہے گا۔ اور یہ سوال ہوگا کہ قربانی کیوں نہیں کی؟ بالکل اسی طرح جیسے کوئی نماز پڑھتا رہا اور روزہ نہ رکھا تو روزہ کا مطالبہ ہوگا۔ اس کو ایک مثال سے سمجھ لیجئے کہ آپ نے ایک نوکر رکھا، جس کے سپرد کھانا پکانے اور کھانا کھلانے کی خدمت سونپی۔ اب اس نوکر نے یہ کیا کہ کھانا تو پکایا نہیں مگر گھر کو صاف کر کے آئینہ بنا دیا۔ ہر چیز قرینے سے رکھ دی جھاڑو بھی دی، فرش بھی دھویا، جالے بھی صاف کئے اب آپ جب گھر پہنچے اور دیکھا کہ ملازم نے گھر کو بہت صاف ستھرا کر رکھا ہے تو یقیناً آپ خوش ہوں گے مگر جب کھانے کے وقت آپ کو معلوم ہوگا کہ اس

نے کھانا نہیں پکایا؟ تو کیا وہ ملازم جواب دے سکتا ہے کہ صاحب میں نے گھر تو صاف کر دیا۔ اب کھانے کا مطالبہ کیسا؟ ظاہر ہے کہ اس سے یہی کہا جائے گا کہ یہاں جو کام تیرے سپرد کیا تھا وہ تو تو نے کیا نہیں اور ایک ایسا کام جو فی الجملہ اچھا ہے مگر تیرے سپرد نہ تھا۔ اس لئے تجھ کو یہ کام کھانا کھلانے کے بعد کرنا چاہئے تھا۔ اسی طرح صدقہ و خیرات تو عبادات نافلہ ہیں، مگر قربانی واجب ہے تو صدقہ دینے سے اس کا مطالبہ باقی رہے گا۔

حاصل یہ کہ آپ جو صورت اختیار کریں گے، اسی کی روح اس میں ڈالی جائے گی۔ جیسے انسان کی صورت میں انسان کی روح اور حیوان کی صورت میں حیوان کی پھر قربانی کی روح صدقہ میں کیونکر آ سکتی ہے؟ اسلئے قیامت میں ہر ایک عمل کی مختلف صورتیں ہوں گی۔ مثلاً جو شخص مسجد بناتا ہے اس کو جنت میں مکان ملتا ہے۔ روزہ دار کے لئے قیامت کے دن دستر خواں بچھایا جائے گا۔ اسی طرح قربانی کے متعلق ارشاد ہے کہ: ''اِنَّــهُ لَيَــأْتِــيْ يَوْمَ الْقِيٰـمَةِبِـقُرُوْنِهَا وَاَشْعَارِهَا وَاَظْلَافِهَا'' ① قیامت کے دن قربانی کے جانور اپنے سینگوں، بالوں اور کھالوں کے ساتھ موجود ہو گا۔

اس جگہ ان اجزاء کا ذکر ہے جن کو ہم بے کار سمجھ کر پھینک دیتے ہیں۔ یعنی اس کے ردی اجزا پر بھی ثواب دیا جائے گا۔ تو جو اصلی چیز یعنی گوشت ہے اس پر کیوں نہ ملے؟ پھر آگے ارشاد ہے: ''وَاِنَّ الدَّمَ لَيَـقَـعُ مِنَ اللّٰـهِ بِـمَكَانٍ قَبْلَ اَنْ يَّقَعَ بِالْاَرْضِ فَطِيْبُوْبِهَانَفْسًا'' ② ''قربانی کا خون زمین پر گرنے سے قبل وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبولیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ تم اس عمل کو کر کے اپنا دل ٹھنڈا کرو''۔ تو مقبولیت کا درجہ بھی قربانی کے ساتھ خاص ہے۔

مسئلہ کا بیان تو ہو چکا مگر ایسے جزئی مسائل میں جو اجماعی چیزیں ہیں شبہ پیش آنا، انتہائی تنزل، اور انحطاط کی علامت ہے۔ اب تک تو علماء کو صرف اصول ثابت کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ مگر افسوس اب جزئیات و مسلمات کو بھی ثابت کرنا پڑتا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ علماء کے ذمہ اس کا ثابت کرنا نہیں یہ تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کو ثابت کریں مگر میرا مقصد یہ ہے کہ اگر ہماری یہی رفتار رہی تو کہاں تک جزئیات کو ثابت کیا جائے گا۔ کچھ چیزیں مسلمات سے بھی رہنے دیجئے یہ تو نہ ہو کہ ہر چیز کی دلیل کی ضرورت پڑنے لگے۔ یہ انتہائی پستی اور تنزل کی دلیل ہے جس کی وجہ علم دین کی طرف سے لاپرواہی اور بے توجہی ہے جس کا علاج بجز اس کے کہ آپ لوگ علم دین حاصل کرنے کی طرف توجہ کریں، کچھ نہیں اور میرا یہ مطلب نہیں کہ آپ دوسرے علوم و فنون حاصل نہ کریں بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اس کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی حاصل کریں۔ تاکہ روزمرہ کے موٹے موٹے مسائل میں آپ کو شبہات پیش نہ آئیں اور آپ کو ہر شخص اپنی خواہشات کا غلام نہ بنا سکے۔ بلکہ آپ کو خود بھی حق و باطل میں

---

① السنن الكبرى للبيهقي، ج: ۹ ص: ۲۶۱۔

② السنن للترمذي، ابواب الاضحية، باب ماجاء في فضل الاضحية، ج: ۵، ص: ۳۴۴۔

خیاز کی تھوڑی سی بصیرت حاصل ہو۔ قرآن مجید کا ترجمہ بھی کسی سے تعلیم کے طور پر حاصل کریں، خود دیکھنے میں ہزاروں غلطیوں کا احتمال ہے۔

اگر آپ کو کسی مسئلہ میں شبہ ہو اور اس کی وضاحت کی ضرورت ہو تو خود اپنی عقل سے کوئی رائے قائم کرنے کی بجائے علماء کی طرف رجوع کیجئے کہ دین بالکل بے غبار ہے بشرطیکہ آپ سمجھنے کا قصد رکھتے ہوں اور آپ کی بحث کا پیرایہ تحقیقی و تعمیری ہو۔ ہٹ دھرمی اور ضد کو اس میں ادنیٰ بھی دخل نہ ہو۔ اب میں بات ختم کرتا ہوں۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو شر ور و فتن سے بچائے اور راہ مستقیم پر قائم رکھے، اور ایمان پر خاتمہ نصیب ہو۔

آمِیْنَ یَارَبَّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَتْبَاعِهٖ اَجْمَعِیْنَ، بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ

حقیقتِ نکاح

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً ۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ﴾صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ.①

احوالِ واقعی..... بزرگانِ محترم! ابھی آپ کے سامنے نکاح کی تقریب انجام پائی ہے۔اور اس میں اپنے عزیزوں میں سے ایک عزیز کا نکاح ہوا اس تقریب کا تقاضا ہے کہ میں نکاح ہی کے سلسلہ میں کچھ کلمات گزارش کروں، جو نکاح کے ثمرات پر مشتمل ہوں۔ چونکہ موقع کے مناسب کوئی بیان ہوتا ہے، تو وہ نفع دیتا ہے۔ جو وقت کا تقاضا ہو۔ اسی کے مطابق بیان کیا جائے۔ گویا اس تقریب نے تقریر کا موضوع متعین کر دیا اسی موضوع کے سلسلہ میں کچھ بیان کیا جائے گا۔ اس وقت دو تین باتیں عرض کرنی ہیں۔ ایک یہ کہ نکاح کی حقیقت کیا ہے؟ دوسرے نکاح کی غرض وغایت، اور یہ کہ نکاح کے احکام کیا ہیں؟ یہ تین باتیں اس تقریر کا موضوع ہوں گی۔

دنیا جنت اور جہنم سے مرکب ہے، تمہید..... ان تین باتوں کے سمجھنے کے لئے پہلے ایک مختصری بات بطور تمہید کے سمجھ لیجئے پھر تینوں باتیں آسان ہو جائیں گی۔ وہ یہ کہ اس کائنات میں اللہ نے دو سلسلے پیدا کئے ہیں۔ ایک خیر کا سلسلہ ہے اور ایک شر کا ایک سلسلہ بھلائی، خوبی اور نیکی کا ہے اور ایک سلسلہ بدی، برائی اور شر کا ہے۔ ہر اصل کے مقابلے میں، جو اچھی اصل ہے، کوئی نہ کوئی اس کی ضد ساتھ لگی ہوئی ہے۔ یہ دنیا کھری نہیں ہے بلکہ بھلائی اور برائی دونوں سے مرکب ہے۔ جو خیر آپکے سامنے آئے گی، اس کے مقابلے میں کوئی شر ضرور ہوگی، جو اس کی ضد کہلائے گی۔ اگر اللہ نے دنیا میں اسلام پیدا کیا، تو مقابلے میں کفر بھی پیدا کیا۔ اگر دنیا میں سچ آیا تو مقابلے میں جھوٹ بھی آیا اگر نور دنیا میں لایا گیا، تو مقابلے میں ظلمت بھی لائی گئی۔ اگر تقویٰ وطہارت لایا گیا تو

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۱۔

مقابلے میں فسق و فجور بھی لایا گیا۔ غرض ہر چیز کی اصل کے مقابلے میں کوئی ضد ضرور ہے۔ اگر دن لایا گیا، تو مقابلے میں رات لائی گئی۔ یہ ایک سلسلہ ہے خیر و شر کا۔ اگر آپ کو محض خیر کی تلاش ہو، جہاں برائی کا نشان نہ ہو، وہ جنت کا عالم ہے اور جہاں خیر اور بھلائی کا نشان نہ ہو تو وہ جہنم کا عالم ہے کہ وہاں سوائے برائی، اور کدورت اور تکلیف کے کچھ نہیں۔ دنیا کو اللہ نے جنت اور جہنم سے مرکب بنا دیا ہے، کہ کچھ خیر جنت سے لائی گئی اور کچھ شر جہنم سے لائی گئی دونوں سے ملا کر ایک عالم بنا دیا گیا، جس کا نام دنیا ہے۔ اس لئے یہاں خیر بھی ہے شر بھی ہے اور نیکی بھی ہے، بدی بھی برائی بھی ہے بھلائی بھی۔ اسلام بھی ہے ظلمت بھی ہر اصل کے مقابلے میں ایک ضد لگی ہوئی ہے۔

عالم غیب میں خیر و شر کا سلسلہ..... اس کائنات میں اوپر سے لے کر نیچے تک یہی سلسلہ ہے۔ غیب کو دیکھا جائے۔ یعنی وہ مخلوق جو آنکھوں سے اوجھل ہے، وہاں بھی یہ دونوں سلسلے ہیں ایک طرف ملائکہ علیہم السلام ہیں جو خیر محض ہیں۔ ان کے مقابلے میں شیاطین ہیں، جو شر محض ہیں۔ ملائکہ ہر بات میں خیر کی طرف چلتے ہیں، شیاطین ہر معاملے میں شر کی طرف چلتے ہیں۔ ملائکہ کے لئے فرمایا گیا: ﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ٥ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ﴾ ①

یہ اللہ کے پاکباز اور مکرم بندے ہیں۔ ﴿لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ﴾ ② ان کا شیوہ یہ ہے کہ اللہ کی ذرہ برابر نافرمانی یا عصیان کا کوئی شائبہ تک ان میں نہیں، سوائے اطاعت، پاکیزگی اور برگزیدگی کے تو ان کو کہا گیا "لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ" عصیان کا نشان نہیں۔ اور شیاطین کو کہا گیا ﴿وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا﴾ ③ "شیطان کا کام ہی کفر کرنا اور کفران نعمت ہے۔

ملائکہ علیہم السلام جہاں ہوں گے، خوشبو کی طرف دوڑیں گے۔ شیاطین جہاں ہوں گے بدبو کی طرف دوڑیں گے۔ حدیث میں ہے کہ مساجد اور ذکر اللہ کی مجالس میں، ملائکہ علیہم السلام کا ہجوم ہوتا ہے۔ جتنی کوڑیاں اور گندگی کی جگہیں ہیں، وہاں شیاطین کا ہجوم ہوتا ہے۔ انہیں وہ پسند ہے۔ یہ خیر کی طرف جاتے ہیں۔ وہ شر کی طرف جاتے ہیں۔ ④ ملائکہ کا کام کیا ہے؟ ہر مخلوق کی خیر خواہی کرنا' ہر ایک کے لئے دعا کرنا، ہر ایک کے لئے بھلائی چاہنا شیاطین کا کام ہے، ہر ایک کی برائی چاہنا، ہر ایک کو ایذا پہنچانا۔ ہر ایک کے لئے تکلیف کا سامان کرنا۔ ملائکہ علیہم السلام کی شان قرآن کریم میں فرمائی گئی کہ ﴿اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ⑤ جو ملائکہ عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں، ان سے زیادہ مقرب کون ہوگا؟ وہ اتنے نزدیک ہیں حق تعالیٰ کے کہ ملائکہ میں سے کسی کو اتنا قرب حق تعالیٰ کا میسر نہیں ہے۔ اور جو ان کے ارد گرد اربوں کھربوں ملائکہ ہیں۔ ان کا کام کیا ہے؟ ﴿يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ

---

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۲۶، ۲۷. ② پارہ: ۲۸، سورۃ التحریم، الآیۃ: ۶. ③ پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۲۷.

④ تفسیر ابن ابی حاتم، ج: ۱۱، ص: ۲۷۳. ⑤ پارہ: ۲۴، سورۃ المؤمن، الآیۃ: ۷.

بہ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ ① حق تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں اور زمین والوں کے لئے استغفار کرتے ہیں۔ نہ صرف ہمارے لئے بلکہ ہماری اولادوں کے لئے، ہماری بیویوں کے لئے، اہل وعیال کے لئے دعائیں مانگتے ہیں کہ یا اللہ! ان کے لئے دنیا میں آخرت میں بھلائی دے۔ یہ ان کا کام ہے۔

اور شیاطین نے کیا کیا؟ سب سے پہلے بڑے شیطان نے اللہ ہی کے سامنے کہا کہ: ﴿فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِيْنَ﴾ ② تیری عزت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایک ایک انسان کو گمراہ کر کے رہوں گا۔ ایک ایک انسان کو بھٹکا کے رہوں گا۔ کبھی خیر پر نہیں آنے دوں گا۔

حق تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ میں بھی اپنی عزت کی قسم کھاتا ہوں، تیرے ایک ایک متبع کو جہنم میں ڈال کے رہوں گا' اور جہنم کو بھر دوں گا۔ تو ملائکہ کہتے ہیں یا اللہ! سب کو بھیج جنت میں، خیر ان کے لئے پیدا کر۔ شیطان کہتا ہے کہ میں گمراہ کروں گا، تا کہ ایک ایک کو جہنمی بنا کے چھوڑ دوں۔ تو وہ انتہائی خیر خواہ یہ انتہائی بدخواہ۔ وہ نیکی کی طرف لاتے ہیں، یہ بدی کی طرف۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ہر انسان کے قلب کی دائیں جانب فرشتہ بیٹھا ہوا ہے اور بائیں جانب شیطان بیٹھا ہوا ہے۔ فرشتہ کا کام کیا ہے؟ خیر کا راستہ دکھلاتا ہے، قلب میں خیال ڈالتا ہے کہ یہ بھی نیکی کر لے یہ بھی نیکی کر لے۔ شیطان کہتا ہے، یہ بھی بدی کر، یہ بھی بدی کر۔ اس میں بڑی لذت ہے۔ زنا کاری کر، اس میں بڑا لطف آئے گا۔ چوری کر، اس میں مال بڑھ جائے گا۔ یہ بدی کو مزین اور آراستہ کر کے پیش کرتا ہے، تا کہ انسان دل لبھادے اور مبتلا ہو جائے۔ فرشتہ نیکی کا راستہ دکھلاتا ہے کہ گناہ میں لذت تو آجائے گی، مگر انجام کو سوچ لے کہ جہنم بھی بھگتنا پڑے گا۔ معصیت کے اندر نفس کو نہایت لذت آتی ہے، مگر تھوڑی دیر کے لئے۔ اس کے بعد قلق، کدورت اور تشویش پیدا ہوتی ہے۔ انسان میں نفرت بڑھتی ہے۔ نیکی کرنے میں ابتداء تکلیف ہوتی ہے۔ مگر انجام کار قلب میں راحت، سکون، بشاشت اور ایک نورانیت پیدا ہوتی ہے۔ تو فرشتہ خیر کی راہ دکھلاتا ہے۔ اور شیطان شر کی راہ دکھلاتا ہے۔ فرشتہ نیکی کے خطرات ڈالتا ہے۔ اور یہ بدی کے وساوس ڈالتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا، یہ جو بعض اوقات انسان کش مکش میں مبتلا ہوتا ہے۔ کبھی تو جی چاہتا ہے، کہ لاؤ نیکی کر لوں اور کبھی سستی آتی ہے کہ دیکھی جائے گی۔ کبھی دل میں خیال آتا ہے کہ تہجد پڑھ لوں۔ پھر خیال آیا کہ رات کا اخیر ہے، بڑی میٹھی نیند ہے، کون پڑھے، کل کو دیکھی جائے گی۔ کبھی ادھر کبھی اُدھر یہ فرشتے اور شیطان کی جنگ ہوتی ہے، جس کی وجہ سے انسان ڈانواں ڈول ہوتا ہے۔ جو غالب آجائے، وہی انسان کر گزرتا ہے۔ اودھر ہی کو طبیعت مائل ہو جاتی ہے۔

شیطان کے کہنے سے نیکی بھی درست نہیں...... اسی واسطے فرمایا گیا: کہ شیطان انسان کا انتہائی دشمن

① پارہ: ۲۴ سورۃ المؤمن، الآیۃ: ۷۔ ② پارہ: ۲۳ سورۃ ص، الآیۃ: ۸۲۔

ہے۔اس کے کہنے سے نیکی بھی مت کرو۔نیکی اپنے ضمیر کے تقاضے سے کرو۔وہ اگر یوں بھی کہے کہ نماز پڑھ لو۔ سمجھو کہ اس میں بھی کوئی مکاری اور شر پوشیدہ ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سو رہے تھے۔اتفاق سے شیطان نے وسوسے ڈالے۔بہر حال نبی اور معصوم تو نہیں تھے۔حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی ابتلاء ہوسکتا ہے۔تو اس کی کچھ حرکت اور تصرف سے ان کا تہجد قضا ہوگیا۔شیطان بہت خوش ہوا کہ ایک جلیل القدر صحابی رضی اللہ عنہ کا تہجد قضا کرادیا۔فرض تو چھڑا نہیں سکتا تھا۔صحابی رضی اللہ عنہ ہیں۔نفل چھوٹ سکتی تھی،وہ چھوٹ گئی۔مگر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اتنا صدمہ گزرا کہ برسوں کا میرا معمول چھوٹ گیا۔سارے دن روئے،استغفار کیا،بیسیوں نفلیں پڑھیں توبہ کی۔اگلا دن جب ہوا،تو ارادہ کر کے سوئے کہ آج ان شاء اللہ ضرور اٹھوں گا۔اور آج میرے اوپر نیند کا غلبہ نہیں ہونا چاہئے۔

ابھی اٹھنے نہیں پائے تھے۔ایک شخص نے آ کر پیر ہلایا کہ امیر معاویہ! اٹھیے تہجد کا وقت آ گیا۔انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا،کہ میرے اٹھانے کے لئے میرے محل سرائے میں رات کے وقت کون اجنبی آیا؟ ہاتھ پکڑا تو معلوم ہوا یہ شیطان ہے۔وہ بھی صحابی رضی اللہ عنہ ہیں۔قوی الایمان ہیں۔فرمایا،مردود تو یہاں کیوں آیا؟ اس نے کہا کہ آپ کی خیر خواہی پیش نظر تھی۔کل آپ کا تہجد قضا ہوگیا تھا۔میں نے کہا آج میں ہی جا کے اٹھادوں۔آپ کو تکلیف دی تھی۔کہا۔منحوس!تو؟ اور خیر خواہی؟ اللہ نے کہا ہے کہ: ﴿إِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا﴾ ① شیطان تمہارا دشمن ہے،اسے دشمن ہی سمجھو یہ مت سمجھنا کہ دوست ہے۔تو اور دوستی کرے اور خیر خواہی کرے۔سچ سچ بتلا تو نے مجھے نماز کے لئے کیوں اٹھایا،کوئی مکاری اس میں ضرور پوشیدہ ہے، کوئی اس میں شر ہے۔کہا کہ نہیں خیر خواہی پیش نظر تھی۔فرمایا کہ تو اور خیر خواہی؟ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔اللہ نے کہہ دیا کہ تو دشمن ہے،یہ ممکن نہیں کہ تو دوستی کرے۔

میں بھی صحابی ہوں۔روحانیت میری بھی قوی ہے۔آج میں تجھے انتہائی طور پر پکڑ کے پیٹوں گا،ورنہ بتا اصلیت کیا ہے؟ ہاتھ پکڑا ہوا ہے چھوٹتا نہیں۔وہ اگر مزاج کا لطیف تھا۔تو یہ روحانیت کے لحاظ سے قوی تھے،ان میں بھی لطافت تھی۔کوئی ہم جیسا ہوتا،شیطان کبھی کا دھکا دے کے بھاگ بھی جاتا۔تب وہ بات نکلی۔

اس نے کہا اصل قصہ یہ ہے کہ کل میں نے کچھ تصرف کیا تو آپ کا تہجد قضا ہوگیا۔آپ نے توبہ کی،استغفار کیا۔پچاسوں نفلیں پڑھیں تو اتنا ثواب ملا کہ تہجد کا بھی اتنا نہیں تھا۔میں نے کہا لاؤ اٹھادوں کہ ثواب تو تھوڑا ہو جائے۔دن بھر محنت کریں گے،پچاس رکعتوں کی بجائے یہ چار رکعات ہی کی فرمایا۔اب بات تو نے ٹھیک کہی، پھر اس کو چھوڑ دیا کہ دور ہو ملعون تجھ پر لعنت تو شیطان خیر خواہی کبھی نہیں کرسکتا وہ ہمیشہ بدخواہی کرتا ہے۔وہ اگر خیر کا راستہ بھی دکھائے۔اس میں بھی کوئی نہ کوئی شر ہوگی۔اس کے کہنے سے خیر بھی نہیں کرنی چاہئے۔جب دل میں اور

---

① پارہ:۲۲،سورۃ الفاطر،الآیۃ:۶۔

ضمیر میں آ جائے تبھی آدمی کرے۔ تو ملائکہ علیہم السلام انتہائی خیر خواہ ہیں، اور شیاطین انتہائی بدخواہ ہیں۔ تو غیب کا عالَم ہے۔ دونوں سلسلے وہاں بھی قائم ہیں۔ ایک خیر کا، وہ ملائکہ علیہم السلام ہیں۔ اور ایک شر کا، وہ شیاطین ہیں۔

دنیا میں خیر وشر کا سلسلہ...... دنیا میں آنے کے بعد یہ سلسلہ یہاں بھی قائم ہے۔ انسانوں میں مقدس ترین طبقہ انبیاء علیہم السلام کا ہے، جو خیر محض ہیں۔ ان میں شر کا نشان نہیں ہے۔ ہر چیز میں بھلائی، ہر چیز میں خیر اور ہر انسان کے خیر خواہ۔ اور اس درجہ خیر خواہ کہ بعض اوقات حق تعالیٰ کو روکنا پڑتا ہے کہ اس درجہ خیر خواہی بھی مت کرو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رحمت للعالمین ہیں۔ آپ ہدایت فرماتے، کوئی ہدایت کو نہ مانتا، تو بیٹھ کر گھٹتے، محبت اور مخلوق کی خیر خواہی کی وجہ سے قلب مبارک کو تکلیف پہنچتی۔ کہ کیوں نہیں یہ سیدھے راستے پر آتے، کیوں برائی کے راستے پر چل رہے ہیں؟ کیوں تھوڑی سی لذت کے لئے اپنی آخرت کو تباہ کرر ہے ہیں۔ کیوں نہیں انہیں سمجھ اور عقل آتی۔ تو جب نہیں مانتے تھے تو آپ گھٹتے تھے۔ حق تعالیٰ نے روکا ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾ ① کیا ان کی ہدایت کی طمع میں آپ اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت کر دی، نہیں کوئی مانتا تو جائے جہنم میں۔ آپ اس میں کیوں مبتلا ہیں کہ قلب میں ضیق اور گھٹن ہے۔ تو روکنے کی نوبت آئی، اس لئے کہ خیر خواہی انتہائی درجہ کی تھی۔ ہر ایک کے لئے چاہتے تھے کہ ایماندار بن جائے۔ اس لئے جو خلاف کرتا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچتی تھی۔ تو انبیاء علیہم السلام خیر محض ہیں۔ انتہائی محبت رکھتے ہیں۔ اور محبت ہی دنیا میں پھیلاتے ہیں۔

دنیا میں جو انبیاء علیہم السلام کے مقابل ہیں۔ وہ دجال کہلاتے ہیں۔ ہر نبی علیہ السلام کے مقابلے میں کوئی نہ کوئی دجال آیا۔ اور انبیاء علیہم السلام کے زمانے میں دجال آئے۔ انہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ دجل کے معنی ہی یہ ہیں کہ ظاہر کچھ اور باطن کچھ۔ آدمی تلبیس پیدا کرے۔ دعویٰ نبوت کا اور اندر سے کفر بھرا ہو۔ یوں تلبیس کر کے دنیا کو کفر پر لاتے تھے۔ تو نبی کا ٹھیک مقابلہ دجال سے ہوتا ہے۔ نبی خیر محض اور دجال شر محض ہے۔ ہر نبی کے مقابلے میں ایک نہ ایک دجال لایا گیا ہے کہ نبی مخلوق کو خیر کی طرف لائے، اور دجال شر کی طرف لائے۔

چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ اور نبوت، علم اور ایمان کا کمال، غرض سارے مراتب نبوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ختم ہو چکے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی کامل الایمان نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی کامل الہدایت نہیں ہے۔ سارے مراتب خیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات پر ختم ہیں۔ اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں کہ نبوت کا ہر درجہ اور مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر آ کر ختم ہو گیا۔ اسی لئے آپ کی امت میں جو دجال آئے گا، وہ اتنا بڑا دجال ہوگا کہ کوئی دجال ایسا نہیں گزرا ہوگا۔ اس لئے کہ اتنے بڑے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مقابلہ ہے تو اتنا ہی بڑا دجل وفریب ہونا

① پارہ: ۱۹ سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۳۔

چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ اور دجالوں نے نبوت کے دعوے کئے۔ اسلام میں جو اخیر میں دجال آئے گا، وہ خدائی کا دعویٰ کرے گا۔ اس پر شر کے مراتب ختم ہوں گے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کی پشت مبارک پر مہرِ نبوت تھی، جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کی علامت تھی، اور اس پر لکھا ہوا تھا: سِرْ حَيْثُ شِئْتَ فَإِنَّكَ مَنْصُوْرٌ جہاں بھی جاؤ، خدا کی مدد تمہارے ساتھ ہے۔ خیر تمہارے ساتھ ہے۔ خیر کے مراتب تم پر ختم ہیں۔ تو آپ کے لئے مہرِ نبوت تھی۔ جس میں ظاہر کیا گیا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خیرِ مجسم ہیں۔ دجال کی پیشانی پر کفر لکھا ہوا ہوگا ''ک، ف، ر'' تو یہ کفرِ مجسم ہے۔ وہاں کفر کے مراتب ختم۔ تو انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ دجالوں سے ہے۔ انبیاء خیر و محبت لیکر آتے ہیں۔ دجال عداوت اور شر لے کر آتے ہیں۔ تو وہاں ملائکہ اور شیاطین کا مقابلہ تھا، یہاں انبیاء اور دجالوں کا مقابلہ ہے۔

انبیاء کے ماننے والوں میں جو اعلیٰ مقام پر پہنچتے ہیں۔ انہیں امام کہتے ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُوْنَ بِأَمْرِنَا﴾ ① ہم نے لوگوں کو امام بنایا وہ خیر کے راستے کی ہدایت کرتے ہیں''۔ دجالوں کے جو اعلیٰ ترین متبع ہیں، ان کو آئمۃ الکفر کہا گیا ہے ﴿وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ إِلَى النَّارِ﴾ ② ''ہم نے ایسے امام بنائے، جو جہنم کی دعوت دیتے ہیں۔ لوگوں کو آگ کی طرف لے جاتے ہیں''۔

یہ امام شر کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ امام خیر کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ امام ایمان کے ہیں یہ امام کفر کے ہیں۔ پھر ان آئمہ کے متبع ہیں۔ ائمہ ہدایت کے جو متبع ہیں، ان کا لقب ''اولیاءُ الرَّحمٰن'' ہے۔ اور ائمہ کفر کے جو متبع ہیں، ان کا لقب ''اولیاءُ الشیطٰن'' ہے۔ ایک ''حزب اللہ'' ہے، اور ایک ''حزب الشیطان'' ہے۔ ایک کے لئے کہا گیا ہے۔ ﴿أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ ③ اللہ ہی کے لشکر کو انجام کار فلاح نصیب ہوگی۔ ادھر کہا گیا: ﴿أَلَا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ ④ شیاطین کے جو لشکر ہیں، وہ انجام کار گھاٹے، خسارے اور ٹوٹے میں رہیں گے۔ غرض اوپر سے لے کر نیچے تک دو سلسلے ہیں۔ ایک خیر کا، ایک شر کا۔ ادھر ملائکہ، ادھر شیاطین ادھر انبیاء، ادھر دجال، ادھر ائمۃ الایمان، ادھر ائمۃ الکفر۔ ادھر اولیاء الرحمٰن، ادھر اولیاء الشیطان یہ دو متضاد سلسلے دنیا میں چلے آرہے ہیں۔

خیر و شر کے سلسلوں کے کام...... اس خیر کے سلسلہ کا کام کیا ہے؟ یہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑتا ہے۔ جو بچھڑ جاتے ہیں، ان کو ملاتا ہے۔ جن میں عداوت ہو، ان میں محبتیں پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جن میں لڑائی ہو، ان میں صلح کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ ملائکہ انبیاء اور اولیاء الرحمٰن کا سلسلہ یہ چاہتا ہے کہ ساری دنیا بس ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائے۔ سب کے قلوب ایک بن جائیں، سب ایک دوسرے سے محبت کریں، ایک دوسرے سے

① پارہ: ۲۱ سورۃ السجدۃ، الآیۃ: ۲۴۔ ② پارہ: ۲۰ سورۃ القصص، الآیۃ: ۴۱۔
③ پارہ: ۲۸، سورۃ المجادلۃ، الآیۃ: ۲۲۔ ④ پارہ: ۲۸ سورۃ المجادلۃ، الآیۃ: ۱۹۔

ملیں، ایک دوسرے کی خیر خواہی میں غرق ہو جائیں۔ شیاطین، دجالوں اور آئمۃ الکفر کا سلسلہ یہ چاہتا ہے کہ جو جڑے ہوئے ہیں، ان میں عداوتیں پھیل جائیں۔ جو ایک دوسرے کی خیر خواہی کر رہے ہیں وہ ایک دوسرے کی بد خواہی میں لگ جائیں۔ ہر ایک دوسرے کے راستے میں کانٹے بچھائے، ہر ایک دوسرے کو ذلیل وخوار کرنے کی کوشش کرے۔ دنیا میں فتنہ وفساد پھیلے۔ یہ دجالوں کا شیاطین کا اور آئمۃ الکفر کا تقاضا و مقتضیٰ ہے تو انبیاء محبتیں پیدا کرانے، اور دجال عداوتیں پیدا کرانے کے لئے آئے ہیں۔

انبیاء کا کام یہ ہے کہ جو بندے خدا سے بچھڑ جائیں، انہیں خدا سے ملا دیں۔ جو آپس میں بچھڑ جائیں۔ انہیں آپس میں ملا دیں۔ شیاطین چاہتے ہیں کہ بندے خدا سے بھی ٹوٹ جائیں۔ بندے بندوں سے بھی آپس میں ٹوٹ جائیں۔ بھائی بھائی میں لڑائی ہو۔ گھر گھر میں فساد ہو۔ اس واسطے جتنے سلسلے محبتیں اور اتحاد کے ہیں، انبیاء علیہم السلام ان کے حامل ہیں۔ اور جتنے سلسلے لڑائی، فتنے اور دنگے فساد کے ہیں، شیاطین ان کے حامل ہیں۔

انسانوں کو ملانے والا سب سے بڑا سلسلہ..... سب سے بڑا سلسلہ دنیا میں انسانوں کو ملانے والا نکاح کا سلسلہ ہے، جس سے دو اجنبی جڑ جاتے ہیں، جن میں پہلے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اور اچانک ان میں ایسا جوڑ لگتا ہے کہ منافع مشترک، اِتحاد باہمی اور خاندانی اشتراک سے ایسی محبت ہو جاتی ہے۔ ایسی مودت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس سے پہلے اتنی محبت اور مودت نہیں دیکھی گئی۔ نکاح جوڑ لگانے کا سلسلہ ہے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام اس سلسلے کے حامل ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ." ① "فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ." ② "نکاح میری سنت ہے، جو اس سے بھاگے گا، گریز کرے گا۔ وہ میری جماعت سے خارج ہے"۔ وہ میری جماعت میں شامل نہیں۔ اس واسطے کہ نکاح اتحاد کا ذریعہ ہے، اور انبیاء علیہم السلام کا مقصد ہی یہ ہے کہ وحدت ومحبت باہمی پیدا ہو۔

شیاطین اس کے حامل ہیں کہ یا نکاح ہونے نہ پائے، یا ہو کر ٹوٹ جائے، ایسی تفریق ان میں پڑے کہ نکاح ٹوٹ جائے، کہیں طلاق ہو جائے، آپس میں پھوٹ پڑ جائے، وہ یہ چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام نکاح سے محبت رکھتے ہیں۔ طلاق اگرچہ جائز ہے، اور مجبوری کے وقت میں اسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حق تعالیٰ کے نزدیک جائز ہو کر بھی اس سے بغض ہے۔

ارشاد ہے: "أَبْغَضُ الْحَلَالِ عِنْدَ اللهِ الطَّلَاقُ" ③ وہ چیز جو جائز ہے، مگر اللہ کو اس سے عداوت اور بغض ہے، وہ طلاق ہے۔ اس لئے کہ طلاق نکاح کو توڑنے والی ہے، جس سے لوگ بچھڑ جائیں گے، عداوتیں

---

① السنن لابن ماجه، كتاب النكاح، باب ماجاء في فضل النكاح، ج: ۵، ص: ۳۲۹. حدیث صحیح ہے، دیکھئے: صحيح وضعيف سنن ابن ماجه ج: ۴ص: ۳۴۲، رقم: ۱۸۴۶. ② الصحيح للبخاري، كتاب النكاح، باب الترغيب في النكاح، ج: ۱۵، ص: ۴۹۳. ③ السنن لابي داؤد، كتاب الطلاق، باب في كراهية الطلاق، ج: ۶ ص: ۹۱.

پیدا ہوں گی اور یہ انبیاء کے موضوع کے خلاف ہے۔ اس لئے انبیاء نکاح سے محبت رکھتے ہیں۔ شیاطین طلاق سے محبت رکھتے ہیں۔ اللہ ورسول کے نزدیک طلاق مبغوض ہے۔ مجبوری کی بات الگ ہے مگر مبغوض ہے۔ نکاح کے بارے میں کہا گیا ہے: "اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ۔" اور یہ نہیں کہا گیا کہ "اَلطَّلَاقُ مِنْ سُنَّتِیْ۔" طلاق میری سنت ہے۔ یہ تو مجبوری کی چیز ہے، کوئی عاجز آ جائے، ایسے وقت میں اجازت دی جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ چونکہ طلاق نکاح کو توڑنے والی ہے، اول تو اس سے بغض کیا گیا اور پھر اس کی تقسیم کی گئی۔ وہ یہ ایک طلاق سنت ہے، اور ایک طلاق بدعت۔ طلاق سنت یہ ہے کہ آدمی تین طلاق ایک دفعہ میں نہ دے۔ الگ الگ دے۔ اس لئے ہر طلاق کے بعد موقع رہتا ہے کہ پھر رجوع کرے۔ نکاح کی ضرورت نہ پڑے۔ تو سنت یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ مجبوری یا ضرورت پیش آئے۔ تینوں طلاقیں ایک دم ہاتھ سے نہ نکالے، پھر وہ بائنہ ہو جائے گی۔ زیادہ سے زیادہ ڈرانے دھمکانے کی خاطر دینا ہی ہے تو ایک دے۔ تاکہ چار مہینے اور دس دن جو عدت ہے، اس میں پھر آدمی کو رجوع کا حق رہے۔ اس کے بعد بھی اگر نوبت آئی، پھر ایک اور دے دے۔ پھر تین چار مہینے موقع رہے گا کہ پھر رجوع کرے اور تین طلاق ایک دم ختم کر دیں، سارے تیر ترکش سے نکال دیئے۔ آگے رجوع کا کوئی موقع نہیں۔ اکٹھی تینوں دے دینا، اسے طلاق بدعت کہا گیا ہے اور طلاق سنت یہ ہے کہ ایک ایک کر کے دے۔ تاکہ رجوع کرنے کا موقع رہے۔ بہر حال انبیاء علیہم السلام ہر ایسے طریق کو چاہتے ہیں، جس سے رشتہ جڑا رہے۔ یہ تعلق قائم رہے۔ اس لئے کہ یہ اتحاد باہمی کا ذریعہ ہے۔

عورت کے ذریعے خاندانوں میں محبت قائم ہوتی ہے ...... ایک اور رو کے اتحاد کا ذریعہ نہیں کہ خاوند اور بیوی مل جائیں۔ ایک بات ہے کہ جب خاوند بیوی آپس میں ملیں گے، تو خاوند کے عزیز، بیوی کے عزیزوں سے، اور بیوی کے عزیز، خاوند کے عزیزوں سے ملیں گے۔ یہ دو کا ملنا نہیں ہے۔ یہ کئی کا ملنا ہے۔ یہ دو خاندانوں کا ملنا ہے، دو خاندانوں کا آپس میں جڑ جانا ہے۔ پھر حقوق قائم ہو جاتے ہیں۔ محبتیں ہو جاتی ہیں۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح فرمائے۔ اور نو ازواج مطہرات ہوئی ہیں۔ ان کی مصلحت یہی تھی کہ ان خاندانوں سے جوڑ لگایا جائے۔ جن کے ذریعے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کے لئے کام لینا تھا۔ جب خاندانوں میں نکاح ہو گیا، وہ مربوط ہو گئے۔ ٹوٹ نہیں سکتے تھے۔ ان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ دین میں کام لیا، ان نکاحوں کی برکت سے قبیلے اسلام میں داخل ہوئے۔ اس لئے کہ عرب میں اس کی بڑی رعایت کی جاتی تھی کہ جہاں سلسلہ رشتہ دامادی کا قائم ہو گیا، وہ کئی کئی پشتوں تک اس کی رعایت کرتے تھے اور ان حقوق کو مانتے تھے۔

جب مصر فتح ہوا تو مصر سے جو قیدی پکڑ کر لائے گئے ہیں۔ ان میں مرد بھی ہیں عورتیں بھی۔ حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، جو زوجہ مطہرہ ہیں۔ وہ مصر سے پکڑی ہوئی آئی تھیں۔ آ کر دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دیکھو مصر سے سسرال کا رشتہ قائم ہو گیا۔ اس کی

رعایت کرنا پوری امت پر حق عائد کر دیا کہ مصر والوں کی رعایت کرو۔ کیونکہ وہ میری سسرال بن گئی۔ یہ جو داماد اور سسر کا رشتہ ہے یہ گویا اتنا لگاؤ پیدا کر دیتا ہے کہ خاندان اس سے مربوط ہو جاتے ہیں۔ تو انبیاء علیہم السلام کو سب سے زیادہ عزیز نکاح کا تعلق ہے۔ حتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "حُبِّبَ إِلَيَّ مِنْ دُنْيَاكُمْ ثَلَاثٌ" ① تمہاری دنیا میں مجھے تین چیزیں پسند ہیں"۔

ان میں سے ایک چیز فرمائی کہ وہ عورت ہے۔ عورت کو اس لئے پسند نہیں فرمایا کہ وہ معاذ اللہ شہوت رانی کا ذریعہ ہے۔ اس لئے کہ وہ تعلق و محبت کے قائم ہونے کا ذریعہ ہے۔ محبتیں عورت کے راستے سے قائم ہوتی ہیں۔ مرد تو اپنے کام کاج میں لگے رہتے ہیں۔ کوئی دکان پر، کوئی دفتر میں، کوئی کھیتی باڑی میں۔ یہ جو رشتہ داریاں جڑتی ہیں، اور حقوق ادا ہوتے ہیں۔ یہ زیادہ عورتوں کے ذریعہ سے ہوتے ہیں۔ اگر عورت بدسلیقہ ہو، وہ توڑ پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے اندر سلیقہ ہو، خاندانوں کو ملا دیتی ہے۔ محل محبت فی الحقیقت عورت ہے۔ اس لئے کہ اسی سے محبتوں کے اگلے سلسلے چلتے ہیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "حُبِّبَ إِلَيَّ مِنْ دُنْيَاكُمْ ثَلَاثٌ" ② تمہاری دنیا میں مجھے تین چیزیں پسند ہیں۔ اس میں سے خوشبو کو پسند فرمایا۔ نماز کو پسند فرمایا، اور عورت کو پسند فرمایا۔ اس واسطے کہ خوشبو لگے گی، تو ملائکہ کا ہجوم ہو جائے گا۔ یہ بھی محبت باہمی کا ذریعہ بن جائے گی۔ عورت آئے گی، یہ بھی خاندانوں کے جڑ جانے کا ذریعہ بن جائے گی۔ اس سے بھی محبت واتحاد قائم ہوا۔ تو نکاح کی بڑی غرض و غایت وحدت باہمی اور سکون باہمی ہے۔

نکاح کی غرض و غایت ...... یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں جو نکاح کی غرض و غایت ذکر کی گئی، وہ سکون باہمی ذکر کی گئی ہے۔ لیکن نسل بڑھنا، یہ تو طبعی طور پر بڑھے گی۔ غرض و غایت اصلی جو ہے، وہ یہ ہے۔ ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ ③ اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ تم میں سے تمہارا جوڑی جوڑا نکال دیا۔ مرد میں سے عورت نکال دی، عورت میں سے مرد نکال دیا۔ ورنہ دونوں سلسلے الگ الگ ہیں۔ مرد میں سے اگر کوئی نکلتا تو مرد ہی نکلتا۔ عورت میں سے عورت نکلتی۔ اس قدر عجیب قدرت حق کی ہے کہ مرد میں سے عورت نکال دی۔ اور عورت میں سے مرد کو پیدا کیا۔ فرمایا کہ یہ ہماری قدرت کی نشانی ہے کہ تم میں سے تمہارا جوڑا نکالا۔ اگر عورت انسانوں کی جنس میں سے نہ ہوتی، فرشتوں میں سے یا جنات میں سے ہوتی، کبھی باہمی محبت قائم نہ

---

① جامع العلوم والحکم، ص: ۳۰۰. ② الحدیث اخرجہ الامام البیہقی فی سنۃ الکبریٰ وقال: لفظ حدیث علی وفی روایۃ موسی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: حبب الی من الدنیا (تابعہ یسار بن حاتم عن جعفر بن سلیمان عن ثابت عن انس) وروی ذالک جماعۃ من الضعفاء عن ثابت واللہ اعلم، دیکھئے: السنن الکبریٰ للبیہقی ج: ۷ ص: ۷۸.
③ پارہ: ۲۱ سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۱.

ہوتی۔ دوسری جنس کے ساتھ میلان ہی نہیں ہوتا۔ جانوروں میں ہر طبقے میں ہزاروں مادائیں ہیں۔ شیر ہے تو شیرنی بھی ہے۔ بھیڑیا ہے تو اس کی مادہ بھی ہے۔ انسانوں کا بھی رجوع نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ غیر جنس سے کبھی میلان نہیں۔ اپنی جنس کی طرف میلان ہوتا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ ہماری قدرت کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے میں سے تمہارا جوڑا پیدا کیا، تمہاری جنس میں سے ایک تمہارے اندر میں سے، تا کہ تمہارا جب جٹ بنے تو تمہارے میں محبت قائم ہو۔ اگر غیر جنس کا جوڑا ملا دیتے۔ جنی عورت بنا دیتے، تمہارا رابطہ کبھی نہ ہوتا۔ وہ مقصد اور موضوع ختم ہو جاتا ہے تو۔ ﴿أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ﴾ ① تم میں سے تمہارے نفسوں میں سے پیدا کیا۔ ﴿أَزْوَاجًا﴾ تمہارے جوڑوں کو۔ کیوں پیدا کیا؟ ﴿لِتَسْكُنُوْٓا إِلَيْهَا﴾ تا کہ تم اس سے سکون حاصل کرو۔ ﴿وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾ اور تم خاوند بیوی میں محبت اور مودت پیدا ہو۔ تم ایک دوسرے کے خیر خواہ بنو۔ ایک دوسرے میں تم میں محبت پیدا ہو۔ اس لئے ہم نے جوڑا بنایا اور فرمایا: ﴿إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ ② جو لوگ فکر رکھتے ہیں، وہ اس چیز کی قدر کریں گے، جو ہم کہہ رہے ہیں۔ جو بے فکر ہیں، عقل ہی نہیں رکھتے، انہیں کیا خبر ہوگی کہ اس میں کیا مصلحت ہے؟ لیکن جب تم زندگی گزارو گے، اور اس مقام پر آؤ گے۔ تمہیں قدر آئے گی کہ ہم نے تم کو کتنی بڑی نعمت دی ہے۔ جو تمہارا جوڑا تم میں سے پیدا کیا۔ تا کہ تم میں سکون پیدا ہو۔

نکاح اللہ کی قدرت کی نشانی بھی ہے..... نکاح کو آیت کہا گیا ہے۔ آیت قدرت کی نشانی کو کہتے ہیں۔ کہ خدا ہی کر سکے، دوسرا نہ کر سکے۔ اسے آیت کہتے ہیں۔ جیسے قرآن کریم کی آیتیں ہیں۔ آیت کرسی ہے، آیت استخلاف ہے، آیت الرحمٰن ہے، آیت رحمت ہے۔ یہ اللہ کی آیتیں اور قدرت کی نشانیاں ہیں۔ کوئی دوسرا ایسا کلام نہیں لا سکتا۔ اسی طرح سے اس کے افعال میں بھی کچھ آیتیں ہیں فرمایا۔ ﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ اَحْيَيْنٰهَا﴾ ③۔ یہ ہماری آیتوں میں سے ہے کہ زمین ہم ہی بنا سکتے ہیں، کوئی دوسرا نہیں زمین مردہ ہو جاتی ہے، بارش برسا کے ہم اسے دوبارہ زندہ کر دیتے ہیں۔ کہیں فرمایا: إِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ اٰيَتَانِ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَا يَنْخَسِفَانِ لِمَوْتِ اَحَدٍ وَّلَا لِحَيَاتِهٖ ④ سورج اور چاند اللہ کی قدرت کی آیتوں میں سے دو آیتیں ہیں، جیسے قرآن کی آیت کا جواب نہیں۔ ان آیتوں کا بھی جواب نہیں کہ اس جیسا کوئی سورج بنا دے۔ چاند جیسا چاند بنا دے۔ تو زمین سورج اور چاند کو بھی آیت کہا اور فرمایا: ﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ﴾ ⑤ یہ جو رات ہے یہ ہماری قدرت کی نشانی اور آیت ہے اسی کے اندر سے جب ہم کھینچتے ہیں، تو دن نکل آتا ہے۔ اندھیروں میں سے چاند نکل آتا ہے۔ ابھی دنیا پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کہیں نور کا نشان نہیں تھا۔ انسانوں نے محنت کر کے مصنوعی انڈے، قمقمے لاکھوں جلائے چاندنا تو ہو گیا۔ مگر رات بدستور رہی۔ دن نہیں نکلا ہماری قدرت دیکھو۔ جب دن نکالنا چاہتے

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۱۔ ② پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۱۔ ③ پارہ: ۲۳، سورۃ یٰس، الآیۃ: ۳۳۔
④ الصحیح لمسلم، کتاب الصلوۃ، باب صلوۃ الکسوف، ج: ۳، ص: ۲۴۴۔ ⑤ پارہ: ۲۳، سورۃ یٰس، الآیۃ: ۳۷۔

ہیں۔ بس سورج کی آمد آمد ہوئی، اور رات غائب ہوئی یا تو دنیا پر ظلمت چھائی ہوئی تھی یا ایک دم چاند نے کی حکومت قائم ہوگئی۔ ایک دم عالم میں نور پھیل گیا۔ یہ ہماری قدرت کی نشانی ہے۔

اسی طرح سے قدرت کی نشانی نکاح کو بھی کہا گیا ہے آپ کہیں گے نکاح میں نشانی ہونے کی کیا بات ہے؟ دو مرد عورت کا نکاح کر دیا۔ اس میں نشانی ہونے کی کیا بات ہے؟ کہ اللہ ہی بنا سکتا ہے اور کوئی نہیں تو نکاح میں آیت ہونے کی کیا شان ہے؟ خطیب نے خطبہ پڑھ دیا۔ مولانا انصاری صاحب نے بڑا عمدہ خطبہ پڑھا، ایجاب و قبول ہو گیا۔ اس میں قدرت کی نشانی کیا ہے؟

اس میں قدرت کی نشانی یہ ہے کہ دو بول پڑھے جانے سے پہلے مرد کو عورت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بالکل ایک اجنبیت تھی۔ اگر رشتہ داری بھی ہوگی، تو رشتہ داریاں ہزاروں سے ہوتی ہیں، لیکن یہ کہ اس مرد کے قلب کا لگاؤ اس عورت سے تھا، قطعاً نہیں یا اس عورت کا لگاؤ مرد سے تھا، قطعاً نہیں۔ وہ بالکل اجنبی، یہ بالکل اجنبی، اس کا دل اس سے بیگانہ، اس کا دل اس سے لیکن جہاں چار حروف پڑھے گئے، ایجاب و قبول ہوا۔ ایک دم انقلاب پیدا ہوا۔ اب اس مرد کے دل کا تعلق اس عورت سے قائم ہوا۔ ایسے وقت اگر یہ خبر آئے کہ میری بیوی کو تکلیف ہے، اسے دکھ پہنچے گا۔ اگر اسے پہلے خبر پہنچتی تو کہتا ہزاروں عورتیں تکلیف میں ہوں گی۔ لیکن چار حرف پڑھے گئے، اور قلب کا رابطہ قائم ہو گیا۔ عورت کو اگر اطلاع ہو جائے کہ جس سے میرا نکاح ہوا ہے خدانخواستہ وہ کسی تکلیف میں ہے۔ وہ پریشان ہو جائے گی۔ لیکن نکاح پڑھے جانے سے پہلے پچاس خبریں آتیں۔ وہ کہتی ہزاروں مرد ہیں، عزیز بھی ہیں، رشتہ دار بھی ہیں، مجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ دو حرف پڑھنے کے بعد جو انقلاب عظیم برپا ہوا، یہ اللہ کے سوا کون کر سکتا ہے؟ جو دلوں کو ایک دم موم اور مائل کر دیا۔ ابھی اجنبیت تھی، ابھی یگانگت پیدا ہوگئی۔ ابھی بے تعلقی تھی، منٹ بھر کے بعد تعلق پیدا ہو گیا۔ یہ مرد عورت بے واسطہ تھے، اب ایک دم واسطہ پیدا ہو گیا۔ ایسے میں اگر کوئی خوشی کی خبر بیوی کی نسبت آئی، خاوند کا دل بڑھ جائے گا، کہ جس سے میرا نکاح ہوا، اس کی کیسی عمدہ خبر سنی۔ خاوند کی طرف سے کوئی خوشی کی خبر پہنچے، اس کا دل بڑھ جائے گا کہ جس سے میرا رشتہ قائم ہوا۔ اس کے لئے بڑی عزت کا سامان ہے۔ وہ عورتوں میں سر اونچا کرے گی کہ میرے لئے فخر کی بات ہے۔ یہ مردوں میں سر اونچا کرے گا۔ لیکن جب تک چار حرف نہیں پڑھے گئے تھے، نہ اس کا سر اونچا تھا، نہ اس کا سر اونچا تھا۔ یہ جو ایک دم عظیم انقلاب برپا ہو گیا۔ یہ خدا کے سوا کون کر سکتا ہے؟ میرا آپ کا کام تو نہیں ہے۔ یہی معنی ہیں نشانی ہونے کے کہ قلوب میں، روحوں میں انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ ابھی کچھ تھا، ابھی کچھ ہو گیا۔ اس لئے فرمایا: ﴿وَمِنْ اٰیٰتِہٖ﴾ اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے کہ تم میں سے تمہارا جوڑا نکالا اور اسی کی نشانی یہ بھی کہ تم میں دو حرف کے پڑھے جانے سے اچانک سکون و مودت پیدا کر دیا۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے اسے موضعِ انعام میں ذکر فرمایا۔ معلوم ہوتا ہے اللہ کو یہ محبوب و مطلوب ہے کہ یہ خاوند بیوی ملیں۔ ان میں محبت پیدا ہو۔ غرض و غایت نکاح کی یہ ذکر کی گئی۔ تو

جب اللہ کا منشاء یہ ہے کہ مرد عورت جن کا نکاح ہے، وہ محبت سے ملیں۔ تو انبیاء کیسے نہیں پسند کریں گے؟ انبیاء وہی چیز پسند کرتے ہیں جو اللہ کو پسند ہو۔ وہ اللہ کے ترجمان بن کر آتے ہیں تو انبیاء علیہم السلام کو بھی پسند ہے کہ محبت باہمی پیدا ہو جائے۔

خانگی زندگی میں سکون کا راز ...... یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات ایسی چیزیں عمل میں لاتے تھے جس سے محبت بڑھے۔ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بیٹھ کر ایک برتن میں کھانا کھاتے۔ اور ایسے دنوں میں جب وہ نماز نہیں پڑھ سکتی تھیں۔ زمانہ جاہلیت میں دستور یہ تھا، ایام حیض میں عورت کو اچھوت سمجھتے تھے۔ اس کے سائے کو بھی ناپاک سمجھتے تھے۔ ایک الگ کوٹھری میں بٹھا دیتے تھے، روٹی پانی بھی دیتے تھے تو بانس کے ٹکڑے سے دیتے تھے کہ کہیں اس کا سایہ نہ پڑ جائے۔ یہ نجس ہوگئی۔ اسلام نے اس خیال کو مٹایا کہ یہ بیہودگی ہے۔ وہ نجاست حکمی ہے۔ اللہ کا حکم ہے۔ کوئی اس کا عین اور بدن تھوڑا ناپاک ہوا ہے۔ وہ تو ایسا ہے جیسے کوئی استنجا کر کے آئے، تو وضو کرنی واجب وہ حکمی نجاست ہے، یہ تھوڑا ہے کہ کوئی برائی اور گندگی لگی ہوئی ہے۔ حکمی طور پر نجاست ہے۔ حکم ہے کہ پاک بنالو۔ طاہر بن جاؤ۔

اسی طرح سے ایام حیض میں جو نجاست ہے، وہ حکمی ہے، یہ نہیں کہ بدن پر نجاست لگی ہوئی ہے۔ اس کا دھونا ضروری ہے۔ حکم خداوندی ہے نجس سمجھو، پاک بناؤ۔ مگر زمانہ جاہلیت والے اس نجاست کو اتنی بڑی نجاست سمجھتے تھے کہ عورت کو اچھوت سمجھتے تھے۔ اس کا کھانا، پینا اور مکان تک الگ۔ اس کے سائے سے بچتے تھے۔ اسلام نے یہ کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عین اس زمانے میں جب عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر ایام گذر رہے تھے۔ ایک برتن میں کھانا کھایا اور نہ صرف یہی بلکہ حدیث میں یہ بھی ہے کہ جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے لقمہ لیا منہ میں رکھ لیا، زبان لگادی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پاس سے چھین کے خود تناول فرمالیا۔ تاکہ امت کو بتلادیں کہ عورت کی ذات میں کوئی نجاست نہیں آتی۔ اس سے محبت قطع کر دینا، اسے اچھوت بنا دینا، یہ انسانیت کے خلاف بات ہے۔ یہ اسی لئے تھا تاکہ اس تعلق کی مضبوطی زیادہ سے زیادہ ہو۔ اس واسطے اس قسم کی چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم عملاً فرماتے۔

حدیث میں ہے ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: آؤ ہم اور تم مل کر دوڑیں۔ آپس میں بھاگ ہوئی کہ کون آگے نکلتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آگے نکل گئے، صدیقہ رضی اللہ عنہا پیچھے رہ گئیں۔ اخیر عمر میں جب بدن مبارک بھاری پڑ گیا۔ پھر ایک دفعہ فرمایا کہ اچھا ہم اور تم مل کے بھاگیں۔ کون آگے نکلتا ہے۔ اب کے صدیقہ رضی اللہ عنہا آگے نکل گئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بدن مبارک بھاری پڑ گیا تھا۔ فرمایا: "تِلْکَ بِتِلْکَ" "چلو برابر سرابر قصہ ہوگیا۔ ایک دفعہ ہم جیت گئے تھے۔ ایک دفعہ تم جیت گئیں۔ اب کوئی کہے، انبیاء علیہم السلام کو بھاگ دوڑ سے کیا تعلق؟ حقیقت یہ ہے کہ عورت کے دل کو مٹھی میں

لینے کے لئے، اس کی دلداری کرنے کے لئے یہ چیزیں فرمائیں۔ اور فرمایا: ہر وہ لہولعب جو حرام ہے بیوی کے ساتھ جائز ہے۔ تاکہ اس کا دل مٹھی میں آئے، اس کی دلداری دل جوئی ہو۔ مقصد یہ ہے، اس کے لئے تسلی کا سامان ہو۔ اس کے ساتھ محبت و یگانگت کا معاملہ ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اِنَّ اَکْرَمَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَحْسَنُکُمْ اَخْلَاقًا اَلْطَفُکُمْ اَهْلًا'' ① ''تم میں سے زیادہ قابلِ تکریم مسلمان وہ ہے جس کے اخلاق پاکیزہ ہوں۔ اور بیویوں کے ساتھ لطف و محبت اور مدارات کا برتاؤ کرتا ہو''۔

سخت گیری نہ کرتا ہو، تیز و تندلب و لہجے سے نہ بولتا ہو۔ ہر وقت ڈرانے اور دھمکانے کے فکر میں نہ رہے، جیسے بے وقوف خاوندوں کی عادت ہوتی ہے اپنی شوخی اور قوت جتانے اور حکومت قائم رکھنے کے لئے سخت کلامی سے پیش آتے ہیں۔ جب آئیں تو ناک منہ چڑھی ہوئی ہے، تاکہ بیوی بیچاری ڈر جائے، کہ کوئی شیر اور بھیڑیا آ گیا تاکہ میرا رعب رہے۔ یہ نہایت لغو حرکت ہے انسانیت و محبت کا برتاؤ کرنا چاہئے۔

ایک صحابی ہیں حضرت انجشہ رضی اللہ عنہ انہوں نے کہیں اپنی بیوی کو مارا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غضب ناک ہوئے۔ چہرہ مبارک غصہ سے سرخ ہو گیا۔ فرمایا اے انجشہ! کانچ کی شیشیوں کو توڑ ڈالنا کوئی جوان مردی کی بات ہے؟ عورت پر ہاتھ اٹھایا؟ لڑنا تھا تو کسی مد مقابل سے لڑتے اپنے سے زیادہ قوی سے لڑتے۔ اگر تمہیں کوئی شوخی اور طاقت دکھلانی تھی۔ عورت پر ہاتھ اٹھایا؟ نازک صنف کو مارنا شروع کیا، تاکہ آپ کی بہادری واضح ہو اتنے بڑے بہادر ہو، عورت کو مارا اور آ کے فخر کیا کہ میں نے مارا۔ بھئی کسی پہلوان پہ ہاتھ اٹھایا ہوتا۔ کسی جوان مرد کے مقابلے پہ آتے تم ایک مارتے، وہ چار رسید کرتا۔ جوانی معلوم ہو جاتی۔ عورت کے مقابلے پہ جوانی دکھلانا کہ میں بڑا طاقت ور ہوں۔ یہ تو کمینوں کی سی بات ہے۔ شرافت کی بات نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوئے، خفا ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ تو یہ تھا کہ ایک پیالے میں کھانا کھاتے ہیں۔ بعض اوقات بھاگنے دوڑنے کو فرمایا، تاکہ عورت کا دل مٹھی میں رہے، اس کی مدارت ہو۔ اس کے ساتھ لطف و اکرام کا برتاؤ ہو۔ اور دوسرا برتاؤ جو حضرت انجشہ رضی اللہ عنہ نے کیا، تو آپ نے ڈانٹا، خفا ہوئے اور ناراض ہوئے۔

اس سے معلوم ہوا انبیاء علیہم السلام کا مقصد یہ ہے کہ دونوں خاوند بیوی میں مدارات کا برتاؤ رہے۔ اور وجہ اس کی یہ ہے اگر یہ دونوں مدارات اور لطف کا برتاؤ کریں گے، خانگی زندگی بہترین ہو جائے گی۔ جس گھر کے اندر خاوند بیوی ایک ذات ہوں، ایک دل اور ایک جان ہوں۔ اولاد میں بھی محبت پیدا ہوگی۔ عزیزوں میں بھی محبت پیدا ہوگی۔ اور جہاں خاوند بیوی کی لڑائی ہے۔ یہ اس کی صورت دیکھ کر منہ بچھور رہا ہے۔ وہ اس کی صورت دیکھ کر منہ بچھور رہی ہے، اس کا نتیجہ ہوگا کہ اولاد میں بھی وہی چیزیں پیدا ہوں گی۔ اور گھر جہنم بن جائے گا۔ اس کا منہ ادھر کو، اس کا منہ ادھر کو۔ وہ گھر کیا ہوا۔ وہ تو دوزخ ہو جائے گی۔ جنت جب بنے گا گھر، جب ایک کو دیکھ کر دوسرا خوش ہو۔

① البحر المحیط، ج: ۱۰، ص: ۳۳.

نیک بیوی آدمی کی سعادت کی علامت ہے..... حدیث میں فرمایا ہے: آدمی کی خوش نصیبی اور سعادت کی تین علامتیں ہیں۔ پہلی تو یہ ہے کہ آدمی کا رزق اس کے وطن میں اترے اس کے لئے مارا مارا نہ پھرے کہ دنیا میں رزق کی تلاش کرتا ہوا جارہا ہے۔ جہاں گھر ہے وہیں رزق کا سامان اللہ نے کردیا۔ پہلی علامت خوش نصیبی کی یہ ہے۔

دوسری علامت یہ فرمائی گئی، اس کو گھر وسیع ملے، تنگ کوٹھری نہ ہو، کہ دیکھ کر اس کے دل میں تنگی اور گھٹن پیدا ہو جائے۔ صحن اسکا وسیع ہو، مکان ذرا اچھا ہو، اس لئے کہ مکان کی خوشنمائی سے دل میں بھی وسعت پیدا ہوتی ہے، اور مکان کی تنگی اور گھٹن سے دل میں بھی تنگی اور گھٹن پیدا ہوتی ہے۔ تو دوسری علامت خوش نصیبی کی یہ فرمائی گئی کہ مکان اور اس کا صحن وسیع ہو، گھر اچھا ملے۔ تاکہ دل میں بھی وسعت پیدا ہو۔

اور تیسری علامت یہ ہے کہ بیوی نیک بخت ملے۔ جب اس کی صورت دیکھے، دل میں خوشی پیدا ہو جائے، اور جب اسے گھر میں چھوڑ کر جائے تو وہ مرد کی عزت و ناموس کی حفاظت کرے۔ ایسی صالحہ بیوی کہ وہ اللہ کا بھی حق ادا کرے، اپنے خاوند کا بھی حق ادا کرے۔ فرمایا: وہ آدمی خوش نصیب ہے جس کے پاس یہ تین چیزیں ہوں۔ گھر بھی درست ہو، بیوی بھی درست ہو۔ روزی بھی اسکی اس کے وطن میں اترے۔ باہر مارا مارا نہ پھرے۔ یہ تین علامتیں خوش نصیبی کی فرمائی گئیں۔ ان میں بڑی علامت یہ ہے کہ بیوی صالحہ ملے۔ جب اسے دیکھے، دل کے اندر خوشی بھر جائے اور جب اس کے ساتھ برتاؤ اور معاملہ کرے، خوشی پیدا ہو کہ بڑی سمجھدار ہے اور جب اسے گھر پہ چھوڑ کے جائے تو اتنا مطمئن رہے کہ میرے گھر میں کوئی خرابی نہیں آسکتی، میری بیوی سلیقہ مند ہے، خوش نصیب ہے۔ تو واقعی بیوی کی صلاحیت وسوجھ مندی، اور اعلیٰ درجہ کی ہوش مندی نہایت ہی بڑی نعمت اور ایک بڑی مسرت ہوتی ہے۔

فن نحو کے امام یحییٰ ابن اکثم رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ان کے واقعات میں ہے۔ بڑے جلیل القدر عالم تھے۔ مگر انتہائی بدصورت، رنگ بھی کالا، ہونٹ بھی موٹے، آنکھوں میں زردی اور دانتوں میں بھی زردی۔ غرضیکہ جتنی بدصورتی کی علامتیں ہوسکتی ہیں وہ سب جمع تھیں۔ اور بیوی اتنی حسین وجمیل تھی کہ ملکوں میں اس کا جواب موجود نہیں۔ جتنی علامتیں حسن و جمال کی ہوسکتی تھیں، وہ بیوی میں تھیں۔ جب دونوں خاوند بیوی بیٹھتے، جیسے دھوپ چھاں بیٹھی ہوتی ہے۔ ایک طرف دھوپ چھن رہی ہے۔ دوسری طرف رات نظر آرہی ہے۔ جب ایک دوسرے کے سامنے بیٹھتے تو یحییٰ ابن اکثم بیوی کو خطاب کر کے کہتے تو بھی یقیناً جنتی ہے۔ میں بھی یقیناً جنتی ہوں دونوں جنتی ہیں۔ کیوں؟ اس واسطے کہ مجھے تو ملی تجھ جیسی بیوی۔ تو میرا کوئی منٹ شکر گزاری سے خالی نہیں ہوگا۔ شکر کے راستے سے تو جنت میں جاؤں گا اور تجھے ملا مجھ جیسا خاوند کہ کوئی منٹ بھی تیرا صبر سے خالی نہیں۔ تو صبر کے راستے سے جنت میں پہنچ جائے گی۔ میں بھی جنتی، تو بھی جنتی۔ حقیقت یہی ہے اگر بیوی صالحہ ہو اور حسن و جمال بھی ہو۔ دونوں کی خوش نصیبی ہے۔ وہ اسے دیکھ کے خوش ہے، وہ اس سے راضی ہے۔ تو محبت باہمی مقصود ہے۔

بیوی کے انتخاب کا معیار..... مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھ لینا چاہئے کہ محبت عورت سے محض

صورت کی وجہ سے نہ کرنی چاہئے۔صورت ڈھلتی ہوئی دھوپ ہے۔آج اچھی صورت ہے،کل کو بگڑ گئی۔بڑھاپے میں تو کم سے کم بگڑ ہی جاتی ہے اور اللہ بھلا کرے بخار کا کہ دو تین دن ہی میں حلیہ بگاڑ دیتا ہے۔تین دن بخار آیا۔نہ رنگ رہا،نہ عنفوانی رہی گلاب کا سا رنگ تھا وہ ختم ہو گیا قصہ۔اور اگر بخار نہ آئے تو بڑھاپا تو کہیں گیا ہی نہیں۔بڑھاپا آ کے صورت کو بگاڑ دیتا ہے۔اور بڑھاپا بھی نہ آئے تو موت کہیں گئی ہی نہیں۔وہ سب کی صورتیں ختم کر دیتی ہے۔صورت ایک آنی جانی چیز ہے۔اس لئے اگر کوئی بیوی سے محبت محض صورت کی وجہ سے کرے گا، وہ محبت غائب ہو جائے گی۔اس لئے کہ جب صورت ڈھلی،محبت بھی ڈھل جائے گی۔اس واسطے محبت کاہے سے کرنی چاہئے؟حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا معیار ارشاد فرمایا۔فرمایا:"تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِمَالِهَا وَلِحَسَبِهَا وَلِجَمَالِهَا وَلِدِيْنِهَا"①

عورت سے چار وجوہ سے نکاح کیا جاتا ہے،کبھی تو اس کی خوبصورتی کی وجہ سے۔صاحب جمال ہے۔آدمی کا دل چاہا،نکاح کر لیا۔کبھی اس کے مالدار ہونے کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے کہ نکاح کریں گے تو جائیداد قبضے میں آئے گی۔رئیس بن کے بیٹھ جائیں گے۔کبھی اس کی حیثیت عرفی کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے کہ بڑے اونچے خاندان کی ہے،اس کا نام بلند ہے۔اس کے ماں باپ کی عزت دنیا میں قائم ہے۔میں ایسی عورت سے نکاح کروں گا تو میری بھی عزت بڑھ جائے گی۔اور کبھی اس کی دینداری کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے،کہ اس کا دین بہت اعلیٰ ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:"فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ" ② نہ صورت کو دیکھو،نہ حسب کو دیکھو،دین کو دیکھو۔اس لئے کہ اگر دین کی وجہ سے محبت قائم کریں گے،تو مرتے دم تک قائم رہے گی۔اس میں ڈھلاؤ کی کوئی صورت نہیں۔لیکن اگر صورت کی وجہ سے محبت کی،تو جہاں جوانی ڈھلی،محبت میں کمی آ گئی۔اور آپس میں لڑائی شروع ہو گئی۔دولت کی وجہ سے محبت کی۔تو دولت کو رات دن آفت آتی رہتی ہے۔جائیداد وغیرہ خدانخواستہ ختم ہو گئی،محبت کو بھی خیر باد کہیں گے،جب وہ بات ہی نہیں رہی،جس کی وجہ سے محبت تھی۔اور اگر حیثیت عرفی یا ظاہری عزت کی وجہ سے کی۔تو عزت و ذلت تو اضافی چیز ہے،کبھی عزت ہو جاتی ہے،کبھی ذلت ہو جاتی ہے۔کبھی وقار،کبھی بے وقار۔تو جہاں بے وقاری پیدا ہوئی۔آپ کی محبت ختم ہو جائے گی۔لیکن اگر دین کی وجہ سے محبت ہے،فرض کرو عورت کالی کلوٹی ہے۔آدمی یہ سمجھے گا،حق تعالیٰ نے اس کا حق میرے اوپر قائم کیا،میرا فرض ہے کہ میں اس کا حق ادا کروں۔چاہے یہ گوری ہے،چاہے یہ کالی ہے۔چاہے یہ دولت مند ہے۔چاہے یہ مفلس ہے۔چاہے یہ باحیثیت ہے،چاہے یہ بے حیثیت ہے۔میری قسمت میں لکھ دی گئی،میرے اوپر اس کا حق آ گیا ہے۔میرا فرض ہے کہ مرتے دم تک اس کا حق ادا کروں۔دین کی وجہ سے مرد و عورت کا معاملہ سدا بہار ہو جاتا

① الصحيح للبخاري، كتاب النكاح،باب الاكفاء في الدين،ج:١٦،ص:٣٣. ② الصحيح للبخاري، كتاب النكاح،باب الاكفاء في الدين،ج:١٦،ص:٣٣.

ہے۔اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نکاح دین کی وجہ سے کرو۔ تاکہ محبت میں دوام حاصل ہو جائے حقوق کی ادائیگی دائمی طور پر ہو جائے۔

تو انبیاء علیہم السلام کے ہاں نکاح سنت ہے اس لئے کہ وہ محبت اور اتحاد باہمی کا ذریعہ ہے۔شیاطین کے ہاں نکاح سے بغض ہے۔اس لئے کہ وہ اتحاد کا ذریعہ ہے۔شیاطین چاہتے ہیں کہ لڑائیاں ہوں، پھوٹ پڑے۔ نکاح ہونے نہیں دیتے، انہیں نکاح سے چڑ ہے۔وہ چاہتے ہیں کہ آدمی زناکاری اور بدکاری کی طرف چلے، اس لئے کہ بدکاری کا انجام لڑائی، پھوٹ قلوب کی کدورت اور قلق ہے۔

زوجین میں لڑائی، بڑے فتنے کا پیش خیمہ بنتی ہے...... یہی وجہ ہے، حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے، شیطان روزانہ عصر کی نماز کے بعد سمندر کے کنارے یا پانی کے اوپر اپنا تخت بچھاتا ہے اور اس پر بیٹھتا ہے۔ پانی پر اس لئے بچھاتا ہے کہ اللہ میاں سے مقابلہ کرتا ہے ان کا پانی کے اوپر عرش ہے۔تو میں بھی اپنا عرش بچھاتا ہوں۔ فرق اتنا ہے، ان کا عرش جو پانی پر ہے وہ نہایت لطیف اور پاک ہوتا ہے۔اور یہ کڑوا، نمکین، اور بعض اوقات اس سے اذیت بھی پہنچتی ہے۔یہ مادی پانی ہے۔وہ روحانی پانی ہے۔مگر بہر حال شیطان ظاہری صورت بناتا ہے کہ اگر اللہ میاں عرش پر ہے، تو میں بھی عرش پر ہوں۔ان کا عرش پانی پر، تو میرا عرش بھی پانی پر۔ کیونکہ یہ حق کے مقابلے میں ہے۔تو وہاں بھی کمبخت مقابلہ ہی ٹھانتا ہے۔صورت ہی مقابلے کی بنا لیتا ہے، روزانہ سمندر پر تخت بچھا کر اس کے اوپر بیٹھتا ہے۔کیوں بیٹھتا ہے؟ اس کے شتونگڑے، اس کی اولاد دو و ریت دن بھر میں لوگوں سے بدکاریاں کراتی ہیں۔ہر ایک آ کر اس کے پاس رپورٹ دیتا ہے۔میں نے فلاں کی نماز قضا کرادی۔شیطان کہتا ہے کہ کام تو بہت عمدہ کیا، مگر کوئی بڑی بات نہیں کی، کہ تجھے انعام یا شاباش دوں۔ دوسرا آتا ہے میں نے فلاں سے زنا کروادیا ہے۔کہتا ہے کہ ہاں ٹھیک کیا۔مناسب کام کیا۔کوئی بڑا قابل قدر کام نہیں کیا۔ایک آتا ہے میں نے جھوٹ بلوادیا، جھوٹی گواہی دلوادی، کہتا ہے تو نے بھی اچھا کام کیا۔مگر کوئی بڑی بات نہیں ہوئی۔ایک آتا ہے کہتا ہے کہ میں نے آج خاوند بیوی میں لڑائی کرادی۔حدیث میں ہے اس کو سینے سے لگاتا ہے کہ تو میرا سپوت۔تو نے بڑا کام کیا ہے۔تیرے سے میں خوش ہوں تیرے سے زیادہ بہترین میری دوسری اولاد نہیں ہے۔تو نے یہ کام کیا کہ خاوند بیوی میں لڑائی کرادی۔تو سینے سے لگاتا ہے، چمٹاتا ہے، اسے شاباش دیتا ہے۔ ①

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ زنا کا فعل برا ہے۔اس پر شاباش دینی چاہئے تھی۔یہ خاوند بیوی میں لڑائی کرادی۔ یہ تو گھروں میں ہوتا ہی رہتا ہے۔لڑائی بھی ہو جاتی ہے، صلح بھی ہو جاتی ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ کیوں خوش ہوتا ہے؟ اس لئے کہ خاوند بیوی کی لڑائی دو کی لڑائی نہیں ہے، بلکہ سو کی لڑائی ہے۔اس لئے کہ جب خاوند بیوی لڑیں گے، تو خاوند کے جتنے عزیز ہیں، وہ خاوند کی حمایت کریں گے۔ بیوی

① الصحيح لمسلم، كتاب صفة القيامة والجنة والنار، باب تحريش الشيطان.... ج: ١٣، ص: ٢٢٦.

کے جتنے رشتے دار ہیں، وہ بیوی کی حمایت کریں گے۔ تو دو آدمیوں میں نہیں چلی، بلکہ دو گھرانوں میں چل گئی۔ اب گھرانے ایک دوسرے سے منہ پھیرے ہوئے بیٹھے ہیں۔ وہ ان کے مدمقابل، یہ ان کے مدمقابل۔ پھر ان دونوں گھرانوں کے لوگ آدھے اُدھر آ جائیں گے، آدھے اِدھر آ جائیں گے۔ بیوی والے بیوی کی طرف، خاوند والے خاوند کی طرف۔ تو دو گھروں میں نہیں چلی، دو خاندانوں میں چل جاتی ہے۔

اور اگر خاوند بیوی باحیثیت ہیں۔ جیسے ملک اور ملکہ، بادشاہ اور بادشاہ بیگم ہیں۔ ان میں لڑائی ہو جائے تو فوجیں کٹ مرتی ہیں۔ دو ملکوں میں لڑائی ہو جاتی ہیں اور جنگ عظیم برپا ہوتی ہے۔ تو دو کی لڑائی، بحقیقت سینکڑوں کی لڑائی ہے اور جب دو خاندانوں میں چلتی ہے، پھر کیا ہوتا ہے؟ بدگوئی الگ، وہ اسے برا کہیں گے وہ اسے، غیبت کا گناہ سرزد ہوا۔ یہ اس کے ایذا رسانی کے درپے ہے۔ وہ اس کے درپے ہے۔ یہ ایذا رسانی کا گناہ الگ۔ اس کے بعد مقدمہ بازی چلے گی۔ وہ الگ بے عزتی، یہ الگ بے عزت، پھر مقدمہ بازی میں جانبین کا روپیہ خرچ ہوا۔ لاکھوں انہوں نے برباد کیے، لاکھوں انہوں نے، جائیداد ختم ہوئی۔ تو ایک گناہ میں سینکڑوں گناہ چھپے ہوئے ہیں۔ جب دو میں لڑائی ہوگی، تو غیبتیں الگ ہوں گی۔ چغلخوریاں الگ ہوں گی، مقدمہ بازی الگ ہوگی، مال الگ ختم ہوگا، گھر الگ بے عزت ہوگا، شہر میں الگ فتنہ برپا ہوگا۔ لوگ کہیں گے، میاں دیکھا۔ فلاں دو بڑے بن رہے تھے۔ کیسی جوتیوں میں دال بٹ رہی ہے۔ دیکھا آپ نے لڑائی ہو رہی ہے؟ وہ الگ تحقیر کر رہا ہے، الگ برائی بیان کر رہا ہے۔ تو بدنامی الگ، مال کی بربادی الگ، عزت کی تباہی الگ، سکون دل الگ ہٹا۔ بیوی خاوند کی لڑائی ایک گناہ نہیں، بلکہ سینکڑوں گناہ اس کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔ اس لئے شیطان خوش ہوتا ہے کہ اس میں فتنہ پھیلتا ہے، اور ہزاروں گناہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر کسی نے جھوٹ بول دیا۔ بس ایک گناہ، ختم ہوگیا، لیکن اس گناہ میں غیبت بھی ہے۔ عزت کی تباہی ہے، مال کی بربادی ہے، وغیرہ وغیرہ شیطان کے لئے کتنا خوشی کا موقع ہے؟

تو انبیاء علیہم السلام نکاح کے ختم ہونے پر خفا اور ناراض ہیں۔ اور شیاطین نکاح کے کمزور ہونے اور ٹوٹ جانے پر خوش ہیں۔ اس لئے کہ نکاح ٹوٹنے سے فتنہ پھیلے گا۔ اور اگر نکاح جڑا رہے گا، تو امانت داری پھیلے گی۔ انبیاء امانت کے حامل ہیں۔ شیاطین فتنہ کے حامل ہیں، وہ فتنہ پردازی پر خوش ہیں۔ یہ امانت داری پر خوش ہیں۔ انبیاء کو نکاح سے محبت ہے اور شیاطین کو اس کے ٹوٹ جانے سے محبت ہے۔

بیوی پر خاوند کی انتہائی اطاعت واجب ہے...... اس لئے خاوند سے کہا گیا ہے کہ تو عورت سے لطف و کرم کا معاملہ کر۔ عورت کو کہا گیا ہے کہ تو اپنے خاوند کے سامنے انتہائی اطاعت سے پیش آ۔ حدیث میں ہے اگر خاوند کسی کام کا حکم دے۔ اور عورت نہ مانے، تو جس دن اور رات میں اس نے حکم نہیں مانا، اس دن اور رات میں تمام ملائکہ اس عورت کے اوپر لعنت کرتے ہیں، کہ تو نے خاوند کی نافرمانی کی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اگر میں غیر اللہ کے لئے کسی کو سجدہ کا حکم دیتا تو بیویوں کو حکم دیتا کہ

اپنے خاوندوں کو سجدہ کیا کرو۔ بیوی کے مقابلے میں اتنا واجب الاحترام شریعت اسلام نے خاوند کو بتایا، کہ اگر غیر اللہ کے لئے سجدہ حرام نہ ہوتا تو سجدے کرنے کی اجازت دے دیتا، اس حد تک کے لئے میں تیار ہو جاتا۔ معلوم ہوا، بیوی کے اوپر اطاعت لازم ہے۔ ①

گویا یوں سمجھو، کہ ایک تو رب حقیقی ہے، جو اللہ رب العزت ہے۔ عورت کے حق میں اس کا خاوند رب مجازی ہے، جو اس کی پال پرورش کرتا ہے محنت کر کے کماتا ہے۔ بیوی کے ہاتھ پہ لا کے دیتا ہے، تو اس کے حق میں گویا وہ ایک مجازی طور پر رب ہے۔ اس واسطے عورت کا فرض ہے کہ وہ اپنے اس خاوند کی جو رب مجازی ہے اور اللہ کا سایہ ہے اس کی اطاعت کرے۔

اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ جب نکاح ہو گیا تو ظاہر بات ہے عورت پر ماں باپ کا تو کوئی حق باقی نہیں رہا۔ سوائے اس کے کہ تعظیم و توقیر کرے۔ لیکن یہ کہ خاوند کے مقابلے میں ماں باپ کوئی امر یا حکم دیں، اس کا کوئی حق باقی نہیں رہا۔ جب عورت اپنے ماں باپ کے گھر سے آ گئی، وہ گھر اس سے منقطع ہو گیا۔ ماں باپ کے حقوق ختم ہو گئے۔ اب تو وہ خاوند کے رحم و کرم پر ہے۔ اگر یہ اطاعت کرے گی، وہ رحم کرے گا۔ تو اسی کا گھر بنے گا۔ اور اگر اس نے لڑائی جھگڑا اٹھا لیا، اور اس نے سختی کی۔ ماں باپ کا تو گھر رہا نہیں کہ وہاں جا کے پناہ پکڑے، خاوند کو الگ ناراض کر دیا۔ نہ ادھر کی رہی نہ ادھر کی رہی۔ تو دانش مندی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ خاوند کی اطاعت کرے۔ نافرمانی کرنے میں نہ اس گھر کی رہے گی نہ ماں باپ کے گھر کی رہے گی۔ تو ادھر سے عورت کو یہ حکم دیا کہ انتہائی اطاعت کر۔ انتہائی مدارات کر اور اگر تو نہیں کرے گی تو ملائکہ علیہم السلام تجھ پر لعنت کریں گے۔ ادھر خاوند کو کہا کہ انتہائی شفقت کر لطف و کرم کا برتاؤ کر تو نے اگر ذرا کمی کی تو تیری گردن قیامت میں نپے گی کہ تجھے ہم نے بادشاہ بنایا تھا، تو نے اپنی رعیت کے ساتھ ظلم کیوں کیا؟ عورت تیرے عیال میں تھی، تیری زیر تربیت تھی۔ تجھے اس کے اوپر سختی کا کیا حق تھا؟

پھر یہ کہ عورت تجھے باندی بنا کے تھوڑا ہی دی گئی ہے کہ تیری محکوم ملازمہ ہے وہ تو برابر کی شریک زندگی ہے۔ جو تیرا حق ہے، وہی اس کا حق ہے۔ کوئی باندی ملازمہ اور نوکر نہیں ہے۔ تجھے کیا حق ہے کہ اسے حقیر سمجھے یا کم مرتبہ سمجھے؟ تو مرد کو کہا گیا کہ تو اس کی انتہائی توقیر کر۔ انتہائی محبت کر۔ عورت کو کہا تو انتہائی اطاعت کر۔ جب ادھر سے اطاعت، ادھر سے شفقت ہوگی۔ تو گھریلو زندگی کی گاڑی اچھی طرح چلے گی۔ اگر ادھر سے اطاعت، ادھر سے شفقت نہ ہو، تو گھر کی گاڑی نہیں چل سکتی۔ گھر تباہ ہو جاتا ہے اولاد ہوئی تو وہ بھی تباہ ہو جاتی ہے۔ رشتہ دار اور ماں باپ الگ پریشان ہوتے ہیں۔ اس واسطے فرمایا گیا ہے کہ دونوں مل کر اس گھر کو چلاؤ۔ جیسے بیل گاڑی ہوتی ہے۔ دو بیل آگے جڑے ہوتے ہیں تو بیل گاڑی چلتی ہے۔ اگر ایک کندھا ڈال دے، گاڑی آگے نہیں چلے گی تو

---

① السنن لابی داؤد، کتاب النکاح باب فی حق الزوج علی المرأة، ج: ۶ ص: ۳۲.

گھر کی گاڑی نہیں چل سکتی جب تک خاوند بیوی محبت سے مدارات سے نہ چلیں۔اسی واسطے جگہ جگہ تاکید کی گئی۔
کم خرچ نکاح میں برکت دی جاتی ہے.....مگر اس میں ایک بات یاد رکھنے کی ہے۔وہ یہ کہ یہ چیز جب ہوگی جب نکاح میں برکت ہو،اگر نکاح میں خدانخواستہ برکت نہ ہوئی، پھر برے آثار پڑتے ہیں۔اور نکاح میں برکت کب ہوتی ہے؟ فرمایا گیا جس نکاح میں خرچ کم ہوگا اس میں برکت زیادہ ہوگی۔جس نکاح میں خرچ زیادہ ہوگا، برکت اٹھالی جائے گی۔اس لئے کہ خرچ عموماً فخر و مباہات کی وجہ سے زیادہ ہوتا ہے کہ برادری میں ناک نہ کٹ جائے۔ہم ذرا اونچے سمجھے جائیں۔اس لئے آدمی حیثیت سے بڑھ کر خرچ زیادہ کرتا ہے۔اور یہ غلطی ہے۔اس لئے کہ جسے برادری کہتے ہیں، وہ ہر صورت میں ناک کاٹنے ہی کے فکر میں رہتی ہے۔کتنا ہی خرچ کرلے، آدمی کی ناک نہیں رہتی۔اس لئے کہ بھائی برادر اس فکر میں رہتے ہیں کہ ذرا سی کمزوری ملے، اسے ہی اچھالتے ہیں۔تو جسے ناک کہیں، وہ پھر بھی نہیں رہتی۔تو مایہ بھی کھوئی، اور ناک بھی کٹوائی، فائدہ کیا ملا؟
وہ کسی ساہوکار نے اپنی بیٹی بیاہی، تو اس نے یہ سوچا کہ میں اتنا خرچ کروں کہ دنیا میں آج تک کسی نے نہ کیا ہو۔تاکہ دنیا میں میرا نام ہو جائے۔تو اس نے ایک ہزار آدمی کی تو بارات بلائی۔اور خدا جانے پچیس چالیس قسم کے کھانے پکوائے۔تمام کمرہ کھانوں سے بھر گیا اور ہر ہر مہمان کے لئے کہیں بستر کہیں تکیے غرض سامان کی انتہا کردی اور چلتے ہوئے فی مہمان دس دس گنیاں بھی دیں۔دس دس پونڈ بھی پیش کئے جواب تک کسی نے نہیں دیے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ میرا نام ہو جائے کہ بھائی ساہوکار نے بڑی شادی کی۔یہ سب کچھ کرکرا کے جب بارات رخصت ہوئی۔لاکھوں روپے کا سامان بھی اپنی لڑکی کو دیا۔تو ساہوکار ذرا میل بھر آگے چلا گیا کہ کسی جھاڑی میں چھپ کر بیٹھوں۔تاکہ میری تعریف کرتے ہوئے لوگ جاویں گے، کہ بھائی لالہ جی نے بڑا کام کیا۔اور ساہوکار نے بڑا جہیز دیا۔تو ذرا دل میرا بڑھے گا۔اس واسطے بارات کو رخصت کرکے، گھوڑے پر سوار ہوکر، دوسرے راستے سے میل بھر آگے جاکے آپ جھاڑی میں جاکر بیٹھ رہے، جہاں سے بارات گذر رہی تھی۔کہ لوگ جب تعریفیں کرتے ہوئے گذریں گے، میرا دل خوش ہوگا، اور میری محنت وصول ہو جائے گی۔میں نے اپنا گھر کھویا ہے۔گھر تو کھویا گیا، دل تو نہ کھویا جائے۔جب وہاں بارات پہنچی۔اتفاق سے وہاں زمین ناہموار تھی۔اونچ نیچ تھی۔مٹی بہت جمع ہوگئی تھی۔اندیشہ تھا کہ اگر گاڑیاں گزریں، تو الٹ جائیں گی اور لوگ گریں گے۔تو یہ ارادہ کیا گیا کہ بھئی پہلے مٹی درست کرلو۔یہ جو مٹی جمع ہوگئی۔اسے کھود کر ایک طرف پھینک دو۔تو پھاوڑے کی تلاش ہوئی جس سے مٹی کھودا کرتے ہیں۔اتفاق سے پھاوڑا کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔اب کسی کو کیا خبر تھی کہ ہمیں راستہ میں سڑک بھی بنانی پڑے گی جو پھاوڑا رکھتے، کسی نے بھی نہیں رکھا۔لوگوں نے کہا، بھئی! تلاش کرو جہیز میں ہوگا، سارے جہیز میں تلاش کیا، پھاوڑا نہ ملا۔ساروں نے کہا۔سسرے نے دیا ہی کیا، پھاوڑا تک تو دیا ہی نہیں۔بس ساہوکار اٹھے کہ، لعنت اس بارات کے اوپر، لعنت اس خرچ کے اوپر، سارا گھر کھو دیا، اور اب بھی میں سسرا ہی بنا رہا۔اور یہ کہ" کیا

دیا سسرے نے، بچاؤ، ابھی تو دیا ہی نہیں“۔

اور جو کچھ دیا تھا، وہ سب اکارت۔ تو جسے ناک کہتے ہیں۔ ناک رہ جانا، برادری والے کسی کی ناک نہیں رہنے دیتے۔ وہ ناک کاٹ کے ہی رہتے ہیں۔ پھر آدمی بے وجہ فضول اپنا گھر بھی تباہ کرے، ناک بھی کٹوائے؟ موقع سے اعتدال کا جو درجہ ہے، اس کے مطابق خرچ کردے۔ بیٹی کو دینا ہے، ساری عمر دے سکتا ہے۔ یہ کیا ضروری کہ آج ہی دے۔ آج جو دے رہا ہے وہ محض نام آوری کے لئے دے رہا ہے۔ بیٹی پیش نظر نہیں ہوتی۔ ناک پیش نظر ہوتی ہے۔ شریعت یہ کہتی اگر کچھ دوتو بیٹی کو دو۔ ناک کو کچھ مت دو۔ یہ رہنے والی نہیں، یہ تو کٹ جاتی ہے۔ بیٹی کو دے، تو ساری عمر دے سکتا ہے۔ مگر وہ بھی اعتدال کے ساتھ دے۔ اس لئے کہ اگر ایک ہی بیٹی ہے، چلو بہت سارے دیا۔ لیکن اگر اور بھی بیٹی ہے، تو اور اولاد کا بھی حق ہے۔ اب نام آوری کے لئے سارا گھر ایک کے اوپر خرچ کر دیا کل کو جب دوسری شادی ہوگی، اور ہاتھ پلے کچھ نہیں ہوگا۔ لوگ یہی کہیں گے کہ بڑا بے وقوف آدمی تھا۔ پہلی پہ تو اتنا خرچ کر دیا۔ دوسری اولاد کیا سوتیلی تھی، حقیقی نہیں تھی؟ اس کے لئے کچھ بھی نہ کیا۔ جب ناک نہیں کٹی تھی۔ تو اب کٹ جائے گی۔ اس واسطے آدمی مال خرچ کرنے میں اعتدال سے کام لے۔ حدیث میں فرمایا گیا: اس نکاح میں برکت دی جاتی ہے، جس میں خرچ کم ہو۔ اور جس میں خرچ زیادہ ہوتا ہے، اس سے برکت اٹھالی جاتی ہے، یا کم کردی جاتی ہے۔

معاملات میں سب سے زیادہ آسان نکاح ہے...... اس کی بنا یہی ہے کہ وہ زیادہ خرچ مفاخرت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ نام آوری یا نمود کی وجہ سے۔ یہی خراب کرنے والی چیز ہے۔ ورنہ نکاح کو اللہ نے سب سے زیادہ آسان بنایا ہے جسے ہم نے سب سے زیادہ مشکل بنا رکھا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نکاح ایسی سادہ چیز تھی کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جو جلیل القدر صحابی ہیں۔ اور ایسے جلیل القدر صحابی ہیں کہ بعض اوقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں جاتے تو اپنا نائب بنا کر جاتے تھے۔ اتنے بڑے لوگوں میں ہیں۔ اور جنت کی بشارت جن دس لوگوں کو دی گئی ہے، ان میں عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ شامل ہیں۔ تو دنیا ہی میں جنتی ہیں۔ اتنے جلیل القدر ہیں۔ ایک دن مجلس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے تو کپڑے اور چہرے پر زرد دھبے تھے۔ فرمایا، عبدالرحمٰن! یہ کیا بات ہے؟

عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے نکاح کیا ہے۔ اس زمانے میں جب نکاح ہوتا تھا تو ایک خاص قسم کا عطر ہوتا ہے، جو زعفران سے بنتا تھا۔ اس کو لگاتے تھے تو کپڑے پر کوئی دھبہ بھی آجاتا تھا۔ جیسے بعض عطر مخصوص ہوتے ہیں۔ جو نکاح ہی کے دن لگائے جاتے ہیں، جیسے لڑکی کو نخ جلا کر بسایا جاتا ہے۔ نخ یہ چھوٹے چھوٹے چوپارے سے ہوتے ہیں، ان کو جب جلاتے ہیں تو خوشبو مہکتی ہے کپڑوں میں وہ خوشبو لگاتے ہیں تو کپڑے مہک اٹھتے ہیں۔ اس کو نخ بسانا کہتے ہیں۔ وہ شادی ہی کے دن لگائی جاتی ہے۔ ویسے اس کو کوئی نہیں لگاتا۔ ایسا ہوتا ہے، رواج کی بات ہے۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ زرد رنگ کیسا؟ عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نے نکاح کیا ہے اور نکاح کے دن خوشبو لگائی۔ فرمایا: کنواری سے نکاح کیا ہے یا بیوہ سے؟۔ عرض کیا۔ یا رسول اللہ! بیوہ سے۔ فرمایا کیوں؟ عرض کیا، یا رسول اللہ! پہلی بیوی مرگئی تھی، اس کی کچھ اولاد تھی۔ کنواری سے کرتا تو پال نہ سکتی۔ بیوہ بیچاری خدمت کر دے گی۔ اولاد کو پال دے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا دی۔ ①

آپ نے دیکھا کہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عاشق کون ہوسکتا تھا۔ صحابی بھی جلیل القدر ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر محبوب کون ہوسکتا تھا؟ ان کی دنیا اور آخرت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے اندر پوشیدہ ہے۔ ایمان نام ہی محبت کا ہے۔ تو عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ عاشق صادق، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم محبوبِ کامل۔ نکاح کرتے ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بلاتے۔ یہاں نکاح ہوتا ہے کہ جب تک تو ٹیں نہ پھرے، جب تک برادری اور کنبے کے سرنہ جمع ہوں، یہ ناک کی مصیبت ہے کہ کہیں یہ نہ کٹ جائے۔ چاہے گھر میں کچھ ہو یا نہ ہو، لیکن ناک کی وجہ سے جمع کریں گے۔ اور وہاں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک کو دعوت نہیں دی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی برا نہیں مانا۔ یہ نہیں فرمایا بھئی! ہمیں تو تم نے بلایا ہی نہیں۔ نہ کوئی شکایت کی معلوم ہوا نکاح جیسی سادہ چیز اسلام میں کوئی نہیں تھی، کہ نکاح کریں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک کو خبر نہ ہو۔ معلوم ہوا گھر میں بیٹھ کر کرلیا۔ اتنی سادہ چیز تھی۔

نکاح میں معمولی دو خرچ ہیں..... نکاح کے بڑے اخراجات دو ہی ہیں۔ ایک مہر کا خرچ ہے۔ ایک ولیمہ کا خرچ ہے۔ خاوند کے ذمہ یہی ہے کہ ولیمہ کرے اور مہر ادا کرے۔ یہ اتنے آسان بنا دیئے کہ ولیمے کے بارے میں فرمایا: "اَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاةٍ" ② اگر کچھ بھی نہ ہو، تو ایک بکری ذبح کر کے کھانا کھلا دو۔ بکری بھی نہ ہو۔ جو ہاتھ چلے ہے، وہی کھلا دو۔

اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی ہوگئی گھر میں کچھ تھا نہیں کہ ولیمہ کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوئے تھے کہ کیا کھلاؤں گھر میں تو فقر و فاقہ ہے۔ اسی وقت ایک شخص ہدیہ میں کچھ کھجوریں لے کر آیا، اور ایک مٹکا لے کر آیا آپ نے گٹھلیاں نکلوا کے مٹکے میں ملوا کے چمڑے کے دسترخوان پہ ڈال دیا۔ حاضرین سے فرمایا: کھاؤ، یہ ہمارا ولیمہ ہے۔ ③ تو بکری نہیں لانی پڑی، جو پاس تھا کھلا دیا۔ بس ولیمہ ہوگیا ایک خرچ نکاح میں یہ تھا۔ یہ اتنا سادہ، اور ایک مہر کا خرچ ہے۔ تو فرمایا گیا: دس درہم بھی! اگر کسی کے پاس ہوں، نکاح ہو جائے

---

① الصحیح للبخاری، کتاب النکاح، باب الصفرة للمتزوج، ج: ۱۶ ص: ۱۲۷۔

② الصحیح للبخاری، کتاب النکاح، باب الصفرة للمتزوج، ج: ۱۶ ص: ۱۲۷۔

③ المعجم الکبیر للطبرانی، ذکر ازواج رسول اللہ ﷺ، صفیة بنت حیی... ج: ۲۴ ص: ۶۷۔ علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواه الطبرانی وفیه النهاس بن قهم وهو ضعیف مجمع علیه، دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۹ ص: ۲۵۱۔

گا۔دس درہم کی ہندوستانی قیمت اڑھائی روپے بنتی ہے۔تو اڑھائی روپے میں نکاح شرعی ہوسکتا ہے۔
نکاح میں زیادہ خرچ کا نتیجہ...... یہ جو آدمی اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ کرتا ہے۔تو نکاح تو ہو جاتا ہے۔ تھوڑی بہت واہ واہ بھی ہو جاتی ہے۔مگر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ گھر برباد ہو جاتا ہے۔

ہمارے ہی عزیزوں میں سے تھے شیخ ظفر حسین صاحب مرحوم بہت بڑے رئیس تھے،ان کی حویلی آج بھی دیو بند میں کھڑی ہے،یوں معلوم ہوتی ہے کہ شاہی قلعہ ہے۔ہاتھی کے گھسنے کا دروازہ اور بڑی بڑی چیزیں۔انہوں نے اپنے بڑے بیٹے کا نکاح کیا۔تو ولیمہ جو کیا ہے،وہ فقط سارے دیو بند کا نہیں بلکہ دیو بند کے ارد گرد جتنے دیہات تھے،سب کو مدعو کیا۔ہزاروں دیہات والے۔پھر ایک وقت کا نہیں،بلکہ ایک ہفتے تک دعوت کی۔پورے سات دن یعنی چودہ وقت کا کھانا کھلا دیا۔

اور یہ بھی اعلان تھا کہ دیہاتیوں کو آنے میں زحمت ہوگی،کوئی دس میل سے آئے گا کوئی بیس میل سے۔تو کھانے پک پک کے بہلیوں پر گاؤں گاؤں پہنچے۔اور گھر گھر تقسیم ہوئے۔ایک ہفتے تک کھانے پہنچتے رہے،بڑا نام ہو گیا،دنیا میں ایسا ولیمہ کسی نے نہیں کیا ہوگا۔دنیا ایک وقت کا ولیمہ کرتی ہے،انہوں نے چودہ وقت کھلا دیا۔مگر نتیجہ یہ نکلا کہ نکاح تو ہو گیا،لیکن آج اگر جا کے دیکھا جائے ان کی اولاد کا گزر بھیک کے ٹکڑوں پر ہے (اَلْعِیَاذُ بِاللّٰہِ) کسی نے خدا واسطے دے دیا،کھانا کھالیا،نہیں تو نہیں۔ایسی شادی سے فائدہ کیا؟ یہ خانہ آبادی نہیں یہ تو خانہ بربادی ہے۔
نکاح میں پاک ثمرات کب ظاہر ہوتے ہیں...... میں اس پہ عرض کر رہا تھا کہ پاک ثمرے جب ظاہر ہوتے ہیں جب نکاح میں برکت ہو۔اور برکت جب ہوتی ہے،جب نکاح میں خرچ کم ہو۔اس لئے جو رائج الوقت مہر ہو اس کو باندھ دو۔کوئی خاص مہر تلاش کرنا،یا جہیز کے سلسلے میں بہت زیادہ حدود سے گزر کر خرچ کرنا،یہ سب غلط چیزیں ہیں۔مسلمانوں کی جائدادیں اس میں تباہ ہوئی ہیں۔یا شادی کی رسوم میں،یا غمی کی رسوم میں۔مرنے والا مرتا ہے،وہ تو گیا۔اس کے بعد اب برادری کے کھانے ہو رہے ہیں۔چالیس دن کا الگ ہو رہا ہے۔دس دن کا الگ ہو رہا ہے۔برسی الگ ہو رہی ہے،اور چہلم الگ ہو رہا ہے۔نہیں ہوتا تو قرض لے لے کر کرتے ہیں۔تو مسلمانوں کی جائیدادیں برباد ہوئی ہیں۔حکومتیں چھن گئیں۔شادی کی رسموں میں،یا غمی کی رسموں میں رسوم کی وجہ سے مسلمان تباہ ہوئے۔اور اب تک بھی ہوش نہیں آتا،اسی میں مبتلا ہیں۔

بہر حال میں نے اس لئے عرض کیا کہ نکاح کی غرض وغایت باہمی سکون ومودت ہے۔مودت ومحبت کا اثر جب پڑتا ہے۔جب نکاح بابرکت ہو۔بابرکت جب بنتا ہے۔جب اخراجات میں کمی کی جائے۔نام ونمود اور شہرت کے جذبات سے خالی ہو۔فرض کی ادائیگی پیش نظر ہو کہ اولاد کا فرض ہے،اللہ کا حکم ہے،اس کو ادا کر رہے ہیں۔اس میں دین پیش نظر ہو۔خاوند کے پیش نظر بھی یہ ہو کہ لڑکی سے اس کے دین کی وجہ سے نکاح کر رہا ہوں۔ وہ خوب صورت ہو یا بدصورت اس کے ساتھ دین کی وجہ سے معاملہ کروں گا۔میرے ذمہ تو حق ہے۔مرتے دم تک

مجھے ادا کرنا ہے۔ وہ مالدار ہو یا بے مال ہو۔ میرے ذمے اس کا حق ادا کرنا ہے۔ جب اللہ نے میرے حصے میں لگا دیا ہے، مجھے حقوق کی ادائیگی پیشِ نظر ہے۔ جب اللہ نے حکم دیا کہ محبت سے برتاؤ کرو، میرا فرض ہوگا کہ میں اپنی بیوی کا دل مٹھی میں رکھوں اس کی مدارت کروں اسکے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤں۔ اس میں پھر ایسی برکت ہوگی کہ اولاد میں برکت ہوگی، گھر بار میں برکت ہوگی، معاملات میں بھی برکت ہوگی۔

ادھر عورت کا یہ فرض ہے وہ یوں سمجھے کہ خاوند کا حق مجھ پر عائد کر دیا گیا۔ یہ خوبصورت ہو یا بدصورت۔ میرا فرض ہے اس کا حق ادا کرنا۔ میرے لئے وہ رب مجازی بنایا گیا ہے۔ یہ انتہائی بدصورت سہی، مگر میرے لئے تو سرتاج ہے۔ میرا فرض ہوگا میں اس کے حقوق ادا کروں گی۔ یہ جذبات ہوں گے تو حقوق کی ادائیگی مرتے دم تک ہوگی۔ گھر جنت بن جائے گا۔ عارضی چیزوں پر مدار ہوگا۔ دولت، عزت، حیثیت، یہ آنی جانی چیزیں ہیں۔ آتی بھی ہیں، جاتی بھی ہیں، ان پر اگر مدار رکھ دیا، محبت بھی عارضی ہوگی۔ چند دن کے بعد ختم ہو جائے گی۔ تو مقصود اصلی اور غرض و غایت نکاح کی یہ ہے: ﴿ لِتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ﴾ [1] اس لئے تم میں سے تمہارا جوڑا پیدا کیا۔ تم میں انس، سکون ہو۔ تم ایک دوسرے کے ساتھ محبت و مودت کا برتاؤ کرو۔ اگر تم غور و فکر کرو تو یہ اللہ کی بڑی قدرت کی نشانی ہے۔

نکاح کے احکام...... نکاح کی یہ غرض و غایت رکھی گئی۔ اس غرض و غایت کے تحت احکام وہ رکھے گئے جن سے میل ملاپ پیدا ہو۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ خاوند بیوی میں جھڑپ بھی ہو جاتی ہے۔ فرشتے تو ہیں نہیں، انسان ہی تو ہیں۔ اس کا مضائقہ نہیں۔ بعض دفعہ خاوند ناخوش ہو جاتا ہے۔ ڈانٹ ڈپٹ کر دیتا ہے۔ بعض دفعہ بیوی بھی ناخوش ہو جاتی ہے، اسے بھی ناز ہوتا ہے۔ وہ بھی خاوند کو چار باتیں کہہ دیتی ہے۔ ایسا بھی گھروں میں ہوتا ہے۔ جب وہ بشر ہیں، تو ہوگا اس میں ہدایت یہ کی گئی ہے کہ اگر ایسا ہو تو حکمت سے کام لے۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا: یہ عورت جو ہے، یہ بائیں پسلی کی پیدائش ہے۔ بائیں بھی پسلی آدم علیہ السلام کی نیچے والی۔ جو زیادہ ٹیڑھی ہوتی ہے، اس سے پیدا ہوئی۔ اس کے مزاج میں ٹیڑھ ہے اور تھوڑی سے کجی ہے۔ فرمایا نہ اسے بالکل ویسے ہی چھوڑ دو، ورنہ اور ٹیڑھی بنے گی اور نہ بالکل سیدھی کرنے کی فکر میں رہو، ورنہ ٹوٹ جائے گی۔ تو نہ بالکل سیدھی کرو، نہ ویسے ہی چھوڑ دو۔ کچھ نرمی، کچھ گرمی، کچھ مدارات، کچھ ڈانٹ ڈپٹ، کچھ سمجھانا بجھانا، دونوں چیزیں ہونی چاہئیں۔

درشتی و نرمی بہم در بہ است

فرمایا گیا نہ بالکل ویسے آزاد چھوڑ دو، زیادہ ٹیڑھی ہو جائے گی۔ نہ اتنی سختی کرو کہ وہ بالکل ٹوٹ جائے۔ اعتدال کا معاملہ رکھو۔

---

[1] پارہ: ۲۱ سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۱.

اس واسطے قرآن حکیم میں اس کی ہدایت کی گئی۔ برداشت اور صبر کے برتاؤ کا حکم دیا گیا فرمایا گیا:
﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ﴾ ① نیک بیویاں کون ہیں؟ نیک ازواج کون ہیں؟ جو صالحات ہیں۔ وہ اللہ کی عبادت گزار بندیاں ہیں۔ جو اپنے نماز روزے، دین و دیانت کی پابند ہیں۔ وہی صالح بن سکتی ہیں۔ چکنی چپڑی باتیں کرنے والی صالح نہیں ہوتیں۔ حق ادا کرنے والی صالح ہوتی ہیں۔ ''حٰفِظٰتٌ'' جو غیب کی حفاظت کریں۔ غیب سے مراد خاوند کے راز اور اسرار ہیں وہ کسی پہ ظاہر نہیں کرتیں۔

خاوند کی ناقدری کا انجام...... بعض عورتوں کی عادت ہوتی ہے۔ کسی محفل میں بیٹھیں۔ اس نے کہا تیرا خاوند کیسا برا، اس نے کہا تیرا ایسا برا۔ رات دن اسی لعن طعن میں مبتلا ہیں۔ اگر اس (تقریر) میں میری بہنیں بھی شریک ہوں، جو سن رہی ہوں۔ وہ بھی کان کھول کر سن لیں۔ جہاں میں نے ان کے لئے یہ کہا ہے کہ خاوند کا فرض ہے ان کی مدارات کرے۔ حقوق ادا کرے۔ یہ کرے وہ کرے۔ کچھ ان کے ذمے بھی حقوق ہیں۔ کچھ ان میں بھی کجی اور ٹیڑھ ہے۔ وہ اپنی اصلاح و حفاظت کریں۔

حدیث میں ہے کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے دن عورتوں میں وعظ فرمایا۔ عورتیں ایک طرف تھیں، مرد ایک طرف تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور عورتوں کے گروہ میں وعظ فرمایا: ''تَصَدَّقْنَ يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ فَإِنِّيْ أُرِيْتُكُنَّ أَكْثَرَ أَهْلِ النَّارِ'' ② اے عورتوں کے گروہ! صدقہ کثرت سے دیا کرو۔ اس لئے کہ جہنم میں کثرت سے عورتوں کو دیکھتا ہوں صدقہ دوگی تو بلیات رد ہوں گی۔ حدیث میں ہے: ''اَلصَّدَقَةُ تُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ كَمَا يُطْفِئُ الْمَآءُ النَّارَ'' ③

صدقہ اس طرح سے اللہ کے غضب کو بجھا دیتا ہے، جس طرح پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ تو فرمایا صدقہ کثرت سے کیا کرو۔ اس لئے کہ عورتوں کو جہنم میں میں کثرت سے دیکھتا ہوں۔ حدیث میں ہے: ایک عورت کھڑی ہوئی، اس کا حلیہ بھی آتا ہے۔ کالے رنگ کی تھی۔ موٹے موٹے ہونٹ تھے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کوئی حبشی ہوگی۔ کہنے لگی: ''وَبِمَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟'' یا رسول اللہ! آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم ہی جہنم میں زیادہ ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں بھی ہم ہی چولہا جھونکیں۔ یہاں بھی آگ وہاں بھی آگ۔ دونوں جگہ آخر ہماری کیا مصیبت آئی۔ ایسا آخر کیوں ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وجہ ارشاد فرمائی۔ وہ میری بہنوں کے سننے کی ہے اور اس کو پلے باندھ لیں۔ اس لئے کہ انہوں نے یا مردوں نے مجھے اس کرسی پر بٹھلایا ہے یہ کرسی معالج کی ہے، جو دلوں کا علاج کرتا ہے۔ معالج چن چن کر امراض سامنے رکھ دے کہ یہ کھوٹ ہے، یہ بیماری ہے۔ تاکہ علاج کر سکیں۔ وہ طبیب بہت خائن

---

① پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۳۴. ② الصحیح للبخاری، کتاب الحیض، باب ترک الحائض الصوم، ج: ۲ ص: ۳.
③ الصحیح لابن حبان، ج: ۱۴ ص: ۱۲۱. حدیث صحیح ہے دیکھئے: السلسلۃ الصحیحۃ ج: ۳ ص: ۲۷ رقم: ۱۹۰۸.

ہوگا کہ وہ تعریف کے کلمات کہہ جائے، اور کھوٹ کو ظاہر نہ کرے۔ وہ حکیم نہیں وہ علاج نہیں کر سکتا۔ اس واسطے اگر میری بہنیں یہاں ہوں تو برا نہ مانیں۔ بہرحال جو اصلی بات ہے وہ کہہ دوں تاکہ علاج کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ اور یہ میں تھوڑا ہی کہہ رہا ہوں۔ یہ تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ میں نقل کر رہا ہوں۔ اس واسطے میرے سے برا ماننے کی ضرورت نہیں۔ میں تو ناقل ہوں، حکم شرعی جو ہے وہ پہنچا دیا۔ اب تم برا مانو یا بھلا، تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس عورت نے کہا "وَبِمَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ؟" آخر ہم ہی کیوں آگ میں ہیں۔ یہاں بھی وہاں بھی۔ یہ ہماری قسمت میں ہی کیوں آگ رہ گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دو وجہیں ارشاد فرمائیں۔

"تُکْثِرْنَ اللَّعْنَ وَتَکْفُرْنَ الْعَشِیْرَ" تم میں دو بیماریاں اور دو روگ ہیں۔ ایک "تُکْثِرْنَ اللَّعْنَ" لعن کی تم میں کثرت ہے۔ جس مجلس میں عورتیں بیٹھیں گی لعن لعن نام رکھنا، تیرا زیور بہت برا، میرا زیور بہت اچھا۔ اس کی صورت اچھی نہیں، میری صورت اچھی، اس کا لباس خراب، میرا لباس اچھا۔ دنیا بھر کی بات اگر مجلس میں ہے تو وہ یہ فلانی بری اور میں اچھی صورت بھی میری اچھی، حیثیت سے بے خبر ہو۔ جاہل کا کام دوسرے کو طعن دینا ہے کیونکہ ان میں جہالت زیادہ ہوتی ہے، اس واسطے دوسرے کو طعنے دیتی رہتی ہیں۔ اگر اپنے عیب پیشِ نظر ہوں۔ دوسرے کو طعن دینے کی کبھی جرات نہیں ہو سکتی۔ اس کی بنا یہ ہے کہ اپنی چیز پیشِ نظر ہوتی ہے۔ دوسرے کی ہوتی نہیں اپنی برائی سامنے ہے نہیں بس دوسروں کی برائی نظر آتی ہے۔ آنکھوں کے سامنے آئینہ ہے تو صورت تو اچھی نظر آ رہی ہے اور دل کا آئینہ ہے نہیں کہ یہ دیکھے دل میں کیا کارگزاری ہے۔ اس واسطے فرمایا کہ ایک بات تم میں یہ ہے کہ تم کثرت سے لعن طعن کرتی ہو۔ ایک مرض تو تم میں یہ ہے۔ اور فرمایا "وَتَکْفُرْنَ الْعَشِیْرَ" دوسرے یہ کہ خاوندوں کی ناقدری اور کفرانِ نعمت یہ بھی تمہارے اندر زیادہ ہے۔ یہ میں نہیں کہتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں، میں تو اسے نقل کر رہا ہوں، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، ایک خاوند عمر بھر سلوک کرے، جب وہ زیور مانگے، تو زیور بھی لا کے دے اور جب خاوند کے ساتھ اس کی لڑائی ہوگی تو کیا کہے گی؟ مَا رَأَیْتُ مِنْکَ خَیْرًا قَطُّ میں نے تو اس اجڑے گھر میں آ کے کبھی خیر دیکھی ہی نہیں۔ مصیبت ہی میں مبتلا رہی، سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ عمر بھر جو اس نے سلوک کیا تھا وہ ایک جملے میں ختم کر دیا، کہ میں نے تو کبھی اس گھر میں خیر دیکھی ہی نہیں۔ بس ڈولے میں آئی تھی اور کھٹولی میں نکل جاؤں گی۔ بیچ میں یہی مصیبتیں میری تو قسمت میں تھیں۔ یہ ناقدری کا حال ہے۔ اب وہ خاوند غریب دیکھ رہا ہے کہ میں نے چوری کر کے، ڈکیتی ڈال کے اس کے لئے اشیاء فراہم کر دیں اور اس نے یہ قدر دانی کی کہ "مَا رَأَیْتُ مِنْکَ خَیْرًا قَطُّ" میں نے کبھی اس اجڑے گھر میں آ کے خیر دیکھی ہی نہیں، اب وہ بیچارہ جواب دے تو کیا دے۔ اپنا سا منہ لے کر چپکے سے آ جاتا ہے۔ یا تو خفا ہو، پھر لڑائی ٹھنتی ہے۔ سوائے اس کے کہ صبر کرے کہ اس عورت سے کون لڑے۔ غریب آ جاتا ہے۔ ①

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب کفران العشیر و کفر دون کفر، ج: ۱ ص: ۵۰۔

ہمارے مولانا عبدالرب صاحب مرحوم تھے۔ انہوں نے عورتوں کی ذہنیت نمایاں کرنے کے لئے بڑی مثل بات کہی۔ کہنے لگے اگر خاوندان سے پوچھے گھر میں تمہارے پاس کچھ ہیں کپڑے؟ تو کہیں گی، آئے تھے کپڑے وہ چار چیتھڑے پڑے ہوئے ہیں، کون سا میرے لئے لباس بنایا تھا؟ اور اگر کہے کہ تمہارے پاس جوتا بھی ہے؟ تو کہیں گی۔ آئے تھے جوتے، وہ دو لیتھڑے پڑے ہوئے ہیں۔ لا کے دیئے تھے تم نے جوتے اور پوچھے کہ بھئی برتن بھی ہیں گھر میں؟ دھرے تھے برتن، وہی چار ٹھیکرے پڑے ہوئے ہیں۔ خود باپ کے گھر سے لے آئی تھی، وہ کام آ رہے ہیں، ورنہ تم نے کون سے لائے دیئے تھے۔ غریب کے سارے کئے کرائے پہ پانی پھیر دیا۔ اس نے محنت کی، عمر بھر کما کما کے دیا۔ یہ اس کی قدر نکلی کہ چار چیتھڑے ملے، دو لیتھڑے ملے، اور چار ٹھیکرے ملے، یہ اس کی قدر دانی ہوئی خاوندوں کی ناقدری کرنا تمہارا شیوہ ہے۔

اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اتنی ناقدری کرتی ہیں کہ عمر بھر کے احسان کا بدلہ دو لفظ میں چکا دیتی ہیں۔ فرمایا: یہ وجہ ہے کہ جہنم میں کثرت سے جاؤ گی۔ اس کا علاج بتایا کہ صدقہ کثرت سے دو۔ تاکہ غضب خداوندی بجھے۔ اس لئے کہ لعن طعن کرنے سے اللہ کا غصہ بھڑکتا ہے۔ کفران نعمت سے اللہ کا غضب بڑھتا ہے۔ صدقہ دو گی، یہ غضب ٹھنڈا ہو جائے گا۔ جتنی غریبوں کی خبر گیری صدقات خیرات سے کرو گی۔ تو اس برائی کی تلافی ہو جائے گی، جو تمہارے اندر ہے۔ تب جا کے اس عورت کو بات ذرا تسلیم ہوئی۔

عورت مرد کو اپنی ہدایت پر نہ چلائے ...... اور اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرما دیا کہ: ہونا تو "نَاقِصَاتُ الْعَقْلِ؟" اس پر کھڑی ہو گئی ہم میں کیا نقصان عقل ہے؟ گویا اپنے نزدیک وہ بڑی افلاطون تھی، ارسطو بنی ہوئی تھی کہ ہم سب سے زیادہ عقل مند ہیں اور بعضوں کو تو یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ مردوں میں کیا عقل رکھی۔ عقل تو ہمارے اندر ہے اور یہ ایک حد تک انہوں نے صحیح بھی کہا۔ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ "مَارَأَيْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَّدِيْنٍ اَذْهَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ إِحْدَاكُنَّ" ①

فرمایا کہ ہیں تو یہ ناقص العقل: مگر بڑے بڑے مردوں کی جو کامل العقل ہوتے ہیں، ان کی عقلیں اچک لے جاتی ہیں، اسے پاگل بنا کے چھوڑتی ہیں۔ ایسے اترچھاؤ سے بات کریں گی، اچھا خاصا عقلمند آدمی ان کے سامنے بیوقوف بن جائے گا، اور جو کہیں گی، وہ کرنا پڑے گا۔

چنانچہ ان رسوم کے بارے میں جب لوگ کہتے ہیں کہ بھئی تم عقلمند ہو، تم یہ کیا کر رہے ہو، کہ جی عورتیں نہیں مانتیں گویا عورتیں حکام ہیں۔ آرڈر وہاں سے آتا ہے۔ یہ حضرات نیاز مند اور غلام ہیں۔ تعمیل کرنا ان کا فرض ہے۔ یہ جواب دیتے ہیں۔ تو ان کا ایک حد تک دعویٰ بھی صحیح ہے کہ ہم عقل مند ہیں۔ جب عقلمند کو بے وقوف بنانے کی قدرت ہے تو اور اس سے زیادہ کیا عقل مندی ہو گی؟ مگر فرمایا کہ: ناقص العقل اور ناقص الدین۔ اس پر ایک عورت

① السنن لابن ماجه، كتاب الفتن، باب فتنة النساء، ج: ۱۲ ص: ٦.

نے عرض کیا۔ یا رسول! صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں کیا نقصان عقل ہے اور نقصان دین کیا ہے؟

فرمایا: مہینہ میں بیس دن نماز پڑھو گی، دس دن سوؤ گی تو دین سے محروم ہی رہیں؟ اور نقصان دین کیا ہوتا ہے؟ اتنے دن دین سے بالکل محروم نہ نماز نہ روزہ، اور نقصان عقل یہ ہے۔ اگر عدالت میں شہادت ہو تو دو عورتیں ایک مرد کے برابر لی جاتی ہیں۔ گویا وہ آدھے مرد کے برابر ہیں۔ تو عقل بھی آدھی رہ گئی۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا۔

اور حقیقت یہ ہے کہ عورت کی جو خلقت ہے، وہ مرد کی نسبت کمزور ہے۔ جیسے قوی ظاہری کمزور ہیں، قوئی باطنی بھی کمزور ہیں۔ (فہم اور عقل وغیرہ) مگر بھئی! یہ جنس کی بات کہہ رہا ہوں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ بعض عورتیں ایسی بڑی عقل مند گزری ہوں کہ ہزاروں مرد بھی عقل وفہم میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکے۔ وہ افراد کی بات ہے، یہ جنس کی بات ہے۔ جنس مرد کی قوی ہے۔ عورت کی جنس ضعیف ہے۔ اب اگر اتفاق سے کوئی عورت پہلوان بن جائے تو جنس اپنی جگہ رہے گی، افراد ایسے ہی نکلیں گے۔

جیسے ہمارے ہاں ہندوستان میں ایک حمیدہ بانو پہلوان ہے۔ بڑے بڑے پہلوانوں کو اس نے پچھاڑ دیا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ مجھے کوئی نہیں پچھاڑ سکتا۔ ہر لڑائی کے اندر وہی پالا جیتتی ہے۔ اب جنس تو اس کی کمزور رہے گی۔ اتفاق سے ایک عورت ایسی بھی قوی نکل آئی جنس تو ناقص العقل رہے گی۔ لیکن اتفاق سے بعض عورتیں ایسی کامل العقل بھی گزری ہیں کہ انہوں نے سلطنتیں چلائیں ہیں۔ مردوں میں وہ عقل کی قوت نہیں، جو ان کے اندر ہے، تو وہ افراد کا قصہ ہے، افراد، آ جا دانش مند بھی نکلیں، شاعر بھی نکلیں، ادیب بھی نکلیں محدث ومفسر بھی نکلیں۔ مگر جنس جو ہے اس کی عقل میں بہر حال نقصان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا: "لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمْ اِمْرَأَةً" ① وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جس نے اپنی سلطنت کے کاروبار عورت کے ہاتھ دے دیے۔ یعنی اس کی عقل پہ چھوڑ دیئے وہ لے کے سارے کنبے کو ڈوبے گی۔ اس کی جیسی عقل ہے اس کے مطابق چلے گی۔ عورت کی عقل مرد کے اعتبار سے کمزور ہوتی ہے۔ اتفاق سے کوئی اعلیٰ ترین عقل والی نکل آئے تو وہ ایک فرد کی بات ہوگی، جنس کی نہیں، بلکہ بعضوں کو، گدھوں سے بھی کم عقل ہوتی ہیں۔ بعضے ایسے بھی انسان نکلتے ہیں۔ مگر یوں نہیں کہا جائے گا کہ انسانوں کی جنس بے عقل ہے۔ مردوں کی جنس عقلمند، عورتوں کی جنس کم عقل، بعضی عورتیں بڑی عقل مند، بعضے مرد بڑے بے وقوف، یہ الگ قصہ ہے۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلا دیا کہ نقصان عقل بھی ہے، نقصان دین بھی ہے۔ اس واسطے تمہارا فرض ہے کہ مردوں کی ہدایت پر چلو۔ انہیں اپنی ہدایتوں پر مت چلاؤ۔ ورنہ وہ بھی ڈوبے گا اور پورا کنبہ بھی ڈوبے گا اگر تمہاری ہدایتوں پر چلا۔

عورت پر خاوند کیسے مہربان ہوسکتا ہے...... تو میں نے چند باتیں عرض کیں۔ ایک یہ کہ نکاح کی غرض و

① الصحیح للبخاری، کتاب المغازی، باب کتاب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الی قیصر...... ج: ۱۳، ص: ۳۳۔

غایت کیا ہے؟ وہ باہمی سکون و مودت ہے۔ نسل کی تکثیر خود بخود ہوگی۔ احکام کیا ہیں کہ مرد کے ذمے شفقت واجب ہے۔ عورت کے ذمے اطاعت واجب ہے۔ مرد کا کام یہ ہے کہ اپنی بیوی کے ساتھ لطف و کرم کا برتاؤ کرے۔ بیوی کا کام یہ ہے کہ کامل اطاعت کا برتاؤ کرے۔ اور اپنے خلاف بھی ہو تو سننے کی عادت ڈالے۔ یہ نہ ہو کہ جہاں خاوند نے مزاج کے خلاف بات کہی اور اس کی ناک چڑھی ہوئی ہے۔ ایک کیا چار جواب دینے کو تیار۔ اس سے بے مہری پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ گھر کی گاڑی جب چلتی ہے، جب عورت خاوند کی مطیع ہو اور خاوند عورت کا مطیع بن جائے، مگر مطیع کب بنے گا؟ جب عورت انتہائی محبت اور ایثار کا برتاؤ کرے گی۔ اطاعت، اطاعت کو کھینچتی ہے۔ سرکشی کرے گی تو اسے بھی نفرت پیدا ہو جائے گی۔ اگر کوئی عورت یہ چاہتی ہے کہ میرا خاوند بالکل میرے کہنے میں رہے، میرا غلام بن جائے۔ تو پہلے خود غلام اور بندھی بن جائے۔ وہ بھی مجبور ہو کے غلام بن جائے گا۔ غلام بنانا، غلام بننے سے ہوتا ہے۔ پہلے تو دعملاً بندی بن کے دکھلائے وہ خود بخود غلام بن جائے گا۔ اطاعت سے راحت ہوتی ہے؟ جتنی اس کی اطاعت کی جائے گی، وہ بھی اس کی اطاعت کرے گا۔ تو عورت کا یہ فرض ہے کہ وہ چوبیس گھنٹے اس فکر میں رہے کہ کن چیزوں سے میرا خاوند ناخوش ہوتا ہے، میں وہ بات نہ کروں اور جن چیزوں سے وہ خوش ہوتا ہے، قصداً ہی وہ چیزیں کروں کہ اس کا دل راضی ہو، جتنا راضی ہوگا، میرے اوپر مہربان بن جائے گا، میرا گھر چلے گا۔ اور مرد کا یہ فرض ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ اس کی ذہنیت کیا ہے۔ کن چیزوں سے یہ خوش ہوتی ہے۔ وہ چیزیں کرے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ اپنی عورت کو راضی کرنے کے لئے اس کی خواہشات کچھ پوری کرے۔ آخر اس کا کچھ حق بھی تو ہے۔ وہ گھر میں آتی ہے، اپنے جذبات لے کر آتی ہے۔ اگر خاوند ان جذبات کی رعایت نہیں کرے گا۔ تو کیا محلے والے رعایت کریں گے؟ یہ خاوند کا فرض ہے۔ جانبین سے جب یہ بات ہوگی تو گھر کی گاڑی عمدگی کے ساتھ چلے گی۔ پھر سکون و محبت اور باہمی مودت پیدا ہو جائے گی۔

عورت کی طرف سے نافرمانی پر تنبیہہ کے درجات...... اس میں اگر اتفاق سے کوئی ناچاقی پیش آ گئی تو جانبین کو ذرا صبر و تحمل سے کام لینا چاہئے۔ یہ نہ ہو کہ ایک دم آپے سے باہر نکل کے وہیں جنگ چھڑ جائے۔ چنانچہ قرآن کریم نے اس کے بارے میں ہدایت کی فرمایا: ﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ﴾ ①

نیک بیویاں کون ہیں؟ جو قانتات ہیں، عبادت گزار ہیں۔ اس لئے کہ جو اللہ کا حق ادا کرے گی، وہی خاوند کا حق ادا کر سکتی ہے۔ جو حق تعالیٰ کی نافرمانی کرے، وہ کسی کی مطیع نہیں بن سکتی۔ آگے فرمایا: "حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ" غیب کی حفاظت کریں، مرد کے رازوں اور اسرار کی۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے۔ کہ غیب سے مراد خاوند کا مال و دولت ہے۔ اس کی حفاظت کرے۔ یہ سمجھے کہ میں اس کی نگران ہوں۔ اگر وہ باہر جائے تو گھر میرے سپرد ہے۔ پوری طرح سے اس کی حفاظت کرے۔

---

① پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۳۴

آگے فرماتے ہیں: ﴿وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ﴾ ① جن عورتوں سے تمہیں یہ خطرہ ہو کہ اب یہ نا فرمانی کریں گی۔ اس کا پارہ تیز ہو گیا ہے۔ اب ممکن ہے یہ جنگ پہ آ جائے۔ اور مقابل آ جائے۔ اس کی ہدایت دی۔ یہ نہ ہو کہ تم یہ محسوس کرو کہ بیوی میں غصہ بڑھ گیا ہے۔ یہ مدمقابل آ ئے گی۔ تم چار برے بھلے کہہ کے اس کے دل کو بیزار کر دو۔ فرمایا جس سے نافرمانی کا خوف ہو، وہ خفا ہو چکی ہے۔ کچھ زبان سے کہہ بھی رہی ہے، بکواس بھی کر رہی ہے۔ لیکن اندیشہ ہے کہ بالکل بات ٹوٹ جائے۔ تو پہلا درجہ یہ نہیں ہے کہ اس کو برا بھلا کہہ کے گھر سے نکال دو۔ نہیں ﴿فَعِظُوْهُنَّ﴾ ② کچھ وعظ و نصیحت بھلے کی کرو۔ اور یوں کہے کہ شریف زادیوں کے یہ دستور نہیں ہوا کرتے۔ شریف گھرانے کی بیویوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ شرافت سے رہیں، اس طرح سے رہیں۔ یہ غلط طریقہ ہے تو پیار و محبت سے سمجھایا جائے۔ جو شریف الطبع عورت ہوگی۔ وہ یہ لفظ سن کر فوراً پگھل جائے گی۔ اور غصہ ڈھیلا پڑ جائے گا۔ تو چار لفظوں سے نصیحت کرنا، یہ کارگر بن جائے گا اور جھگڑا و فساد ختم ہو جائے گا۔ گھر جنت بن جائے گا۔

لیکن اگر کوئی ایسی بے وقوف ہے کہ نصیحت نے اس پر اثر نہ کیا، اب بھی یہ نہیں کہا اسے جدا کر دو۔ یا معاذ اللہ اسے طلاق دے کر نکاح توڑ دو۔ نہیں۔ فرمایا جب نصیحت سے نہیں مانی تو ﴿وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ﴾ ③ دوسرا علاج یہ ہے کہ اس کو بستر سے تنہا چھوڑ دو، اپنا مردانے میں آ کے لیٹنا شروع کر دو۔ جو شریف زادی ہے، طبیعت میں رعایت ہے، وہ سمجھے گی خاوند کی نگاہ پھر گئی ہے، راضی کرنے کی کوشش کرنی چاہئے وہ تو گھر چھوڑ کے باہر بیٹھ گیا۔ مردانہ میں سونے لگا۔ اب گھر میں نہیں آ رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں مجھ سے بالکل ہی بیزار ہو جائے۔ کہیں گھر ہی اجڑ جائے، تباہ ہو جائے۔ تو اب پیام و سلام شروع ہو جائیں گے۔ آدمی پہنچے گا تشریف لائیے، ذرا بات چیت کیجئے۔ وہ جو ایک بعد تھا، وہ ختم ہو جائے گا۔ تو اول درجہ یہ ہے کہ نصیحت کر دے، نصیحت سے نہ مانے تو اسے گھر میں تنہا چھوڑ کے باہر قیام کر لے۔ ایک رات نہیں گزرنے پائے گی کہ دماغ سیدھا ہو جائے گا۔

لیکن اگر کوئی ایسی کوڑھ مغز ہے کہ اس کو نہ نصیحت کا اثر ہوا نہ باہر کا۔ اس نے کہا میری جوتی سے اگر باہر لیٹ جائے، لیٹ جائے جاکے۔ پھر آ دے گا۔ دو دن میں آ دے گا، چار دن میں آ دے گا، جھک مارے گا، پھر آ دے گا۔ یہ جو ایسی کوڑھ مغز ہے تو اس کے بارے میں فرمایا ﴿وَاضْرِبُوْهُنَّ﴾ ④ تھوڑی سی تنبیہ تھوڑی سی مار پٹائی بھی ایسے حالات میں جائز ہے۔ مگر شریعت نے مار پٹائی کی صورت بھی بتلائی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ لکڑی لے کے اس کے سر ہو جاؤ۔ غریب کے ہاتھ پیر توڑ دو، یہ نہیں ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے "وَاضْرِبُوْهُنَّ" (مار سکتے ہیں) کی تفسیر یہ کی ہے کہ اس کا دوپٹہ لے کر ذرا اسے لپیٹ دے کے دو چار مار دو۔ اس سے تم کو یہ ظاہر کرنا ہے کہ خدا کی طرف سے مجھے یہ بھی اختیار حاصل ہے۔

① پارہ: ۵ سورۃ النساء، الآیۃ: ۳۴۔ ② پارہ: ۵ سورۃ النساء، الآیۃ: ۳۴۔
③ پارہ: ۵ سورۃ النساء، الآیۃ: ۳۴۔ ④ پارہ: ۵ سورۃ النساء، الآیۃ: ۳۴۔

مارنا پیٹنا مقصود نہیں ہے۔ تھپڑوں سے مارے یا لکڑی سے مارے۔ یہ نہیں بلکہ اس کی صورت یہی ہے کہ اس کا دوپٹہ یا رومال لے کر ایک دو الٹیٹ دے کے رسید کرے۔ چوٹ ووٹ تو اسے لگے گی نہیں۔ وہ یہ سمجھ لے گی کہ اُدھو یہ کام بھی اس کو آتا ہے۔ کل اگر اس کے ہاتھ میں لکڑی آ گئی، تو کیا ہوگا؟ گھبرائے گی۔ مگر یہ اس کا علاج ہے جو کوڑھ مغز ہو۔ جس پر نہ نصیحت اثر کرے، نہ بستر پر تنہا چھوڑ دینا اثر کرے۔ ایسی کوڑھ مغز کا تو یہی علاج ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس کی اجازت نہیں کہ اس کو چھوڑ دو۔ یہ نکاح توڑ دو۔

﴿فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا﴾ ① اب اس کے بعد اگر اطاعت کر لے تو بس اب راستہ چھوڑ دو۔ زیادہ اسے تنگ مت کرو۔ مقصود پورا ہو گیا لیکن اگر کوئی ایسی احمق ہے کہ نہ نصیحت نے اثر کیا، نہ خاوند کے چھوڑ کر چلے جانے نے اس پر اثر کیا اور دو چار دو پٹے، الٹیٹ دے کے اس نے کھینچ مارے، اس کا بھی اثر نہ ہوا۔ معلوم ہوا بڑی احمق ہے۔ اس کے دل میں کوئی کجی اور عناد بھرا ہوا ہے، الٹی کھوپڑی کی ہے۔ اس کے لئے اب چوتھا علاج ہے۔ یہ نہیں کہا کہ اب اُسے نکاح سے جدا کر دو۔ یہ اب بھی اجازت نہیں دی۔

علاج یہ کہ اب تحکیم کا مسئلہ جاری کرو۔ حَکَم بناؤ۔ ایک حَکَم عورت کی طرف سے آئے، ایک حَکَم مرد کی طرف سے، دونوں طرف سے ایک ایک ثالث مقرر ہو۔ وہ دونوں ثالث مل کر فریقین کی شکایتیں پیش کریں۔ بیوی کا ثالث کہے کہ بیوی کو یہ یہ شکایتیں ہیں۔ خاوند کا ثالث کہے کہ خاوند کو یہ یہ شکایتیں ہیں۔ فرماتے ہیں حق تعالیٰ ﴿إِنْ يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا﴾ ② اگر نیک نیتی سے یہ دونوں ثالث بات چیت کریں گے، تو اللہ ضرور اصلاح فرمادے گا اور صلح صفائی ہو جائے گی۔ اور وہ جو کدورت بیٹھ گئی تھی، وہ نکل جائے گی۔

عند الضرورت آدابِ طلاق...... لیکن اگر اتنا کوڑھ پڑ گیا ہے کہ بجائے خود ثالث بھی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے مزاجوں میں توافق نہیں ہے۔ عمر بھر ان میں کھٹ پٹ رہے گی، لڑتے رہیں گے۔ اب اجازت دی گئی کہ اتنے مرحلے گزارنے کے بعد اس حالت میں طلاق دے سکتے ہو۔ لیکن طلاق میں میں نے جیسے عرض کیا ایک طلاق سنت ہے ایک طلاق بدعت ہے۔ تو طلاق بدعت ممنوع ہے۔ طلاق سنت یہ کہ ایک طلاق دے، تاکہ مدت عدت میں پھر تمہیں رجوع کرنے کا حق رہے۔ اگر ایک دم تینوں دیدیں۔ اور پڑ گئیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بائنہ ہو گئی، بات ہاتھ سے نکل گئی۔ بہت ممکن ہے۔ بعد میں پچھتاوا پیدا ہو، کہ بھئی ایسے جھگڑے تو روز ہو جاتے ہیں۔ میں نے اپنی بیوی کو الگ کر دیا۔ پھر بیٹھ کر روئے گا۔ اور بیوی بھی روئے گی۔ اس لئے فرماتے ہیں اگر مجبور ہو گئے ہو اور طلاق دینی ہی پڑے تو طلاق سنت ہی دو۔ ایک طلاق دینے کے بعد عدت کی مدت گزارے۔ عدت میں بلا نکاح رجوع کر سکتا ہے۔ طلاق دینے کے بعد ممکن ہے دل میں آئے میں نے بڑی غلطی کی کہ طلاق دے دی۔ معاملہ سنبھل سکتا تھا۔ تو جدید نکاح کی ضرورت نہیں۔ بس رجوع کر لے اس سے معاملہ

① پارہ: ۵ سورۃ النساء، الآیۃ: ۳۴۔ ② پارہ: ۵ سورۃ النساء، الآیۃ: ۳۵۔

شروع کر دے۔ وہ اس کی بیوی ہے۔ پھر بھی اگر نباہ نہیں ہوسکا، پھر آگے دوسری طلاق کا حق ہے۔ پھر آگے اس کی عدت ہے۔ اس میں پھر رجوع کرنے کی گنجائش ہے۔ جب کوئی بھی گنجائش نہ ہو اور معلوم ہو کہ یہ عورت ہی الٹے مزاج کی ہے اور یہ گھر ہی کو تباہ کر کے رہے گی۔ جب تیسری طلاق دے کے قصہ پاک کیا جاسکتا ہے۔

آپ نے اندازہ کیا کہ شریعت نے کتنی برداشت کی ہے۔ اگر لڑائی کا خوف ہو تو نصیحت کرو، نصیحت سے نہ مانے تو ذرا گھر میں اس کو تنہا چھوڑ دو۔ اس سے نہ مانے تو اس کے دوپٹے سے ذرا اس کو تنبیہ کردو۔ اس سے بھی نہ مانے تو ثالث مقرر کرلو اور اس سے بھی نہ مانے تو طلاق سنت دے دو۔ نکاح کو قطع مت کرو۔ اس سے اندازہ ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے ہاں نکاح کتنی محبوب چیز ہے کہ اسے توڑنا نہیں چاہتے۔ اور شیاطین کے ہاں اتنی مبغوض چیز ہے وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح نکاح ٹوٹ جائے۔ اور ناچاقی پھیل جائے۔ خاوند بیوی کو لڑانے والا شیطان بھی آتا ہے، تو اسے بڑا شیطان گلے لگاتا ہے کہ تو ہے میرا سپوت۔ تو نے بڑا کام کیا۔ اس سے واضح ہوا کہ نکاح انبیاء علیہم السلام کو محبوب اور عزیز ہے۔ اور شیاطین کو نکاح کا ٹوٹنا عزیز ہے۔

اللہ کے جوڑ کو باقی رکھنے والے ہی نیک نہاد ہیں..... تو نیک نہاد وہ ہوں گے جو انبیاء علیہم السلام کے راستے پر چلیں گے۔ اور نکاح کرنے کے بعد دل میں عہد باندھیں کہ ہمیں صبر و تحمل سے اپنی بیوی کی داشت کرنی ہے۔ اس کے حقوق ادا کرنے ہیں۔ اگر وہ تھوڑی بہت زیادتی بھی کرے گی ہمیں صبر و تحمل کرنا ہے، درگزر کرنا ہے، اسے لئے کہ ہمیں گھر بگاڑنا نہیں ہے۔ اور گھر بھی الگ رہا۔ دو خاندانوں کو لڑوانا نہیں ہے۔ یہ خاوند اور بیوی کے مزاج کے اوپر موقوف ہے۔ یہ نیک نیتی سے سچا معاملہ رکھیں گے تو دو گھر بھی جڑے رہیں گے، دو خاندان جڑے رہیں گے۔ دو برادریاں آپس میں جڑی رہیں گی۔ انہوں نے بے وقوفی کی تو دو خاندانوں اور برادریوں میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ دارومدار ان دو کے اوپر ہے۔ اگر وہ دونوں حقوق پہچان لیں۔ نکاح کی غرض و غایت آداب اور وہ حقوق پہچان لیں جو شریعت نے بیان کئے ہیں تو گھر بار، برادری سب عزیز و اقارب درست اور اپنی جگہ رہیں گے۔ یہ کتنی بڑی چیز ہے کہ ایک آدمی پوری برادری کو سنبھالنے کا ذریعہ بن جائے۔ اور وہ کتنا برا انسان ہوگا جو پوری برادری میں پھوٹ ڈالنے کا ذریعہ بن جائے۔ اس واسطے نکاح کا مرحلہ بڑا نازک بھی ہے اور آسان بھی ہے۔ آسان تو یہ کہ چار بول پڑھے گئے اور وہ جڑ گئے، نازک اس لئے کہ ذمہ داریاں اس میں بہت آجاتی ہیں۔ عورت کی بھی ذمہ داری بڑھ گئی۔ مرد کی بھی ذمہ داری بڑھ گئی۔ ان کا نبھانا صبر و تحمل والے کا کام ہے، جو ذرا ذرا سی چیزوں میں آپے سے باہر نکل جانے کا عادی ہو، وہ تو لڑائی ہی کرا کے رہے گا۔ خاندانوں میں بگاڑ ہی پیدا کر کے رہے گا۔

حق تعالیٰ شانہ نے اس لئے نکاح کو اپنی آیت بتلایا، کہ یہ ہماری قدرت کی ایک بڑی نشانی ہے۔ ہم ہیں دلوں کے بدلنے والے جب اللہ دلوں میں جوڑ لگادے۔ تو نیک طینت بندہ وہ ہے جو اللہ کے جوڑ کی عزت کرے۔ اسے مرتے دم تک باقی رکھے۔ اور اس کی غرض و غایت کہ تم سکون حاصل کرو، مرد عورت کی طرف رجوع

کر کے سکون حاصل کرے۔عورت مرد کی خدمت کر کے سکون حاصل کرے۔اور ان دونوں کے درمیان میں مودت،محبت اور رحمت کا علاقہ ہو،غضب وقہر اور توڑ پھوٹ کا علاقہ نہ ہو۔﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ﴾ ① اس نکاح میں قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔میں کہتا ہوں ان ساری چیزوں کو ادا کیا جائے، تو ہر ہر چیز مستقل ایک قدرت کی نشانی ہے۔اگر خاوند اور بیوی اس پر تیار ہوں اور عمل کریں تو ساری چیزیں نشانیاں بن جائیں گے۔مگر ان کے لئے جو غور و تفکر کرتے ہیں اور عقل لڑاتے ہیں۔

''تبریک''......اس آیت کی روشنی میں یہ چند باتیں میں نے اس لئے عرض کیں کہ اس وقت نکاح کی تقریب تھی۔عزیز و اقرباء نے تو مبارک باد پیش کی۔میری مبارک باد یہ ہے کہ میں نے نکاح کے بارے میں اس کے حقوق و آداب عرض کئے۔ان الفاظ کے ساتھ میں بھی مبارک باد پیش کرتا ہوں،ان دونوں خاندانوں کے سامنے لڑکے والوں اور لڑکی والوں کے لئے بھی۔بس فرق اتنا ہی ہے کہ آپ حضرات نے عزیز داری کے ضمن میں مبارک باد دی۔میں ایک خادم قوم ہونے کی حیثیت سے مبارک باد دیتا ہوں۔اور خادم قوم کا کام یہی ہے۔کہ خدمت کے طریقے پیش کر دے۔یہ سب سے بڑی مبارک باد ہے اگر خاوند بیوی ان نصائح پر عمل کریں۔

تو سب سے بڑی مبارک باد کی بات فی الحقیقت یہی ہوگی۔اور وہی نکاح باعث خیر و برکت ہوگا۔اب آپ سب حضرات دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں خاوند بیوی میں باہمی محبت نصیب فرمائے۔جو دو گھرانے آپس میں جڑے ہیں،ان دونوں کے اندر محبت و مودت کا رشتہ قائم ہو۔ایک دوسرے کی خیر خواہی میں لگے رہیں اور ایک دوسرے سے محبت و مدارات کا نفع حاصل کریں۔ان کے دلوں میں سکون و تحمل رہے اور ایک دوسرے کے لئے خوشی کا باعث بنیں۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَامًا وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۱.

فلسفۂ موت

موت جیسے فزعِ اکبر ہے۔ جیسے عظیم ترین مصیبت ہے ویسے ہی عظیم ترین نعمت بھی ہے عظیم ترین انعام خداوندی بھی ہے۔ موت کے بارے میں صرف ایک پہلو ہی سامنے نہ رہنا چاہئے۔ بڑے افسوس، ہائے افسوس کا۔ بلکہ خوشی کا بھی ایک پہلو ہے کہ یہ تحفۂ مومن بھی ہے۔ یہ طریقہ ہے دنیا سے اللہ تعالیٰ کو ملنے کا۔ یہ طریقہ ہے دنیا کی آبادکاری کا۔ یہ طریقہ ہے نئے نئے علوم پیدا ہونے کا، اور نئے مربیوں کے پیدا ہونے کا۔ اس لئے موت کا ایک پہلو نہیں کہ اس سے ڈریں بلکہ موت میں پہلو خوشی کا بھی ہے کہ اس کا انتظار بھی کرے اس کی تمنا بھی کرے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ . اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا . وَدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ، اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ . يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ① اِلٰى قَوْلِهٖ تَعَالٰى هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ .

تمہید ...... بزرگانِ محترم! میری اس وقت حاضری کا مقصد ملتان میں نہ کوئی جلسہ تھا، نہ کوئی مجلس تھی نہ کوئی تقریب اور وعظ کا تخیل ذہن میں تھا۔ میری حاضری کا مقصد حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (بانی مدرسہ خیر المدارس ملتان) کی وفات کے بعد یہ پہلی حاضری تھی تاکہ تعزیت ادا کروں۔ تعزیت کے لئے ہجوم اور مجمع نہیں ہوتا، اگر مجھے پہلے سے علم ہوتا کہ جلسہ کا اعلان کیا گیا، تو میں روک دیتا اور مجھے امید تھی کہ مولانا محمد شریف صاحب (مہتمم مدرسہ خیر المدارس، فرزند ارجمند حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ) مان بھی لیتے لیکن اچانک آکر معلوم ہوا کہ کوئی جلسہ بھی ہے اور اجتماع بھی۔ جلسہ اور تقریر میں ان سب کے لئے ضرورت پڑتی ہے نشاط کی، طبیعت میں انشراح ہو نشاط ہو۔ یہ ساری چیزیں مل جاتی ہیں مگر میں اس وقت حاضر ہوا ہوں ایک بجھے ہوئے دل کے ساتھ۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا غم سامنے ہے، یہاں آکر تازہ ہو گیا۔ حالانکہ ان کی وفات کو ایک عرصہ گزر چکا ہے مگر میرا تعلق اتنا قوی تھا ان سے اور قلبی رابطہ برسہا برس سے تھا۔

---

① پارہ: ۲ سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۵۳۔

مولانا مرحوم جب جالندھر میں مقیم تھے۔ پنجاب کا جو بھی میرا سفر ہوا دو جگہ اترنا لازمی ہوتا تھا۔ جالندھر میں مولانا مرحوم کی وجہ سے، اور امرتسر میں مولانا مفتی محمد حسن صاحب مرحوم کی وجہ سے۔ پاکستان بننے کے بعد مولانا مرحوم کا قیام ملتان میں ہوا۔ یہاں بھی ایک آدھ مرتبہ ان کی حیات میں حاضری ہوئی۔ اس وقت ان کی وفات کے بعد یہ پہلا موقع ہے حاضری کا۔ تو وہ سارے تعلقات سامنے آ گئے، وہ ساری تاریخ سامنے آ گئی۔ اس وجہ سے دل پر غم کا ایک بوجھ ہے تو اس بجھے ہوئے دل سے میں کیا تقریر کروں اور کیا جلسے کا حق ادا کروں؟ اور اوپر خود میرا بھی اب ضعیفی کا عالم ہے قوت بھی وہ نہیں ہے جو پہلے تھی۔ جذبات بھی سرد پڑ چکے ہیں۔ ایسی حالت میں تقریر ہو تو کیا ہو؟

بہر حال جب ہو گیا ایک اجتماع اور حضرات جمع ہو گئے ان کا احترام بھی ضروری ہے۔ اس کا تقاضا یہی ہے کہ کچھ نہ کچھ عرض کیا جائے۔ اس لئے غم کے سلسلے میں تعزیتی تقریر ہوگی۔ کوئی خاص وعظ و نصیحت اس میں نہ ہوگا۔

عالم کی بقاء روحانیت کی بقاء سے ممکن ہے..... حقیقت یہ ہے کہ مولانا مرحوم کی ذات ایک مقناطیسی ذات تھی جو قلوب کا رجحان تھا، اور دل کھنچتے تھے اور ان کی وفات جیسا کہ مقولہ مشہور ہے۔ "موت العالم موت العالم" "عالم کی موت فی الحقیقت عالم کی موت ہے" اس لئے کہ عالم کے ذریعے سے حیات پھیلتی ہے وہ حیات یہ نہیں ہے جو کھانے پینے کی ہے وہ حیات روحانی ہوتی ہے اور وہی حقیقی حیات بھی ہے اور وہی حقیقی روح بھی ہے، اسی لئے حق تعالیٰ شانہ نے قرآن کریم کو اپنی روح فرمایا ہے۔ اسی روح سے اقوام زندہ ہوں گی اور اسی روح کے نکل جانے سے پژمردگی طاری ہوگی۔

فرمایا ایک موقع پر کہ: ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ ①

اے پیغمبر! ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے یعنی اپنی روح آپ کے اندر ڈالی ہے وہ عالم کی روح ہے، اور وہ کتاب اللہ اور قرآن کریم ہے جس کو روح بتلایا گیا ہے۔ فی الحقیقت یہ زندگی ہے سارے عالم کی۔ یہ روح ایک فرد سے نکل جائے تو وہ مردہ ہو جائے گا۔ پوری کائنات سے نکل جائے تو کائنات بھی مردہ ہو جائے گی۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

"لَاتَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يُقَالَ فِى الْاَرْضِ اَللّٰهُ اَللّٰهُ" ②

"قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جس وقت اس عالم میں ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہوگا" جب یک بھی باقی نہیں رہے گا تو قیامت آ جائے گی۔ تو قیامت اس پورے عالم کی موت ہے۔ اس حدیث سے واضح ہے کہ اس عالم کی زندگی اور اس کی روح "اللہ اللہ" ہے۔ جب یہ روح نکل جائے عالم مردہ ہو جائے گا، اس کا ریزہ ریزہ بکھر جائے گا۔ آسمان و زمین ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور ساری کائنات کا شیرازہ منتشر

---

① پارہ: ۲۵، سورۃ شوریٰ، الآیۃ: ۵۲.

ہو جائے گا۔ غرض عالم کی روح وہ فی الحقیقت ذکر اللہ اور یادِ خداوندی ہے، نہ صرف پورے عالم کی بلکہ ایک ایک جز کی روح بھی یہی ہے۔

''ہر چیز تسبیح خواں ہے''..... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: درخت کی ہر ہر ٹہنی بھی اللہ کی تسبیح کرتی ہے تسبیح بند ہو جاتی ہے اس پر زردی چھا جاتی ہے، وہ اس کی موت کا وقت ہوتا ہے۔ روح نکل گئی، موت طاری ہو گئی۔

حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ: چلتا ہوا پانی اللہ کی تسبیح کرتا ہے۔ تسبیح بند ہو جاتی ہے جب کہ وہ ٹھہر جاتا ہے۔ تسبیح بند ہو جانے کے بعد ٹھہرا ہوا پانی سڑتا بھی ہے بدبودار بھی ہوتا ہے۔ یہ اس کی موت کا وقت ہوتا ہے۔ تو پانی کی زندگی بھی تسبیح و تہلیل سے ہے۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: امام کے لئے مکروہ تحریمی ہے کہ ایسے کپڑے پہن کر امامت کرائے کہ پسینے میں تر ہوئے ہوں۔ پسینے کی بو آ رہی ہو۔ اس کو فقہاء نے مکروہ لکھا ہے۔ ظاہری وجہ تو یہی ہے کہ جب بدبودار کپڑے ہوں گے اور تعفن ہوگا تو مقتدیوں کو اقتداء کرتے ہوئے کراہت پیدا ہوگی، نشاط باقی نہیں رہے گا۔ جو ایک رابطہ ہے بندہ اور خدا کے درمیان میں وہ پورا قائم نہیں رہ سکے گا، اسی لئے فقہاء لکھتے ہیں کہ امام کے لئے صاف ستھرے کپڑے پہننا ضروری ہیں، اتنے میلے نہ ہوں کہ ان میں سے بدبو آنے لگے۔ رنگ بدل جائے، ظاہری وجہ تو یہی ہے کہ بدبو سے مقتدیوں کو عار پیدا ہوگی۔

حقیقی وجہ یہ ہے کہ کپڑا گندا ہو کر اس کی تسبیح بند ہو جاتی ہے۔ ذکر اللہ منقطع ہو جاتا ہے، وہ بھی ختم ہو جاتا ہے، انقباض پیدا ہوتا ہے روح میں۔ تو درحقیقت عالم قائم نہیں رہے گا۔ عالم کی جزیات ختم ہو جائیں گی تو ہر ہر چیز اللہ کی تسبیح میں مشغول ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ﴾ ①

''کوئی چیز دنیا کی ایسی نہیں ہے جو حق تعالیٰ کی تسبیح میں معروف نہ ہو۔ تم ان کی زبان نہیں سمجھتے یا آواز کو نہیں سنتے۔'' تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہاتھی چنگھاڑ رہا ہے اور درحقیقت وہ اللہ کی تسبیح میں مصروف ہے اپنی زبان میں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ شیر دھاڑ رہا ہے۔ فی الحقیقت وہ اللہ کی تسبیح کر رہا ہے۔ پرندے سیٹیاں بجاتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ وہ چہچہا رہے ہیں۔ حقیقت میں وہ ذکر الٰہی میں معروف ہیں اپنی زبان میں۔ تو ـــ

ہر یکے را اصطلاحے دادہ ایم

ہر ایک کو اللہ نے ایک زبان دی ہے۔ وہ اپنی زبان میں اللہ کی حمد و ثناء اور تسبیح و تہلیل میں معروف ہے۔ ہم اس کی زبان کو نہیں سمجھتے، اور ہم ان کی زبان کو اگر نہیں سمجھتے تو تعجب کی بات نہیں ہے۔ ہم اپنے ہی بھائی بندوں کی سب زبانیں کب سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی پشتونی آدمی پشتو میں اللہ کو پکارنے لگے، دعائیں مانگنے لگے، ہم کیا کریں گے،

① پارہ: ۱۵، سورۃ بنی اسرائیل، الآیۃ: ۴۴.

بیٹھے ہوئے دیکھتے رہیں گے۔ ہمیں کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ ٹھیٹھ پنجابی میں آپ بولیں تو میں کیا سمجھ لوں گا۔ کوئی انگریزی میں اللہ کو پکارے تو ہم کیا سمجھیں گے، تو ہزاروں زبانیں دنیا میں رائج ہیں انسانوں میں۔ ہم اپنے بھائی بندوں کی زبانیں نہیں جانتے۔ اگر پرندوں کی زبان بھی نہ جانیں تو اس میں حیرت کی کونسی بات ہے؟ ہر ایک کی ان کی ایک تسبیح ہے ..... اپنی زبان میں وہ اللہ کو یاد کر رہا ہے۔ آپ نہیں سمجھتے نہ سمجھیں۔ تو فرمایا گیا:

﴿وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ ① تم ان کی تسبیح کو نہیں پہچانتے باقی معجزے کے طور پر اگر اللہ کسی کو بتلادے پرندوں کی بولیوں تو اس کی قدرت ہے جیسے سلیمان علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ﴾ ② اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیاں بتلادی گئی ہیں۔

جب پرندے بولتے تو سلیمان علیہ السلام فرماتے کہ یہ فلاں بات کہہ رہا ہے۔ وہ سمجھتے تھے ان کی بولیوں کو۔ یہ آواز بھی آسکتی ہے ہم لوگوں کے کان میں بھی معجزانہ طریق پر، جیسے کہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹھی بھر کے کنکریاں اٹھائیں تو کنکریوں میں سے زور زور سے آواز آرہی تھی۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم سن رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کنکریاں دے دیں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں۔ تسبیح برابر جاری رہی۔ انہوں نے وہ کنکریاں دیں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں۔ تسبیح برابر جاری رہی۔ جب اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو منتقل کی گئیں تو تسبیح کی آواز سننا بند ہوگئی۔ تسبیح جاری رہی ہوگی مگر سنائی نہیں دی۔ اعجازی طور پر ہم سن بھی سکتے ہیں۔ جب اللہ کا کوئی معجزہ کسی پیغمبر کے ہاتھ ظاہر ہونا چاہے۔

اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے آپ ٹیلیگراف آفس میں جائیں اور جا کر کہیں کہ بھائی یہ تار دے دو، کہ میں فلاں گاڑی سے پہنچ رہا ہوں۔ اس نے پیتل کی ٹلی پر ہاتھ رکھ کر کھٹ کھٹ شروع کی۔ تو آپ کہیں گے کہ: احمق آدمی میں نے یہ کہا ہے، کہ میرے آنے کی اطلاع دے دو۔ تم نے کھٹ کھٹ شروع کردی، وہ کہے گا احمق تو تو ہے۔ اسی کھٹ کھٹ میں یہ سارا علم پہنچ رہا ہے دوسرے ملک میں۔ باقی تو اس کھٹ کھٹ کی آواز سے واقف نہیں ہے۔ میں نے اس کی مشق کی ہے، اس کا فن حاصل کیا ہے۔ اس لئے میں جانتا ہوں کہ ایک دفعہ کھٹ ہوگی تو الف مراد ہوگا۔ دو دفعہ ہوگی تو ب مراد ہوگی۔ تین دفعہ ہوگی تو ج مراد ہوگا۔ تو کھٹ کھٹ سن رہا ہے۔ اور حقیقت میں یہ علم ہے جو ایک ملک سے دوسرے ملک منتقل ہورہا ہے، تو اس فن کو حاصل کرے گا۔ تو تجھے بھی معلوم ہوجائے گا۔ نہیں حاصل کرے گا، تو نہیں پتہ چلے گا۔

تو جس طرح ہم اس کھٹا کھٹ سے علم نہیں سن سکتے۔ نہیں سمجھ سکتے اسی طرح جانوروں کی آوازوں کو ہم سنتے ہیں مگر تسبیح ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ ان کی زبان میں تسبیح ہے، ذکر ہے اپنی زبان میں، وہ کر رہے ہیں۔

ملائکہ علیہم السلام کو بھی مختلف تسبیحات دی گئی ہیں۔ وہ اپنی زبان میں تسبیح کرتے ہیں، ممکن ہے ان کی زبانیں بھی

① پارہ: ۱۵، سورۃ بنی اسرائیل، الآیۃ: ۴۴۔ ② پارہ: ۱۹، سورۃ النمل، الآیۃ: ۱۶۔

متعدد ہوں۔ اپنی اپنی زبان میں وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں، بعض روایات میں ان کی تسبیحات بھی آئی ہیں۔ جیسے فرمایا گیا ہے کہ بعض ملائکہ کی تسبیح ہے کہ: "سُبْحَانَ مَنْ زَيَّنَ الرِّجَالَ بِاللُّحٰى وَزَيَّنَ النِّسَاءَ بِالذَّوَائِبِ" "پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو زینت دی ہے ڈاڑھیوں سے، اور عورتوں کو زینت دی ہے مینڈھیوں اور چوٹیوں سے"۔

بیان کی زبان میں تسبیح ہے ان کی۔ وہ اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ تو مختلف تسبیحات ملائکہ بھی کرتے ہیں، جنات بھی کرتے ہیں، آسمان بھی تسبیح میں مصروف ہیں، زمین بھی تسبیح میں مصروف ہے۔ ستارے بھی تسبیح میں مصروف ہیں۔

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ﴾ ①...... قرآن کریم نے خطاب فرمایا ہے کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ آسمانوں میں جو ہیں وہ بھی مصروف، پہاڑ۔ اور یہ تو ہے تسبیح۔

ہر چیز نمازی بھی ہے...... قرآن کریم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز نمازی بھی ہے اپنے اپنے انداز سے نماز بھی ادا کرتی ہے۔ فقط ذکر ہی میں مصروف نہیں ہے۔ دعویٰ کیا ہے قرآن کریم نے:

﴿كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ﴾ ②

"ہر چیز نے اپنی نماز کو بھی پہچان لیا ہے اور اپنی تسبیح کو بھی جان لیا ہے۔" تو ہر ایک مخلوق نماز پڑھ رہی ہے۔ باقی اس کی نماز اسی انداز کی ہے جیسے اللہ نے اس کی ساخت بنائی ہے، جیسے اس کی ہیئت بنائی ہے اس ڈھنگ کی اس کی نماز بھی ہے۔ شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ درختوں کی نماز میں قیام ہے۔ رکوع اور سجدہ نہیں ہے، وہ ایک انچ نہیں ہٹ سکتے۔ اطاعتِ خداوندی میں لگے ہوئے ہیں۔ چوپائیوں کی نماز میں رکوع ہے۔ ان کی ہیئت ہی ایسی بنائی گئی ہے کہ وہ ہر وقت سر کو جھکائے ہوئے رکوع میں ہیں۔ حشرات الارض ہیں، سانپ، بچھو، کیڑے، مکوڑے، ان کی نماز سجدہ سے ہے۔ قیام اور رکوع نہیں ہے۔ اسی طرح پہاڑوں کی نماز میں تشہد ہے۔ جیسے انسان زمین پر گھٹنے ٹیکے ہوئے بیٹھے ہیں، ان کی نماز تشہد کے ساتھ ادا ہو رہی ہے، تسبیح میں مصروف ہیں۔

جنت اور دوزخ کی نماز دعا مانگنا ہے۔ جنت بھی دعا کر رہا ہے کہ: اے اللہ! مجھے بھر دے اور وعدۂ خداوندی ہے کہ ہم بھر دیں گے۔ جہنم کی بھی یہی صدا ہے کہ مجھے بھر دیجئے، میری غذا مجھے پہنچایئے۔ قیامت کے دن دوزخ کو بھر دیا جائیگا۔ اہل جہنم جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ مگر دونوں کی آواز بند نہیں ہوگی۔ جہنم کہے گا "هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ" اور لایئے ابھی تو میں خالی ہوں، جنت کہے گا میرے ہزاروں شہر خالی پڑے ہیں۔ آبادکاری فرمایئے، آپ کا وعدہ ہے کہ بھر دیں گے، تو جنت کے لئے حق تعالیٰ ایک مستقل مخلوق پیدا فرمائیں گے، جس سے آبادکاری ہوگی جنتوں کی۔ جہنم کے لئے مستقل مخلوق نہیں بنائیں گے۔ حدیث میں ہے کہ اپنا قدم رکھ دیں گے اس پر، جیسا قدم ان کی جناب کے لائق ہے، تو وہ کہے گا قط قط۔ بس بس۔ اب مجھ میں ہمت نہیں ہے میں بھر گیا۔ اس کی دعا قبول

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۱۸. ② پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۴۱.

ہو جائے گی۔ تو جنت اور جہنم کی نماز دعا مانگنے سے ہے۔

ملائکہ علیہم السلام کی نماز ہے صف بندی، کروڑوں ملائکہ صفیں باندھے ہوئے ہیں۔ ہزار ہزار برس سے، کوئی جماعت رکوع میں ہے۔ کوئی جماعت سجدہ میں ہے۔ کوئی قیام میں ہے۔ صفیں بنی ہوئی ہیں۔ صف بندی ان کی نماز ہے۔ سیارے ہیں جو گھومتے ہیں، ان کی نماز حرکت دوراں ہے کہ جہاں سے چلے تھے پھر وہیں لوٹ آئیں۔ گھومنا ہی ان کی نماز ہے۔

اسلام کی نماز کی عظمت اور جامعیت...... یہ حق تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے کہ اسلام کی نماز میں ساری کائنات کی نمازیں اللہ نے جمع کر دی ہیں۔ درختوں کا سا قیام بھی ہے، چوپایوں جیسا رکوع بھی ہے حشرات الارض جیسا سجدہ بھی ہے۔ پہاڑوں کا سا تشہد بھی ہے۔ جنت و دوزخ کا سا سوال و دعا بھی ہے اور سیارات کا سا دوران بھی ہے۔ اس واسطے کہ ایک رکعت پڑھنے کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور ملاؤ تاکہ شفعہ بن جائے تو دو یا چار رکعت کی نماز میں آپ کیا کرتے ہیں، جو کام پہلی رکعت میں کیا الحمد پڑھی، سورت پڑھی، تسبیح پڑھی...... دوسری رکعت میں پھر وہیں سے شروع کر دیتے ہیں، وہی الحمد، وہی سورت، وہی تسبیح، وہی تحمید۔ تو جہاں سے چلے تھے وہیں پھر آ گئے ایک دور ہے تمہاری نماز میں۔ تو سیارات جیسی گردش بھی آپ کی نماز میں۔ تو جامع ترین نماز ہے کہ جتنی ہئیتیں ممکن ہیں عقلاً وہ سب دی گئی ہیں، تاکہ بندہ عبادت اور تذلل کے ساتھ پیش ہو، کھڑا ہو تو تذلل، بیٹھے تو اپنی ذلت کا اظہار، جھکے تب ذلت کا اظہار۔

عبادت کا صحیح مفہوم...... غرض عبادت نام ہے اظہار تذلل کا۔ انتہائی درجہ کی ذلت اپنی پیش کی جائے۔ اس لئے کہ جس ذات کے سامنے آدمی کھڑا ہوتا ہے وہ انتہائی عزت کے مقام پر ہے کہ اس کے بعد کوئی درجہ نہیں عزت کا۔ اس کے سامنے اتنی ذلت پیش کی جائے کہ اس کے بعد ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ تو ذلیل محض بن کر آدمی اپنے پروردگار کے سامنے حاضر ہوگا۔ اس لئے کہ وہ عزت کے انتہائی مقام پر ہے اس کا فرض ہے کہ ذلت کے انتہائی مقام کو پیش کرے۔ کھڑے ہوتے ہیں آپ جامد و ساکت۔ یہ ایک درجہ ہے اظہار ذلت کا۔ رکوع کیا تو گردن جھکا دی، یہ دوسرا درجہ ہے اظہار ذلت کا۔ اس کے بعد ہاتھ اٹھائے، دعائیں مانگیں، تو بھیک مانگنا، یہ سب سے زیادہ انتہائی درجہ ہے ذلت کا۔ تو جتنی ہئیتیں ہیں وہ سب اظہار تذلل کی ہیں۔ جتنے اذکار ہیں نماز میں یا عظمت خداوندی کا اظہار ہے یا اپنی نیاز مندی کا اظہار ہے۔ انہی دو چیزوں پر مشتمل ہیں تمام اذکار، تو ذکر بھی، افعال بھی، ہئیت بھی سب اظہار ذلت کے ہیں نماز میں۔

صرف نماز اپنی ذات میں عبادت ہے...... اس لئے یوں کہنا چاہئے کہ حقیقی معنوں میں اگر عبادت ہے تو صرف نماز ہے۔ دوسری عبادات اور وجوہ سے عبادت بنی ہیں، اپنی ذات سے عبادت نہیں۔ نماز اپنی ذات سے عبادت ہے۔ روزہ...... اس کا معنی یہ ہے کہ کھانے پینے سے آدمی مستغنی ہو جائے، تو کھانے سے، پینے سے، بیوی سے مستغنی

ہونا، یہ اللہ کی صفت ہے۔اس میں ذلت تھوڑا ہی ہے۔ یہ مشابہت ہے حق تعالیٰ کے ساتھ۔ کہ کھانے سے بھی بری، پینے سے بھی بری، بیوی سے بھی بری، تو یہ اظہارِ ذلت تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو اظہارِ عزت ہے۔ یہ عبادت تعمیل حکم کی وجہ سے ہے۔ حکم دیا تعمیل کرو تو بن گئی عبادت۔

زکوٰۃ..... اپنی ذات سے عبادت نہیں ہے۔اس کے معنی عطا کرنے کے ہیں کہ فقیروں کو دو، عطا کرنا تو اللہ کی شان ہے۔ یہ تشبیہ ہے حق تعالیٰ کے ساتھ۔اس میں ذلت تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو عین عزت ہے۔ زکوٰۃ عبادت بنی اس لئے کہ حکم ہے کہ زکوٰۃ دو، تو تعمیل ارشاد نے اس میں پیدا کر دیئے معنی عبادت کے۔ اس طرح سچ بولنے کو عبادت کہتے ہیں اور وہ عبادت ہے لیکن سچ بولنا اپنی ذات سے عبادت نہیں یہ تو اللہ کی صفت ہے۔

﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا﴾ اللہ سے زیادہ کس کا قول سچا۔ ①

﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا﴾ اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی۔ ②

تو سچ کہنا اور سچ بولنا حق تعالیٰ کی شان ہے بندہ اگر سچ بولے گا تو مشابہت پیدا کرے گا کمالاتِ خداوندی کے ساتھ۔اس میں ذلت تھوڑا ہے یہ تو عین عزت ہے۔ پھر بھی وہ عبادت ہے کہ حکم کی تعمیل کی جاتی ہے۔ اللہ کا کہنا ہے سچ بولو۔ تعمیل کے لئے گردن جھکا دی کہ سچ بولوں گا۔ سچ کو عبادت بنا دیا تعمیل حکم نے۔ اپنی ذات سے عبادت نہیں تھی۔ ورنہ اللہ کی صفت نہ ہوتی۔

صرف نماز پوری کائنات پر فرض ہے..... لیکن نماز کی ہر ہیئت اظہارِ ذلت کے لئے ہے۔ ہر ذکر بھی اپنی ذلت کے اظہار پر مشتمل ہے اس واسطے نماز اپنی ذات سے عبادت ہے محض تعمیل حکم سے عبادت نہیں، اس کے اندر خاصیت ہی اظہارِ تذلل کی ہے یہی وجہ ہے کہ ساری کائنات پر فرض کی گئی ہے۔ زکوٰۃ، حج اور سچ بولنا فرض نہیں کیا گیا، فرمایا گیا: ﴿كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ﴾ ③ ہر چیز نے اپنی نماز کو پہچان لیا۔ یہ نہیں فرمایا: ''كُلٌّ قَدْ عَلِمَ حَجَّهٗ، كُلٌّ قَدْ عَلِمَ زَكٰوتَهٗ.'' تو نماز کائنات کی ہر چیز پر فرض کی گئی ہے۔ انسان، جن، فرشتہ، درخت، پہاڑ اور پتھر سب کے لئے عبادت اور نماز لازمی قرار دی گئی ہے تو اصل معنی کے لحاظ سے نماز ہی عبادت ہے۔ بقیہ عبادتیں تعمیل حکم کی وجہ سے عبادتیں بنی ہیں۔

ربط مع الحق بدوں نماز ممکن نہیں..... یہی وجہ ہے کہ بندے کا حقیقی رابطہ اللہ سے بغیر نماز کے قائم نہیں ہو سکتا۔ آپ زکوٰۃ دیں گے تعلق مع الخلق درست ہو جائے گا۔ غریب کی خبر گیری ہوگی، وہ آپ کا ممنون ہوگا۔ تعلقات استوار ہو جائیں گے، اس تعمیل کی وجہ سے اللہ سے بھی تعلق پیدا ہوگا، مگر حقیقتاً وہ تعلق ہے مخلوق کے ساتھ۔ اس واسطے رابطہ بندے کا اللہ سے بغیر نماز کے قائم نہیں ہو سکتا۔ اگر نماز میں قصور ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا رابطہ حق تعالیٰ سے قائم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر (نماز میں) دوسرا خیال لاتا ہے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ حق تعالیٰ

---

① پارہ: ۵ سورۃ النساء، الآیۃ: ۱۲۲. ② پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۸۷. ③ پارہ: ۱۸ سورۃ النور، الآیۃ: ۴۱.

فرماتے ہیں: میرے ہوتے ہوئے غیر کی طرف توجہ کرتا ہے تجھے حیا نہیں آتی۔ اگر متنبہ ہوگیا بندہ، پھر تعلق قائم ہوجاتا ہے۔ نہ ہوا تو پھر خود بے رخ بن جاتے ہیں۔ توجہ ہٹا لیتے ہیں۔ اٹھک بیٹھک رہ جاتی ہے۔ تو نماز سے ہی فی الحقیقت رابطہ قائم ہوتا ہے۔

نماز سے دیدارِ خداوندی کی استعداد ...... اس لئے حدیث میں فرمایا گیا: تمام نمازوں کے بارے میں اور خصوصیت سے صبح اور عصر کی نمازوں میں کہ ان دونوں سے استعداد پیدا ہوتی ہے دیدارِ خداوندی کی۔ نماز ہی سے اللہ کو دیکھنے کی صلاحیت بندہ میں آتی ہے۔ عمر بھر نماز پڑھتا رہے گا تو ابتداءً عقیدے کی آنکھ سے دیکھے گا، پھر کشف کی آنکھ سے دیکھے گا۔ اور پھر ایک وقت آئے گا کہ آخرت میں اس آنکھ سے بھی دیکھ سکے گا۔ تو مقصودِ اصلی عبادت سے معبود کو دیکھنا اور اس کا قرب حاصل کرنا ہے اور یہ صرف نماز سے ممکن ہے۔ تو حقیقی عبادت نماز ہی ہے۔

روحِ خداوندی ہر چیز میں موجود ہے ...... میں یہ عرض کر رہا تھا کہ: حق تعالیٰ نے قرآن کریم کو اپنی روح فرمایا۔ اس روح کے اندر یہ عبادات بھی شامل ہیں۔ تعمیلِ ارشاد ہی اس کی روح ہے فی الحقیقت، بندے میں اللہ نے قرآن کی روح ڈال دی تا کہ اس میں بندگی پیدا ہو اور اللہ کی معبودیت ظاہر ہو۔ "وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا" پیغمبر! عالم امر کی روح ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈال دی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتیوں کے صدقے سے وہ روح ہم تک پہنچ گئی، ہمارے اندر بھی وہ روح ہے ہم اس روح کو داخل رکھیں گے تو قوی رہیں گے۔ قوت کی علامت اس روح کی برقراری ہے اور ضعف کی علامت اس روح کا نکل جانا ہے۔

مسلم اقوام کی پریشانی کا علاج ...... دنیا میں مسلمان شکایت کرتے ہیں کہ فلاں قوم نے ہمیں تباہ کر دیا، فلاں قوم نے اپنی مکاریوں سے ہمیں پریشان کر دیا۔ ہماری جائدادیں ختم کر دیں۔ ہمارے جان ومال کو ختم کر دیا۔ میں کہتا ہوں کہ: یہ شکایت بالکل غلط ہے...... شکایت تو کفار کو ہونی چاہئے کہ تمہاری نابکاری سے ہم بدعنوان بن گئے۔ اگر تم صحیح معنوں میں اپنے دین پر قائم رہتے تو ہم تمہاری ٹھوکروں کے نیچے رہتے، ہم تمہاری اتباع کرتے لیکن جب تم اپنے نہج پر نہیں ہو تو ہم سے کیا توقع رکھتے ہو، کہ ہم تمہاری پیروی کریں یا پابندی کریں۔

تو حقیقت میں شکوہ ہے مسلمانوں کا۔ مسلمانوں کا حق نہیں ہے غیر اقوام سے شکوہ کرنے کا مسلمان آیا تھا دنیا کی اقوام کو درست کرنے کے لئے۔ اس کو اقوام امام بنایا گیا، امام ہی کا وضو نہ ہو تو کیا مقتدیوں کی نماز ہو جائے گی؟ اقوام کیوں اس کی اقتداء کریں گی۔ اور کیوں کہ اس کی پیروی کریں گی؟

اس لئے کہ وہ قوت اس نے ختم کر دی جو غالب اور قاہر تھی اقوام پر۔ وہ روح ہوا کی طرح بھری ہوئی تھی۔ جب تک وہ ہے مسلمان قوی ہے، وہ نکل گئی مسلمان ضعیف ہے آپ نے دیکھا ہوگا کہ گیند ہے اس میں ہوا بھری ہوئی ہے اگر آپ اسے زمین پر پٹخ دیں تو گز وا کھاکے دس گز اوپر جاتی ہے اس لئے کہ ہوا بھری ہوئی ہے اس میں۔ اور اگر اس میں سوئی چبھو دی جائے تو ہوا نکل جائے گی، تو جہاں ڈالیں گے، وہیں پڑی رہ جائے گی۔ اس کو آپ

پیروں سے پامال کردیں، وہ اٹھنے کا نام نہیں لے گی، اس لئے کہ روح نکل گئی۔

روح اسلامی نکلنے سے مسلمانوں کا انجام..... مسلمانوں کی روح قرآن پاک ہے۔ اقوام کی یہ مجال نہیں کہ اس کو دبائیں، دبائیں گے وہ یخ دیں گے نیچے، تو یہ دس گز اوپر جائے گا، اور اوپر ہی جائے گا۔ ''اَلْحَقُّ یَعْلُوْ وَلَایُعْلیٰ'' (حق غالب ہوتا ہے مغلوب نہیں ہوتا) لیکن یہ روح نہیں ہوگی، تو جہاں ڈالیں گے وہیں پڑا رہے گا۔

آج اگر مسلمان پامال ہو رہے ہیں، نہ اس لئے کہ کفار میں جان ہے۔ اس لئے کہ تم بے جان ہو گئے، جو روح تھی وہ نکال باہر کی، تو روح نکل جانے کے بعد آدمی لاشہ بن جاتا ہے۔ لاشہ کے لئے ہر انسان کا پہلا فرض ہوتا ہے۔ دبائے، جلائے یا اسے دفن کر دے (الغرض آنکھوں سے اوجھل کرنا سب کے نزدیک ضروری ہے، اس دنیا میں اب اس کا کوئی مقام نہیں) اس کو گھر نہیں چھوڑتے، باہر نہیں چھوڑتے۔ اس کے تعفن سے دنیا کی صحت خراب ہوگی۔ پہلا کام یہ کرتے ہیں اسے دفن کرتے ہیں، کوئی جلاتا ہے، کوئی پانی میں بہا دیتا ہے، اور کوئی برا نہیں مناتا۔ لیکن اگر زندہ آدمی کو کوئی جلائے، تو گورنمنٹ ہی مدعی ہو جائے گی کہ اسے پھانسی دو، قوم بھی مدعی بنے گی کہ یہ بدکار ہے، مجرم ہے، روح کے ہوتے ہوئے کسی کی مجال نہیں ہے کہ دبائے، دبائے گا تو مجرم ثابت ہوگا۔ لیکن جب روح نکل جائے گی، جس کا جی چاہے جلا دے، دفن کر دے، تو مسلمانوں کا یہ شکوہ کرنا کہ فلاں قوم نے ہمیں جلا دیا، یا فلاں نے گرا دیا، میں کہتا ہوں غلط ہے۔ اس نے خود اپنے کو گرا دیا ہے، جب روح نکال دی، زندگی ختم ہو گئی زندہ آدمی کو کوئی نہیں جلا سکتا۔

عالم کی روح فی الحقیقت ذکر اللہ ہے..... میں عرض یہ کر رہا تھا کہ حقیقی معنی میں حق تعالیٰ نے دینی روح (مسلمان میں) ڈال دی، اور وہ ہے قرآن مجید۔ ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ ① تو اس عالم کی روح فی الحقیقت ذکر اللہ ہے۔ جب یہ نکل جائے گی، تو عالم لاشہ کی، سند ہو جائے گا، اور لاشہ کا انجام پھولنا، پھٹنا، سڑنا، گلنا اور ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ ایک ایک چیز کا ذرہ ذرہ پھٹ جائے گا قیامت کے دن، یہ عالم کی موت ہوگی اور یہ اس لئے واقع ہوگی کہ روح نکل جائے گی۔

روح کا حسی مرکز..... اس روح کا سب سے بڑا حسی مرکز بیت اللہ شریف ہے، جس کے ذریعے چلتی ہے اسی میں تجلی خداوندی ہے، جس کے سامنے ہم جھکتے ہیں۔ یہیں سے بطفیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انوار و برکات چلتے ہیں۔ تو یہ مرکز روح ہے فی الحقیقت، قیامت کا جب قرب ہوگا اور روح نکلنے والی ہوگی تو حدیث شریف میں ہے کہ بیت اللہ کو ایک حبشی غلام ریزہ ریزہ کر دے گا۔ ایک ایک پتھر اس کا جدا کر دے گا۔ تو سب سے پہلے بیت اللہ ختم ہوگا۔ پھر عالم پر قیامت طاری ہو جائے گی۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے بادشاہ کا لشکر چلتا ہے تو سب سے پہلے شاہی خیمہ نصب کیا جاتا ہے تا کہ بادشاہ آ کر

---

① پارہ: ۲۵، سورۃ الشوریٰ، الآیۃ: ۵۲.

ٹھہرے، ان کے اردگرد ان کے دربار کے اُمراء کے خیمے لگتے ہیں، پھر فوجیوں کے خیمے لگتے ہیں، جب بادشاہ آتے ہیں تو بڑا شہر بن جاتا ہے لیکن جب کیمپ اجڑتا ہے تو سب سے پہلے شاہی خیمہ اکھاڑا جاتا ہے بعد میں اور امراء کے خیمے اکھڑتے ہیں اور پھر میدان خالی ہو جاتا ہے، یہی صورت یہاں بھی ہے وہ خیمۂ خداوندی کہ تجلیات الٰہیہ اس میں مقیم ہیں، سب سے پہلے اس کو عالم میں قائم کیا گیا۔ فرمایا گیا: ﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ. ﴾① ”سب سے پہلا گھر جو اللہ نے عبادت کے لیے قائم کیا وہ وہ ہے جو مکہ شہر میں ہے اس کا نام کعبہ مقدس ہے۔“ یہ گویا خیمہ شاہی ہے جب عالم کو آباد کرنا ہوا تو سب سے پہلے خیمہ شاہی نصب کیا گیا اور جب عالم کا خیمہ اکھڑے گا اور یہ دنیا ختم ہوگی، تو سب سے پہلے شاہی خیمہ اکھاڑا جائے گا۔ جب بیت اللہ کی ایک ایک حبشی غلام اینٹ سے اینٹ بجا دے گا اور تجلی خداوندی اسے چھوڑ دے گی۔ اس کے بعد عام مساجد بھی ویران ہوں گی۔ تمام اہل اللہ کے ذکر خانے (خیمے) بھی ویران ہوں گے، اور ساری دنیا ویران ہو جائے گی۔ تو اولین چیز وہ شاہی خیمہ ہے جو سب سے پہلے نصب ہوتا ہے کیمپ میں اور اکھڑنے کے وقت سب سے پہلے شاہی خیمہ اکھڑتا ہے۔ تو اولین چیز جو قائم کی گئی وہ بیت اللہ ہے اور ابتداء میں قیامت کے قرب میں وہ سب سے پہلے اکھاڑا جائے گا۔ بہرحال وہ روح ذکر اللہ ہے جو اس کے اندر موجود ہے۔ اسی کی بقاء سے عالم باقی ہے۔

فلسفۂ موت اور علماء ربانی کی شان ..... تو موت فی الحقیقت نام ہوا ذکر اللہ کے منقطع ہو جانے کا، یہ منقطع نہ ہو تو آدمی مرتا نہیں۔ اسی لیے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ: ”مَثَلُ الذَّاكِرِ فِي الْغَافِلِيْنَ كَمَثَلِ الْحَيِّ فِي الْأَمْوَاتِ.“ ② ”غافلوں کے اندر ایک بھی ذکر اللہ کرنے والا موجود ہے تو وہ مثل زندہ ہے، وہ غافلوں میں سے نہیں اس لئے مردوں کے اندر وہ زندہ ہوتا ہے۔“

تو علماء ربانی کی شان یہی بتائی گئی ہے کہ ان کا دل، روح اور دماغ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد میں مصروف رہتا ہے، یہ اثر ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اور ان کا صدقہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں یہ فرمایا گیا ہے: ”كَانَ يَذْكُرُ اللهَ عَلٰى كُلِّ أَحْيَانِهٖ.“ ③ ”کوئی لمحہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اللہ سے خالی نہیں ہوتا تھا۔“ زبان سے ذکر کریں۔ قلب سے ذکر کریں، جس کو فکر کہتے ہیں۔ روح سے ذکر کریں جس کو توجہ کہتے ہیں اور معرفت کہتے ہیں۔ غرض کسی نہ کسی طریق پر ذکر میں مصروف رہتے ہیں۔ جب کوئی عالم ربانی اٹھتا ہے جس کے لئے کہا گیا ہے کہ ”موت العالم موت العالم“ تو ایسے عالم کا اُٹھ جانا، پورے عالم کا اٹھ جانا ہے، کیونکہ وہ روح نکل جاتی ہے تو پورے عالم پر ایک پژمردگی چھا

---

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۹۶۔ ② مرقاۃ المفاتیح، کتاب الصلوٰۃ، باب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، ج: ۳ ص: ۹۵ ؛ حدیث صحیح ہے، امام بخاری نے بھی اس کے مثل روایت کی ہے دیکھئے: الصحیح للبخاری، کتاب الدعوات، باب فضل ذکر اللہ عزوجل، ج: ۲۰ ص: ۲۳۔ ③ الصحیح لمسلم، کتاب الحیض، باب ذکر اللہ تعالیٰ فی حال الجنابۃ وغیرھا ج: ۲ ص: ۲۹۷۔

جاتی ہے۔ تو میں نے (ابتداء میں) عرض کیا تھا کہ مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ، جیسے ان کے نام میں خیر ہے ان کے مسمّٰی میں اللہ نے خیریت ہی رکھی تھی۔ اور واقعتاً خیر ہی خیر تھے۔ حدیث کا پڑھنا پڑھانا، قرآن پاک کا پہنچانا، مواعظ سے تبلیغ و تلقین کرنا۔ اپنے پروردوں کی تربیت کرنا غرض ذکر اللہ ہی ان کا مشغلہ تھا کسی بھی انداز سے ہو۔

ایسے عالم ربانی کا اٹھ جانا یقیناً پورے عالم کے لیے موت کا بھی اور علامات موت کا یقیناً اشارہ ہے۔ جب کوئی عالم ربانی اٹھتا ہے تو قلوب محسوس کرتے ہیں کہ ایک قسم کی ظلمت طاری ہوگئی ہے۔ پورے عالم میں روحانیت میں کمی آگئی۔ ہر شخص محسوس نہیں کرتا، صاحب دل جانتا ہے کہ نورانیت میں کمی کی آتی ہے، اسی واسطے فرمایا گیا کہ: ''اَلْمَوْتُ اَلْفَزْعُ الْاَکْبَرُ'' ''موت سب سے زیادہ گھبرا دینے والی چیز ہے۔'' مگر مجھے ساتھ یہ بھی عرض کرنا ہے کہ موت جہاں گھبرا دینے والی چیز ہے، وہاں ایک تحفہ بھی ہے۔ ایک نعمت بھی ہے یہ نعمت بھی اللہ کی طرف سے ہے۔ اگر موت نہ ہو عالم کی آبادکاری نہیں ہوسکتی۔

اللہ اور فرشتوں کے درمیان مکالمہ..... ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ: حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی ساری اولاد کو ملائکہ علیہم السلام کے سامنے پیش کیا۔ اربوں، کھربوں انسان جو قیامت تک آنے والے ہیں۔ ملائکہ نے انہیں دیکھ کر عرض کیا۔ یا اللہ یہ زمین میں سمائیں گے کیسے؟ یہ تو تین ارب ہو جائیں گے تو اسی وقت کہیں گے کہ نس بندی کراؤ فیملی پلاننگ کرو۔ ایک طوفان برپا ہے۔ اگر وہ پچاس ارب ہو جائیں تو زمین کا کیا حشر ہوگا؟ تو ملائکہ کو یہ خلجان گزرا کہ زمین میں یہ کیسے سمائیں گے؟

حق تعالیٰ نے کہا کہ: موت مسلط کردوں گا۔ آئیں گے بھی جائیں گے بھی، زمین خالی ہوتی رہے گی۔ اگلے آتے رہیں گے، پچھلے جاتے رہیں گے۔ تو میں نے موت کا سلسلہ قائم کیا تاکہ جانے والے جائیں، اور آنے والے خالی جگہ آکر لیتے جائیں۔ اس پر ملائکہ نے عرض کیا جب موت مسلط ہوگی تو ہر وقت موت کی فکر لاحق ہوگی، ان کی زندگی تلخ ہوجائے گی۔ نظام دنیا کیسے چلے گا؟ ہر وقت موت کی فکر میں غرق رہیں گے۔ فرمایا: حق تعالیٰ نے کہ اُمیدیں مسلط کردوں گا ان کے قلوب پر۔ اُمیدوں میں لگے رہیں گے، موت کا دھیان بھی نہیں ہوگا، نظام دنیا چلتا رہے گا۔

بہر حال موت جہاں ''فزعِ اکبر'' ہے گھبرا دینے والی چیز ہے۔ وہاں آبادکاری کا بھی ذریعہ ہے اگر موت نہ ہوتی تو اس زمین پر آبادکاری ممکن نہ ہوتی۔ تو مسافروں کی طرح آتے ہیں انسان اور چلے جاتے ہیں۔ جگہ خالی کر دیتے ہیں۔

موت دنیوی تحفہ بھی ہے..... اور اگر دنیوی لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی موت ایک عجیب نعمت ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''الموت تحفۃ المؤمن'' ① ''موت سب سے بڑا تحفہ ہے مومن کے لئے'' اس سے بڑھ کر

---

① علامہ عجلونی اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: رواہ الدیلمی عن جابر بزیادۃ: والدرہم والدینار مع المنافع وھما زادہ الی النار، ورواہ عن عائشۃ بلفظ: الموت غنیمۃ والمعصیۃ مصیبۃ والفقر راحۃ. دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۲ ص: ۲۹۰۔

اللہ کی طرف سے کوئی نعمت نہیں دی گئی اور کیوں ہے وہ تحفہ؟ اس کی وجہ بھی حدیث میں ہے: ''اَلْمَوْتُ جِسْرٌ یَصِلُ الْحَبِیْبَ اِلَی الْحَبِیْبِ'' ''موت ایک پل ہے جس سے گزر کر آدمی اپنے حبیب سے جا ملتا ہے'' تو محبوب حقیقی سے مل جانا، یہ کوئی گھبرانے کی چیز ہے؟ یہ کوئی مصیبت ہے؟ یہ تو عین خوشی کی چیز ہوئی۔ بندہ اپنے خدا سے جا ملے تو جس طرح کسی بندے کی پیدائش پر خوشیاں مناتے ہیں، میں کہتا ہوں موت بھی خوشی کی چیز ہے۔ (اس پر بھی خوشیاں منانے کا اہتمام ہوا کرے) مگر لوگ تو یوں کہیں گے کہ یہ تو بالکل الٹی بات ہے، عقل کے بالکل خلاف، لوگ رونے پیٹتے ہیں خوشی کیسے منائیں گے؟

میں کہتا ہوں وہ رنج موت پر نہیں، وہ فراق پر رنج ہوتا ہے۔ موت کی خوشی ہوتی ہے کہ بندہ اپنے خدا سے جا ملا۔ اسی لئے کہا کرتے ہیں کہ کسی کی اگر اچھی موت ہو کہ خدا ایسی موت تو سب کو نصیب کرے۔ اگر موت خوشی کی چیز نہ ہوتی تو کیوں کہتے لوگ؟

معلوم ہوا موت گھبرانے کی چیز نہیں ہے، جو روتے ہیں، وہ موت پر نہیں روتے۔ جدائی پر روتے ہیں کہ ایک نعمت ہم سے چھن گئی۔ ایک چیز ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ تو صدمہ فراق پر ہے موت پر نہیں موت خوشی کی چیز ہے۔ اس لئے کہ یہ مصیبت تو نہیں ہے کہ بندہ اپنے اللہ سے جا ملے۔ یہ تو عین خوشی کی چیز ہے کہ بندہ محبوب حقیقی تک پہنچ گیا۔

موت کی تمنا کرنا علامت ولایت ہے..... اسی واسطے موت کی تمنا ہی فی الحقیقت ولایت کی علامت بتلائی گئی ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ یہود نے دعویٰ کیا تھا کہ ہم اولیاء اللہ ہیں، تو قرآن نے دعویٰ کیا کہ:

﴿قُلْ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِیَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ ① تو خود موت کی تمنا بھی ایک نعمت ہے۔ اسی واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی ہے۔ ''اَللّٰهُمَّ حَبِّبِ الْمَوْتَ اِلٰی مَنْ یَّعْلَمُ اَنِّیْ رَسُوْلُكَ'' ''اے اللہ! ہر اس شخص کے دل میں موت کی محبت ڈال دے جو میرے نبی ہونے کا قائل ہے''۔ اس لئے کہ موت ہی واسطہ ہے اللہ تک پہنچنے کا، موت نہ ہو تو بندہ اللہ تک کیسے پہنچے؟ تو موت ذریعہ ہے وصول الی اللہ کا۔ اس لئے موت تحفہ بھی ہے، نعمت بھی ہے اور واسطہ بھی ہے بندہ کا اللہ سے۔ اس لئے فرمایا کہ: موت کی تمنا کرنا ولایت کی علامت ہے۔

اولیاء اللہ رات دن موت کی تمنا میں رہتے ہیں۔ ان کی زبان پر تو یہ رہتا ہے:۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بردیم	راحت جان طلبم وز پے جاناں بردیم
نذر کردم کہ اگر آید بسر زیں غم روزے	تادر میکدہ، شاداں وغزل خواں بردیم

وہ کون سا مبارک دن ہوگا کہ اس اجڑے ہوئے دیار کو ہم چھوڑیں گے، اور شہر مطلوب میں پہنچیں گے، جہاں اللہ سے ہمارا رابطہ قائم ہوگا۔ خدا کرے کہ وہ ساعت جلد آئے تو اولیاء اللہ کے دل میں تو (موت کی) تڑپ رہتی ہے۔

① پارہ:۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ:۶۔

حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھوپالی نقشبندی خاندان میں سے ہیں اور ہمارے عزیزوں میں سے تھے، ان سے بہت فیضان اور (مخلوق کو) فائدہ ہوا۔ مرض وفات جب شروع ہوا، اور موت بالکل قریب آئی تو لوگوں نے جا کر تسلی دی کہ حضرت فکر نہ کریں، ان شاء اللہ صحت ہو جائے گی۔ غصہ آ گیا مولانا کو فرمایا:۔

''عمر بھر اس وقت کی تمنا میں تھے اور تم اس کو ہٹانے آئے ہو، خدا خدا کر کے وقت آیا کہ موت قریب آئی اور تم موت سے تسلی دیتے ہو کہ اور زندہ رہوں۔ خبردار اس کے بعد یہ جملہ نہ کہنا، دعاء کرو حسن خاتمہ ہو جائے۔ تسلیاں مت دو کہ میری عمر زیادہ ہو۔ عمر بھر میں اس وقت کی تمنا میں تھا۔ وقت آیا تو تم ہٹانے آ گئے۔''

طالب علمانہ شبہ...... یہاں یہ ممکن ہے کہ کوئی طالب علم، طالب علمانہ طریق سے شبہ کرے کہ ایک حدیث میں تو موت کی تمنا کرنے سے ممانعت فرمائی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ: ''لَا یَتَمَنَّیَنَّ اَحَدُ کُمُ الْمَوْتَ'' ① ''دیکھو تم میں کوئی موت کی تمنا نہ کرے'' یہاں تو فرمایا جا رہا ہے کہ موت کی تمنا نہ کرو، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعا دیتے ہیں کہ موت کی محبت ہر قلب مسلم میں ڈال دی جائے تو بظاہر تعارض ہے۔

جواب...... میں کہتا ہوں تعارض نہیں ہے، جس حدیث میں فرمایا گیا کہ ''دیکھو موت کی تمنا نہ کرو'' اسی روایت میں یہ لفظ بھی ہیں۔ ''بِضُرٍّ نَزَلَ بِهٖ'' ''موت کی تمنا مت کرو دنیا کی کسی مصیبت سے گھبرا کر بیماری سخت ہوگئی کہ موت کیوں نہیں آ جاتی؟ افلاس بڑھ گیا، تمنا کرو، اس کی ممانعت ہے کہ دنیا کے مصائب سے گھبرا کر موت کی تمنا مت کرو، یہ بے اعتمادی ہے حق تعالیٰ پر اور یہ بندگی کے خلاف ہے۔ باقی اللہ سے ملاقات کے شوق میں تمنا کرنا یہ ولایت کی علامت ہے تو ہر ولی کامل دل میں شوق رکھے گا اللہ سے ملاقات کا، اور چاہے گا کہ جلد اللہ تک پہنچ جاؤں۔ بہر حال موت جہاں گھبرا دینے والی چیز ہے وہاں ایک عظیم تحفہ اور نعمت بھی ہے۔

موت چھوٹوں کے جوہر کھلنے کا ذریعہ ہے...... میں کہتا ہوں کہ اس لحاظ سے بھی ایک بڑی نعمت ہے کہ اگر قیامت تک سارے بڑے بیٹھے رہا کرتے تو چھوٹوں کے جوہر کھلنے کی کوئی صورت نہ ہوتی۔ چھوٹوں کا نہ علم سامنے آتا نہ کمال مگر بڑوں کا کمال سامنے رہتا، سب اسی میں لگے رہتے اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک دنیا میں تشریف رکھتے تو صحابہؓ کے جوہر نہیں کھل سکتے تھے۔ وہ ہر وقت اطاعت اور اطاعت گزاری میں رہتے، مستقل ہو کر آگے آ کر اپنی طبیعت اور قلب کے جوہر نہ دکھلاتے۔ نہ صدیق اکبرؓ کے جوہر کھلتے نہ فاروق اعظمؓ کے جوہر کھلتے۔ یہ جبھی ہوا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے، اور یہ قائم مقام بنے، قائم مقامی کا کام انجام دیا، اس میں تمام جوہر کھلے۔ تو میں کہتا ہوں کہ: اس لحاظ سے بھی موت نعمت ہے کہ چھوٹوں کے جوہر کھلنے کا ذریعہ ہے۔

اگر آج مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہیں ہیں۔ بے شک غم کی چیز ہے لیکن ان کے خلف صالح موجود ہیں۔ ان کی ذریت صالح موجود ہے، ان کے تلامذہ موجود ہیں جو اس کام کو جاری رکھیں گے اور ان کی طبیعت میں

① الصحیح لمسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب کراھیۃ تمنی الموت... ج:١٣ ص:١٧٨.

جو جوہر موجود ہیں وہ کھلیں گے۔ اگر سولؐ تاہی رہتے تو یہ چیزیں کبھی نہ کھلتیں۔ تو یہ بھی ایک فائدہ کی چیز ہے۔ اگلوں کے جوہر کھلنے کا ذریعہ ہے اگے دنیا کو آباد کریں گے، وہی کلمہ پہنچائیں گے۔

موت اصلاح وتربیت کے تعدد وتفنن کا ذریعہ ہے

موت نہ ہو تو نئی نسل کے دین سمجھنے میں دشواری پیش آتی، کیونکہ ہر زمانے کی نفسیات الگ الگ ہوتی ہیں، ہر سو برس بعد نفسیات بدل جاتی ہیں۔ اسی واسطے حدیث میں وعدہ کیا گیا: ''اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَأْسِ کُلِّ مِأَۃِ سَنَۃٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا۔'' ① ''ہر قرن پر مجدد کا وعدہ کیا گیا ہے کہ جاہلانہ طریق پر جو لوگ تاویلیں کر کے دین میں خلط پیدا کر دیں گے۔ اللہ سو برس کے بعد پھر مجدد پیدا کر دیں گے۔ وہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دے گا، پھر دین کو نکھار دے گا۔ اس لیے کہ سو برس میں ایک نسل ختم ہو کر دوسری نسل کا آغاز ہو جاتا ہے اور ہر آئندہ آنے والی نسل کے نظریات الگ ہوتے ہیں، افکار الگ ہوتے ہیں، نفسیات الگ ہوتی ہیں۔ اس لئے ضرورت پڑتی ہے کہ اسی دور کے اہل علم اپنی نفسیات میں ان کو دین سمجھانے والے ہوں۔ پرانے لوگ اگر ہوتے تو اپنی نفسیات میں سمجھاتے تو وہ لوگ دین کو نہ سمجھ سکتے۔ اس لئے اللہ نے موت کو رکھا تاکہ نئے لوگ جب آئیں تو نئے مجدد بھی پیدا ہوں، اسی زمانے کی اصطلاح میں، اسی زبان میں، اسی ڈھنگ سے دین کو پیش کریں اور سمجھائیں، تو موت اس لحاظ سے بھی بڑی نعمت ثابت ہوتی ہے کہ وہ ذریعہ ہے تربیت اور اصلاح کے تفنن اور تعدد کا، تاکہ مختلف الوان سے تربیت خداوندی میں داخل ہوں۔

ہر دور کے تقاضوں کے مطابق علماء وقت نے اسلام پیش کیا..... ایک زمانہ تھا کہ روایت کا غلبہ تھا۔ عوام میں سے کوئی اس وقت تک دین کی بات نہیں مانتا تھا جب تک کہ سند پڑھ کر کوئی حدیث نہ سنا دی جائے۔ تو یہ روایت کا دور تھا، روایتی طور پر دین کو قائم کیا جاتا تھا جب تک کہ عقل کے پیرائے میں نہ سمجھائیں تو ایسے علماء اللہ نے کھڑے کئے۔ امام رازیؒ، امام غزالیؒ کہ انہیں کی زبان میں دین سمجھایا، ان کو تائب کیا، پھر ایک زمانہ تصوف پسندی کا آیا، جب تک صوفیانہ رنگ میں کوئی نہ سمجھائے، لوگ نہیں سمجھتے تھے، تو اللہ نے ایسے صوفیائے کرام کھڑے کئے کہ ہر مسئلہ کو صوفیانہ رنگ میں ڈھالتے کہ لوگ ماننے پر مجبور ہو گئے۔

آج حسیت کا دور ہے فلسفۂ قدیم کا دور ختم ہو گیا جو محض نظریاتی طور پر فلسفہ تھا۔ اب حسیات کا دور ہے، مشاہدات کا دور ہے، جب تک ایسے علماء نہ ہوں کہ مشاہدات کے انداز میں سائنس کے انداز میں حسی مثالوں سے دین کو نہ سمجھائیں گے، لوگ نہیں سمجھیں گے، اگر بڑے ہی لوگ بیٹھے رہتے، آج کی اصطلاحات سے ناواقف ہوتے تو دین نہ سمجھا سکتے۔ اللہ نے انہیں اٹھا لیا، ان کے خلف صالح پیدا کر دیئے کہ وہ اس دور کے مطابق اسی رنگ میں سمجھائیں، تو بہرحال موت جیسے فزع اکبر ہے، جیسے عظیم ترین مصیبت ہے، ویسے ہی عظیم ترین نعمت بھی ہے،

① السنن لابی داؤد، کتاب الملاحم، باب مایذکر فی قرن المائۃ ج: ۱۱ ص: ۳۶۲.

عظیم ترین انعام خداوندی بھی ہے۔ موت کے بارے میں صرف ایک پہلو ہی سامنے نہ رہنا چاہئے۔ ہائے افسوس، ہائے افسوس کا، بلکہ خوشی کا بھی ایک پہلو ہے کہ یہ تحفۂ مومن بھی ہے۔ یہ طریقہ ہے، راستہ ہے اللہ تعالیٰ کو ملنے کا۔ یہ طریقہ ہے دنیا کی آبادکاری کا۔ یہ طریقہ ہے نئے نئے علوم پیدا ہونے کا، اور نئے نئے مربیوں کے پیدا ہونے کا، اس لئے موت کا ایک پہلو نہیں کہ اس سے ڈریں بلکہ موت میں پہلو خوشی کا بھی ہے کہ اس کا انتظار بھی کرے، اس کی تمنا بھی دل میں رکھے، تو اس لئے میں نے عرض کیا کہ لوگ موت کو ہر وقت وحشت ناک سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ وحشت کی چیز نہیں ہے اگر تعلق مع اللہ مضبوط ہے تو اس سے بڑھ کر نعمت کوئی چیز نہیں اگر غفلت ہے تو بے شک موت عظیم ترین مصیبت بھی ہے، اسی واسطے وہ کفار کے حق میں مصیبت ہے، مومن کے حق میں مصیبت نہیں۔

کافر کی تمنا..... اور فرمایا کہ کافر تمنا کرتا ہے کہ زندگی بڑھتی ہی رہے۔ ﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ﴾ ① "تم ان کفار کو دیکھو گے کہ سب سے زیادہ حریص ہیں دنیا کی زندگی پر موت کے نام سے بھی موت آتی ہے انہیں اور مشرکین کو اگر ہم ہزار برس کی عمر بھی دے دیں تو اسی کی تمنا کریں گے کہ ایک ہزار برس اور ہو" یہ حال اور خاصہ کفار کا ہے، اور مومن کا یہ ہے کہ بس عمر ہو جائے تو اکتا جاتا ہے کہ اللہ جلدی بلا لیجئے کہ آپ سے مل لوں۔

تو بالکل برعکس ہے قصہ، تو موت سے فقط ڈرتے رہنا، گھبراتے رہنا غفلت کی علامت ہے، اور یہ غفلت (عن الحق) کفر کا سرا ہے اللہ بچائے ہر ایک کو، اور حق تعالیٰ سے موت کی تمنا کرنا یہ بیداری اور تعلق مع اللہ کی علامت ہے۔ اس لئے موت کا ایک ہی پہلو نہیں کہ آدمی رنج کرتا رہے بلکہ رنج کرنے سے روکا بھی ہے۔ طبعی رنج جتنا ہو اس کا مضائقہ نہیں لیکن اس رنج کو پالنا، تازہ کرتے رہنا، اس کو شریعت نے پسند نہیں کیا اور فرمایا: "لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُوْدَ وَشَقَّ الْجُيُوْبَ" ② "وہ ہم میں سے نہیں ہے جو موت کے غم میں بال نوچ ڈالے، رخسارے پیٹ ڈالے، چھاتی پیٹ ڈالے۔" اس لئے کہ موت آتی ہے بیدار کرنے کے لیے نہ کہ غافل بنانے کے لئے، کہ آدمی اسی میں الجھ کر رہ جائے، موت آئی، "اناللہ" پڑھا، اس کے بعد مرنے والے کے عمل کو جاری کیا۔ اپنے عمل کو جاری کیا، اپنی تیاری شروع کر دی، تو موت بیداری پیدا کرنے والی چیز ہے نہ کہ غافل بنانے والی۔ بیداری جس سے پیدا ہو وہ تو نعمت ہے، مصیبت تھوڑا ہی ہے، مصیبت بنتی ہے اس کے لئے جس پر غفلت طاری ہو۔

غفلت عن الحق کے بُرے آثار..... غافل عن الحق کو موت کے نام سے بھی موت آتی ہے، جو اللہ سے غافل ہو موت کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرے گا، ہر وقت اسی موڈ میں رہے گا۔ پھر اس میں سرکشی تمرد اور بغاوت پیدا ہوگی۔ مورخین لکھتے ہیں کہ فرعون کی عمر چار سو برس کی ہوئی، اس عمر میں کبھی بھی بیمار نہیں ہوا، کبھی بھی کوئی مصیبت

---

① پارہ: ۱، سورة البقرة، الآية: ۹۶.

② الصحيح للبخاري، كتاب الجنائز، باب ليس منا من ضرب الخدود ج: ۵ ص: ۱۲۵.

نہیں دیکھی، تو کبر اور نخوت میں آپے سے باہر ہو گیا، اور کہا: انا ربکم الاعلی ۔ یعنی میں سب سے بڑا رب ہوں، اور موسیٰ علیہ السلام کی تحقیر و تذلیل کے درپے ہو، اور کہا:

﴿اَلَیْسَ لِیْ مُلْکُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ اَمْ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ مَهِیْنٌ وَّلَا یَکَادُ یُبِیْنُ﴾ ① ..... کیا تم نہیں دیکھتے کہ میرے پاؤں کے نیچے نہریں جاری ہیں، مصر کی حکومت میرے ہاتھ میں ہے۔ کرسیاں میری مضبوط ہیں اور میرے مخالفین کو تم عزت دار سمجھتے ہو جس کے کپڑے بھی ٹھیک نہیں، یعنی موسیٰ علیہ السلام، تو تو ہین کے درپے ہوا۔

یہ کیوں ہوا تو ہین کے درپے۔ اس لئے کہ غفلت تھی اللہ سے، تو غفلت والے کو موت کے نام سے موت آتی ہے۔ اور (فرعون کی) جب واقعی موت آنے لگی اور لگا ڈوبنے تو باآواز بلند کہا۔ میں ایمان لایا موسیٰ علیہ السلام پر اور ان کے پروردگار پر، جس کو فرمایا گیا:

﴿آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَکُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ﴾ ② ..... "اب ایمان لایا جب کہ عالم غیب منکشف ہو گیا۔ اور اب تک دنیا میں فساد برپا کرتا رہا۔"

بعض روایات میں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام اس کے منہ میں ریت ٹھوس رہے تھے کہ ایسا نہ ہو یہ ایسے کلمات کہے، کہیں نجات ہی نہ ہو جائے۔ بد بخت بخشا نہ جائے۔ ساری عمر تو مخلوقِ خدا کو پریشان کیا اور اب نجات پا جائے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ علیہم السلام پر غلبہ حال کا ہوتا ہے غلبۂ محبت کا یا غلبہ عداوت کا۔ بہر حال جب غفلت طاری رہتی ہے، اللہ سے بری رہتا ہے۔ جب بری رہے گا، موت کو نہ پسند کرے گا، اور اگر غفلت کی بجائے بیداری اور قلب میں ذکر اللہ ہے تو اللہ سے قریب ہوگا اور موت کی تمنا بھی کرے گا اور وہ ذریعہ بنے گا قربِ خداوندی کا۔ تو موت کا جہاں پہلو غم کا ہے وہاں خوشی کا بھی ہے، جہاں دل بیٹھنے کا ذریعہ ہے وہاں دل کے ابھرنے کا بھی ذریعہ ہے اس واسطے دونوں پہلوؤں کی موت کے اندر رعایت رکھنی چاہئے۔ کوئی میت ہو گئی تو یہ نہیں کہ آدمی غم میں ڈوب کر آپے سے باہر نکل جائے۔ عقل سے بھی کام لے، جو اس کے لئے نفع بخش ثابت ہو۔

میت پر جزع فزع ..... اگر غم میں بیٹھ کر آدمی نے بین کرنا شروع کیا تو میت کو کیا فائدہ پہنچا، بلکہ میت کو تکلیف پہنچتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: "اِنَّ الْمَیِّتَ لَیُعَذَّبُ بِبُکَاءِ اَهْلِهٖ عَلَیْهِ" ③ "جب بین کر کے لوگ روتے ہیں تو میت کو تکلیف پہنچتی ہے" اور ایذا پہنچتی ہے یوں کر کے رویا جائے کہ واجبلاہ ہائے تو تو پہاڑ تھا، تو ملائکہ چوکا لگاتے ہیں کہ کیا واقعی آپ پہاڑ تھے؟ وہ کہتے ہیں واشمساہ کہ تو تو سورج تھا، ملائکہ کچوکے دیتے ہیں کہ کیا واقعی آپ سورج تھے؟ اس سے اذیت پہنچتی ہے میت کو۔ تو رونا بکا نوحہ، جزع فزع یہ میت کے لئے تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔

---

① پارہ: ۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۵۱-۵۲. ② پارہ: ۱۱، سورۃ یونس، الآیۃ: ۹۱.

③ الصحیح للبخاری، کتاب الجنائز، باب قول النبی ﷺ یعذب المیت... ج: ۵ ص: ۳۰.

اسی واسطے حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا کہ میت ہونے پر پہلا کام تو یہ ہے کہ صبر کرو اور انا للہ پڑھو۔ دوسرا کام یہ ہے کہ اس کو نفع پہنچانے کی کوشش کرو، تو وہ رونے سے نہیں پہنچتا، ثواب پہنچانے سے پہنچتا ہے۔ جس کے لئے ایصال ثواب ہو گا اس کے لئے باعث خیر و برکت ہو گا۔ تو میت کے لئے ہمیں نافع ہونا چاہئے اور میت کا نام آئے تو اس کے لئے فائدہ کا سامان پہنچانا چاہئے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''اُذْکُرُوْا مَحَاسِنَ مَوْتَاکُمْ ''۔ اپنے مرنے والوں کی خوبیاں یاد کرو اور لوگوں کے سامنے بیان کرو، مرنے والوں کی برائیاں مت ذکر کرو۔ اس کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ اگر اللہ نے بخش دیا ہے، تم اگر برائیاں کرتے ہو اس سے کیا ہوتا ہے؟ تمہاری زبان گندی ہوگی، وہ تو مغفور ہو گیا۔ جتنا ممکن ہو خوبیوں اور اچھائیوں کا ذکر کرو۔ تاکہ لوگوں کو اچھا کام کرنے کی رغبت پیدا ہو۔ بہر حال میت ہونے کے بعد دوسرا کام یہی ہے کہ طبعی رنج ہوتا ہے۔ اس سے اللہ نے نہیں روکا۔ لیکن عقلاً روک دیا ہے کہ غم کو پالنے کے لئے مت بڑھاؤ۔

میت پر ضرورت سے زیادہ غم کرنا رسمی ہوتا ہے، حقیقی نہیں۔ وہ رسمی غم ہوتا ہے جس کا زمانہ جاہلیت میں دستور تھا، کہ جب کوئی بڑا آدمی مر جاتا تو وصیت کر کے جاتا تھا کہ مجھے چھ مہینے رویا جائے، مجھے برس تک رویا جائے تو باندیاں کرائے پر رکھتے کہ انہیں رونے کی مشق ہوتی ہے، جہاں گردن جھکائی اور ٹپ ٹپ آنسو گرنے شروع ہو گئے۔ تو کرایہ پر جہاں رونے والی رکھی جاتی ہوں، جہاں انہوں نے دیکھا کہ کوئی تعزیت کے لئے آیا، یا کوئی نیا آدمی آیا وہاں انہوں نے گھیرا بنایا اور ہا ہا شروع کی کہ واحبیباہ۔ واشمساہ واقمراہ۔ ہائے تو تو پہاڑ جیسا تھا وغیرہ، بیٹھی رو رہی ہیں۔ تو راہگیر کہتے تھے کہ کوئی بڑا آدمی مر گیا ہے، جو چھ مہینے گزر گئے اور اب تک رویا جا رہا ہے، تو یہ علامت تھی بڑے ہونے کی۔

ظاہر بات ہے کہ یہ رونا کوئی حقیقی رونا تھوڑا ہی تھا۔ یہ تو رسمی اور بناوٹی رونا تھا۔ اسلام نے تصنع اور بناوٹ نہیں سکھلائی۔ حقیقت بتلائی ہے، کہ محض تصنع اور بناوٹ سے کوئی کام کرنا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ طبعی غم ہو اس کا مضائقہ نہیں لیکن عقلی طور پر غم کو پالنا اور بڑھاتے رہنا زمانہ جاہلیت کی رسم تھی۔ اسلام نے یہ رسم نہیں رکھی۔ اس نے تو یہ سیدھی بات بتلا دی کہ جب کوئی انتقال کرے تو صبر جس سے آئے وہ پڑھو۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آیت استرجاع میں عقلاً و طبعاً صبر کی تعلیم ہے...... اس آیت میں صبر اور تسلی کا پورا سامان موجود ہے۔ جب آدمی نے یوں کہا: انا للہ ہم سب اللہ کی ملک ہیں۔ اس سے عقلی طور پر صبر آ گیا کہ جب ہم اللہ کی ملک ہیں تو اپنی مملوک میں وہ جو چاہے تصرف کرے۔ چاہے اٹھائے، چاہے دنیا میں زندہ رکھے۔ ہم کون ہیں اس میں دخل دینے والے؟ اس سے صبر آ جائے گا عقلی طور پر کہ ہم مملوک ہیں اور مالک کو اختیار ہے، اپنی مملوک میں جو چاہے کرے۔ مگر طبعاً ابھی تک تعلق موجود تھی، طبعی رنج بھی ہوا تھا، تو دوسرے جملے میں اس کا علاج بتلا دیا فرمایا: وانا الیہ راجعون۔ کہ جب ہم بھی وہیں جائیں گے۔ ملاقات ہو جائے گی۔ ہمیشہ کے لئے تھوڑا ہی جدائی ہوتی ہے، تو انا للہ کے لفظ سے عقلاً اور انا الیہ راجعون سے طبعاً بھی صبر آ جاتا ہے۔ دعا، اس لئے بتلائی گئی تاکہ صبر و تحمل کے ساتھ اپنے عمل میں لگیں، فکر

آخرت میں گئیں، غم منا نہ گھلیں بیٹھ کر...... فارسی میں عرفی کا ایک شعر جس کا ترجمہ یہ ہے) اگر رونے سے مرنے والا واپس آجایا کرتا تو ہم ہزار برس رولیا کرتے، مگر وہ واپس آنے والا نہیں ہے۔ جو گیا سو گیا۔ اب اس جہان میں دوبارہ آنے والا نہیں ہے اب ملاقات ہوگی تو اس جہان میں ہوگی۔ یہ جہان بھی ختم ہو جائے گا۔

مومن اور کافر کی موت کا موازنہ...... مومن کو تو ہر وقت آس لگی ہوئی ہے کہ اپنے عزیزوں سے ملوں گا، دوستوں سے ملوں گا اور فلاں فلاں سے ملاقات ہوگی۔ کافر جس نے ساری زندگی اسی دنیا کو سمجھا ہے، مایوس وہ ہے مسلمان نہیں۔ اس لئے کہ اسے کوئی تمنا نہیں ہے تو بہر حال اسی حکم (انا للہ وانا الیہ راجعون) سے صبر آجاتی ہے۔

تو میں نے عرض کیا تھا کہ اس وقت نہ کوئی جلسہ تھا نہ کوئی وعظ کہنا مقصود تھا، نہ کوئی تقریب مقصود تھی، تعزیت مقصود تھی، اور تعزیت ہنگاموں کو نہیں چاہتی، یہ ہمارے مولانا (محمد شریف صاحب مہتمم مدرسہ خیر المدارس ملتان) نے بیٹھے بٹھائے خواہ مخواہ آپ لوگوں کو تکلیف دی۔ میں تعزیت کے لئے حاضر ہوا تھا تو تعزیت کر کے واپس ہو جاتا۔ لیکن خیر بہر حال جب آپ حضرات تشریف لے آئے اور آپ کا کرم ہوا اور ہماری سعادت ہوئی کہ اتنے بھائیوں کی زیارت نصیب ہوگئی، اتنے بھائیوں سے ملنا ہو گیا۔ تو مجمع کی ہیئت ایسی بن گئی کہ آپ سامنے بیٹھ گئے، مجھے اس کرسی پر بٹھلا دیا، اور سامنے لاؤڈ اسپیکر رکھ دیا، تو خواہ مخواہ بولنا ہی پڑتا ہے۔ یہ ہیئت مقتضی ہوئی، کہ کچھ نہ کچھ کہا جائے۔ اس لئے میں نے وہی چند کلمے کہے جو آپکے مقصد سے متعلق تھے اور وہ مقصد تھا تعزیت۔ تو تعزیت ہی کے سلسلے میں کچھ موت کا ذکر، کچھ موت کے پہلوؤں کا ذکر، کچھ مولانا (خیر محمد صاحب) مرحوم کی خیر وخوبی کا ذکر، کچھ ان کے پس ماندگان کا ذکر، اور ان کے خلفاء کا ذکر، یہی چیزیں تعزیت میں آسکتی تھیں اس لئے چند جملے عرض کئے گئے، حق تعالیٰ شانہ صبر کی توفیق دے اور مولانا مرحوم کا نعم البدل ہمیں زیادہ سے زیادہ عطا فرماوے، اور ان کا جو کام تھا حق تعالیٰ اس کو جاری وساری رکھے۔

اللھم ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

ضروری نوٹ...... ہمارے ہاں یہ بات ہمارے قومی مزاج میں داخل ہو چکی ہے کہ ہر نو وارد سے مصافحہ کو ضروری خیال کرتے ہیں اور اس میں دوسرے کی راحت کا خیال پیش نظر نہیں رکھا جاتا، حالانکہ نظم وضبط مسلمان کا امتیازی نشان تھا۔ حضرت حکیم الاسلام مدظلہ العالی تقریر فرما چکے تو ایک اژدہام اسٹیج کی طرف امڈ آیا، اور مصافحہ کی کوشش میں ادب واحترام اور ایذاء مسلم کا بھی بالکل پاس نہ رہا، بلکہ ایک دھینگا مشتی کا عالم تھا جو نہایت قابل افسوس تھا، اور خصوصاً ایسے مجمع میں جہاں علماء کرام اور مدارس عربیہ کے طلباء کرام کی کثیر تعداد تھی۔ لیکن با ایں ہمہ وہ سب کچھ ہوا جس کی توقع کم از کم دینی تعلیم یافتہ اصحاب سے نہ تھی۔ حضرت قاری صاحب مدظلہ العالی نے مجمع کی اس پراگندہ حالت کو دیکھ کر نظم وضبط کی تعلیم فرمائی۔ اس کے باوجود حضرت قاری صاحب مدظلہ العالی کو اسٹیج سے اپنی رہائش تک رسائی میں انتہائی دقت اور دشواری پیش آئی۔ جلسہ کے منتظمین مجمع عام ہونے کی وجہ سے اپنی اپنی جگہ معذور تھے۔

یہ چند کلمات بھی جو کہ ہمارے قومی مزاج کی اصلاح کے لئے آپ نے ارشاد فرمائے تھے، ذیل میں رقم کئے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ سب کو عمل کی توفیق بخشے۔ (از مرتب غفرلہ)

بحیثیت مسلمان ہونے کے آداب شرعیہ اختیار کریں۔ آپ کے اندر نظم وضبط ہونا چاہئے۔ مصافحہ باعث برکت چیز ہے اور بہت خیر کی چیز ہے۔ اس پر اجر کے وعدے کئے گئے ہیں۔ فرمایا گیا ہے کہ دو مسلمان جب مصافحہ کرتے ہیں، اور دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ آ جائے تو ہاتھ جدا نہیں کر پاتے کہ دونوں کے گناہوں کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ تو مصافحہ بڑی باعث برکت چیز ہے مگر ہر اطاعت کے اندر یہ شرط ہے کہ دوسرے کو اذیت نہ پہنچے، تکلیف کا سامان نہ ہو، ایذاء رسانی حرام ہے اور مصافحہ کرنا فرض نہیں۔ ایک مستحب کے لئے ایک مکروہ چیز کا ارتکاب کرے یہ غلط بات ہے۔ لوگ جو مصافحہ کے لئے دوڑتے ہیں، یہ طریقہ آدابِ اسلامیہ کا نہیں ہے۔ اسے بالکل ترک کر دیا جائے اور پھر اس طریق سے ہاتھ دھانا، جس سے مصافحہ کرتے ہیں وہ بھی عاجز آ جاتے ہیں۔ یہاں ہم پاکستان میں عاجز ہوتے، تو قاعدے سے تو ہم پولیس کی حراست میں تھے اور ان کی نگرانی میں تھے اور اب قوم کی حراست میں ہو گئے کہ جب تک حلقہ نہ بنے بھگو دینا نہیں کی جاسکتی۔ یہ کیا واہیات بات ہے؟ یہ مصافحہ ہے؟ یہ تو ایذاء پہنچانا ہے۔ اس لئے کوئی صاحب مصافحہ کی تکلیف نہ کریں۔ جب میں اٹھوں تو راستہ دے دیں۔ یہ مصافحہ خیر و برکت نہیں ہوگا جس میں اذیت پہنچے ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے۔ ''اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ''۔ ① مسلمان وہ ہے جس کی زبان سے جس کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان کو تکلیف نہ ہو۔ تو یہ ہاتھ سے تکلیف پہنچانا ہے۔

آپ حج کو جاتے ہیں، حجر اسود کا بوسہ یا تو مستحب ہے یا واجبات میں سے ہے، مگر جب دوسرے کو تکلیف پہنچے تو شریعت نے اجازت دی ہے کہ اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر اس کو چوم لے، یہ مصافحہ ہو گیا۔ ہاتھ بھی نہ اٹھا سکو تو لکڑی سے اشارہ کر دو یہ کافی ہو گیا۔ وہاں تو مصافحہ واجب تھا، اس کے لئے بدل رکھا اور یہاں تو واجب بھی نہیں ہے۔ اس واسطے خواہ مخواہ دوسروں کو اذیت پہنچانا، آپا دھاپی اختیار کرنا ماجر تو اجر، اس پر تو وبال ہوگا۔ اس لئے کوئی صاحب مصافحہ کا ارادہ نہ کریں۔ اور میں ویسے بھی کمزور ہوں، ضعیف اور بیمار ہوں، خود کو تحمل نہیں کہ ایک ہزار آدمیوں سے مصافحہ کروں۔ ہر ایک تو ایک دفعہ کرے گا، مجھے ایک ہزار مرتبہ ہاتھ اٹھانے پڑیں گے۔ مجھ میں یہ طاقت نہیں ہے۔ لہٰذا بیٹھے رہیں اور جب اٹھوں تو راستہ دے دیجئے۔

---

① الصحيح للبخاري، كتاب الايمان باب المسلم من سلم المسلمون، ج: ١ ص: ٦.